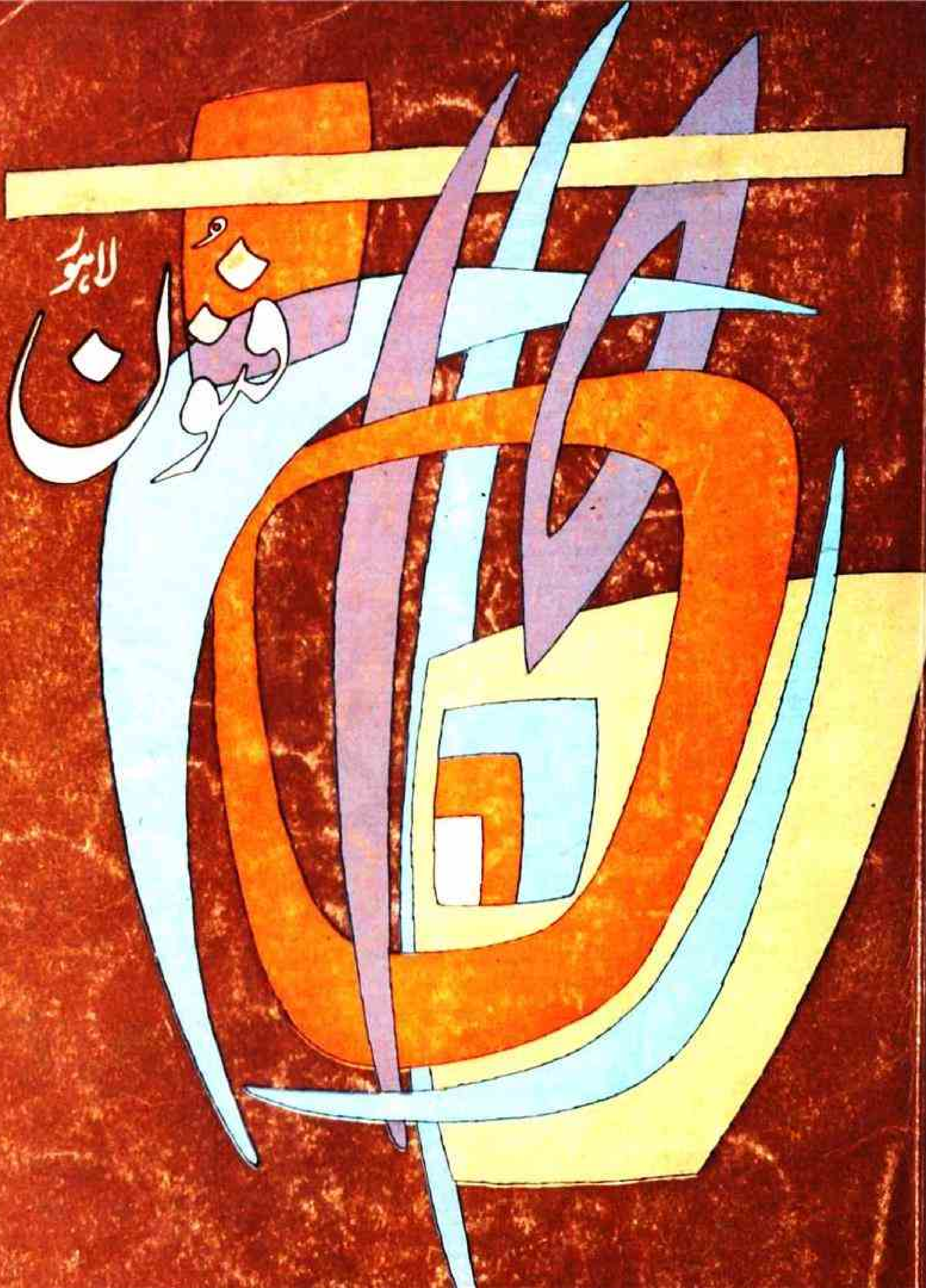

لاہور
فنون

رجسٹرڈ ایل نمبر: ۷۶۷۹
ٹیلیفون نمبر: ۶۹۵۸۰

معیاری علم و فن کی تخلیقی رفتار کا پیمانہ

فنون

اشاعتِ خاص
(۴)

فروری، مارچ ۱۹۶۶ء

ادارہ:

احمد ندیم قاسمی
حبیب اشعر دہلوی

معتمد:
موجد

جلد: ۲ | شمارہ: ۴، ۵ | قیمت فی پرچہ: تین روپے

سالانہ چندہ: ۱۴ روپے (ڈاک سے) دستی: ۱۲ روپے غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

مقامِ اشاعت: ۱۷۰ - انارکلی - لاہور

مندرجات

مختار صدیقی

حرفِ اوّل

"فنون" کے اس شمارے کا بیشتر حصّہ پریس میں جا چکا تھا جب ہمیں محترم مختار صدیقی نے ایک ایسی نظم عنایت کی جس میں وہ سب کچھ ہے جو ہم اس شمارے کے اداریے میں کہنا چاہتے تھے سو اب کے یہی نظم نذرِ قارئین ہے:

ادارہ

خون سے سینچی ہوئی خاک پہ اب حدِ نظر تک ہیں
نئے کھیت
نئی فصل — نئی ہریالی!
ٹینکوں اور فوجوں سے روندی ہوئی مٹی پہ
تباہی کا کوئی گھاؤ
نہ تخریب کی ہل چل کی کہیں بد حالی!
ہر طرف ہیں — نئی محنت کی نئی بیل بہاریں
نئی شادابی سے وارفتہ ہوئی جاتی ہے ڈالی ڈالی!
امن کا وقفہ یہاں خواب کی پرچھائیں نہیں
ٹینکوں اور توپوں کی خاموشی چھلاوہ بھی نہیں
مورچوں کا یہ سکوں، بھی کوئی دیباچۂ آرام نہیں!!

یہ ہرے کھیت
نئی بیل بہاریں تو
نئے عزم، نئے کام کی تمثال ہیں
اس امن کے وقفے کی یہ تاریخ ہیں
یہ حال ہیں!
جن سے کوئی ماضی نہیں ہوتا خالی!
میری ملّت کا یہ پیمانِ مقدس ہیں
— کہ ہر موت ہے جینے کی نئی تیاری!
یہ نئی بیل بہاریں
مری ملّت کا یہ احساس، یہ ایماں ہیں
— کہ ہم سوزِ یقیں سے نہیں ہوں گے عاری!
یہ نئے کھیت تو
ملّت کی یہ تقدیر بنے ہیں
— کہ ہمیں جنگ بھی آساں ہے
تو یہ امن کا وقفہ بھی نہیں ہے بھاری!!

آؤ — ہر روز — ہر اک شب
اسی تقدیر
اسی سوزِ یقیں کا
اسی ایماں
اسی پیماں کا اعادہ کریں!
آؤ — ان پاک شہیدوں کی جو سنّت ہے
اُسے جانِ ارادہ کریں!
آؤ — اس سنّتِ پائندہ کے
یہ قول
یہ الفاظ
ابد تک کے لیے رہبرِ جادہ کریں!

"کیا کہا پھینک دوں ہتھیار؟ یہ تم کہتے ہو
تم نے وردی بھی پہن رکھی ہے اور
خود کو سپاہی بھی سمجھتے ہو گے!
سُنو: ہتھیار یہ اس واسطے باندھے تھے
کہ یہ پاک وطن زندہ و پائندہ رہے
دینِ برحق کا علم اونچا رہے
کوئی بھی خطرہ، نہ اسے آج رہے
اور نہ آئندہ رہے
میں یہ ہتھیار نہیں دوں گا
یہ دینے کو نہیں باندھے تھے!!"

گزشتہ سہ ماہی میں اردو زبان و ادب کو دو جانکاہ حادثوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان سے پنڈت تلوک چند محروم کے انتقال کی خبر آئی اور پاکستان میں میاں محمد شریف نے رحلت فرمائی۔ محروم نے پنجاب کے ایک مغربی گوشے کا باشندہ ہونے کے باوجود اردو شاعری اور اردو زبان پر بے شمار احسانات کیے ہیں۔ اور تاریخِ ادبِ اردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پروفیسر ایم ایم شریف پاکستان کے ایک نامور فلسفی اور ماہرِ تعلیم تھے۔ انہوں نے بیشتر انگریزی میں لکھا ہے۔ مگر عمر کے آخری دور میں انہوں نے اردو کو بھی اپنے حکیمانہ مقالات سے مالا مال کیا۔ دونوں شخصیتوں کے پس ماندگان سے ادارہ "فنون" کو دلی ہمدردی ہے۔



کشور ناہید





ادا جعفری



فہمیدہ ریاض



محسن احسان



ابر و سبزه

عمل ـ مبارک حسی

مجید امجد

ثمرِ خون

یہ قصّہ حاصلِ جاں ہے، اسی میں رنگ بھریں
لہو کی لہر کے لہجے میں، اپنی بات کہیں
دھوئیں میں آگ کے تیشے ہیں، زخم ہیں — اب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چُنیں!
ہمارے جیتے گھروندے، ہمارے جلتے چمن
یہ مورچے — یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں!
جلی زمین، سیہ دُھول، صدقِ خوں کی مہک،
قدم قدم پہ یہاں — مہر و مہ کی سجدہ گہیں!
یہ دن بھی کتنے مقدس ہیں، بے بہا ہیں، کہ آج
ہمارا حصّہ بھی ہے طالعِ شہیداں میں!
اسی تڑختی ہوئی بارُود میں، ہمیں کو ملیں
سنورتی، سجتی، نکھرتی، دلوں کی اقلیمیں!
یہ جینے والوں نے دیکھا کہ اِس گروہ میں تھے
وہ جاں نثار — کہ جو موت کو بھی فتح کریں!
مَیں اِن کو طاقِ اَبد سے اُتار لایا ہوں،
یہ شمعیں، جن کی لَویں میرے آنسوؤں میں جلیں

قتیل شفائی

قلمکار

(۶ر ستمبر ۶۵ء کے بعد)

صبح کے نور میں لپٹا ہوا توپوں کا دھواں — یوں مرے گھر کے در و بام سے ٹکرایا تھا
جیسے بھونچال کی ہیبت کا پیمبر بن کر — کوئی لاوا کسی وادی میں اُتر آیا تھا
میں نے حیرت کے دریچے سے جو باہر جھانکا
میرا گھر پھونکنے والا مرا ہمسایا تھا

یہ مرا "ہمدمِ دیرینہ" کہ جس نے برسوں — امن و تہذیب کے نغمات سنائے مجھ کو
جس کے ہونٹوں پہ چمکتی ہوئی عیاری نے — راستے حسنِ تکلم کے سجھائے مجھ کو
میں حقیقت کا پجاری تھا ازل سے لیکن
اُس نے الجھے ہوئے کچھ خواب دکھائے مجھ کو

اب جو حالات نے چہرے سے اٹھائی ہے نقاب — گر گئے سارے وہ خوابوں کے فلک بوس محل
مر گیا امن کے گلشن کا سجیلا پنچھی — خون کی جھیل میں حل ہو گئے چاہت کے کنول
اس نے چاہا مرے گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے
مرثیہ بن نہ سکی پھر بھی مری کوئی غزل

میری پلکوں پہ لرزتی جو غموں کی شبنم — میں زمانے سے بھلا آنکھ ملاتا کیسے؟
میرا فن موت نہ بنتا جو مرے دشمن کی - — میری عظمت کا یقیں بھی اُسے آتا کیسے؟
میں قلمکار ہوں مجھ میں وہی دم باقی ہے
میرے ہاتھوں میں ابھی میرا قلم باقی ہے

فارغ بخاری

ہم ایک آواز بن گئے ہیں

افق کا دامن لہو لہو ہے
لہو لہو ہے افق کا دامن
یہ کس ستمگر نے زندگی کا سہاگ لوٹا
یہ کون امن و اماں کی دیوی پہ
راکشس بن کے آج ٹوٹا
یہ کس سے نالاں ہے
آج دھرتی کا ذرّہ ذرّہ
ہر ایک کنج اور ہر ایک گوشہ
کنول کنول، غنچہ غنچہ، گلشن کا بوٹا بوٹا
چمن چمن، باغ باغ، گلزارِ زندگی میں
اس آشتی کے عدو کے ہاتھوں
تڑپ رہا ہے، سسک رہا ہے
لہو لہو ہے
یہ کون ظالم، یہ کون غارت گرِ جہاں ہے
کہ جس کی غارت گری پہ سب دھرتی نوحہ خواں ہے
کہ جو فلسطین و الجزائر میں
کانگو، ویتنام، کوریا میں
روڈیشیا میں
ہمیشہ جمہوریت کی شہ رگ کو کاٹتا ہے
جو آمریت کا زہر دنیا میں بانٹتا ہے
عوام کا خون چاٹتا ہے

میں اپنے قاتل کو جانتا ہوں

وہ جو بھی بہروپ بھر کے آئے
میں اس کے انداز جانتا ہوں
لوممبا اور فضلی کا قاتل
جمیلہ اور جولیس کا قاتل
حسینؓ و سقراط و ابنِ مریم کی قیمتی زندگی کا قاتل
امان و یونس، عزیز بھٹی سے غازیانِ جری کا قاتل
کبھی جو قابیل بن کے آیا
یزید و شمرِ لعین کا سوانگ بھی رچایا
کبھی جو چنگیز اور ہلاکو کا بدنما روپ دھار آیا
جو زار و ہٹلر، جو سام و چرچل، جو چیانگ و چاؤن کے روپ میں
امن و آشتی کا، سلامتی کا، حیاتِ انساں کی ہر خوشی کا
ہمیشہ قاتل بنا رہا ہے
عوام و جمہوریت کا قاتل
وہ ساری انسانیت کا قاتل
وہ میرا قاتل، وہ تیرا قاتل
جو آج کشمیر کی حسیں وادیوں میں ہو کر برہنہ اندام
موت کا رقص کر رہا ہے
جو زندگی کے حسین قالب میں کب سے ناسور بھر رہا ہے
جو ساری دھرتی کو بے بسوں کے لہو سے رنگین کر رہا ہے
ہم آج اس بے مہار قاتل کا سر کچلنے کو
سارے فنکار، سارے شاعر، ادیب، نغمہ گر و مصوّر
اب ایک مرکز پہ آ گئے ہیں
اب ایک آواز بن گئے ہیں

سیّد علی عباس جلالپوری

شہدائے چونڈہ

کون ہیں یہ نوجواں، یہ جاں ہار؟
خاک کا اوڑھے کفن اور خون میں لتھڑے ہوئے
جن کے رخساروں کے پھول
جن کی آنکھوں کے شرر
یوں لپکتے ہیں، دہکتے ہیں ابھی
جس طرح کاٹی ہوئی شاخِ گلاب
اور اس کا سرنگوں پژمردہ گل
جس طرح وقتِ غروبِ آفتاب
بادلوں کی راکھ میں چمکے شفق

کون ہیں یہ نوجواں، یہ جاں ہار؟
جن کے چاروں اور
جگرناتھ[1] کی بکھری پڑی ہیں پسلیاں
ہندی جگرناتھ جن کی حیدری ضربوں سے چور

سر بریدہ پر شکستہ لوٹتا ہے خاک پر
یہ ہیں ناموسِ وطن کے پاسباں
یہ ہیں ہاشم اور علیؑ کے خانوادوں کے چراغ
یہ ہیں جاٹوں کے سپوت
یہ ہیں افغاں شاہباز
یہ ہیں اعوانوں کے شیر
یہ ہیں بلوچی دلیر
یہ ہیں وہ جیوٹ جیالے راجپوت
یہ ہیں فوجِ پاک کے وہ سرفروش
جن کے سینوں کے ابلتے خون سے
ارضِ پاکستان پھر سینچی گئی
ان شہیدوں نے
ہماری سرحدوں پر
ہڈیوں کی باڑ دی

۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

[1] جگرناتھ یعنی جگنی ناتھ دیوتا کا رتھ جو ہر شے کو روندتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Juggernaut ہی کہا گیا ہے۔ یہاں ہندی فوج کا بکتر بند ڈویژن مراد ہے۔

ظہور نظر

موجِ صدا

اک شگاف اور پڑا
ایک زمین اور ہلی
ایک زخم اور بھرا
ایک کلی اور کھلی
ایک زنجیر کے کٹنے کی صدا اور آئی
ایک زنداں کے لرزنے کی خبر اور ملی
چیر کر ظلمتِ شب، ظلمتِ غم، ظلمتِ جور
توڑ کر ہند کے بے مہر اندھیرے کی فصیل
ہر گذر گاہ کے ہر موڑ پہ آویزاں ہوئی
جنگِ آزادیٔ کشمیر کی روشن قندیل
جبر کے کوہ سے ٹکرا کے بڑھی، گونج اٹھی، پھیل گئی
لرزشِ بانگِ درا، تمکنتِ بانگِ رحیل
تل کی درگاہِ مقدس ہو کہ ہو ڈل کی چمکتی ہوئی جھیل
سب اسی بانگِ درا، موجِ صدا، طرزِ ادا کے ہیں قتیل
جوڑیاں ہو کہ چونڈا ہو کہ لاہور و قصور
کاتبِ وقت نے ہر شہر کی، ہر گاؤں کی پیشانی پہ لکھ دی ہے یہ تحریرِ جمیل
سچ جہاں بھی ہو اُسے ملتی ہے عزت کی سند
جھوٹ ہر بزم میں، ہر رزم میں ہوتا ہے ذلیل

مرحبا جنتِ ارضی کے نہتے لوگو!
مرحبا مملکتِ پاک کی افواجِ قلیل!!
ٹوٹنے پائے نہ یک جہتیٔ ملت کا یہ زور
سوکھنے پائے نہ یہ شوقِ شہادت کی سبیل!!

احمد فراز

میں کیوں اُداس نہیں

(۱)

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

(۲)

وہی ہوس ہے مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو ویٹ نام ہو کہ بٹ مالو
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج مرا
متاعِ درد سبھی پہ نثار اپنی ہو

(۳)

نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب میرے شعر ثبوت
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

(۴)

بجا کہ امن کا بربط اُٹھائے آج تلک
ہمیشہ گیت محبت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی
بجا کہ پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی بجائے
ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

(۵)

میں سنگدل ہوں نہ بیگانۂ وفا یارو
نہ یہ کہ میں ہوں کسی خواب زار میں کھویا
تمہیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے
تو بند رہ نہیں سکتا مرا لب گویا
وہ مرگِ ہمنفساں پر حزیں نہیں ہے تو کیوں
جو فاطمی و لوممبا کی موت پر رویا

(۶)

عزیز[۱] و شامی[۲] و مسعود[۳] کی شہادت پہ
مرا جگر بھی لہو ہے پہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لیے
بجز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں قصے
یہ شہرِ زندہ دلاں آج بھی اداس نہیں

(۷)

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم
یہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

ہر گریز دا ز صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

---

[۱] شہید میجر عزیز بھٹی
[۲] شہید برگیڈیر شامی
[۳] شہید میجر مسعود اختر

انجم رومانی

سلامتی کونسل

نہیں ہے حق و صداقت سی کوئی چیز یہاں
نہ کوئی ظالم و مظلوم میں تمیز یہاں
ہے منصفوں کو مفاد اپنا ہی عزیز یہاں

رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل
سلامتی کی علامت سلامتی کونسل

اٹھا کے طاق پہ رکھا ہوا ہے وہ منشور
حقوق جس میں کہ انسانیت کے ہیں مسطور
حقوق - جن کا تحفظ تھا اصل میں منظور

رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل
سلامتی کی علامت سلامتی کونسل

ستم رسیدوں کو اب تک یہی گلہ ہے یہاں
کہ سامراجیوں کا ایک سلسلہ ہے یہاں
کسی غریب کو انصاف بھی ملا ہے یہاں؟

رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل
سلامتی کی علامت سلامتی کونسل

چراغ مصلحتوں کے جلائے جاتے ہیں
ستم گروں کے یہاں دل بڑھائے جاتے ہیں
فلاح و امن کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں

رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل
سلامتی کی علامت سلامتی کونسل

عوام مرتے ہیں کشمیر میں تو مرنے دو
مُکر رہا ہے اگر انڈیا، مُکرنے دو
جو کر رہی ہیں بڑی طاقتوں کو کرنے دو

رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل
سلامتی کی علامت سلامتی کونسل

جمیل ملک

طلوع

شب کا مہمان ہوں میں، نیند کہاں سے آئے
دل سے اک ٹیس اُٹھے، پھیلتی، بڑھتی جائے

زندگی، وقت کی رَو بن کے، خلا میں جھولے
دور سے آتی ہوئی چاپ، زمیں کو چھولے

رات کا پچھلا پہر، اور گھنا سنّاٹا
کتنی صدیوں کا سفر ایک ہی پل میں کاٹا!

چھوڑ جائے گی مجھے رات بھی آخر، تنہا
میرے اِس جذبۂ خاموش کا پھر کیا ہوگا!

طفلِ معصوم ہوں، تنہائی میں کھو جاؤں گا
دن کی دہلیز پہ روتا ہوا سو جاؤں گا

احمد ظفر

آنکھیں

(مقبوضہ کشمیر کے اندھوں کے لیے)

اس دل میں ستم کے راگ کئی — ہونٹوں پہ کبھی آ جاتے ہیں
اس بستی سے اُس بستی تک — خوشبو کی طرح لہراتے ہیں

گو آگ وہی ہے، دل بھی وہی — جلتی ہے پرانی آگ نئی
خنجر کی زباں کب گیت بنی؟ — کب شاخِ صلیب پہ پھول کھِلا؟

اک اندھے نے اندھے سے کہا — یہ رنگ ہے کیا، وہ روپ ہے کیا
وہ پاؤں جو پھول مسلتے ہیں — اب جسم بھی ان کو کچلنے دو
میں اندھا ہوں، تم اندھے ہو — ہر آنکھ کو خون اُگلنے دو

ہر سینے کو اک زخم ملے — دن ہو تو اندھیرا مونس ہو
شب ہو تو اندھیرا ساتھ رہے — اب تیرا میرا ساتھ رہے

یہ خواب ستمگر اندھوں کے — تعبیر سے عاری رہتے ہیں
چشمے نہ رکیں گے پتھر سے — ٹکرا کے بھی جاری رہتے ہیں

کرنیں بھی کبھی زنجیر بنیں؟ — سورج بھی روز نکلتا ہے
جو آگ جلاتا ہے، اک دن — اس آگ میں خود بھی جلتا ہے
ظالم کو بھی زد میں لے لے گا — جو پہیہ ظلم کا چلتا رہے

وہ بات جو برسوں دل میں رہی — وہ بات، پرانی بات سہی
اس وادی سے اُس وادی تک — خوشبو کی طرح لہرائے گی
ان جنم جنم کے اندھوں کو — خنجر کی زباں سمجھائے گی
زنجیر پگھل ہی جائے گی
شب ہے تو سحر بھی آئے گی

منظور عارف

جمخانہ کلب

شہرِ لاہور میں جمخانہ ہی جمخانہ نہ تھا
اس میں داتا بھی تھا، اقبال بھی پیمانہ ہی پیمانہ نہ تھا
اہلِ دل بھی تھے، قلندر بھی تھے، درویش بھی تھے
جنھیں کچھ اور ابھی مرحلے درپیش بھی تھے
میں تھا سرشار تو کیا
تھا، مگر اتنا گنہگار نہ تھا
میں بھی داتا کا ہی دم بھرتا تھا
ہند کی فوج کے سالار کے خواب
تو ہے اچھا کہ بُرا
میری تاریخ بنا
جانے کیا تیری فضا میں ہے سُرور
تیرے ماحول میں کیا ہے مستور
ہند کی فوج کا جنرل ترا دیوانہ ہوا
خود سے بیگانہ ہوا
اپنے احباب کے ساتھ
ہاتھ میں ڈال کے ہاتھ
اُسے آنا تھا یہاں شام منانے کے لیے
اپنی مرضی کی کوئی بزم جمانے کے لیے
کتنے لشکر تھے جلو میں اُس کے
گولیاں، ٹینک، جہاز
اپنی رفتار پہ کرتا ہوا ناز
ہُو کے عالم سے اُٹھاتا ہوا ہر سُو آواز
خطۂ پاک کے اندر آیا
سب سے پہلے کوئی جاگا تو وہ داتا جاگا
ارضِ لاہور پہ سویا ہوا پہلا غازی
جس نے سر کی ہے ہمیشہ بازی
خطۂ پاک کے لوگوں کا یقیں
جو کبھی زیرِ زمیں ہے کبھی بر روئے زمیں
جس کی بخشش کے بغیر
شہرِ لاہور بھی کیا چیز ہے، لاہور کی خیر
جاگا جب داتا تو لاہور کی سرحد کے جواں
خود سرو خود نگراں
مئے توحید کے مستانے چند
شمعِ اسلام کے پروانے چند
ایسے چمکے کہ قضا سے کھیلے
ایسے لپکے کہ فنا سے کھیلے
اِن کی ہمت کی قسم کھا کے بڑھے
قافلے پاک وطن کے آگے
ان کی جرأت کی قسم کھا کھا کے
ظلم کے لشکرِ جرار ہٹے، ہٹتے گئے
ہند کی فوج کے سالار کی شام
ہوئی صحرا میں حرام
اتنی آساں نہ تھی لاہور کی سیر
میرے جمخانہ کی خیر

جعفر طاہر

ماں اور بیٹے

اے قادر و قیوم و قوی، قائمِ دوراں
کیا لائے بھلا کوئی تری ذات پہ برہاں

کیا لافِ خرد، کیا ہوسِ فہم و تفکر
کیا ندرتِ افکار و خیالاتِ پریشاں

کیا حوصلۂ دانش و تدبیر و تخیل
کیا ناطقۂ شوق و لبِ فکرِ کریماں

کیا جدتِ اسلوبِ ادا، حسنِ معانی
ہر چند کہ سعدیؒ و سنائیؒ ہموں ثنا خواں

تمکین تصورِ نہ سہ و برگ بیاں ہے
کیا حسنِ زباں، زورِ سخن، جوشِ سخنداں

ہر ولولہ و قدرتِ اظہار خجل ہے
ہر شیوۂ گفتار یہاں سر بہ گریباں

کیا نظم کا یہ شور، یہ غوغائے زباں کیا
کیا شوخیٔ تحریر، چہ انشائے ادیباں

آشوبِ گہہِ عشق میں کیا ناقۂ توفیق
کیا نغمۂ جبریلِؑ امیں، لحنِ حدی خواں

تعمیرِ خجالت کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں
الفاظ و معانی و حروف و ہمہ الواں

اے حلقہ گرِ خاک، یہ اعجازِ زمانی
ہر دیدۂ ادراک تری بزم میں حیراں

پوشیدہ ترے علم سے کچھ بھی تو نہیں ہے
اے تو کہ نہیں تجھ سے نہاں پیدا و پنہاں

کیا چیز ترا کوئے کرم، شہرِ حرم ہے
ہر دل میں ہیں پیوست ہزاروں سرِ پیکاں

یہ ذوقِ تماشا، یہ تری ناز نگاہی،
آدم ہے کہ ہے لاشۂ ہابیل پہ گریاں

ہیں تیری سماعت کی رضا نوحؑ کے نوحے
چشمانِ پیمبرؐ ہیں کہ سرچشمۂ طوفاں

انصاف ترا تختے کو تختے میں بدل دے
اے تو کہ ترے ہاتھ میں ہے عدل کی میزاں

یہ صرصرِ تقدیر و سمومِ ستم آرا
خارا کی چٹانوں میں بدلنے لگے ایواں

یہ خطۂ سنگین و سیہ بخت سہ ومی
یہ سنگِ نمک ہے کہ زنِ ناقصِ پیماں

اعجاز ترا خوف و غمِ خوابِ زلیخا
یہ تیری تجلی کہ جمالِ مہِ کنعاں

اک طرفہ جسارت کی جزا، وصل کا مژدہ
یہ دیدۂ غیرت کی سزا، کلفتِ زنداں

ہاتھوں میں ابھی موم ہوں فولاد کے انبار
داؤد کا یہ لحن کہ تو خود ہے غزل خواں

یہ تیری جلالت ہے کہ دیووں کا ہے قبضہ
وہ دولتِ بلقیسؒ نہ اب تختِ سلیماں

فرزند تہِ تیغِ قضا تیرا تقاضا
انعام کہ ہو آتشِ نمرود گلستاں

فرعون تہِ نیل میں ڈوبے تو نہ ابھرے
ہو طور بکف، برق بجاں، موسیٰؑ عمراں

یہ طلعتِ تقدیس و طہارت، یہ شرافت
مریمؑ کی گواہی کے لیے عیسیٰؑ دوراں

یہ حجت و ارشاد، یہ تہدیدِ حریفاں
یہ سلسلۂ دار و رسن، زیست کا عنواں

اٹھے جو تری آنکھ کبھی جانبِ صحرا
اک طرفہ تجلی نظر آئے سرِ فاراں

پھر کعبۂ نو شان کا حامل نظر آئے
ہو گردِ یتیمی سے خجل سطوتِ کیواں

حیرت ہے کہ صدیقؓ بنیں اور کبھی فاروقؓ
وہ لوگ، عرب جن کی شقاوت پہ ہوں نازاں

اک بندۂ مزدور، سپہدار و سخنور
اک نانِ جویں کھا کے بشر ہو شہِ مرداں

بن جائے محبت کی اذاں بانگِ بلالی
ہو جائیں صداقت کی زباں بوذرؓ و سلماںؓ

اک طفلکِ معصوم کے پاؤں میں ہو زمزم
ترسے لبِ دریا، دلِ شبیرؑ و عزیزاں

آتی ہے صدا آج بھی یہ کرب و بلا سے
بیکار نہ جائے گا کبھی خونِ شہیداں

ٹپکے گا لہو خنجرِ قاتل سے پیاپے
یہ طوق گہِ لالہ و گل روشن و تاباں

بیکار نہ جائیں گی ضعیفوں کی یہ آہیں
رہنے کا نہیں طنطنہ و تاجِ یزیداں،

جلتے ہوئے خیموں سے دھواں اٹھتا رہے گا
ہوتا رہے گا دشت کے سینے پہ چراغاں

شرمائے گی رہ رہ کے سحر ہائے ستم کو
افسردگی و خامشیٔ شامِ غریباں

یہ جلوہ گہِ اہلِ وفا، مقتلِ اشراف
کیا مشہدِ عشاق بنی خاکِ بیاباں

یہ سرِ بقا، رمزِ فنا تیری ادائیں
وہ زہرِ ہلاہل ہو کہ ہو چشمۂ حیواں

کب رخشِ فنا رقص کو ہو تیرا اشارا
کیا جانے ٹھہر جائے کہاں عمرِ گریزاں

یارب! ترے اسرار کھلے ہیں نہ کھلیں گے
فیلانِ فلک فر کو نگل جاتی ہیں چڑیاں

شمشیرِ بلا جاں ہے ترے قرب کا پردہ،
رہ رہ کے ترے نام پہ ہوتے رہے قرباں

ہے نذر لہو آج شہیدانِ وطن کا
یہ ہدیۂ نایاب تری شان کے شایاں

میدانِ چونڈا کے شہیدوں کا لہو ہے
لایا ہوں تری نذر کو یہ خونِ مسلماں

ہم سوختہ جانوں پہ نوازش کی نظر ہو
بے برگیٔ مظلوم بنے سازِ شبستاں

سرمایہ ہمارا یہی خاکِ شہدا ہے
یہ خاک کہ ہے دولتِ دیں، ثمرۂ ایماں

یہ سلطنتِ پاک کے وہ مردِ جری تھے
جو تجھ پہ فدا ہوتے کو آئے سرِ میداں

رہ جائے ترا نام، دعا تھی تو یہی تھی
لڑتے رہے سینوں سے لگائے ہوئے قرآں

بڑھ بڑھ کے ترے نام پہ کٹتے رہے بیٹے
ہر بار ترا شکر بجا لاتی رہی ماں

یہ شہرِ شاہِ مرادؒ سوتا ہے
خلدِ اقبالؒ خواب میں ہے
نہ گوشِ سنگینِ دلبراں ہیں، نہ شوخیٔ عرضِ عاشقانہ
نہ لعل ہائے لبِ پری طلعتاں، نہ جامِ مئے شبانہ
نہ کوئی روشن چراغِ خانہ
نہ داغ سینوں کے جل رہے ہیں
نہ برق و خرمن کے تذکرے ہیں
نہ کوئی سنگ و شرر کی باتیں
نہ چشم و ابرو کی جنبشیں ہیں
نہ عرضِ آغوشِ آرزو ہے
نہ کوئی خطِ جبیں، نہ کوئی نشانِ پا ہے
نہ کسوتِ رہگزر میں تارِ نظر ہے
کہ نیند میں اب تو ہر بشر ہے
تمام اشجار سو رہے ہیں
ہرے لبادوں میں کتنے درویش خواب کی لذتوں میں گم ہیں
حسین پودے ہوا کی باہنوں میں کھیلتے کھیلتے جو ٹھہرے تو سو گئے ہیں
چناب کی موج موج مدہوش ہو گئی ہے
سیاہِ صد اضطراب خاموش ہو گئی ہے
محیط ہے رات کی سیاہی
مگر یہ کیا ہے مرے خدایا
یہ وہم ہے یا غلط نگاہی
یہ کون ہیں کون یا الٰہی؟
یہ لوگ سورج چرانے والے
ملاحد ستانِ بے حیا!
دیو ہائے ظلمت نہاد، یہ تند خو درندے!
ہرے بھرے کھیت آہنیں پاؤں کے تلے روند روند کر بڑھتے آ رہے ہیں
یہ کتنے کج بازو کج ادا

ناسپاس و نافہم و تیرہ دل !
بد سرشت ہمسائگانِ وحشت لقا !
یہ گرگانِ آتشیں رُو !
قطار اندر قطار یہ کم خروش و چالاک بھیڑیے گرگ بندیوں میں لگے ہوئے،
سبز گھاس میں رینگتے ہوئے ناگ، پھن اُٹھائے ہوئے یہ خونخوار اژدہے — چاہتے ہیں
سوتے ہوؤں کو ڈس لیں
نہ فرصتِ موجِ یک نفس دیں
سبکسرانِ دیارِ بھارت !
یہ رام کا نام لینے والے جو راونوں سے کہیں زیادہ سیاہ دل ہیں
یہ شانتی اور امن کے ان گنت پجاری
یہ عزّتِ ذات و حرمتِ قوم کے جواری
کرشن کے نام لیوا اور کنس کے حواری
نظر نظر جن کی سوچ کی روشنی سے خالی
یہ دُشمن سرشتانِ دہر، یہ مارِ دو زباں جن کے دل غمِ دوستی سے خالی
یہ جن کے چہروں پہ سخت بالوں کے ابرِ ناپاک — نفرتوں کے غبار طاری
یہ داڑھیاں ہمت و شہامت کے حسن سے ناشناس و عاری
الٰہی یہ کجروی یہ کافرادائی کیسی ؟
بغیرِ اعلانِ جنگ ہم سے لڑائی کیسی ؟

سیالکوٹ کی ہیں سرزمینِ پاک پہ ہم
ستارہ وار کھڑے ہیں سپہرِ خاک پہ ہم

گرجتی گونجتی توپیں، یہ ٹینک، یہ بمبار
یہ گوشِ عافیتِ شہر، شورِ برق شکار

کھڑے ہوئے ہیں جگر دار ماں کے پہلو میں
کھڑے ہیں سایۂ محرابِ پاکِ ابرو میں

یہی وہ اہلِ نظر ہیں جنھیں یہ عرفاں ہے
وطن سے بڑھ کے مقدس لہو نہیں ہوتا

گوارا آج کریں گے نہ ماں کی یہ توہین
یہ زخم وہ، جو لگے تو رفو نہیں ہوتا

ہزار خونِ شہیداں ہی کیوں نہ ہو یارو
یہ خوں بہا، عوضِ آبرو نہیں ہوتا

بپئے جہاد رضائے کرم کے طالب ہیں
علیؓ کی تیغ نبیؐ کے علم کے طالب ہیں

ہمارا ورثۂ آبا ہمیں عطا جو کرے
ہمارے حق میں یہی آخری دعا جو کرے

خدا عدو پہ ہمیں فتح و کامرانی دے
ضعیف ہیں تو وہ بارِ دگر جوانی دے

ہیں دین و دنیا کی ساری سعادتیں اپنی
جو اپنے سر ہیں سلامت شہادتیں اپنی

یہ سیلِ لشکرِ اعدا، یہ آتشیں سیلاب
لہو میں ڈوب کے لیکن بہے گا آج چناب

گرجتے گونجتے ٹینکوں کو ہم نہ چھوڑیں گے
بموں کے برج بھی، تیری قسم نہ چھوڑیں گے

ترے ستاروں سے ہوگا نہ آسماں خالی
رہے گا ہم سے، نہ میدانِ امتحاں خالی

خجل ہے آتشِ دوزخ، بہشت کے آگے
جھکے گا کعبہ نہ ہرگز کنشت کے آگے

ہے سب سے جدا جن کی ہر اک بات ہمیں ہیں
جو موت کو دیتے ہیں سدا مات، ہمیں ہیں

شمشیر کشانِ پےِ ناموسِ الٰہی،
کرتے ہیں خدا سے جو ملاقات، ہمیں ہیں

افلاک سے آتے ہیں فرشتوں کے بلاوے
شائستۂ اربابِ سمٰوات، ہمیں ہیں

کرتی ہیں دعا جن کے لیے قرب کی حوریں
وہ مرکزِ امید و مناجات، ہمیں ہیں

ہے جن کا لہو صیقلِ آئینۂ اسلام
دھو دیتے ہیں جو گردِ طلسمات، ہمیں ہیں

سنتا ہے خدا جن کی شب و روز دعائیں
ہیں جن کی عبادات عبادات، ہمیں ہیں

مشروط نہیں جن کے لیے بخششِ باری
ہیں جن کے لیے طرفہ مراعات، ہمیں ہیں

خالدؓ کی قسم طارقؒ و محمودؒ کی سوگند
زندہ ہیں ابھی جن سے روایات، ہمیں ہیں

ہیں جن کی شجاعت کے زبانوں پہ قصیدے
ہیں جن کی زمانے میں حکایات، ہمیں ہیں

ہے لرزہ براندام جہاں جن کی صدا سے
پروردۂ آفات و قیامات، ہمیں ہیں

پیتے ہیں جو مے خونِ عدو کی سرِ میداں
وہ آبروئے اہلِ خرابات، ہمیں ہیں

توپوں کی گرج اپنے لیے بربطِ جبریلؑ
میداں ہیں جنھیں محفلِ نغمات، ہمیں ہیں

خیبر شکنی، بت شکنی، فکرِ حسینی
ہیں جن میں خدا والوں کی عادات، ہمیں ہیں

توپیں ہوں کہ ٹینکوں کی فصیلیں ہوں، کچل دیں
اللہ کی تیغیں بھی ہمیں، ہات، ہمیں ہیں

رکھ دیتے ہیں جو صورتِ حالات بدل کر
وہ صاحبِ اعجاز و کرامات، ہمیں ہیں

سیاہ رات یہ سیلِ ستم سپاہِ بلا
یہ چیختی ہوئی شاخیں یہ بین کرتی ہوا
یہ ایک ساتھ کمانوں سے تیر کیا چھوٹے
گماں ہوا کہ جوانوں کے حوصلے ٹوٹے
فصیلِ شہر کے سینے سے خون جاری ہے
علم بدوش بکف تیغ بیرِ پاک نہاد
فصیلِ شہر پہ سینہ سپر ہے شاہِ مرادؑ
چلیں نہ سر پہ جو آرے تو کون یحییٰؑ ہو
جو بجلیوں سے نہ کھیلے وہ خاک موسیٰؑ ہو
نہ اپنے خوں میں نہائے اگر جواں مریمؑ
محال ہے کوئی عیسیٰؑ مسیحؑ پیدا ہو
لبِ فرات نہ تڑپے جو تشنگی سے حسینؑ
سبیلِ زمزم و کوثر غبارِ صحرا ہو
مہ و نجوم نہ راتوں کو دیں جو قربانی
نئی سحر نہ افق سے کبھی ہویدا ہو

کھڑے ہیں پہلوئے پُرنور میں جواں فرزند
یہ نخلہائے برومند و مرو بکتر بند
نہ تیغ تیز نہ تیر و کماں کو دیکھتے ہیں
تڑپ تڑپ کے صفِ دشمناں کو دیکھتے ہیں
زآسمانِ ستم ابرِ سنگ مے بارد
دمے کہ تیر نہ بارد تفنگ مے بارد
مگر یہ زخم، دلِ خستگاں کی دولت ہیں
یہ پھول، انجمنِ عاشقاں کی دولت ہیں
ندیم طالبِ مرہم نہیں ہیں یہ سینے
دلوں کا نور بنے ٹوٹ کر یہ آئینے
خدا امان میں رکھے گا دستِ بدخو سے
مریں گے، ماں کو بچائیں گے ضربِ پہلو سے
عدو سے بارِ دگر دور باش کہتے ہیں
نہنگِ تشنہ دریا ہیں، تم ڈرو ان سے
یہ وہ نہیں کہ نشاں چھوڑ دیں خراشوں کا
نہ ڈھونڈنے سے ملے گا سراغ لاشوں کا

گھنن گھنن گھنن — یہ دیو آتشیں دہن
یہ توپ توپ شعلہ زن — بھڑک اٹھے وہ باغ، بن
یہ صرصرِ ستم چلی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

یہ ٹینک ٹینک الاماں — رواں دواں رواں دواں
ستم کا سیلِ بیکراں — فضا، خلا، دھواں دھواں
فلک جلا، زمیں جلی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

کئی پہاڑ پھٹ پڑے — دلوں کے دل جھپٹ پڑے
ہٹے تو پھر پلٹ پڑے — کہ آسماں الٹ پڑے

لہو لہو گلی گلی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

ہوئی وہ توپ توپ سر بدن لہو میں تر بتر
بڑھے ادھر جوان جگر گرا وہ ٹینک ٹینک پر
کرے گا اب خدا بھلی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

سروں سے دشت پٹ گئے کئی ہزار کٹ گئے
نہیں نہیں کہ ہٹ گئے مقابلے پہ ڈٹ گئے
مہار کھنچی، مہابلی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

الٰہی! یہ ستم گری یہ ظلم و جور و خودسری
یہ کافری یہ کج روی مدد بہ حرمتِ نبیؐ
کرم بنامِ ہر ولی
علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ

اے تو کہ تری ذات ہے آنے سے بری آ آنے کا یہی وقت ہے آ اور ابھی آ
یہ فوجِ محمدؐ، یہ علَم تیرے علیؑ کا آ بہرِ جوانانِ حسینؑ ابنِ علی، آ
یہ کفر و ضلالت کی سیہ پوش گھٹائیں اے داورِ خورشید پئے جلوہ گری، آ
اے صاحبِ والنّور بکفِ طور، ادھر بھی آ، دیدۂ بدبیں کی مٹا کم نظری، آ
گونجی ہوئی ناقوسِ برہمن کی صدا ہے آ، بہرِ علاجِ تپِ شوریدہ سری، آ
یہ آہن و فولاد کا پندار ___ الٰہی آ، بارِ دگر دیکھ یہ خیبر شکنی، آ
ٹینکوں کے مقابل میں جواں تن کے کھڑے ہیں دیکھی نہ کہیں ہوگی یہ سینہ سپری، آ
ہوتے ہیں فدا آج ترے نام پہ کیسے آ، دیکھ جگرداروں کی یہ بے جگری، آ
کفار کی فوجوں پہ اُمڈتی ہوئی فوجیں اعجاز دکھانے کو ہے بے بال و پری، آ
یہ حوصلہ و ولولہ و عزم و یقیں دیکھ آ، دیکھنے کو جنگِ جوانانِ جری، آ
کس شان سے آراستہ مردوں کی صفیں ہیں آ، تجھ کو دکھاؤں میں تری کرّ و فری، آ
یہ وقت نہ پھر آئے گا اے داورِ جانہا انجام کے نزدیک ہے بیداد گری، آ

گو بجا ہے ترے نام کا نعرہ سرِ میداں — آ، تو بھی، کہ ہم مل کے کریں بت شکنی آ
اک رنگ نیا دینے کو ہیں صبحِ وطن کو
آ، دیکھ ہمارا ابھی جہادِ سحری، آ

فصیلِ شہر سے کچھ دور ایک قصبہ ہے
ہمارے شہر و شبستاں کی آبرو ہے یہی
ہمارے عزم کا عنوانِ گفتگو ہے یہی
ہماری غیرت و ہمت کی بارگاہِ جلال
ہمارے شیوۂ صبر و رضا کا پاک مقام
دلوں کے جس میں ہزاروں چراغ جلتے ہیں
یہیں سے جنتوں کے راستے نکلتے ہیں
بساطِ جنگ پہ کتنے شہید سوتے ہیں
شکار کھیل کے شیرانِ غاب لیٹے ہیں
مگر فضا میں یہ کیا شور ہے یہ کیا غل ہے؟
مرے خدا! یہ عقاب بلند بال کہاں
جھپٹ رہا ہے کہ لاشوں کو نوچ کر کھائے
ادھر شہیدوں کے سینے تنے ہوئے دیکھو
جوان جسم لہو میں سنے ہوئے دیکھو
یہ چھاتیاں ہیں کہ اہرن گڑے ہوئے ہر سو
ہلا سکی نہ جنھیں کوئی قوتِ بازو
ہزار بار وہ آہن گران جو ر بڑھے
وہ ہاتھ شل ہوئے آخر تو کتنے اور بڑھے
مگر تنے ہوئے سینوں پہ کچھ اثر نہ ہوا
درشت و سخت و تنومند و آہنیں ماتھے
اٹھے ہوئے ہیں سوئے آسماں، یہ دیکھو تو
یہ ابروؤں کی کمانیں ابھی کشیدہ ہیں
مجاہدوں کی سنانیں کہاں خمیدہ ہیں

یہ تیز تیز نگاہیں کہ آتشیں لاوا
گرے ہے کون قیامت کی آگ پر شعلہ
بدن جو ریت کی لہروں پہ جگمگاتے ہیں
مجھے قدیم نوشتوں کی یاد آتی ہے
لکھی ہیں تیغ و سناں سے کہانیاں جن پر
شجاعتوں کی بنی ہیں نشانیاں جن پر
مگر ہوا میں پروں کا یہ شور بڑھتا ہوا
یہ وردِ شورش و آشوب اور بڑھتا ہوا
بلندیوں سے وہ خونیں عقاب اترنے لگا
یہ اس کا سایہ رواں ہو گیا شہیدوں پر
یہ ایک چادرِ ظلمات پھیل پھیل گئی
یہ بحرِ نیل کا پیراک و تاجدارِ فضا
پروں میں کتنے جنوں خیز جنگلوں کی صدا
گرجتی گونجتی لمکارتی گھٹا کی طرح
یہ جس کا سایہ بھی ہے سایۂ قضا کی طرح
یہ سرخ شعلہ فشاں تیز و خونچکاں آنکھیں
بسانِ دشنہ و خنجر مڑے ہوئے پنجے
لہو میں ڈوبی ہوئی نوک تیغِ خارا شگاف
وہ اک شہید کے لاشے پہ اب جھپٹنے لگا
مگر جھپٹنے سے پہلے ذرا پلٹنے لگا
خیال ہے کہ نہ پرواز میں ہو کوتاہی
جھپٹ کے جھپٹا تو پھر تھم کے رہ گیا یارو
اٹھے کے پنجے مگر جم کے رہ گیا دیکھو
جلال روئے شہیداں نے اس کو روک دیا

بڑھا جو حدِ ادب سے تو ٹوک ٹوک دیا
اِدھر وہ دستِ بریدہ ذرا بلند ہوئے
اُدھر کھلے ہوئے شہپر سمٹ کے بند ہوئے
اٹھی جو چشمِ غضب رہ گیا خجل ہو کر
وہیں پہ رہ گئے بازو ہوا میں شل ہو کر
وہ آ کے بیٹھا ہے میرِ سپہ کے پہلو میں
کہ ایک شاہ نشستہ ہے شہ کے پہلو میں
تمام دشت پہ طاری ہے اک مہیب سکوت
یہ سرخ ریت یہ صحرا کے تخت پر تابوت
کوئی خدا کا فرشتہ ہے یا درندہ ہے
یہ کیا کہیں کوئی پتھر ہے یا پرندہ ہے
نہ پیچ و تاب نہ کس بل نہ تابِ برقِ تپاں
خموش دستِ قضا کا یہ شہریارِ جواں
امیرِ عرصۂ افلاک سر جھکائے ہوئے
اِدھر یہ اپنے لہو میں جواں نہائے ہوئے
جمالِ بزمِ شہیداں کی تاب لا نہ سکا
جلالِ بے گنہاں کا جواب لا نہ سکا
ہلا، پروں کو جھنجھوڑا اڑا ہواؤں میں
ذرا سی دیر میں وہ کھو گیا خلاؤں میں
حسیں پروں کے گرے پھول ان شہیدوں پر
پھر اس کے بعد وہی خامشی فضاؤں میں
وہی سکوت وہی سرخ ریت کی لہریں
مگر یہ کیا ہے؟ الٰہی یہ کیا قیامت ہے
دہاڑتا ہوا جنگل سے شیر نکلا ہے
غضب سے خاک اڑاتا ہوا بیاباں کی
الٰہی بو نہ کہیں پا گیا ہو انساں کی
یہ اضطراب یہ غیظ و غضب یہ جوش و خروش
غرورِ ہمت و نازِ شجاعتِ خوں نوش
یہ گرد باد و ہیولائے ریگ زارِ جنوں
یہ ذوقِ جرأت و آہنگِ فطرتِ بیتاب
الٰہی دے تو اسے کون دے ستم کا جواب
یہ جوڑ جوڑ میں اک برقِ بیقرار و تپاں
یہ تیغِ تیز کی مانند پنجۂ خونیں
شجر شجر کے تنے سے بدن رگڑتا ہوا
بسانِ رستمِ دستاں کبھی اکڑتا ہوا
یہ سرخ سرخ شرر بار شعلہ گوں آنکھیں
غضب کی بست و کشودِ دہن کہ جست و شلنگ
نگاہ و غیظ میں تا چیز ہیں نہنگ و پلنگ
کمر کسانِ قضا ہے نظر خدنگِ اجل
یہ جست و خیز، یہ طوفانِ قہرِ عزّ و جل
یہ تاب و تمکنت و طمطراق و جاہ و جلال
اِدھر بساطِ شہیدانِ دشتِ جنگ و جدال
بڑے غرور سے لاشوں کے درمیاں آیا
پئے شکار جو آیا بھی تو کہاں آیا
ذرا سی دیر کو غرّا کے ہر طرف دیکھا
ہزار شیروں کو رہ رہ کے صف بصف دیکھا
شکار کھیل کے آرام سے وہ سوتے ہیں
اسے خبر ہے یہ اچھی طرح سمجھتا ہے
کوئی بھی شیر ہو سب ایک ہی سے ہوتے ہیں
نہ اب وہ غیظ و غضب ہے نہ اب وہ جاہ و جلال
یہ اک عظیم شہنشاہ، صاحبِ اقبال
کھڑا ہوا ہے زباں بستہ کس وقار کے ساتھ
سلام کرنے لگا چشمِ اعتبار کے ساتھ
سکوتِ دشت ادھر ہے کہ بڑھتا جاتا ہے

الٰہی شام کا سورج بھی ڈھلتا جاتا ہے
کہ جیسے کوئی شہنشاہ تخت چھوڑ چلے
مگر یہ شاہ جو لاشوں کی سمت تکتا ہے
نظر خموش و خجل ہے، زباں کو سکتا ہے
غرور و فرِ شہی میں یگانہ و یکتا
کھڑا ہوا ہے بڑی دیر سے یہاں تنہا
اُٹھا کے بارِ دگر سر، اِدھر اُدھر دیکھا
وہ شہریار ہوا ہے وداع آمادہ
بڑے وقار و تحمل سے پھیر لیں آنکھیں
شکست کھا کے بھی اندازِ خسروانہ ہیں
نہیں ہے فاصلہ کچھ درمیانِ شیر و شہید
یہ رسم و راہ یہ آدابِ دوستانہ ہیں
وہ رات چھا گئی دشتِ مصاف پر ہر سُو
وہ قافلے نظر آنے لگے ستاروں کے
فرازِ عرش سے وہ چاند جگمگانے لگا
بساطِ دشت پہ چھٹکی ہے چاندنی ہر سو
یہ ریگ زار کے سینے پہ خون کی نہریں
کہیں پہ کرنوں کے جھرمٹ، یہ دودھیا لہریں
یہ چاندنی میں اُچھلتے لہو کے فوارے
رواں ہیں سینۂ صحرا سے خون کے دھارے
یہ انگھڑیوں کے نگینے، دلوں کے آئینے
عقیقِ سرخ کے تختے ہیں خوں شدہ سینے
کہیں لبوں سے درخشاں لہو لہو یاقوت
کہیں شہیدوں کی پیشانیاں چمکتی ہیں
کشادہ ماتھوں کی لوحیں کہیں دمکتی ہیں
رواں ہے دامنِ صحرا میں نور کا سیلاب
دھڑکتے دل ہیں کہ لہروں پہ تیرتے ہیں گلاب

مگر یہ کون ہے؟ یہ کیا ہے آتشیں پھنکار
یہ ایک اژدرِ پُرکار و قاتلِ خونخوار
اجل کا چابکِ لرزاں یہ سرخ سرخ زباں
زباں کہ شعلۂ ظلم و فساد و جور و جنوں
یہ جسم فتنۂ نخوت، غرورِ زہرِ زبوں
یہ سرد ریت کی لہروں پہ لہلہاتا ہُوا
یہ اک بھنور کی طرح دائرے بناتا ہُوا
لپک لپک کے شرارے بکھیرتے جاتا
یہ ایک سیلِ سیہ بن کے پھیلتے جاتا
بدن پہ حلقہ بہ حلقہ سنہری زنجیریں
تڑپ تڑپ کے اچھلتی ہوئی یہ شمشیریں
یہ بجلیوں کے زمیں میں، غضب کے جوشن ہیں
یہ لال آنکھیں لہو کے چراغ روشن ہیں
کبھی جو کھول کے جبڑے نظر اُٹھاتا ہے
کلیجہ دشت و بیاباں کا منہ کو آتا ہے
یہ حسن و خوف کا واللہ عجیب پیکر ہے
کبھی نیام کبھی نیش گرو کا خنجر ہے
وہ رینگ رینگ کے لاشوں کے درمیاں آیا
یہ نامراد، الٰہی! اِدھر کہاں آیا
غضب سے تن کے کھڑا ہو گیا ہے، دیکھو تو
یہ چاندنی میں سیہ جسم کے جھلکتے خطوط
ستونِ سنگ پہ رخشاں ہوں جیسے نقش و نگار
قدیم مصر کے مندر کی اک حسین دیوار
یہ خطِ مصر و غلافی نفیس تحریریں
یہ چاندنی میں ہزاروں طرح کی تصویریں
فروغِ نورِ نقوش و حروف گونہ رنگ
یہ اس کا بھن ہے الٰہی کہ صفحۂ ارژنگ

بڑی حقارت و نفرت بڑی رعونت سے
قدم قدم پہ یہ بد بخت رُکتا جاتا ہے
لچکتی شاخ کی مانند جھکتا جاتا ہے
مگر وہ طیش میں بل کھا کے پھر بلند ہوا
بدن کھلا کہ بچشمِ زدن کمند ہوا
کسی مکان کا شہتیر جیسے جھک جائے
زمیں پہ گرنے سے پہلے خلا میں رُک جائے
بدن کو تول کے وہ پھر بڑھا کہ حملہ کرے
اِدھر نگاہِ غضب سے جو سونے والوں نے
جھڑک دیا تو لہو خشک ہو گیا تن میں
بجائے زہر فقط راکھ رہ گئی پھن میں
چلا تو لرزہ براندام تھا وہ ننگِ وجود
حقیر ڈھونڈ رہا ہے فرار کی راہیں
کمان بن کے اٹھیں ہر شہید کی بانہیں
اُدھر وہ ریت کی لہریں بلند ہونے لگیں
برائے گردنِ شمرِ لعیں کمند ہوئیں
تڑپ تڑپ کے وہیں مر گیا وہ مارِ زبوں
وہ لوٹ آیا ہے صحرا میں چاندنی کا فسوں

وہی شہیدوں کے چہرے پہ ہے ثباتِ سکوں
شہید سونے لگے ہیں، انھیں بلاؤ نہیں
جو سو رہے ہیں، خدارا انھیں جگاؤ نہیں
خدا نے چاہا تو پھر آئیں گے زیارت کو
عجب سماں ہے بڑا دلفریب منظر ہے
خرامِ ماہ سے مل کر حباب بہتا ہے
کہیں پہ دھان کے بوٹے کھڑے چمکتے ہیں
کہیں گھروندوں کے آنگن میں پھول کھلتے ہیں
کہیں پہ چاند سی پیشانیاں دمکتی ہیں
زمیں پہ شبنم و سبزہ کی بزم آرائی
خرامِ ابر کبھی چاندنی برستی ہے
سرِ مزارِ شہیداں عجیب رونق ہے
کبھی عماریاں افلاک سے اُترتی ہیں
علم بدوش کبھی سبز پوش آتے ہیں
پئے سلام کبھی سرفروش آتے ہیں
مہیب رات ہے طاری عدو کے لشکر پر
ہزاروں شام سے ارتھیاں نکلتی ہیں
کہاں کی روشنیاں؟ وہ چتائیں جلتی ہیں

شکیب جلالی

مبارک وہ ساعت . . . .

میں بھٹکا ہوا اک مسافر
رہ و رسمِ منزل سے نا آشنائی پہ نازاں
تعاقب میں اپنی ہی پرچھائیوں کے رواں تھا
مرے جسم کا بوجھ دھرتی سنبھالے ہوئی تھی
مگر اس کی رعنائیوں سے مجھے کوئی دل بستگی ہی نہیں تھی
کبھی راہ چلتے ہوئے خاک کی روح پرور کشش میں نے محسوس کی ہی نہیں تھی
میں آنکھوں سے بینا تھا لیکن
مرے چار سُو چادریں آنسوؤں کی تنی تھیں
کہ جن کے لیے میرا پر تو ہی تھا ایک زندہ حقیقت
کسی دوسرے کی گوارا نہ تھی اس میں شرکت
میں کانوں سے بہرا نہیں تھا
مگر جس طرح کہنہ گنبد میں چمگادڑوں کے بھٹکنے کی آواز ہی گونجتی ہے
کھلے آسماں کے پرندوں کی چہکار اندر پہنچتی نہیں ہے
اسی طرح میرا بھی ذوقِ سماعت رسا تھا فقط اپنی ہی دھڑکنوں تک
بس اپنے لہو کی سبک آہٹوں تک

میں بھٹکا ہوا اک مسافر
مری راہ سے مٹ چکے تھے سفر کے اشارات سارے
فراموشیوں کی گھنی دھند میں کھو چکے تھے جہت کے نشانات سارے
رہ و رسمِ منزل سے میں آشنا ہی نہیں تھا

کروڑوں مرے ہمسفر تھے
مگر میں اکیلا
کروڑوں کی اس بھیڑ میں بھی اداس اور اکیلا
تعاقب میں اپنی ہی پرچھائیوں کے، رواں تھا

میں شاید ہمیشہ یونہی اپنی پرچھائیوں کے تعاقب میں حیران پھرتا
اگر روشنی مجھ پہ چمکی نہ ہوتی
مبارک وہ ساعت کہ جب موت اور تیرگی کے گھنے سائباں کے تلے روشنی
مجھ پہ چمکی
مرے دل پہ دھرتی نے اور اس کے ارفع مظاہر نے اپنی محبت رقم کی
مبارک وہ ساعت کہ جب یم کے کوڑے فراقی لوہے کی چیلوں سے اور
آتشیں تیر برساتے فولاد کے پاؤں والے درندوں سے مڈبھیڑ میں
میں نے دیکھا:
مرے ساتھیوں کے جگر میں ترازو ہیں جو تیر
ہوا ہوں میں خود ان کا نخچیر،
جو قطرہ لہو کا گرا ان کے تن سے
بہا ہے وہ میرے بدن سے'
مبارک وہ ساعت کہ جب میں نے جانا
مری دھڑکنوں میں کروڑوں دلوں کی صدا ہے
مری روح ہے مشترک، اگرچہ قالب جدا ہے

منو بھائی

چاندنی میرے لیے کس کام کی

چاندنی میرے لیے کس کام کی ؟
کون سی قبروں پہ رونا ہے مجھے
موتیے کے پھول کیوں چنتا رہوں
کون سے زخموں کو دھونا ہے مجھے ؟

چاندنی تھی رات ــــ سارے سو گئے تھے ــ او میں ــ جاگنے کی آرزو دل میں لیے چلتا رہا
شوق میری روح کا حصہ بنا ــــ منزلوں کا درمیانی فاصلہ ــــ ایک خطرے کی طرح بلتا رہا
سونے والے جاگتے تھے ــــ مجھ کو کیا معلوم تھا ــــ جاگنے کی آرزو سونے کی خواہش بن گئی
اپنے دروازوں کے پردے کھینچ کر سونے لگا تو یوں ہوا ــــ خواہشوں میں گھٹ گئی
زندہ رہنے کی تمنا ــــ موت کی خواہش میں حائل ــــ موتیے کے پھول تھے یا چاندنی کی دھول تھی
میرے دروازوں کے پردے ــــ میری خوش فہمی تھی ــــ میری بھول تھی
وقت اُٹھتا جا رہا تھا ــــ میں نے سوچا روک لوں ــــ میری گھڑی خاموش تھی
موتیے کے پھول موتی بن گئے تھے ــــ یا تو میں پاگل تھا یا پھر چاندنی بے ہوش تھی

" باغ میں آنے سے پہلے مشورہ دل سے کیا تھا ؟ " ــــ جی نہیں !
میں نے تو یہ بات اپنے آپ سے بھی کی نہیں "
زخم دھڑکیں گے مرے سینے میں اب دل کی جگہ
اب مری آنکھوں میں آنسو بھی نہیں

چاندنی میرے لیے کس کام کی ؟
کون سی قبروں پہ رونا ہے مجھے ؟
موتیے کے پھول کیوں چُنتا رہوں ؟
کون سے زخموں کو دھونا ہے مجھے ؟

سیف زلفی

اے زمینِ وطن!

اے زمینِ وطن — تیرے بیٹے۔ جیالے جواں
تیرے کام آ گئے

اے زمینِ وطن!
تیرے بیٹوں نے خوں میں نہا کر تری مانگ میں چاند تارے بھرے
تری مانگ کے چاند تارے
جہاں تیرگی کا تصور نہیں ہے
تری مانگ روشن رہے گی
تری مانگ کی روشنی میں
رواں ہے
جواں سال شیروں کا وہ کارواں
جن کے ہاتھوں میں ہیں
عظمتوں کے نشاں
بہرِ تاریخ گو
سینۂ وقت پر — لکھ گئے داستاں
اے زمینِ وطن! تیرے بیٹے — بجیلے جواں
تیرے کام آ گئے!

سیف زلفی

خون کی ہولی کھیلنے والو!

انسانوں پر ظلم کہاں تک۔ ظلم کی بھی حد ہوتی ہے

وہ کشمیر کی وادی جس کو دنیا جنّت کہتی ہے
اُس وادی کی روش روش پر خون کی ندی بہتی ہے

رام کی پوجا کرنے والو تم نے خون بہایا ہے
لچھمن کا دم بھرنے والو تم نے حشر اُٹھایا ہے
دین دھرم کو ماننے والو تم نے پاپ کمایا ہے
پیار کو شکتی جاننے والو تم نے بیر جگایا ہے
انسانوں کا خون بہا کر کیا کھویا کیا پایا ہے
ساری دنیا میں رسوا ہو

خون کی ہولی کھیلنے والو۔ خون ہے یہ مظلوموں کا
مظلوموں کا خون یقیناً اک دن رنگ بھی لائے گا
مشرق تا مغرب گونجے گا، اپنا حق منوائے گا
یہ وہ خوں ہے جس کا قطرہ قطرہ پھول کھلائے گا
سبز پھریرا لہرائے گا
اِس وادی کے پھولوں میں
مظلوموں کا خوں مہکے گا
آزادی کے پھولوں میں
انسانوں پر ظلم کہاں تک۔ ظلم کی بھی حد ہوتی ہے
کل کا مؤرخ کیا لکھے گا، سوچو تمہارے بارے میں
اپنی ارتھی لیے پھرو گے جیون کے اندھیارے میں
تم کو کنارا مل نہ سکے گا ظلم و ستم کے دھارے میں
دستِ ستم شل ہو جائے گا مظلوموں کی ہمت سے
ظلم کے بادل چھٹ جائیں گے اس وادی کی جنت سے
ظلم کی اک حد ہوتی ہے.......

الیاس عشقی

نِروان

شہر کے سگ ہائے آوارہ مزاج،
رات بھر غوغائے بے ہنگام سے،
اس مشینی دور کی تہذیب پر آوازہ کستے ہی رہے،
جگمگاتی ہوٹلوں کے بام و در پر فلوریسینٹ[1] اور نیون سائن[2]
اس لق و دق دشتِ آدم زاد کے ظلمت کدوں پر طنز ہیں،
اس مہذب شہر کے اُونچے مکانوں کے مکیں،
اہلِ گیتی کے غم و آلام سے،
بے نیاز و بے خبر، آرام سے سوتے رہے،
اپنے محور پر رہی گرداں زمیں،
جیسے اک ظرفِ گلی ہو چاک پر،
رات بھر چلتا رہا ہوٹل کا لفٹ،
اہلِ دولت، پیر و برنا، مرد و زن، آتے رہے جاتے رہے،
جاز[3]، رمبا، والز، ٹینگو، پولکا اور فاکس ٹروٹ
وال ڈزنی[4]، ایلوس پریسلی، سناترا، شیمپین[5]
ٹرینکوئیلائزر[6]، ٹوسٹ[7]، وسکی، پینی سیلین اور ٹیسونیکس
جنس کی بیماریاں، تحلیلِ نفسی، آپریشن، گرافٹنگ[8]
میکمیلن، وارڈ، پروفیومو، عوام
ڈاؤننگ اسٹریٹ میں کرسٹین کیلر کا ہیولیٰ محوِ رقص،
اہلِ دانش، منچلے، آوارہ، برٹش میوزیم اور ہائڈ پارک
انتخابِ حسن، اعضا کا تناسب، جسم کی پیمائشیں، فیشن پریڈ،
سالِ نو کا مژدہ مس جاپان، مسٹر یونیورس
چست کپڑے، پوائنٹڈ ٹو[9]، ڈرین پائپ ٹراؤزر[10]
ریس، اسٹرپٹیز[11]، سرکس، کیسینو[12]،
بار، پب[13]، بوبی، جرائم، ٹیڈی بوائز،
ہالی وڈ، مرلین منرو، رات کی تنہائی، سلیپنگ پلز[14]،
ٹیلیفون، موت،
کش مکش کی رات، بوڑھا اور سمندر[15]، جج، گولی، رائفل
موت کی یورش پہ خندہ زن حیات،

۱۔ Florescent ۲۔ Neon Sign ۳۔ مختلف مغربی رقص ۴۔ مشہور فلم ایکٹر اور مغنی۔ ۵۔ ایک شراب ۶۔ اعصاب کو آسودہ کرنے والی ایک دوا ۷۔ ایک رقص ۸۔ آپریشن کے ذریعہ انسانی اعضا کو بدل ڈالنے کا فن۔ ۹۔ Pointed Toe ۱۰۔ Drain Pipe Trousers ۱۱۔ Striptease ۱۲۔ Casino ۱۳۔ Pub ۱۴۔ Sleeping Pills ۱۵۔ Old Man & the Sea

پوپ، اسرائیل، کیوبا اور عرب ملکوں کا قومی اتحاد،
قحط، آفاتِ سماوی، زلزلے،

سرحدوں کی جنگ، مجرم طاقتوں کا اتحاد،

سازشیں، کینہ، ہوائی حادثے،

سینٹو[1]، سیٹو[2] کے سمجھوتے، علاقائی تعاون کے پلان،
فیملی پلاننگ[3]، کنٹراسیپٹو[4] اور بڑھتی آبادی کا دہلاتا گراف،

ٹوپ لیس بکنی، ہمرسن باتھ، سوئمنگ کاسٹیوم[5]،

بیٹنک[6] کلب، اینگری ینگ مین[7]، بیٹل[8] نوجوان،

ٹیوب ٹرینیں، سبمرین[9]، اسکائی اسکریپر[10]، براج،

اولمپک، باکسنگ، ریسلنگ کلب، شادی، طلاق،

سارتر، ساگان، پکاسو، برجی باردو، پال کلی[11]،

امنِ عالم، سائنس، نوبل پرائز اور لینن اوارڈ،

ٹیلی ویژن، ٹائپ رائٹر، روٹری — اخبار چھپتے ہی رہے
روس، کانگو، کوریا اور ویت نام

ماؤ، بن باللہ، ہوچی من، ڈیگال،

بین الاقوامی عدالت، یوروپین مارکٹ،

ایک نفرت کینیڈی کا قتل، اسٹالن کی لاش،

یو این او، اوتھانٹ، ویٹو، سرخ چین،
ان گنت افریشیا کے کالے پیلے جسم اور گوری صلیب،

ہر طرف پھیلا ہوا ڈالر کا جال،

دورِ مشرق، ساتواں بیڑا، مبصر، امن فوج،

سرخیاں، ڈسپیچ، ایڈیٹوریل،
اک نئی ترتیب میں ڈھلتے رہے

ماسکو، نیویارک، پیکنگ، ٹوکیو،

ہر طرف سایہ فگن، عفریتِ جنگ،

ہر طرف ریڈار[12] محوِ جستجو، جاسوس یو ٹو[13] کی اڑان،

جیٹ، بیلسٹک میزائل[14] اور پروازِ خلاء،

آسماں پر برق رو، راکٹ کے بل کھاتے ہوئے سفاک
دھوئیں کی لکیر

ای برابر ایم سی اسکوائر[15] لکھتی ہی رہی،
دم بخود ہے روحِ آئن شٹائن اک مصلوب عیسیٰ کی طرح،
اس مشینی دور کے تحفے پٹیشیم سائی نائٹ[16]،
کینسر[17]، کورونری[18]، ٹی بی، سریبرل ہیمریج[19]،

اس صدی کے جوہری گوتم کا یہ نروان ہے!

1. Cento 2. Seato 3. Family Planning 4. Contraceptive 5. Swimming-costume 6. Beetnick 7. Angry youngmen 8. Beatle. 9. Submarine 10. Sky Scraper 11. Paul Klee 12. Radar 13. U.2 14. Ballistic Missile 15. $E = Mc^2$ 16. Potassium Prynite 17. Cancer 18. Caronery 19. Cerebral Hamberege.

حسن حمیدی

اقوامِ متحدہ

اے کج کلہانِ بزمِ عالم! محفل ہے کہ تختِ استخواں ہے
لہراتا ہے یہ پرچمِ امن نیزے پہ کٹی ہوئی زباں ہے
شعلوں کی غذا جگر کے ٹکڑے انصاف کی شمع ضو فشاں ہے

تہذیب کی مامتا قفس میں فردا کے چراغ ڈھونڈتی ہے
عریانیِ مریمِ تقدس عصمت کے ایاغ ڈھونڈتی ہے
تاریخ کی مانگ مقتلوں میں سیندور کے داغ ڈھونڈتی ہے

اے کج کلہانِ دہر! اب ہم قاتل سے کلام کر رہے ہیں
جو ہاتھ قلم ہوئے جنوں میں اب تم کو سلام کر رہے ہیں
میزانِ صلیب دوش بدوش انصاف عوام کر رہے ہیں
سینے کو درِ شفق بنا کر سورج کی تلاش میں چلے ہیں
پتھر میں جگر کی قاش بو کر ماضی سے خراج لے رہے ہیں

اے کج کلہانِ دہر، یہ بزم قاتل کی زباں سے بولتی ہے
یہ منفعتِ ہوس کی محفل، مقتل میں لہو کو تولتی ہے

منشورِ بہار، خونِ انساں
منصف ہے جنونِ دستِ قاتل
ہم تم سے سوال کر رہے ہیں
اس محفلِ خودنگر کا حاصل؟

سلیم شاہد

کشتِ سحر

جو لبِ زخم تک آگیا خود بخود
اس لہو کو بہانے میں کیا عذر ہے
اور کچھ دیر میں درد تھم جائے گا
اور کچھ دیر میں زخم بھر جائے گا
"چڑھتے دریاؤں کو روکنا موت ہے"
ورنہ شریانوں میں خون جم جائے گا

ابر کم یاب ہوں، بحر بے آب ہوں
جسم کے چاہ میں جس قدر خون ہو
اس زمیں کو نمی چاہیے آج کل
کس قدر آنکھ میں گوہرِ اشک ہیں
آبیاری کا موسم ہے اس کشت میں
چشمِ گل شبنمی چاہیے آجکل

شب کے دیوار و در سرخ جب بھی ہوئے
کوئی سورج افق پر اُبھرتا رہا
رات پگھلی تو ہر داغ دُھل جائے گا
لو نکل آئی ہیں دھوپ کی پتّیاں؛
غنچۂ لب پہ سرخی اُتر آئی ہے
کوئی دم میں یہ رنگ اور کھُل جائے گا

منزلوں کے نشاں گو نظر میں تو تھے
درمیاں کا سفر اس قدر کم نہ تھا
تیز تر ہو گئے گردشوں کے قدم
ہر طرف ہیں چنار، ایسے مشعل بکف
ظلمتیں دھوپ میں منہ چھپانے لگیں
لہلہانے لگے پربتوں کے علَم

رحمان فراز

حرفِ آخر

بات فقط اِتنی ہے، اپنی نظریں تھیں انجان
ورنہ ان رستوں پہ ہوئیں کیا شکلیں خاک سمان
قدم قدم پر دُکھ میں جلتی آنکھوں کے شمشان
پلک پلک پر مچلیں زہری اشکوں کے طوفان

اپنے دھیان میں لاکر دیکھو اک خونی دوپہر
بھری بہار کی گرمی میں سویا ہوا سارا شہر
آ نکلے سونی بند گلی میں اک ظالم خو شبو
جس کے پیچھے آگ لگائے کوئی شعلہ رُو
ایک کہانی ـــ ایک کہانی کے کتنے پہلو

محل کے اُونچے دروازوں پہ خونی پہرے دار
دُور سے مچلتی پازیبوں کے چھناکے چھن چھن چھن
بھٹکی ہوئی نظروں کو سمجھائیں پیار بھرا آنگن
پاؤں اُٹھیں تو سامنے سنگ و آہن کی دیوار
ایک سی ہے مجبُوری سب کی، ایک سے ہیں بندھن

اس بندھن میں جکڑے ہوئے گذرے ہیں کیا کیا لوگ
جن کی موت ہے ایک المیہ، جیون اک سنجوگ
ان رستوں پر ہوئی ہیں کیا کیا شکلیں خاک سمان
بات فقط اِتنی ہے، اپنی نظریں تھیں انجان

ادیب سہیل

شعلۂ روح

میں اُس منزلِ عمر میں رخت کش تھا
جہاں آپ ہی کھنچ کے آتے ہیں جلوے
بہ ہر رنگ دل کو لبھاتے ہیں جلوے
ہجومِ نظارا کی اِس رہ گذر پر
مری روح کی خلوتِ بے صدا میں
دوئی کے ہر اک مرحلے سے گذر کر
دبے پاؤں اک روشنی یوں در آئی
ازل سے ہو جیسے یہی اس کی منزل
رگ و پے میں یوں زندگی گونج اُٹھی
خموشی میں بیدار ہو جیسے چھاگل
ہجومِ نظارا کی اِس رہ گذر پر
سجے روزنوں پر دل آویز منظر
ملے ہر قدم اپنی جانب بلاتے ہوئے کتنے پیکر
کھنچے دمبدم کتنے بے تاب جلوے
مگر جب یہ پیکر یہ دلدار منظر یہ بے تاب جلوے یہ سرشار لمحے
رگ و پے میں تحلیل ہونے کے جذبے سے نزدیک آئے
کھڑی ہو گئی ایک یادِ حسیں رہ میں دیوار بن کر
وہ یادِ حسیں جو ازل ہے ابد ہے
نشاطِ نہاں ہے
مری روح میں جس کا شعلہ ہے روشن
رگ و پے میں جو گونج بن کر رواں ہے

عرفانہ عزیز

صبحِ نو

وہ افق در افق فضاؤں میں
اک دھندلکا سا نیم خوابی کا
اور کرنوں کے گیت میں رقصاں
وہ تبسم گلِ شہابی کا

نور و نکہت کا ایک سیلِ رواں
یوں ترنم میں ڈھلتا جاتا ہے
میرے وجدان کی حکایت کا
جیسے عنواں بدلتا جاتا ہے

یوں چھلکتا ہے شیشۂ مستی
رنگ و بو کے نگار خانے پر
روحِ تخلیق جس طرح رقصاں
حسنِ مطلق کے آستانے پر

مبارک حیدر

۱۹۶۵ء کی ایک نظم

ٹھہر اے ہوائے مراجعت کہ نئے گلوں کا ظہور ہے
جو نجھے پڑے ہیں، شرر بنا کہ زمیں کی صبح غرور ہے
کہ سحر میں بوئے نجات ہے

وہ نجھے نجھے سے عزیز دل جو سیاہیوں میں اُتر گئے
وہ اداس راہی بہار کے، جو مثالِ خاک بکھر گئے
جنھیں شہرِ وحشت فنا ہوئے، جو اسیرِ چاہِ انا ہوئے
جو غزالِ ماہ شکار کرنے گئے تھے، پھر نہ خبر ملی
وہ ہمارے نام کی آبرو ہیں، اُنھیں ہمارے سلام دو
کہو زرد رستے ہرے ہوئے، جو علیل تھے وہ شفا ہوئے
کہ جو بوٹا بوٹا بندھے ہوئے تھے، وہ ابر بن کے ہا ہوئے

کوئی جبر میں جھانکو، صدا کرو، کہو آنکھیں تم کو ترس گئیں
بھلا قحط رُت کی سیاہیوں میں عذیب رشتوں کو چھوڑ کر
کوئی یوں بھی آنکھ چراتا ہے
مگر اب گلوں کی گھڑی نہیں، جو ہوا بخیر گذر گیا
کہ تمھاری قید کی مدتوں میں تمھارے بھائی جواں ہوئے

تمھیں صبحِ نو کی بشارتیں، کبھی ہُو کے دشت سے آؤ بھی
کہ تمھارے شہروں میں اذنِ عام کی ساعتوں کا نزول ہے

یہ طلوعِ شمس طلسم ہے
یہ بشارتوں کی گھڑی ہے
لوگ تھکے تھکے سے گھروں سے نکلے، چھتوں سے اُٹھے
بجھی بجھی سی ترنگ ہے
کہ افق پہ کوئی صدائے سحر پکاتی ہے: نہیں نہیں —
کوئی حرفِ خوف ہوا میں ہے
کوئی ہولے ہولے ہمارے خوں میں ضعیف شبہے اتارتا ہے
سنو! فریب کے لاکھ چہرے ہیں
تین نسلیں شناختوں میں گذر گئیں
ابھی تم تو اچھے شناختی بھی نہیں ہو
پشت پہ اُٹھتے ہاتھ کا وار کیسے بچاؤ گے
ابھی اور سال خیالِ خالی میں صرف ہوں گے، یقیں کرو
ابھی اور ہاتھ شناختوں میں کٹیں گے، دیکھو! یقیں کرو

تو کہاں سے آیا ہے، کون ہے
تُو ہمارے صحنوں میں سایہ سایہ بھٹک رہا ہے
مگر عجب ہے کہ تیرا کوئی نشاں نہیں
تیری بھیگی بھیگی سسک ہمارے لہو میں زہر بہائے
آنکھوں میں کوئی نقش نہ آئے، اٹھے قدم تو رکھا نہ جائے
دیکھ، جہاں گواہ، تو اور کوئی بھی روپ لیتا، تو ہم تجھے
کٹے ہاتھ کے عجب تماشہ دکھاتے، تیری سیاہ خاک سے
کلیاں کلیاں ضیائے صبحِ خنک اُگاتے
ہمارے سینوں میں اُس کی چاہ کا نُور ہے
جو نمو کی رُت ہے، کہ اُس کا حسن تمام صبحِ ظہور ہے

میں صدلئے خوفِ خفی ہوں، شہرِ سلامتی کا پیام ہوں
ابھی لوگ اپنے کنوؤں میں غرق پڑے رہیں گے، ابھی نہیں
وہ برادرانِ سیاہ دل کہ لگے ہوئے زخم چھپائے، گھلتے رہیں گے، ٹھہرو، ابھی نہیں
میں دلوں کی پشت پر اٹھتا ہاتھ ہوں،
میرا وار تہی نہ جائے، افق سے پار کوئی نہ جائے، چھتوں میں کون شجر اُگائے

مری تین نسلیں اُداس شاموں کی مثل راہوں میں گھُل گئیں
وہ دھوئیں کی لہروں میں گرہیں تھیں کہ ہوا کے لمس پہ کھُل گئیں
مجھے سب خبر ہے مگر میں سینے کی آگ کیسے بجھاؤں، کیسے بجھاؤں ....
یہ بصیرتوں کا جہاں ہے، پر مری آنکھ نور سے بے خبر ہے
کوئی نہیں جو کنوئیں سے نکلے، مجھے مہیب ستونوں بیچ کھڑا کرے
میں خود اپنی ہمتِ بے پناہ کے بوجھ نیچے بکھرتا جاتا ہوں
کوئی مجھ کو سیاہیوں سے رہا کرے تو فصیلِ ظلم کے انہدام سے بستی بستی رہا کروں
کہ زمیں پہ اب بھی عذابِ عام کی ساعتوں کا نزول ہے
وہی خوابِ خوف ہے، راستوں میں اک اور نسل کی دھول ہے
میں فصیلِ قحط کے وسط میں ہوں اور آسمان پہ ابرِ سبز کہیں نہیں
مری زرد، مرگ مآل نسلیں گذرتی جائیں، گذرتی جائیں، گذرتی جائیں ___

انور شعور

اے ہموطنو

مملکت زندہ و بیدار ہے اے ہموطنو
قوم ایثار سے سرشار ہے اے ہموطنو
ہم بہادر ہیں مگر ظالم و بے رحم نہیں
دشمنوں کو بھی یہ اقرار ہے اے ہموطنو
تیرگی جانے کہاں دور سسکتی ہوگی
رات بھی اب سحر آثار ہے اے ہموطنو
سرخ رو کیوں نہ رہیں ہم کہ دلوں میں اپنے
اک عجب جذبۂ ایثار ہے اے ہموطنو
کون ہے اپنے وطن میں جو نہیں ہے اپنا
جو بھی ہے دلبر و دلدار ہے اے ہموطنو
بر سرِ جہد و عمل بازوئے زور آور ہے
زمزمہ خواں لبِ گفتار ہے اے ہموطنو

امجد اسلام امجد

مٹی

مٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو ہر انساں کو
اُس کی قیمت کی بلندی کا پتہ دیتی ہے
مٹی ایک ایسی ردا ہے کہ جو ہر لمحے میں
سینکڑوں جسموں کو دامن میں چھپا لیتی ہے
کتنی ارزاں ہے زمانے میں بظاہر مٹی
فالتو چیز کو مٹی میں ملا دیتے ہیں
یہی مٹی کہ جو بن جائے وطن کی مٹی
اس کی عزت کے لیے جان لٹا دیتے ہیں
یہ وہ مٹی ہے جو سوئے ہوئے کھلیانوں میں
منہ لپیٹے ہوئے سونے کو جگا دیتی ہے
اور اک مست سی پھیلی ہوئی مہکار کے ساتھ
منتظر آنکھ کو محنت کا صلہ دیتی ہے
یہ وہ مٹی ہے جہاں عظمتِ رفتہ کے نشاں
آنکھیں موندے ہوئے چپ چاپ پڑے رہتے ہیں
وقت کٹ جاتا ہے لیکن یہ چمکتے ہوئے نقش
سینۂ خاک پہ ایسے ہی جڑے رہتے ہیں
اسی مٹی کے خزانے کی حفاظت کے لیے
ہم نے ہر دور کے ماتھے کو ضیا بخشی ہے
اور دنیا کو محبت کی بلندی کے لیے
ہم نے ہنستے ہوئے مرنے کی ادا بخشی ہے

احمد ندیم قاسمی

شہیدوں کا لہو

شہیدوں کا لہو وہ نور ہے، جس کی تجلّی سے یقین افراد کے، نسلوں کے مستقبل سنورتے ہیں
اسی کی تابشوں سے، آسمانِ فکر و دانش پر
نئی صبحیں بکھرتی ہیں، نئے سورج اُبھرتے ہیں
شہیدوں کا لہو وہ پھول ہے، جس کے تعطّر سے چمن کھلتے ہیں ذہنوں میں، امنگوں میں، خیالوں میں
اسی کے رنگ سے یوں زندگی کا حسن بڑھتا ہے
جوانی جس طرح شمعیں جلا دیتی ہے گالوں میں
شہیدوں کا لہو وہ نقش ہے انساں کی عزت کا جسے دنیا جہادِ حریّت کا نام دیتی ہے
مشیّت کو بھلی لگتی ہے جب یہ شان مرنے کی
تو پوری قوم کو اس نقش کا انعام دیتی ہے
شہیدوں کا لہو وہ درد ہے، جس کی چمک، دل میں کئی چہرے بناتی ہے، کئی یادیں اُگاتی ہے
انہی چہروں، انہی یادوں سے بنتی ہیں وہ تصویریں
کہ جن سے قوم اپنا قصرِ مستقبل سجاتی ہے
شہیدوں کا لہو وہ آسماں ہے، جس کے سائے میں سنور جاتی ہیں تاریخیں، نکھر جاتی ہیں تہذیبیں
اسی کی وسعتوں میں وہ ستارے رقص کرتے ہیں
کہ جن کو توڑ سکتی ہیں نہ تعزیریں، نہ تادیبیں
شہیدوں کا لہو دیوار ہے دشمن کے رستے میں اسے ڈھانا تو کیسا، اس سے ٹکرانا بھی ناممکن
یہ وہ دیوار ہے جس میں جڑی ہیں قوم کی آنکھیں
کسی کا اس سے کترا کر نکل جانا بھی ناممکن
شہیدوں کا لہو خاکِ وطن میں جذب ہو کر بھی ہزاروں سال تاریخِ وطن میں جگمگاتا ہے
بظاہر یہ لہو بہتے ہی چھپ جاتا ہے نظروں سے
مگر یہ پوری ملت کی رگوں میں سرسراتا ہے

ڈاکٹر سید عبداللہ

اُردو شاعری پر ایک اور نظر

اُردو شاعری کے کل سرمائے کو دو مستقل زمانی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو شاعری روایتوں پر ایمان بالغیب رکھتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری روایت سے الگ چلنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتی۔ . . . اور اس آخری دور میں صورت یہ ہے کہ روایت کی پیروی کو ادبی توہمات میں شامل سمجھا جانے لگا ہے۔ اگرچہ ادب کی بعض سخت جان رسمیں اب بھی سر اُٹھا کر چل رہی ہیں اور اُردو کا کوئی قابلِ ذکر شاعر ان سے کاملاً آزاد نہیں ہوا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی اُردو شاعری کی اپنی ایک شخصیت تھی۔ مگر آج کے دور میں اپنے آپ کو تسلیم کرانے کے لیے اسے چند اعتراضوں کا جواب دینا پڑے گا، جو کبھی بے خیالی سے، مگر کبھی کبھی پوری سنجیدگی سے، بہ تکرار زبان اور قلم پر آتے رہتے ہیں۔

ان اعتراضات کی سرسری فہرست یوں بنائی جا سکتی ہے۔

۱۔ قدیم شاعری برائے شعر گفتن کے نظریے سے نکلی ہے۔

۲۔ قدیم شاعری تقلیدی تھی، لہٰذا ساکن، جامد اور روایت کی غلام رہی ہے۔

۳۔ قدیم شاعری تفریحی اور درباری چیز تھی۔ اس کا زندگی کے سنجیدہ حقائق سے بہت کم تعلق تھا۔

۴۔ قدیم شاعری فرد کی داخلی کیفیات تک محدود تھی۔ اس نے سماجی اور خارجی حقائق کی ترجمانی نہیں کی یا بہت کم کی۔

۵۔ قدیم شاعری ایک ایسی مابعد الطبیعیات کی غلام رہی ہے جس کی اقدار زمینی نہیں، آسمانی اور ماورائی تھیں۔

اس طرح کے کچھ اور اعتراضات بھی ہوں گے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا اعتراضات کہاں تک درست اور کہاں تک غلط ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری نے فارسی کی پیروی کی۔ اسالیب میں بھی، ہیئت میں بھی اور اظہار شعری میں بھی، پس اس لحاظ سے اسے تقلیدی کہنا کچھ غلط نہیں، مگر تقلیدی کہہ کر ہم قدرے مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مغالطہ یہ ہے کہ ہم اُردو شاعری اور فارسی شاعری کے درمیان غیریت کی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں۔ یہ حقیقت اکثر فراموش کر دی جاتی ہے کہ اُردو اور فارسی شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر مشترک تھا اور ان عناصر سے عبارت تھا جن سے صرف اردو شاعری نے نہیں بلکہ مسلمان اقوام کی تخلیق کی ہوئی ہر شاعری نے جنم لیا تھا، اور ان غیر اسلامی ہندی ادبوں نے بھی، اپنی اپنی حد تک اس سے اثر قبول کیا جن کی نشو و نما عہد اسلامی میں ہوئی۔ آج کا معترض اردو شاعری کو اپنے موجودہ مقامی اور محدود نقطۂ نظر میں مقید کر کے اسے اس بین الاقوامی پس منظر سے منقطع دیکھنا چاہتا ہے جو اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج نے اسے دیا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی تک ایک اسلامی بین الاقوامیت چین سے الجزائر اور مراکش تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بین الاقوامیت سے صرف مسلمان اقوام ہی نہیں بلکہ مغرب کی عیسائی سلطنتیں بھی اثر پذیر ہوئیں جس طرح آج کوئی

شاعر، جدید مغربی بین الاقوامی طرزِ فکر اور اسالیب سے منقطع نہیں ہو سکتا، اسی طرح اسلامی ایشیا کا کوئی قدیم شاعر اس قدیم بین الاقوامی اسلامی تہذیب کے اثرات و تصرفات سے آزاد نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے اس بین الاقوامی تہذیب پر اعتماد تھا۔ وہ اس کی قدروں کو سچ مانتا تھا اور اس کی سالمیت، اس کی نگاہ میں مسلّم تھی۔ اس تہذیب میں جغرافیائی مقامیت تو تھی مگر تہذیبی طور پر اس کا علاقہ ہندوستان سے لے کر مراکش تک پھیلا ہوا تھا۔ اردو شاعر کا معاشرہ جن عناصر پر قائم تھا؛ وہ صرف ہندی نہ تھے۔ ایرانی، عجمی، عربی، ترکی غرض بین الاقوامی اسلامی سماجی ہیئت کی پیداوار تھے۔ ہندوستان کا ادیب ان عناصر کو غیر نہیں سمجھتا تھا اسی لئے اس نے ان عناصر سے استفادہ کرنے کو کبھی عیب نہیں سمجھا کیونکہ یہ اس کے نزدیک یک رنگی تھی نہ کہ تقلید، اس لئے کہ تخلیقی محرکات کے سرچشمے مشترک تھے۔ پس فارسی شاعری اس کے لئے غیر نہ تھی۔

یہ کہنا بھی زیادتی ہے کہ قدیم شاعر اپنی زمین اور اپنے مقامی معاشرے سے کٹ کر مطلق رہے ہیں۔ یہ اعتراض اردو شاعری کے سرسری مطالعہ کا نتیجہ ہے یا اس کورانہ جانبداری کا جو مغربی ادیبوں کے بے جا تعلق سے پیدا ہوئی ہے ۔۔۔۔ ورنہ اردو شاعری کے ہر مخلص طالب العلم کو اپنے سرمایۂ شعری میں اپنے معاشرے کی اور اپنی زمین کی بو باس ملتی ہے۔

اس دعوے کی تائید میں دو طریقوں سے بحث ہو سکتی ہے، یا تو مواد کو سامنے رکھ کر یا ہیئت اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے۔ یہ کہنا بے جا ہے کہ اُردو شاعری، فارسی شاعری کا چربہ ہے۔ اس جھوٹ میں صرف اتنا سچ ہے کہ اکثر اصناف کے بیرونی خاکے، اور عمومی علم الکلام بین الاقوامی اسلامی ادبی روایت کے مطابق ہے، مگر جس کسی نے اردو شاعری کو ذرا بھی غور سے پڑھا ہے، اسے معلوم ہے کہ اس کی سپرٹ پر بلکہ خارجی تشکیل پر بھی، مقامیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اُردو شاعری تو درکنار، خود ہندوستان کی فارسی شاعری کا لہجہ بھی ایرانی شاعری سے مختلف ہے۔ اس میں ہندوستان کا آدمی بولتا سنائی دیتا ہے اور بین الاقوامی لباس کے باوجود وہ اسی ملک کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ میں اس وقت نظیر یا محسن کاکوروی کا ذکر نہیں کرتا کہ ان کے کلام پر ہندوستانی چھاپ مسلّم ہے۔ میں غزل کو لیتا ہوں۔

غزل ہماری سب سے مقبول صنف ہے۔ اس کے چند بڑے نمائندے تھے۔ ولی، میر، درد، آتش اور غالب۔ اردو شاعری کا کوئی مخلص طالب علم گہرے مطالعہ کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ ولی سچ مچ ایران کا شاعر معلوم ہو رہا ہے۔ کیا ایران میں کوئی ہیم داس، امرت لال، جگت لال ڈھونڈنے سے بھی مل سکتا ہے، یہ ولی کے ان محبوبوں کے نام ہیں جن کی ستائش اس نے اپنی غزل میں کی ہے۔ کیا میر سچ مچ ایرانی شاعر معلوم ہو رہا ہے، جو یہ کہتا ہے ؎

برگِ سبز است تحفۂ درویش
لینا جا پان ہم فقیروں سے

کیا حافظ یا سعدی کے یہاں ایسا کوئی شعر مل سکتا ہے؟

پہلے تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
اتنی تھوڑی شب میں ہم نے کتنے سوانگ بنائے ہیں

خواجہ درد اور آتش کو نظر انداز کر کے "دو زبان غالب" (یعنی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرنے والے غالب کے بارے میں کیا واقعی یہ سچ ہے کہ وہ عراقی یا حافظ یا سعدی یا جامی سے کوئی گہری مماثلت رکھتا تھا؛ فارسی کا صرف ایک ہی شعر اس کی تردید کے لئے کافی ہے:

زین بعد آب بادۂ گلنار کشید باد
غالب شراب ہندی قدم خراب کرد

واقعہ یہ ہے کہ ادب کے بہت سے جدید طالب العلم ایک دھوکے میں آ گئے ہیں اور یہ سب دھوکے بین الاقوامی طرزِ گفتگو نے دیئے ہیں جو اس زمانے کے ہر آدمی کی مجبوری تھی۔ جیسا کہ آج کے ہر آدمی کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ان طرزوں کو اپنائے جو بین الاقوامیت نے اسے دی ہیں، ہر ادیب

اپنی وسیع تر برادری میں عزت پانا چاہتا تھا اور یہی ان شاعروں کی مجبوری تھی، کیونکہ ان کی وسیع تر برادری کا علاقہ ہندتک محدود نہ تھا بلکہ سمرقند، بخارا اور کوفہ و بغداد تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر یہ اضافہ بھی فکر انگیز ہوگا کہ اس بین الاقوامی مجبوری کے باوجود اردو شاعری نے مقامی اثر قبول کیا۔ چنانچہ بعض اصناف کی داخلی فضا بالکل بدل گئی۔ مثلاً مثنوی کو دیکھئے "سحر البیان" "گلزار نسیم" "زہر عشق" ۔۔۔۔ اور میر کی ساری مثنویاں[۵] اپنی الگ شخصیت رکھتی ہیں۔ ایران کی کوئی مثنوی ان سے مماثلت نہیں رکھتی۔

"سحر البیان" میں دلی کا مزاج اور لکھنؤ کی فضا پائی جاتی ہے۔ خوانسار اور اصفہان یا شیراز و کاشان کا ماحول بالکل نہیں۔ "گلزار نسیم" کی فضا ہندوانہ ہے۔ اسلوب بیان میں فارسی کے اثرات ہوں گے مگر محاورے مقامی ہیں اور جس دیومالا سے اس کو مرتب کیا گیا ہے وہ ہندی ہے۔ خواب و خیال کا لالا ملک ہندوستان کا ہندو زادہ ہے۔ میر تقی میر کا پرستی رام دریائے جیحون کے کنارے بسنے والا کوئی آدمی نہ تھا، نہ اس کی بیوی کوہ قاف کی پری تھی۔ وہ تو سیدھے سادے ہندوستانی مرد و زن تھے۔

اب اور دیکھئے ہندوستان میں آکر بعض اصناف (جو اصلاً ایران یا ترکی سے آئیں) کا مقصد اور ڈھانچا بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً شہر آشوب اور مرثیہ کا ۔۔۔۔۔ شہر آشوب ایران اور ترکی میں محض تفریحی چیز تھی۔ ہندوستان میں اس کی حیثیت سیاسی اور سماجی نظموں کی ہو جاتی ہے۔ مسعود سعد سلمان (جو بہت قدیم شاعر ہے) کے شہر آشوب سے تو یہ گمان گزرتا ہے کہ شہر آشوب اصلاً بھی ہندوستان کی چیز تھی مگر یقین سے کہنا مشکل ہے۔ سودا، میر اور شعرائے دہلی کے شہر آشوب سنجیدہ سیاسی نظموں کا درجہ رکھتے ہیں۔ مرثیہ محتشم کاشی کے یہاں مصائب کا سیدھا سادہ بیان تھا۔ اردو میں آکر اس نے نوک پلک نکالی، یہاں تک کہ اونچے فن کے رتبے تک جا پہنچا۔ اردو کی بعض اور اصناف خالصتاً نئی ہیں مثلاً ریختی ۔۔۔۔۔ جو اردو شاعری کے لئے قابل فخر نہ سہی مگر اس کی جدت اور مقامیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور گیت تو ہے ہی ہندی صنف۔

میری ان گزارشات سے وہ اعتراض بھی بڑی حد تک رفع ہو جاتا ہے کہ اردو شاعری نقل در نقل ہے اور جامد سلسلہ ہے۔ بیرونی ڈھانچے کی حد تک یہ اعتراض بھی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر کاملاً یہ بھی تسلیم نہیں۔ اردو شاعری میں حرکت اور تبدیلی کا عنصر پایا جاتا ہے اور وہ ادب پاروں کے جسم یعنی شکل اور تعداد اشعار کی کمی بیشی، معنوی روح، طرز احساس، رویوں اور لہجوں کے تفاوت کی مدد سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ وجہی اور محمد قلی قطب شاہ کی غزل کی روح وہ نہیں جو سراج، داؤد اور ولی کی غزل کی ہے۔ اسی طرح میر، درد، سودا، مصحفی، آتش، مومن، غالب، ذوق و ظفر سب اپنا الگ الگ لہجہ اور رنگ رکھتے ہیں ۔۔۔۔ ہر ایک کی غزل کی نو مختلف ہے۔ غزل کے ہر دور میں، غزل کے جسم میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں جو ہر اس شخص پر روشن ہیں جس نے

---

۵ مثنوی کی بحث چلی ہے تو فارسی کی اہم مثنویوں کو دیکھئے، شاہنامہ فردوسی کو چھوڑ کر نظامی کی لیلیٰ مجنوں، شیریں خسرو، مخزن الاسرار، ہفت پیکر، سکندر نامہ۔ اردو کی مثنویوں میں ترجموں کو چھوڑ کر ان کا سا رنگ کہاں ہے۔ فریدالدین عطار کی بہت سی مثنویاں ہیں سب تصوف کے موضوعات پر ہیں، خواجو کرمانی کی ہما و ہمایوں اور دوسری مثنویاں اور دوسرے شعرا کو چھوڑ کر جامی کی مثنویاں سبحۃ الابرار، یوسف زلیخا وغیرہ سعدی کی بوستان ۔۔۔۔ غرض کہاں تک شمار کروں گا سب شعرا کے اسی طرح کے موضوعات ہیں۔ ہندوستان میں فارسی کے شاعروں نے ان میں سے بعض کی کچھ تقلید کرنا چاہی مگر مقامی ماحول نے جی بھر کے کرنے نہیں دی۔ امیر خسرو نے بہت سی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں مطلع الانوار، ہشت بہشت وغیرہ کے ساتھ دیول رانی خضر خاں بھی ہے جو خالص ہندوستانی قصہ ہے۔ اس کے بعد فیضی کی مثنویات آتی ہیں۔ ان میں نل دمن کے علاوہ جو خالص ہندی موضوع ہے باقیوں میں قدما کے مقابلے پر خم ٹھونک کر آنے کی ایک ادا ضرور ہے مگر وہ ہندی لب و لہجہ پھر بھی نہیں گیا۔ اردو مثنویات کا سوا مستثنیات کے یا چند ترجموں کے، خاص موضوعات، خاص اسلوب اور خاص فضا الگ ہیں۔ قطب مشتری (جو قلی قطب شاہ کے عشق کی کہانی ہے) اس سے پہلے کدم راؤ پدم راؤ ۔۔۔۔ اور اس کے بعد کی اکثر مثنویات مثلاً بوستان خیال، میر کی مثنویات، خواب خیال، گلزار نسیم، سحر البیان، مثنویات شوق، مثنویات واجد علی شاہ اختر، مثنویات مومن ۔۔۔۔ ان سب کو دیکھئے، ہیئت کے سوا کیا چیز ہے جسے تقلیدی کہا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو فضا اور ماحول ہے اور وہ علی العموم ہندوستانی ہے۔ تصوف کی مثنویات میں اشتراک ہے مگر ان میں بھی مقامی رجحان کے نقوش مل جاتے ہیں۔ لوگوں کی شکایت یہ ہے کہ جیحون و سیحون، دجلہ، فرات اور قیس و کوہکن کی تلمیحات نے ان مثنویوں کو ایرانی بنا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان بین الاقوامی تلمیحات کے اندر ہندی اصل روگ بول رہے ہیں۔ تجزیہ کرنے کی تکلیف گوارا کیجئے، ساری بات روشن ہو جائے گی۔ یہ اس دور کی مجبوری تھی کہ ادیب بین الاقوامی لفظیات کا استعمال کرتے تھے۔ یہ ان کے کلچر کا عطیہ تھا۔

اردو غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ غزل کے جسم سے میری مراد، تعداد اشعار، قوافی کی صورت اور ردیفوں کا مختصر یا لمبا ہونا ہے۔ اس کے علاوہ غزل در غزل، سہ غزلہ، چو غزلہ یا قطعہ در غزل یا غزل در مثنوی یا مثنوی و قطعہ در غزل، یا غزل در مخمس، تضمین یا رباعی در سلام۔

یہ صورتیں، بظاہر غزل کے جسم میں تبدیلی کو ظاہر نہیں کرتیں لیکن غائر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان بدلی ہوئی صورتوں میں غزل کبھی اپنے جسم کو پھیلا رہی ہے، کبھی سمٹتی اور سکڑتی اور کبھی اچھلتی کودتی، پھلانگتی اور پھیلتی نظر آتی ہے مگر تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اردو شاعری کے مختلف ادوار میں، کم اشعار والی یا زیادہ اشعار والی اصناف، سماجی یا سیاسی واقعات کے زیر اثر زیادہ یا کم مقبول ہوتی رہیں۔ میر و سودا کے زمانے میں مخمس کا زیادہ رواج رہا اور لکھنؤ میں مسدس کی مقبولیت عام ہوئی۔ یہ تبدیلی ذوقی اور سماجی عوامل کے تحت تھی۔ طویل غزل در غزل کا رواج بھی انہی اثرات کے تحت ہوا...... اس حد تک تبدیلی ہر دور میں نظر آتی ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس تبدیلی کے پیچھے عظیم سماجی اور ذوقی تغیرات کام کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا قدرے زیادتی ہے کہ ہماری اصناف منتقلاً جمود کا شکار رہیں...... یہ تو میں تسلیم کر سکتا ہوں کہ ہماری قدیم شاعری میں انقلاب اور بغاوتیں نہیں ہوئیں لیکن دور بہ دور تبدیلیوں سے اور عہد بہ عہد تغیرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قدیم اسلامی تہذیب کی قوت کہیے[1] کہ اس نے اپنی زندگی کے قومی سانچوں میں کھانچے نہیں پڑنے دیئے اور جب سے یہ عمل شروع ہوا اسلامی تہذیب کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

اردو شاعری درباری ماحول کی پیداوار ہے یا نہیں، میرے نزدیک قابل بحث مسئلہ نہیں۔ اردو اور فارسی شاعری پر درباروں کے اثرات موجود ہیں۔ یہ اثرات اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود ہماری اچھی شاعری کا سرمایہ کتنا ہے، یہ بھی مدنظر رہے کہ فارسی اردو شاعری کے درباری ہونے کا قصہ قدرے مبالغے سے بیان ہوتا ہے۔ فارسی کی صنف قصیدہ بے شک درباری تھی مگر باقی اصناف یہاں تک کہ مثنوی بھی...... دربارداری سے کم متاثر ہوئی ہیں۔ مگر درباری ہونے کا افسانہ اس درجہ پھیلایا گیا ہے کہ مجھے اس کی تردید کرتے ہوئے خود دھوکا لگتا ہے۔ میں خود بھی تجزیے سے پہلے اس شاعری کو درباروں کا کھیل سمجھتا رہا اب معلوم ہوا کہ اس سچ میں کچھ جھوٹ بھی ہے۔ بار بار لکھ لکھ کر افسانہ طرازوں نے افسانے کو حقیقت بنا دیا ہے۔ پھر بھی یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہماری شاعری پر درباروں کے اثرات ہیں۔

اردو شاعری جس دور میں ارتقا کی منزلیں طے کر رہی تھی، اس وقت کے دربار بھلا کیا دربار رہ گئے تھے؛ سودا زیادہ بڑھے

---

[1] معترض اس کو کمزوری بھی کہہ سکتا ہے مگر جب عقیدوں کے سرچشمے تاریخ میں ہوں، قوت اسی میں ہے کہ تاریخی شعور کو نہ مرنے دیا جائے۔ اس حرکت اور تبدیلی کا کچھ حال...... بلکہ خاصا دلچسپ حال۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" میں پیش کیا ہے۔ اس پر مضمون کے آخر میں گفتگو ہوگی۔

ظاہر ہے کہ اردو شاعری سے مراد صرف غزل نہیں...... مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، وغیرہ وغیرہ یہ بھی اردو شاعری میں ہیں...... لیکن بالفرض غزل کے عظیم سرمایے کے پیش نظر اسی کو بحث کی بنیاد بنا لیں تب بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ غزل کی معنوی روح میں مختلف ادوار کے مختلف نقوش موجود ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے جذباتی رویے اور ہیں، ولی کے اور...... محمد قلی قطب شاہ کا رویہ عشق کے متعلق سیدھا سادہ اور عملی سا رویہ ہے۔ اس میں عشق کے روایتی مضامین موجود نہیں۔ نہ فلسفیانہ، صوفیانہ الفاظ کی جلوہ آرائی ہے۔ ولی کا محبوب ہزار ناموں کے باوجود بے نام ہے۔ حسن اور محبت کے جلوہ ہائے صد رنگ، وحدت میں کثرت، اور کثرت میں وحدت کی تجلی دکھاتے ہیں۔ وہ حسن اور حسن اظہار کا شاعر ہے۔ میر کا طرز احساس بالکل جدا ہے۔ وہ حسن و عشق کی اصطلاحوں میں الم کا انکشاف کرتے ہیں۔ ذات اور کائنات کے مابین موجود رشتوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ حقیقت مشترک ان سب میں الم ہے۔ یہ دلی کے رویے سے اور لکھنؤ والوں کے رویے سے مختلف رویہ ہے۔ مصحفی و آتش کو چھوڑ کر آگے بڑھیے۔ غالب کو لیجیے کیا اس پر بھی گفتگو کرنی پڑے گی کہ غالب کا ماحول اور طرز احساس، قدما و متاخرین سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہری مماثلت، قافیہ و ردیف کی حد تک بلاشبہ موجود ہے مگر غالب اور مومن اور ذوق اگر ایک ہی زمین میں غزلیں لکھ دیں تو کوئی یہ نہ کہے گا کہ یہ سب ایک ہی ہیں۔

تو بسنت خاں کا قصیدہ لکھتے ہوئے یہ کہہ دیا۔ ع

ہیں جو رہے سر پر میرا بسنت خاں ہو

غالب کو جوش آیا تو صرف یہاں تک پہنچ سکے ع

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

اور بڑھے تو دہلی کے بے بس بادشاہ اور شاہزادوں اور کچھ کمشنروں کی مدح کردی کہ اس زمانے کی رسم یہی تھی، درباروں سے متوسل ہونے کی رسم زمانہ قدیم سے چلی آتی تھی مگر سبھی شاعر درباروں کے گدا نہیں بنے۔ نظیر اکبر آبادی مدرسی کرتا رہا، خواجہ میر درد نے فقیر غیور رہنا، خانقاہ میں عمر گزار دی۔ میر تقی میر تلاش معاش میں ادھر اُدھر پھرتے رہے مگر وہ شخص ذہناً کیوں کر درباری ہو سکتا ہے جو یہ بھی کہہ سکتا ہے :

سر کسو سے فرو نہیں آتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

یوں درباری داری ہوئی بھی ہے مگر یہ تو ایک دستور تھا ——— افسوس ہے کہ درباری داری کا طعنہ اس زمانے میں پرانی اُردو شاعری کو سننا پڑ رہا ہے جبکہ ادب کو آزاد سماج کا عکاس سمجھتے ہوئے بھی، لوگ عشرت گہِ خسرو کے مزدور بننے پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور اتراتے پھرتے ہیں۔

میں اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ ہماری شاعری زندگی سے پہلو بچا کر چلتی رہی یا صرف ماورائی ما بعد الطبیعیات میں گم، مدہوشی اور بے خبری کے ترانے گاتی رہی۔ یہ درست ہے کہ ہماری پرانی شاعری زیادہ تر فرد کی داخلی زندگی کی ترجمان اور مصور رہی ہے، پھر بھی بہت سے ایسے شاعر نکل آئیں گے جن کے یہاں سماجی کوائف کا بیان یا عکس بھی پایا جاتا ہے۔ اور سیاسی، سماجی اور تہذیبی اشارے، کنائے اور علامتیں تو ہر دور میں موجود رہی ہیں ———

میر تقی میر دورِ آغازِ زوال کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں سماجی اور سیاسی احوال کی موثر روداد موجود ہے۔ دلی کی بربادی، مرکزی حکومت کا انتشار، اقتصادی بدحالی، چوروں اچکوں، سکھوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار، شاہزادوں کی نکمی کجی اور عام بد اخلاقی کا کھلا اور کنائی بیان میر کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ سودا کا کلام بھی اس سے خالی نہیں۔ بعد کے شعرا کے کلام پر بھی سماجی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ دکنی شاعری اپنی زمین پسندی اور خارجیت کے لئے نمایاں شہرت رکھتی ہے۔ مثنویات میں رزم نامے اور جنگ نامے خاصی تعداد میں ہیں اور آپ بیتی مثنویاں بھی ہیں۔ شہروں اور دریاؤں کی مدح و ستائش بھی ہے شمالی ہندوستان کے شعرا کی مثنویات، قطعات اور شہر آشوبوں میں زندگی کے سماجی رخ کی کافی تصویریں موجود ہیں، اور خود غزل بھی اس سے خالی نہیں، اگرچہ غزل کا یہ عذر بہت پرانا ہے کہ میرا کام واردات و جذبات قلبی کا اشاراتی بیان ہے۔ گویا غزل کو سماجی کوائف کی مصوری کا دعویٰ ہی نہیں۔ پھر بھی غزلوں کے غائر مطالعہ سے سماجی زندگی کی ایک روداد مرتب کی جا سکتی ہے۔

اُردو ادب اور شاعری کے بارے میں، زندگی سے پہلو بچانے کا افسانہ بھی خوب چلا ہے، اور کوئی نہیں سوچتا کہ زندگی سے پہلو بچانے کا مطلب کیا ہے؟ بھلا اس دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے کہ زندہ کہلائے اور زندگی سے دور دور رہے اور زندگی کو پاس نہ پھٹکنے دے۔ شاعر ہو یا کوئی اور جب تک جیتا ہے، زندگی سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے ہمارے قدیم اور جدید شاعروں میں سے کوئی بھی نہیں بچا ——— وہ سب زندہ لوگ تھے اور زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی تفسیر، ترجمانی یا مصوری کرتے رہے۔

دراصل زندگی پر زور دینے والے نئے اہلِ نقد و نظر کے نزدیک زندگی کا مطلب ہی اور ہے۔ ان کے خیال میں زندگی سے مراد مادی وسائلِ اجتماعی کی تنظیم اور اس کے لئے اجتماعی تدبیر ہے۔ ان کے خیال میں شاعری کو سیاست اور علم المعاش کا ترجمان، شارح اور مفسر یا مبلغ ہونا چاہئے۔ شاعر کو خطیب، واعظ اور منصوبہ بند بھی ہونا چاہئے، یعنی دنیا کی ان لڑائیوں میں بھی شریک ہونا چاہئے جو سیاسی جتھوں کی اٹھائی ہوئی ہیں، اور ان میں بہت سی ایسی

جن میں کی بنیاد تنگ نظری، تعصب اور ہوس پر قائم ہے۔ ان اہل نقد و نظر کے نزدیک ترقی کا بھی یہی مفہوم ہے۔ زندگی کا مطلب معاشی اور سیاسی مسئلے ہیں، جذبے اور اخلاق کی شاعری زندگی کی شاعری نہیں۔ زندگی اگر اسی کا نام ہے تو پھر واقعی اردو شاعری نے اس میدان میں کچھ زیادہ کام نہیں کیا۔ مگر یہاں شاعر کے منصب کا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ شاعری وسیع تر انسانیت کی داعی ہے۔ اسے انسان کے چھوٹے جھگڑوں سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ کوئی خاص جھگڑا شاعر کے احساس اور جذبے کا حصہ بن چکا ہو۔ یہ سچا احساس اندر سے بہت وسیع ہوتا ہے۔ محدودیت اور جزویت، اونچی شاعری کی ضد ہے۔ شاعری انسانوں کے عمومی جذبات اور شرافتوں کی مصور بھی ہے اور ترجمان بھی۔ جتھوں اور ٹولیوں کا وسیلہ تبلیغ نہیں۔ جب افراد کو جتھوں کی لڑائی پسینے لگتی ہے اور انسان شرافتوں کے فقدان سے مایوس ہونے لگتا ہے تو شاعری، اس اعتماد کو پھر سے بحال کرتی ہے۔ وہ ایسا جذباتی رویہ پیدا کرتی ہے جو ان جھگڑوں میں انسانیت کو صداقت کی شاہراہ پر چلا سکتا ہے۔ اس میں شاعر کا احساس انفرادی ہوتا ہے مگر اس کی اپیل اجتماعی بھی ہوتی ہے۔ اگر شاعری کا یہ منصب درست ہے تو اردو فارسی شاعری علی العموم یہ کام کرتی رہی ہے۔ اور یہ زندگی کی اصل خدمت ہے۔ زندگی سے بیزاری نہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود، جدید ذوق کو پرانی شاعری کی بعض باتیں کھٹکتی ہیں۔ ان میں ایک بات پرانے شاعروں کی زبان پرستی ہے یعنی زبان ہی کو سب کچھ سمجھنا۔ یہ صحیح ہے کہ زبان بہت کچھ ہے مگر خیال یا مضمون ہر حال میں مقدم ہے۔ اس کے بعد زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو مضمون کا اظہار کرتی ہے۔ پرانی شاعری میں مدعا سے زیادہ زبان پر زور رہا۔ یہ بلاغت اور معانی و بیان کے پرانے نظریوں کے متواتر تسلط کا نتیجہ تھا۔ ولی کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک زبان کی پرستش کا سلسلہ جاری رہا۔ زبان کی اہمیت کا منکر کوئی نہیں لیکن شاعری کو زبان پر قربان کر دینا یا روزمرہ و محاورہ کی مشق کے لیے شاعری کرنا، اور اصل شے یعنی مواد کو ثانوی حیثیت دینا، صحیح زاویۂ نظر نہیں۔ اردو شاعری کو شاعروں کی کثرت نے بھی بدنام کیا۔ استادی شاگردی کے ادارے نے بھی بہت نقصان پہنچایا۔ آج کا قاری جب شعر و غزل کے طومار دیکھتا ہے تو ان کی ظاہری یک رنگی سے گھبرا اٹھتا ہے —— اگر ان یک رنگ مجموعوں سے کچھ معانی، کچھ نکتے، کچھ لطائف اخذ کرنا چاہتا ہے تو اس کی یک صد و ہفتاد منزلوں کا تصور کرتے ہی ہمت ہار دیتا ہے۔ اردو فارسی شاعری کی ایک اور خصوصیت معیاری نمونوں کے مقابلے میں طبع آزمائی اور کاوش ہے۔ بڑے بڑے شعرا نے جو معیاری ادب پارے تخلیق کیے ان کی پیروی یا جواب دینے کی کوشش ہوتی رہی۔ مثلاً صدیوں تک فارسی کے شعرا حافظ کی غزلیات کا جواب لکھتے رہے۔ نظیری ہندوستان میں رہے مگر تتبع حافظ پر فخر کیا:

تا اقتدا بہ حافظ شیراز کردہ ایم — منظور یار گشت نظیری کلام ما

غالب نے بھی نظیری، عرفی، ظہوری اور حزیں کی غزلوں کے جواب لکھے۔ پیروی یا جواب کی یہ رسم اردو شاعری میں بھی رہی۔ اس سے یہ تو ہو جاتا تھا کہ مقابلے اور موازنے سے قارئین شاعر کے زورِ طبع اور قدرت کے قائل ہو جاتے تھے اور نیا مضمون نکالنے پر تحسین بھی مل جاتی تھی —— مگر اس رسم نے جدت اور اختراع اور براہِ راست سوچنے اور احساسات کے آزاد اظہار کا راستہ روکا بھی ہے۔ اسی سے اس شاعری کے دامن پر تقلیدی ہونے کا دھبا لگا اور یہ بجا بھی ہے کیونکہ جوابیہ شاعری کی اصل تحریک کسی سچے جذبے اور واردات سے نہیں ابھرتی تھی بلکہ مسابقہ و مقابلہ اس میں محرک ہوتا تھا۔ اس سے غزلیات کا بیشتر سرمایہ بیکار تو نہیں مگر تکرار و اعادہ کے باعث بے اثر بھی رہا، اور دواوین کی ضخامت خواہ مخواہ بڑھی۔ ان جوابی غزلوں میں احساس اپنا ہی ہوتا تھا مگر مضمون کی بنیاد، سامنے کے قافیے پر اور طرحی غزل کے مضمون پر ہی رہتی تھی، اس لیے احساس کا آزاد اظہار رک جاتا تھا۔ اردو شاعری کے بہت سے عیوب، کثرتِ شعر و شعرا کی بدولت بھی ہیں۔ شاعری ایک

اکتسابی ادارہ بن گئی یعنی ریاضت اور مشق سے شاعری ممکن تھی۔ لہٰذا شعرا کثرت سے نمودار ہو جاتے تھے۔ اس سے عظیم شعرا کی عظمت داغدار نہیں ہوئی مگر ذوق سخن پر بُرا اثر پڑا۔ یہ بات بھی کچھ غلط نہیں کہ اُردو شاعری میں وہ فکری گہرائی نہیں جو مثلاً فارسی شاعری میں ہے یا جو ۱۸۵۷ء کی بعد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ واضح اور مستقل فکری رویے تسلسل کے ساتھ بہت کم شاعروں کے یہاں اُبھر سکے ہیں اس لئے شاعری میں مستقل پیغام بہت کم ہیں۔ اُردو شاعری میں فارسی شاعری کی طرح ایک ہلکی سی اخلاقی لہر بھی موجود ہے مگر اس سطح کی نہیں جیسی فارسی میں ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ اُردو شاعری کی فکری سطح قدرے پست ہے۔ شاعر کو زبان کے چکّر میں پھنس کر فکر و تجزیہ کی فرصت نہیں ملی۔ یہ بھی سچ ہے کہ پرانی شاعری زمینی قدروں کا زیادہ خیال نہیں رکھتی مگر آسمانی اور زمینی قدروں کا مسئلہ معاشرے کے عقائد کا مسئلہ ہے۔ اُردو شاعری جس قوم نے کی وہ دنیا دار بھی تھی۔ مگر وہ خدا پر، آسمان پر، روحانیت پر، نادیدہ قوتوں پر، اسرار زندگی پر بھی یقین رکھتی تھی۔ اسے اپنی تہذیب کی سالمیت کا یقین تھا۔ اس کے روحانی خلا اسی سے پُر ہوتے تھے اور اسے کبھی اپنی شخصیت اور عقیدے کی صداقت پر شک نہیں ہوا۔ اس لئے زمین اور آسمان کو الگ الگ دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ ان شعرا کے نزدیک زمین اور آسمان پر جو کچھ ہے خدا کا ہے اور اس لئے یہ سب کچھ انسان کا ہے۔

اب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری کا تجزیہ کرتا ہوں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور حالی سے اقبال تک (آزادی کا اولین شعور)

دوسرا دور۔ اقبال کی شاعری کا دور۔

تیسرا دور۔ جدت اور انحراف کا دور (یعنی وفات اقبال کے بعد ۱۹۵۵ء تک)

چوتھا دور۔ جدید ترین شاعری ـــــ کامل بغاوت اور جمہوریت کے نعرے کا دور

۱۔ دور اول میں شاعری شعوری طور پر معین مقصد سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس دور کے شاعر کا نعرہ اجتماعیت، نیچر اور نیچرل ہے یعنی مضامین کی ہم آہنگی، آزادی اور روایت اور اسالیب کا نیچر کے مطابق ہونا۔ خواہ اس کا تعلق شاعر کی نیچر سے ہو، یا مظاہر کائنات کے ہو بہو بیان سے، یا شاعر اور قاری دونوں کی نیچر سے ہو۔ اس میں قدیم سرمایۂ ادب پر معتدل تنقید کے ساتھ، تجربوں کی گنجائش نکالی گئی۔

۲۔ دوسرا دور رومانیوں کا ہے خصوصاً اقبال کا جو شاعری کو قریبی مقصد سے ہٹا کر بعید ترین انسانی نصب العین کے مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ پُر جوش اسلوب اور شدتِ جذبات کا دور ہے۔ اقبال کی شاعری جوشِ حیات، جوشِ فکر اور جوشِ جذبات کی شاعری ہے جس میں رومانیت فکریت کے ہم رکاب چلتی ہے۔

۳۔ تیسرا دور نہ صرف جدت کا دور ہے بلکہ اسے انحراف کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شاعری روایتوں کی شکست پر آمادہ ہو جاتی ہے اور ہر میدان میں اختراع کے باغیانہ تصوّر ابھارتی نظر آتی ہے اگرچہ خود روایت کی کاملاً منکر نہیں ہوتی۔

۴۔ چوتھا دور بالکل معاصر دور ہے۔ اس میں قدیم مابعد الطبیعیات اور اقدار سے نہ صرف انحراف ہے بلکہ ان کے خلاف شدید ہیجان، اور ان سے گہری بیزاری پائی جاتی ہے۔ پرانی عمارتوں کا کامل انہدام کر کے، ان کی جگہ بالکل نئی عمارتیں اٹھانے کی آرزو ہے۔

اس مختصر فرصت میں ان ادوار کی خصوصیات کی مفصل بحث ممکن نہیں البتہ ان سے متعلق اہم رجحانات پر مجمل گفتگو ہو سکتی ہے۔ سرسید کے زیر اثر جس شاعری نے ترقی پائی اس کا نعرہ یہ تھا کہ شاعری کے لئے بنیادی وصف طرز ادا نہیں، جذبے کی سچائی ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ جو لطف مضمون میں ہو نہ کہ ادا میں، نہ کہ منشیانہ تراش خراش میں۔ ان کا قول ہے کہ اثر سچائی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ انشا اور شاعری کے لئے کافی ہے۔ در اصل سرسید کا تصور

اس پر تکلف اسلوب پرستی اور زبان پرستی کے خلاف احتجاج تھا جسے لکھنؤ اور قدرے دہلی میں بنیادی آئین کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ قدیم اردو شاعری نظم سے خالی نہ تھی یعنی نظم اور غزل پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد نظم اور غزل کے درمیان ایک آویزش پیدا ہوئی جو آج تک جاری ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ ایک خیال یہ بھی ابھرا کہ صحیح شاعری نظم ہی کی جا سکتی ہے۔ غزل کی ریزہ خیالی کی بھی دبی دبی شکایت ہوئی۔ نظم کے حق میں یہ کہا گیا کہ نظم میں تسلسل ہوتا ہے، خیالات مربوط طریقے سے پیش کئے جا سکتے ہیں اور اس کے ذریعے مخاطب کے دل اور دماغ دونوں کے لئے غذا مہیا کی جا سکتی ہے، مگر اس دور میں نظم کے حامیوں نے غزل کے خلاف کھلی بغاوت نہیں کی ——— اور ثالث بالخیر حالی نے غزل کی اصلاح کا نعرہ بلند کر کے، غزل کو آشوب سے بچا لیا۔ غزل زندہ رہی اور بڑے بڑے غزل گو پیدا ہوتے رہے۔ یہ جھگڑا دراصل ہیئت اور شعری خشت بندی میں آزادی اور پابندی کی نزاع سے بھی وابستہ تھا: غیر مقفیٰ نظم، آزاد نظم، بند والی نظم ہیں وزن کی یکسانی یا شعر کے لئے کسی عروضی قالب کی ضرورت یا آزادی، یہ سب بحثیں دراصل اس آزادی کے مطالبہ سے پیدا ہوئیں جس کی جڑ وہی روایت سے بیزاری تھی اور جسے شروع شروع میں، جدت، تازگی اور ندرت کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔

۱۹۳۵ء کے بعد سب سے زیادہ متنازع فیہ دو مسئلے تھے۔ ایک مسئلہ آزاد نظم اور اس کی ہیئت کا تھا اور دوسرا مسئلہ شاعری کے مواد کا۔ آزاد نظم اور نئی شاعری پر بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ اخلاقیات سے ٹکراتی ہے اور اس کی منکر ہے۔ محض نظم پر بہت کم اعتراض کیا گیا ہے۔ حالی کی نظم، نورد کنار خود شرر کے بلینک ورس اور نظم طباطبائی کی نظم معریٰ بلکہ عظمت اللہ خاں کے سریلے بول اور اختر اور حفیظ جالندھری کی نظموں پر بھی کوئی خفا نہیں ہوا۔ اور حفیظ و اختر کے گیت تو خاص و عام دونوں طبقوں میں مقبول ہوئے۔ لیکن جب نئی شاعری کے بعض علمبرداروں نے قدیم اخلاقی اقدار کو برا بھلا کہا اور پرانی ادبی روایت پر بھرپور حملہ کیا یا شاعری کو کسی سیاسی مسلک یا اقتصادیات یا جنسی کج روی کی تبلیغ کا ذریعہ بنا لیا تو اس پر قدرتی طور پر جھگڑا شروع ہوا، اور یہ جھگڑا دراصل مواد کی وجہ سے تھا، ہیئت خواہ مخواہ اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس سلسلہ میں ایک اعتراض تو یہ ہوا کہ اس میں مروجہ عروضی اوزان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور دوسرا یہ کہ مصرعوں میں ارکان کا بندوبست ایسا ہے کہ شعر کے روایتی ڈھانچے کی کوئی خو بو اس میں موجود نہیں رہی۔ اس پر طرز بیان وہ جو بہت کم لوگوں کو اپیل کرتا تھا۔ استعارات و علامات نامانوس تھے اور زبان بعض اوقات ایسی جو خود ایجاد کردہ معلوم ہوتی تھی، اور ناہمواری کا عیب تو بہت سے شعراء کے یہاں نمایاں تھا۔ اس کے علاوہ ابہام اور کبھی کبھی اہمال شاعری کی خصوصیت سی ہو گئی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ ایجاد کرنے والے تو ایجاد کرنے والے تھے۔ آزاد نظم کی ماہیت کو سمجھانے والے اور اس کا ذوق پیدا کرنے والے لوگ کم تھے اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ نئی نظم کو روایت شکنی اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کے ساتھ لازم و ملزوم سمجھ لیا گیا۔ میری رائے میں (جیسا کہ پہلے عرض ہوا) نئی نظم کے خلاف جو ہنگامہ ہوا وہ بیشتر اس کے مواد کی وجہ سے ہوا ——— یوں روایتی شعری ذوق اس چیز سے بھی مانوس نہ ہو سکا جس کو داخلی آہنگ سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ داخلی آہنگ پیدا کرنا اور اس کا سمجھنا بڑی دیر طلب بات ہے۔ اور بالعموم "فری ورس" میں کامیابی ہوتی بھی کم ہے۔ آزاد تسلسل میں سخت تخلیقی الجھن تھی۔ آزاد تسلسل کے ساتھ شعریت کی نمود کوئی آسان کام نہیں۔ البتہ کوئی عظیم شاعر اس کو سامنے لاتا تو لوگوں کی گردنیں جھک جاتیں۔ بدقسمتی سے آزاد تسلسل کی تحریک کو کوئی بڑا شاعر ملا نہیں۔ اس پر یہ ہوا کہ یہ گروہ ہیئت کی طرح مواد میں بھی انقلابی اور باغی کہلانا چاہتا تھا ——— اخلاق اور مذہب کا انکار کر کے وہ جنسی آزادی اور بے راہروی کے نعروں کے ساتھ معاشرے کے نازک تصورات کے ساتھ ٹکرایا۔ نتیجتاً یہ شاعری محض ایک مخصوص طبقے کی شاعری بن کر رہ گئی۔

نئے شعرا میں صرف ان شاعروں کو قبول عام نصیب ہوا جن کے موضوعات میں قومی زندگی کے کسی اہم اور قابل فہم مسئلے کی ترجمانی تھی۔ یہ شاعر روایت کے منکر بھی نہیں ہوئے اور انھوں نے شعری حسن کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ مثلاً فیض اور ندیم۔ فیض غزل کے علاوہ آزاد نظم میں بھی خوب چلے اور کامیاب رہے کیونکہ انھوں نے اپنے تجربوں کو ذوق عام سے بہت دور نہیں ہٹنے دیا۔ ان کے ہاں بین سیاسی مسائل کی چاشنی موجود ہے مگر ان کے اسلوب اور زبان و بیان مانوس ہیں۔ ندیم نے روایت اور تجربے کو ایک آمیزہ بنا کر پیش کیا اس لئے مواد سے اختلاف رکھنے والوں کو بھی یہ شاعری پسند آئی۔

آزاد نظم لکھنے والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ تمدنی زندگی کی تبدیلیوں نے پرانی قدروں کو ختم کر دیا ہے۔ لہٰذا شاعری کے لئے نئی ہیئت کی ضرورت ناگزیر ہے اور نئی ہیئت سے ان کی مراد یہ ہے کہ روایتی ہیئت کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ کیا یہ سچ مچ صحیح ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہیئتوں کا بدل جانا یا ان کو بالکل منسوخ کر دینا ضروری ہے (جبراً اور لازماً)؟ کیا یہ سچ مچ صحیح ہے کہ نیا زمانہ (اس ملک میں خصوصاً) سابق زمانے کی عین ضد ہو گیا ہے لہٰذا اب پرانی شاعری اور پرانی ہیئت کی روایتوں کو یکسر منسوخ کر دینا لازم ہو گیا ہے؛ کیا یہ سچ مچ درست ہے کہ اب پرانی ہیئتوں میں شاعری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے؛ یہ سب سوال ضروری ہیں۔ یہ تو تسلیم ہے کہ ذوق بدلا کرتے ہیں اور اس کے ہمراہ شاعری کے اسالیب، موضوعات اور ہیئتیں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ جبراً نہیں ہوا کرتا۔ نہ اس کے لئے وعظ و تبلیغ کا یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تبدیلی کے لئے ذوق عام کی تائید ضروری ہے۔ ذوق عام سے مراد شعرا کی پوری جمعیت یا اکثریت کی وہ روش ہے جسے قارئین کی جمعیت یا اکثریت کی پذیرائی حاصل ہو۔ اور قارئین سے مراد چند خواص نہیں بلکہ عام متوسط ذوق و شعور کے قاری بھی ہیں۔ ادب یا شاعری ذوق خاص کی چیز نہیں بلکہ ذوق عام کی چیز ہے۔ غرض تبدیلی تسلیم مگر قوانین قدرت کے تحت تدریجی تبدیلی ——— جو خود رو بے ساختہ اور مسلسل ہوتی ہے۔

یہ بھی عجیب خیال ہے کہ جس قوم نے غزل اور وزن و قافیہ والی شاعری اور مساوی الارکان شاعری پیدا کی تھی وہ اب مر گئی ہے۔ یہ بالکل بے تکی بات ہے، بالکل ویسی ہی جیسی کلیم صاحب کی یہ بات تھی کہ غزل نیم وحشی صنف ادب ہے۔ مساوی الارکان شاعری سے پچھلے معاشرے کا بطور خاص کیا تعلق تھا اور اب معاشرے میں کیا تبدیلیاں ایسی رونما ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے شاعر کے لئے ممکن یا مناسب نہیں رہا کہ وہ مساوی ارکان کی شاعری کرے، اور آزاد نظم جبراً و لازماً اختیار کرے؟ ——— یہ سوال اہم ہیں اور ان کی تحقیق لازمی ہے۔

یہ کہا گیا ہے کہ اب شاعر کا طرز احساس اور اس کی کیفیات بدل گئی ہے۔ یہ فقرہ بہت خوبصورت ہے اور اپیل بھی کرتا ہے مگر اس کی حقیقت کیا ہے؟ شاید یہی کہ شاعر اب اور طرح سوچنے لگا ہے یعنی اس کے غم، اس کی خوشیاں، اس کی آرزوئیں، اس کی تمنائیں اور طرح کی ہیں، اس لیے اس کے احساس کی محرکات اور ان کے رُخ بدل گئے ہیں۔

یہ نیا شاعر اب کس طرح سوچنے لگا ہے؟ اس کا قطعی جواب تو کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کے متعلق فری میسنوں کے انداز میں آنکھوں کے ذریعے باتیں تو ہوتی رہتی ہیں، کبھی کبھی کوئی جرأت مند یہ کہہ بھی دیتا ہے کہ ہم اب وہ نہیں رہنا چاہتے جو ہمارے باپ دادا تھے۔ مجموعی طور سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ اب کا شاعر ایک نئی طرز زندگی اختیار کر چکا ہے اور کرنا چاہتا ہے۔ اس کا معاشرتی احساس بدل گیا ہے کیونکہ بقول اس کے: پرانی معاشرت مر چکی ہے، پرانی تہذیب ختم ہو چکی ہے (یا اسی کی مرغوب اصطلاح میں دم توڑ چکی ہے) اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب آگئی ہے۔ اب شاعر اس نئی تہذیب کے دئے ہوئے افکار اور اسالیب حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور پرانے طریقوں کو چھوڑ چکا ہے یا چھوڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ ہر پرانے اسلوب حیات کی جگہ اس طرح رہنا چاہتا ہے جس طرح مثلاً لوگ امریکہ یا روس میں رہتے ہیں۔

یہ خیالات مبارک، مگر یہ خیال درست نہیں کہ پرانی معاشرت سب کے لئے مر چکی ہے۔ بلاشبہ چند شعرائے کرام کے نزدیک مر چکی ہے مگر یہ شاعر

قوم کا نمائندہ نہیں۔ درست صرف اس قدر ہے کہ ہماری معاشرت کے بعض رُخ، تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کی بعض ظاہری صورتیں بدلی ہیں اور وہ بھی قوم کے ایک محدود گروہ میں، اور یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ بیرونی اثرات کے تحت معاشرت یہ جزوی تبدیلیاں ہمیشہ قبول کرتی رہی ہے اور اب بھی کر رہی ہے جب تک معاشرہ اپنی پوری وسعتوں میں ان بنیادی عقیدوں کو ترک نہیں کرتا جو بمنزلہ روح معاشرہ میں رواں ہیں اس وقت تک یہ جزوی اور سطحی تبدیلیاں ہیں اور یہ ثابت نہیں کرتیں کہ اسلامی معاشرت مر چکی ہے۔ اگر شاعر معاشرے کا مصوّر اور ترجمان ہے تو اسے محدود گروہ کی ترجمانی کی بجائے وسیع تر معاشرے کا مصوّر اور ترجمان ہونا چاہیئے۔ اگر شاعر مصلح ہے تو اسے صاف کہنا چاہیئے کہ وہ مغربی طرزِ حیات اور طرزِ فکر کے مفاد میں اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اگر شاعر باغی ہے تو اسے اور بھی دیانت داری سے اقرار کرنا چاہیئے کہ وہ اس وسیع معاشرے کا جزو نہیں جس کے اندر سے وہ پیدا ہوا ہے۔ ہمارے نوجوان شاعران میں سے کوئی بات بھی جرم کر نہیں سکتے، وہ ایک زندہ قوم کے زندہ معاشرے کو خواہ مخواہ مردہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ایک غیر قوم کے نیم جذب شدہ خیالات کا پرچار کرنے میں آسانی ہو اور یہ پرچار معاشرے کی ترجمانی کے لئے نہیں، ذاتی بیزاری کے اظہار کے لئے ہے اور یہ ذاتی بیزاری کسی سچی ضمیر داری سے نہیں اُبھری بلکہ غیر معتدل نفسیاتی اُبال، اور بے کراں لذت کی خاطر جسمانی آرزوؤں کے تقاضوں سے اُبھری ہے اس پر مغربی تہذیب کے دو بڑے مظاہر یعنی سائنسی طاقت اور لذت پرستی اثر انداز ہوئے ہیں۔

یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ معاشرت کے اسالیب کی تبدیلی کے بعد لازمی ہو جاتا ہے کہ شاعری اور ادب کی ہیئتوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ بیرونی اثرات کے تحت استفادہ اور تجربہ بالکل قدرتی امر ہے لیکن یہ لازمی نہیں۔ اگر کوئی نیا تجربہ ذوق کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے اور ذوقِ عام کو اپیل کرتا ہے تو مقبول ہو جاتا ہے، اس پر کوئی قدغن نہیں۔ اُردو کے بعض شاعروں نے مقامی شعری اسالیب کے تتبع میں، بحور اور ہیئت میں کئی تجربے کئے ہیں، اب بھی تجربے کا راستا کھلا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اندلس کی عربی شاعری نے مقامی شاعری کے کئی اثرات قبول کئے۔ اسی طرح فارسی شاعری نے عربی شاعری کے کئی اثرات قبول کئے۔ فارسی شاعری نے عربی شاعری سے انحراف بھی کیا اور اردو شاعری فارسی شاعری سے الگ بھی چلی کسی نے اس تبدیلی کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ لہٰذا ہیئت کی تبدیلی اور معاشرت کی اقدار سے بغاوت کو کبھی لازم ملزوم نہیں سمجھا گیا۔ نئے احساسات، آزاد نظم میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔ غیر مقفیٰ نظم میں بھی اور غزل میں بھی!

دوسری طرف ہمارے یہاں کچھ لوگ آزاد نظم اور غیر مقفیٰ نظم کے خواہ مخواہ مخالف ہیں (یا شاید آزاد نظم کے بعض نقادوں کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی وجہ سے مخالف ہیں) آزاد نظم ایک تجربہ ہے، ایک ہیئت ہے۔ اس تجربے اور اس ہیئت کے خلاف کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا —— مواد سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ہیئت سے اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس ہیئت کے ساتھ کسی خاص مواد کا لازم و ملزوم ہو جانا یا کر دینا بے جا ہے۔ ہیئت اظہار کی ایک مجموعی خارجی شکل ہے۔ ایک طریقِ اظہار ہے۔ ہر قسم کا مواد اس کے قالب میں سما سکتا ہے —— یہ اور بات ہے کہ اس وقت تک ایک خاص گروہ اس ہیئت سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ غرض آزاد نظم پر کوئی اعتراض بجز اس کے نہیں کہ وہ ذوقِ عام کے لئے ابھی قابلِ قبول نہیں —— یہ اس شاعری کا قصور نہیں، شاعروں کی کوتاہی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ نئی زندگی تسلیم اور نئے تجربے بھی قبول —— مگر یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ گزشتہ کو ناحق سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ہم جس معاشرے کے فرد ہیں اس سے دشمنی کا رویہ غیروں کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم نادانستہ آلۂ کار بنتے رہے ہیں، آزاد نظم یا ساری نظم کو حیثیت کا نمائندہ بنا دینا کسی ضمیر دار ادیب کو تسلیم نہ ہوگا۔ روایت نہ اتنی مقدس ہے کہ اس میں کسی تجربے کی گنجائش نہیں۔ نہ اتنی منحوس چیز ہے کہ اس کے نام سے توحش ہونے لگے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد آج تک کے اعلیٰ شاعروں نے یہ تسلیم نہیں کیا اور بہت سے نظم گروؤں نے خود بھی تسلیم نہیں کیا۔ مختار صدیقی نے کلاسیکی ہیئتوں کو استعمال کیا اور فیض، مجاز، ندیم، اور ظہیر و قتیل نے بھی روایت کو نہیں چھوڑا۔ یہ انتہا پسندوں کے ایک طبقے

کے خیالات ہیں، جو ایذرا پاؤنڈ، ہیوم اور ہلڈا ڈولٹل وغیرہ سے متاثر ہیں۔ اور بغاوت برائے بغاوت کے قائل ہیں ورنہ ہمارے معاشرے کے حالات، ان مغربی معاشروں کے حالات سے مختلف ہیں۔ اور ابھی ان بغاوتوں کی یہاں ضرورت بھی نہیں —— اور جو بھی ہو ان کا اندازِ اظہار جدا ہوگا۔

میں بڑے اطمینان کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مجھے آزاد نظم کے تجربوں سے کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ میرے ذوقِ شعری یا میرے معتقدات کے خلاف اگر کچھ باتیں ان میں ہوں بھی تو مجھے ڈر اس لئے نہیں کہ یہ شاعری اس امتحان گاہ سے ضرور گذرے گی جس میں پہنچ کر خود بخود فیصلہ ہوجاتا ہے کہ کھرا کیا ہے اور کھوٹا کیا؟

نئی نظم نے ہمیں چند ایسے ادب پارے دئے ہیں جن کو اردو شاعری میں اونچا مقام دیا جاسکتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ مواد کی نگہداشت کے ساتھ ہیئت کے تجربے جتنے بھی ہوں، مبارک ہیں۔ البتہ مواد میں زندگی اور ضمیر داری کی شرط لازمی ہے۔ اس میں کسی کی مخالفت بھی ہو تو اس کی بنیاد سچے تجربے اور ضمیر پر ہوگی۔

۱۹۳۵ء کے بعد آزاد نظم گوئی کی تحریک کو مزید تقویت ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں نے نظم کو مقاصدِ اجتماعی کا وسیلہ بنا کر نظم کی ہیئت کو مزید آزادی دلوائی۔ جو لوگ ترقی پسند نہ تھے، انھوں نے بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا اور نظم کو بام عروج پہ پہنچایا۔ تصدق حسین، ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، میراجی، رفیق، یوسف ظفر، قیوم نظر اور دوسرے شعرا نے بلند پایہ نظمیں لکھیں مگر غزل کی مقبولیت پھر بھی باقی رہی۔ حفیظ نے گیت، جوش نے انقلاب انگیز رجزیے، اختر شیرانی نے رومانی نظمیں لکھ کر جو نئے راستے دکھائے تھے ان پر چل کر بہت سے نئے لوگوں نے شاعری کی نئی اقلیمیں دریافت کیں۔ احمد ندیم قاسمی نے قطعات، جعفر طاہر نے کینٹو اور شان الحق نے غنائیے لکھ کر نئے اسلوب نکالے۔ مجید امجد نے نظم کو اور بڑھایا اور منیر نیازی نے اس پر اور رنگ چڑھایا۔

زیر بحث ادوار کی شاعری میں ایک خاص قسم کی استعاریت اور بعد میں تخئیلی کنائیت نے رواج پایا۔ ابہام چونکہ اس کا لازمی نتیجہ تھا اس لیے یہ مبہم شاعری، بعید الفہم علامتوں کی غلام ہو کر کبھی قابل فہم اور کبھی بے حد ناقابلِ فہم رہی۔ چونکہ قدیم اقدار سے بیزاری بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی اس لیے ابہام پسند اور علامت پرست شاعروں کے یہاں مسخ و تحریف زندگی کے رجحان نے شاعری میں "کارتونیت" اور مضحکہ خیز اختراعیت کا راستا بھی کھولا اور بعض نظمیں تو فریب نظر یا نظر کی حیلہ بازی ، Visual Device ، کے سوا کچھ نہیں ہوتیں۔ یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ لازمی ہے کہ جدید یا جدید ترین زمانے کی شاعری لازماً ناقص یا معمولی درجے کی شاعری ہے، یہ گمان اسی طرح غلط ہوگا جس طرح یہ کہہ دینا سراسر غلط ہے کہ ساری کلاسیکی شاعری تقلیدی، درباری، تفریحی، بیکار اور زندگی سے منقطع ہے یا ساری کلاسیکی شاعری اعلیٰ اور عمدہ ہے۔ غزل کا موضوع بھی یہاں زیر بحث آنا چاہیئے مگر دور جدید میں نظم کو جو اہمیت ملی اس مختصر مضمون میں اسی کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ یوں غزل کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مخالفتوں سے دبی نہیں اور بدستور بلکہ کبھی کبھی پہلے سے بھی زیادہ ذوقِ عام کو اپیل کرتی رہی۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری میں حالی، اکبر، اقبال سے قطع نظر شبلی، چکبست جیسے قومی سماجی شاعر، حفیظ، اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر، جوش، مجاز، جذبی جیسے باشعور تند و تیز نے والے شاعر، حسرت، جگر، اصغر اور فانی جیسے غزل گو، فیض و ندیم جیسے ترقی پسند مگر روایت دوست، ن۔م۔ راشد اور میراجی جیسے نئے تجربات والے شاعر —— اور دوسرے بہت سے اونچے درجے کے سخنور سامنے آئے جن کا تفصیل مضمون کو گراں بار کرے گی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری، پچھلی شاعری کے مقابلے میں یوں بھی سر اٹھا کے چل سکتی ہے کہ اس دور میں اقبال جیسا شاعر پیدا ہوا جس کی شاعری میں روایت اور تجربہ، فکر اور جذبہ،

حقیقت اور نصب العین یکجا جمع ہے۔ یہ شاعری قدیم و جدید کو، زمانوں اور قرنوں کی سطح سے اونچا لے جا کر اتنی بلندیوں پر پرواز کرتی ہے کہ اقبال محض اپنے ہی دور کا شاعر نہیں رہتا، بلکہ ہر دور کا شاعر بن جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک بڑی بدنام ہوئی مگر اس کو بدنام کرنے والے بھی اس کی اس نیک نامی کے منکر نہیں کہ اس شاعری نے تحریک کے اصل مقصد کے عین مطابق عمل، جد و جہد، تسخیر کائنات، مساوات اور انسانی درد کی قدروں پر زور دیا، توہم پرستی، ابہام، ہیئت پرستی، جنسی علامت پرستی اور اس قسم کے دوسرے رجحانات کی مخالفت کی جو عقل و فکر اور وضع عمل اور جد و جہد کے خلاف ہیں اور یاس اور کلبیت پیدا کرنے والے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی انتہائی بدنصیبی یہ تھی (گو اپنی جگہ یہ اس کا امتیاز بھی ہے) کہ وہ ایک خاص سیاسی عقیدے سے وابستہ رہی یا پھر یہ کہ روایت کا ہر باغی اس کی صفوں میں شامل ہو گیا، اور محض روایت شکنی کی بنا پر اسے ترقی پسند سمجھ لیا گیا۔ اس سے ترقی پسندی بدنام بھی ہوئی اور اس کے اصل مقصد کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن اس کا یہ احسان ماننا پڑے گا کہ وہ زندگی، عمل، اور ترقی کا پیغام دیتی رہی —— اشتراکی عقیدے سے قطع نظر حیاتِ اجتماعی کو عمل، عقلمندی اور ترقی کی ضرورت ہے۔

مجھے اردو شاعری کے تازہ ترین و جدید ترین رجحانات کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔ نئے شاعروں کا ایک گروہ چند پڑھے لکھے نوجوانوں پر مشتمل ہے اور اپنی شاعری کو روایت اور قدیم رشتوں سے یکسر منقطع کرنے کے درپے ہے۔ ان شاعروں کی شاعری پر ان کی عمر کے مقابلے میں دس گنا زیادہ بڑھاپا ابھی سے طاری ہے۔ انھیں سر پر خدا کا سایہ تسلیم نہیں اور خدا کی وسیع زمین انھیں تنگ تاریک نظر آ رہی ہے —— وہ خدا کے اور پرانی سماجی روایتوں کے اور پرانی ادبی و مابعد الطبیعیاتی اقدار کے ممنون احسان نہیں ہونا چاہتے:

گل بپژمردہ کا نہیں ممنون ان عزیزوں[1] کا طرۂ دستار

ن۔ م۔ راشد کی منطق پھر بھی سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اجنبی حکومت سے انتقام لینا چاہتے تھے، مگر یہ عزیز تو انتقام لینے کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ خود سے جھگڑتے رہتے ہیں اور زندگی کی اس جد و جہد سے بھی نفور ہیں جو ترقی کے لئے لازمی ہے۔ وہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ پرانا معاشرہ تو مر ہی چکا ہے مگر ہم خود بھی جی نہیں رہے۔ ان کے خیال میں مذہبی اور ذہنی تصورات کا زمانہ گزر چکا ہے۔ انھیں تنہائی بہت ستا رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بے سہارا سمجھتے ہیں —— انھیں اپنے معاشرے کے کسی رنگ سے اطمینان نہیں، غرض خود سے اور خدائی سے بیزاری ہے اور یہ ماحول ان عزیزوں نے کچھ اختراع کے شوق سے اور کچھ تجربوں کی خاطر اپنا رکھا ہے۔

پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری کو بالکل مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جو تجربے کر رہے ہیں یہی تجربے انھیں اس آزمودہ تجربے تک جا پہنچائیں گے کہ زندگی "بند پانی" نہیں، جوئے رواں ہے اس میں ایسا تسلسل ہے جس کی انتہا ابتدا سے ملی ہوئی ہے —— ایک اچھی شاعری، پرانی روایتوں سے یکسر آزاد نہیں ہوتی۔ روایتوں کا صالح حصہ نئے تجربات میں محفوظ ہو کر بقائے دوام کے سامان مہیا کرتا جاتا ہے۔ جدت کا انکار زندگی کے بنیادی اصول کا انکار ہے اور روایت کا کفران، حفظِ زندگی کی جڑ کاٹنا ہے —— انسان کی دنیا میں خدا بھی ہے اور خدائی بھی —— زمین بھی ہے اور آسمان بھی —— دیدہ و شنیدہ بھی ہے اور بہت کچھ وہ بھی جو ابھی نادیدہ و ناشنیدہ ہے —— کسی ڈوری کے بغیر تخیل کے غبارے اڑاتے پھرنا بچوں کا کھیل تو ہو سکتا ہے مگر اسے اعلیٰ سنجیدگی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی تخلیق میں تجربے کی سعی کو برا نہ کہنا چاہیئے۔ جدتوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمدردانہ اور بے تعصب تنقید بے اعتدالیوں کی اصلاح خود کرے گی۔

---

[1] میر کے شعر میں "ہم فقیروں کا"

آخر میں تھوڑی سی بحث معاشرتی اور تہذیبی پس منظر کی روشنی میں اصناف کے مزاج، ساخت اور روح کے بارے میں بھی مناسب معلوم ہوتی ہے۔
ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" میں اصناف کے مزاج کا تجزیہ اس طرح کیا ہے:۔

(۱) "اردو شاعری کی تینوں بنیادی اصناف یعنی گیت، غزل اور نظم کا بنیادی فرق محض ہیئت کے فرق تک محدود نہیں بلکہ ان میں سے ہر صنف شعر مزاجاً بھی دوسری اصناف سے مختلف ہے۔"

(۲) اس مزاج کی نوعیت، برصغیر کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

(۳) ہر تہذیب میں وقتاً فوقتاً کسی تصادم (بیرونی یا اندرونی) کی وجہ سے ایک اُبال، ایک تحریک پیدا ہوتا ہے۔ اسی تحریک کی نوعیت کے مطابق اصناف پیدا ہوتی ہیں اور ہیئتیں وجود میں آتی ہیں جن کے اندر اس اُبال کی روح جلوہ گر ہوتی ہے۔"

(۴) "اس تحریک کی ابتدائی حالت میں (جب ہندوستان کو آریاؤں کا سامنا کرنا پڑا) آریائی اور دراوڑی تہذیب کی ثنویت اور تصادم سے گیت کی صنف نمودار ہوئی۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندوستانی تہذیب کو دوسرے بڑے تہذیبی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ ثقافت کے اعتبار سے اس تصادم کی نوعیت آسمان اور زمین کے ملاپ کی سی تھی۔ اور اس سے "غزل نمودار ہوئی" انگریزی تہذیب نے ثقافت میں جو تحریک پیدا کی اس سے نظم وجود میں آئی۔ مغرب میں انفرادیت کا رجحان اور اس کے نتیجے میں نظم کا فروغ ممکن ہوا اور یہی باتیں آج کے معاشرے میں نظم کی ترویج اور فروغ کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہے۔ ان کی کتاب کی ہر ہر سطر سے محنت اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اس تحقیق کے دوران میں بہت سی نئی باتیں دریافت کی ہیں۔ ثقافتی پس منظر کے کینوس کو وسیع ترین انتہاؤں تک پھیلا کر انھوں نے ادب اور ثقافت کے رشتوں کا سراغ لگایا ہے اور شاید اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ جو کتاب اس شوق اور خلوص و محبت کے ساتھ لکھی گئی ہو، اس سے ذرہ برابر بھی اختلاف کیا جائے۔ پھر بھی مزید تجزیے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ گیت، غزل اور نظم کا بنیادی فرق محض خارجی ہیئت کا فرق نہیں بلکہ اس کے مزاج کا فرق ہے —— اور یہ مزاج اس کو اس سرزمین سے ملا ہے جس میں وہ ظہور میں آئی ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ گیت خالص ہندی چیز ہے "غزل میں مسلمانوں کی ثقافت و ادب اور مقامی فضا کا ملاپ ہے اور نظم کا (خصوصاً غیر مقفیٰ اور آزاد نظم) کا فروغ انگریزی اور مغربی تہذیب کا رہین منت ہے۔"

اس کے علاوہ وہ "اُبال" والی بات بھی غلط نہیں۔

بایں ہمہ غور کے قابل امر یہ ہے کہ اردو شاعری کی بحث کو دراوڑی تہذیب تک لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اردو شاعری سنسکرت یا ہندی شاعری کی ارتقائی صورت ہوتی تو اس طریق تحقیق کے لئے وجہ جواز تھی لیکن اردو شاعری کے ڈانڈے اصلاً فارسی، ترکی اور عربی ادبوں سے ملتے ہیں نہ کہ سنسکرت اور ہندی شاعری سے۔ جدید دور کے اردو گیت تو ٹھیک —— لیکن بھگتی دور کا یا اس سے قبل کے ادوار کے گیت کا اردو شاعری سے کیا تعلق ہے؟

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، اس کے نہایت ہی قلیل دکنی سرمایے کے سوا گیت کا اولین وقیع سرمایہ، غزل کی شاعری کے بعد جدید دور ہی میں وجود میں آیا (میں ہندی شاعری کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ کبیر، تلسی داس، سورداس اور میرا بائی کی شاعری ہندی کا سرمایہ ہے نہ کہ

اردو کا) اس لئے اردو شاعری کے مزاج کی بحث میں، ہندی شاعری کے ارتقائی دور کا ذکر، دلیل کے لئے مفید معلوم نہیں ہوتا۔

پھر ایک اشکال یہ ہے کہ غزل گیت کی ارتقائی شکل نہیں، غزل ایرانی چیز ہے، ہندوستان میں آکر اس پر مقامی ماحول کا اثر ضرور ہوا لیکن اصلاً وہ ایرانی چیز ہے۔ لہٰذا غزل اور نظم، تاریخی ترتیب کے لحاظ سے آگے پیچھے کی چیزیں ضرور ہیں۔ مگر ارتقائی لحاظ سے ایک صنف، دوسرے صنف کی ارتقائی تدریج کا حصّہ نہیں۔

دراصل، تہذیب کے تاریخی سرچشموں کی بحث میں قبل از اسلام کی تہذیبوں کا شمول اور ان کے اثرات و فیوض کی پیمائش، ایک نیا رجحان ہے۔ جو بعض سیاسی اور بعض نیم باغیانہ خیالات کی پیداوار ہے۔ ہم پاکستانی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے خالصتاً وہ تہذیب مراد ہوتی ہے جو اس ملک (برصغیر پاک و ہند) میں اسلام کی آمد کے بعد پیدا ہوئی۔ اسلامی عقیدے اور تصوراتِ زندگی اس میں غالب عنصر کا درجہ رکھتے ہیں مقامی عنصر وہی ہے جسے اسلامی عقیدوں نے روا رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں کسی راستے سے، غیر اسلامی اسالیب بھی راہ پا گئے ہوں۔

مذکورہ بالا جدید رجحان یہ عقیدہ پیدا کر رہا ہے کہ اسلام کی آمد محض ایک خاص دور کا حادثاتی نفوذ ہے۔ اس کی حیثیت وہی ہے جو آریاؤں کی آمد، یا انگریزوں کی آمد کی ہے —— یہ عقیدہ مجھے کسی طرح قابل قبول نہیں۔!

اُردو شاعری صحیح معنوں میں دکن میں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے اگر کچھ تھی تو وہ وقیع نہیں۔ ہندی اصناف ہندی شاعری کا حِصّہ ہیں، اردو کا نہیں۔ اردو اصناف نے ہندی اثر قبول کیا ہوگا مگر وہ خالص مسلمانی عہد سے متعلق ہیں۔

اُردو ادب کی اصناف کا مزاج کیا ہے؟

ہیئت کے لحاظ سے اردو کی قدیم اصناف یہ ہیں:

(الف) غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مسدس، مثلث، وغیرہ ضمنی اصناف ہیں۔

(ب) مستعار یا دخیل اصناف

۱۔ ہندی —— گیت وغیرہ

۲۔ انگریزی اثرات کے تحت، غیر مقفیٰ نظم، آزاد نظم، سانٹ، کینٹو، غنائیے وغیرہ

اُردو شاعری کے مزاج کی بحث میں صحیح ترتیب (تاریخی طور پر) یوں ہوگی: نظم (مختصر نظمیں اور طویل مثنویاں)، غزل، گیت (ڈرامے میں)، غیر مقفیٰ نظم، آزاد نظم ——، یہ ترتیب زمانی لحاظ سے قائم ہوتی ہے —— اس کا دراوڑی اور آریائی تہذیب کے حوادث و واقعات سے کچھ تعلق نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو گیت میں ہندی لہجہ اور دھیمے نسوانی جذبات کی چاشنی ہے مگر اردو گیت کا مزاج ہندی گیت کے مزاج سے مختلف ہے۔ اُردو گیت میں سطح کے قریب ہی "مرد" اور وہ بھی "مسلمان مرد" بولتا سنائی دیتا ہے۔ مغربی اثرات کے تحت پیدا شدہ اصناف اس کے برعکس، اردو شاعری کے اصل مزاج سے، درجہ بدرجہ دور اور منحرف اصناف ہیں۔ ہندی اثرات کو اُردو نے مغلوب بھی کیا اور جذب بھی کیا، مگر مغربی اثرات مغربی اقتدار کی وجہ سے غالب رہے اور اب تک غالب ہیں، مگر ملک و قوم کے اصلی ذوق نے ابھی انھیں دل سے قبول نہیں کیا۔ یہ مستقبل میں معلوم ہوگا کہ ان میں سے کیا کیا ہمارے مزاج کا جزو بن گیا ہے۔

غرض قدرتی طور پر اپنی ساری آمیزشوں کے باوجود اردو شاعری کا مزاج، مسلمانی اثرات کا عکاس ہے، واضح، قطعی اور معین!

جہاں ایسا نہیں اور کوئی دوسرا رنگ نظر آتا ہے تو وہ رنگ یقیناً مغلوب رنگ ہوگا اور دراوڑی اثرات کا تو دور دور تک نشان نہیں ملتا۔

ظاہر ہے کہ ہندی شاعری کی آواز یعنی اس کا مزاج نسوانی ہے یا یوں کہیے "مادرانہ" ہے۔ بلکہ اردو فارسی شاعری کا مزاج علی العموم مردانہ یا پدرانہ ہے۔ جو توانا ہے، قہرمانی ہے، ترکمانی ہے۔ سپاہیانہ ہے۔ فارسی کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ یہ مضمون اردو شاعری سے متعلق ہے۔ اردو شاعری کو ورثے میں خنجر، دشنہ، تیغ، کمان اور خدنگ ملے ہیں ــــ نئے گمراہ شدہ عقیدے کے برعکس، یہ ہتھیار پرانے زمانے میں عورتوں کے نہیں، مردوں کے ہوتے تھے (آج کل لوگ خوشامد سے عورتوں کو باور کرا رہے ہیں کہ پرانے زمانے میں عورتیں میدان جنگ میں تلوار باندھتی اور نیزے گھماتی پھرتی تھیں ــــ چلئے یوں ہی سہی، آج کل پھر اس کی ضرورت ہے) جملہ معترضہ کی معذرت ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ہتھیار قدرتاً مردوں سے متعلق تھے۔ غزل کی شاعری بلکہ ہر صنف میں ان لفظیات کی موجودگی، اس مردانہ ماحول کا پتہ دیتی ہے جو مسلمانی اصناف سے مخصوص ہے۔

ہندی شاعروں کے مزاج میں یک گونہ دھندلکا، (فسانویت ایک طرح کی "ڈیو مالائیت" (اس ترکیب کے لئے معذرت خواہ ہوں) ابہام اور بقول فراق "دھواں دھواں" (شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس)، بلکہ بعض اوقات اندھیرا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ کائنات کا خوف اس کا رعب اور دُور ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ اردو شاعری میں یہ اندھیرے نہیں، ہر چیز کا واضح تصور، ہر شے کا اثباتی پہلو موجود ہے۔ نفی کی آواز کو بھی اثبات کے پردے میں اس طرح ڈھانپ دیا گیا ہے کہ نفی نفی معلوم نہیں ہوتی۔ یہ اثباتی آواز ہندی شاعری میں کہاں ہے۔ ہندی شاعری اسرار کی اور جنوں پریوں کی شاعری ہے جس میں ہر شے بعید ہے، طلسمی ہے۔ تخیر کا طلسم اس پر محیط ہے۔ بسنت اور ہولی اس کی اصل فضا ــــ اور اس میں جدائی کی جلن ــــ دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف) یہ ہندی شاعری ہے۔ اس کے برعکس اردو شاعری انکشاف کی شاعری ہے۔ اس میں ہر شے روشن ہے۔ ابن العربی کی اسراریت کا اثر بھی نظر آتا ہے مگر ہوالظاہر و ہوالباطن نے بتا دیا ہے کہ، ظاہر میں ہے، باطن میں بھی وہی ہے۔ صرف انکشاف کی ضرورت ہے۔ خدا کے واضح تصور نے منفیات کو اثبات کی دلیل بنا کر نفی کو کالعدم کر دیا ہے۔ انسان کو جو بلند مقام اردو شاعری نے دیا، اس میں کسی کو کلام نہیں۔ تفصیلوں سے بچنے کے لئے میر کا ایک ہی شعر کافی ہوگا ؎

اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر ــــ مرتے ہیں ہم تو آدم خاکی کی شان پر

اردو جو کبھی کبھی انسان اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی محسوس کرتا ہے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زمینی فطرت جب آسمانوں کی بلندیوں کو دیکھتی ہے تو اسے یہ سوچ کر ڈر سا لگتا ہے کہ ــــ میں ــــ ایک ضعیف انسان ــــ کیا میں ان بلندیوں کو عبور کر سکوں گا؟ ان پہاڑوں کو کاٹ سکوں گا؟ پھر جب اس کی انا اور اثباتی قوت اپنے انکشافات و فتوحات پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا ڈر دور ہو جاتا ہے ــــ!

اُردو شاعری میں انفعال اور دکھ کے حادثے تو ہیں مگر زندگی کے فلسفے ان حادثوں کی بنیاد پر مرتب نہیں کئے جاتے۔ ہندی فلسفے، زندگی کے ابدی دکھ کے قائل ہیں، ہندی شاعری اسی اصول سے اوپر اٹھتی ہے۔ زندگی کے روپ بدلتے رہتے ہیں اور دکھ کے سلسلے قائم رہتے ہیں اور قائم رہیں گے۔ زندگی کے فلسفے، اردو شاعری میں خدا کے اور قیامت کے ایسے تصور پر قائم ہیں جس میں اچھے اعمال کی وجہ سے ابدی راحت مل سکتی ہے۔ یہ نیک عملی روح کی پاکیزگی، خدا سے تعلق اور انسانیت کے لئے اچھے کام کرنے سے عبارت ہے۔

اردو شاعری میں حسن، ایک بہت بڑی قدر ہے، جو تسخیر اور مقاومت کا جذبہ پیدا کرتی ہے ــــ اردو شاعری میں "ہرجائی پن" بھی حسن کی تسخیر عام کا ایک روپ ہے۔

غزل کا لباس نرم و لطیف ہے مگر اس کے حریری لباس کے اندر ایک توانا سپاہی کے جسم و جان کا احساس ہوتا ہے۔ جو زندگی کے تندرستی کے

ندرتِ اسلوب سے بھی بہرہ اندوز ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ غزل میں پردہ داری، نوک جھونک، نکتہ طرازی اور دانش آموزی گھلی ملی ہوتی ہے۔ رباعی میں دانشورانہ کم گوئی گرزبانت ملتی ہے۔ اس کی آواز بھی نسوانی نہیں۔ قطعے میں واقعات سے دانش پیدا کرنے کا رجحان ہے جو انکشافات اور بصیرت آموزی کی آمد سے پیدا ہوتا ہے۔ قصیدہ مسلمانوں کی سپاہیانہ زندگی کے رعب داب، تکلف اور تجمل کی علامت ہے ——— اس کے ماحول میں شاہی درباروں کے ٹھاٹ موجود ہیں۔ زرہ بکتر اور چاتا کے ساتھ ساتھ کلاہِ فغفوری اور قاقم و سنجاب کے پیراہن بھی ہیں۔ یہ قصیدے کا ماحول ہے۔ جو لوگ اس توانا شاعری کو پیوندِ زمین کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کے پس منظر کی بے قدری کرتے ہیں۔ ان کے لاشعور میں دراوڑی ابتدائیت اور بدویت نے انگڑائی لی ہے۔ سو اس کے متعلق میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ ان مُردوں کو تو کیا جگائیں گے خود موت کی نیند سو جانا چاہتے ہیں۔

یہ میں نے ایک عام رجحان کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقصد نہیں۔ انھوں نے تو علمی تحقیق کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ ان کی کتاب کی تحریک سے بحث و نظر کے اور دریچے بھی وا ہوں گے۔ نہ اس وقت ان کی کتاب کا تبصرہ مدِنظر ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اردو شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے جس میں مقامی اثرات بھی ہوں گے لیکن اس کی اصل روح اس کلچر کی نمایندگی کرتی ہے جو مسلمانوں کی آمد کے بعد پیدا ہوا ——— یہاں اردو شاعری کے اسلامی مزاج کی بات بھی نامناسب نہ ہوگی۔ پروفیسر جیلانی کامران نے فرمایا ہے کہ "جس ادب کو مسلمانوں نے تخلیق کیا اور جو اب ہمارے قومی سرمایے میں شامل ہے، اس کی اصل قدر و قیمت اسلام ہی کے حوالے سے جانچی جا سکتی ہے۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "مسلمانوں کا ادب، برائے زیست بھی تھا مگر ان کا ادب برائے مذہب بھی تھا۔"[۵]

ادب برائے زیست اور ادب برائے مذہب بہت اچھی اصطلاحیں ہیں لیکن ان کے متعلق جو تصورات ہمارے ذہن میں پہلے سے جمع ہیں، ان کی وجہ سے ان کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ادب کی ماہیت یہ کہتی ہے کہ وہ کُل کا کُل (اگر وہ سچا ادب ہے تو) انسان کے لئے ہے۔ اس ایک فقرے میں وہ سب مسلک جمع ہو جاتے ہیں جن پر اکثر گفتگو اور نزاع ہوتی رہتی ہے۔

جب ہم ادب برائے انسان کہتے ہیں تو اس میں ادب برائے حسن، ادب برائے زندگی، ادب برائے مذہب، ادب برائے خدا، ادب برائے معاشرہ، سب کچھ جمع ہو جاتا ہے ——— یہ سب انسان کی دنیا کے شعبے ہیں اور ادب ان سب کے لئے ہے۔ انسانی زندگی کیا ہے؟ جسم و روح یا خارجی طور پر تمدن اور داخلی طور پر جذبہ ——— یہی جذبہ اور تمدن ——— کُل خلاصہ ہے زندگی کا ——— انسان کے باطن کی مشین مذہب یا خدا یا وجدان یا کسی اندرونی آواز کے سہارے چلتی ہے۔ اس کو عقلِ اعلیٰ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تمدن کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں میں عقلِ اعلیٰ کی رہنمائی لازم ہے ورنہ انسان بھٹکتا پھرے ——— یہ عقلِ اعلیٰ نظم و ترتیب کی ذمے دار ہے، حسن کی خالق ہے، توازن و ہمواری کی ذمے دار ہے، سہارا دیتی ہے تدبیر سجھاتی ہے ——— اور جب ہم اپنے کو بے سہارا پاتے ہیں تو اسی کو پکارتے ہیں۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ زیست (زندگی) اور مذہب (عقلِ اعلیٰ) دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ زیست عمل ہے اور مذہب اس عمل کے پیچھے کا صحیح عقیدہ ہے جو عمل کی رہنمائی کرتا رہتا ہے اور بقول پروفیسر جیلانی کامران صراط المستقیم کی نشان دہی کرتا رہتا ہے۔

والٹر پیٹر وغیرہ کے خیالات کو لوگ (جھگڑے کے ماحول میں) سمجھ نہیں پائے۔ والٹر پیٹر بھی یہ نہیں کہتا کہ بس حسن کے گیان دھیان میں بیٹھے رہو اور ارد گرد کچھ نہ دیکھو۔ وہ تو مادہ پرست حقیقت پسندوں کو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ ادب علومِ تمدن و سیاست کی کتاب نہیں، یہ تو زندگی کے حسن کی شارح اور ترجمان ایجنسی ہے تو اس میں زندگی اور حسن میں بُعد یا تفریق کہاں آئی؟

---

۵ تنقید کا نیا پس منظر

بہر صورت میں کہہ یہ رہا تھا کہ ادب کا اصل کام برائے انسان ہے اور مذہب اس میں شامل ہے۔ چونکہ ادب ہر قوم اور ہر دور کے خاص مزاج کی عکاسی کرتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر اسلامی ادبوں میں، خدا کے تصوّر کا غلبہ ہے۔ مسلمانوں کی شاعری میں انسان اور خدا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ عشق کی بات چیت، حسن کی بات چیت، کائنات کی بات چیت، اخلاق کی بات چیت، تمدن کے قصے، تاریخ کے اشارے بلکہ مے اور مے خانے کی باتوں میں بھی خدا ہی کا پرتوِ احساس چھایا ہوا ہے۔

کسی ادب کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں مذہب کے ارکان، اور اس کے اوامر و نواہی کی جزئیات موجود ہوں۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی رُوح میں مذہب کی آمیزش ہے یا نہیں ——— اس لحاظ سے ۱۹۴۷ء تک اردو ادب کو اسلامی ادب کہا جاسکتا ہے۔ اس کی عام فضا پر اسلامی خصائص چھلکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ——— اس کی حمد، اس کی نعت، اس کی منقبت کے علاوہ، اس میں خدا کا ہمہ گیر تصوّر، اسلامی رنگ روپ لئے ہوئے ہے۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ اس ادب کو یا کسی ادب کو اسلامی کیوں کہئے؟ اس پر اصرار کرنے سے بہت سی الجھنیں اور پیدا ہو جائیں گی کیونکہ اس میں مے و مے خانہ، کفر کے دعوے، رندی و ہوسناکی کی باتیں بھی تو ہیں۔ صوفیوں نے ان سب اصطلاحوں اور علامتوں کی تطہیر کر دی تھی اور ان کے معنی بدل دیے تھے محمود شبستری نے ایک پوری کتاب (گلشنِ راز) اس کے معانی پر لکھ ڈالی۔ پھر بھی اس شاعری میں جذبات (بلکہ جذباتِ سفلی) کی بات ——— رندی و قلندری، وسعتِ مشرب، تفرقۂ کفر و دین سے بیزاری، "کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست" اور اس سے بھی بڑھ کر کچھ باتیں ہیں۔ یہ در اصل تمدنی تصادم کے وقتی اور گاہ گاہ کے ردِ عمل اور تاثرات ہیں جن کی ضرورت اس لئے پڑتی تھی کہ ادیب کی اصل نظر، اپنے مقصد پر تھی ضمنی باتوں پر نہ تھی۔ ادیب کا اصل منصب ضمیر کی بیداری، انسان کی خدمت اور اس معاشرے کی خدمت اور ترجمانی ہے جس کے اندر وہ پیدا ہوا ہے۔

آسمان پر خدا اور زمین پر اس کی خدائی ——— اور اس میں اس کے نائب یعنی انسان کی بادشاہت ——— اردو ادب کا بس یہی عقیدہ ہے۔ یہ جزءً اسلامی بھی ہے مگر اس کے مذہبی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ——— یعنی یہ کہ اس میں خدا کا ہمہ گیر تصوّر غالب اور محیط ہے۔ ایک مسلمان معاشرے کے ادیب کو لا محالہ ایسا ادب پیدا کرنا پڑے گا جس پر اسلام کا نقش ہو مگر وہ اوامر و نواہی کا فقیہہ نہیں بن سکتا۔ یہ ادیب کا منصب یعنی کام نہیں۔

بہر صورت، پروفیسر جیلانی کامران جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ درست ہے مگر اس کے کہنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ ادب اور معاشرے کے تعلق کو سمجھ لینے کے بعد، کسی کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ وہ اسلامی غزل، اسلامی رباعی، اسلامی مثنوی کی قید لگائے ——— اسلام کی اقدار کی عزت اگر معاشرے میں ہوگی تو ادب کی ہر صنف پر اس احترام کا اثر خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔

سید علی عباس جلالپوری

روحِ عصر

۳

عہدِ علم کلام[1]

رومۃ الکبریٰ کے زوال اور نشاۃ الثانیہ کے درمیان کی صدیوں کو مورخینِ مغرب نے ازمنۂ تاریک کا نام دیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس زمانے میں چاروں طرف جہالت اور وہم پرستی کی تاریکی محیط ہو گئی تھی۔ یہ خیال محلِ نظر ہے کیونکہ اسی دور میں ایشیا کے اکثر ممالک میں علم و فن کی شمع روشن تھی۔ برٹرنڈ رسل[2] نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ کہتے ہیں

"ہم سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۰۰۰ء بعد از مسیح تک کے زمانے کو تاریک عہد کا نام دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری توجہ ناواجب طور پر مغربی یورپ پر مرتکز ہو چکی ہے۔ چین میں یہ زمانہ تانگ خاندان کے تسلط کا ہے جو چینی شاعری کا عظیم ترین عہد ہے اور کئی دوسرے پہلوؤں سے ایک یادگار زمانہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی زمانے میں ہندوستان سے لے کر ہسپانیہ تک اسلام کا درخشاں تمدن پھیلا ہوا تھا۔"

ان صدیوں میں اسلام اور عیسائیت کی اشاعت ہوئی۔ یہ دونوں مذاہب ایک ہی تنے کی دو شاخیں تھیں لیکن سیاسی مسابقت اور تجارتی راستوں کے حصول کے لئے مدت مدید تک مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ یورپ کے اجڈ اور نیم وحشی قبائل ٹیوٹن، گاتھ، ہنی فرینک، وینڈل، کلٹ اور بربری محض نام کے عیسائی تھے۔ اُن کے ہاں جاگیرداری نظام قائم تھا۔ بڑے بڑے روسا، اپنے ناقابلِ تسخیر سنگین قلعوں میں خود مختاری کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی رعایا کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے تھے۔ تعلیم و تدریس راہبوں کے زاویوں تک محدود تھی اور یونان و روم کے علمی و ادبی شاہکار تہ خانوں میں مدفون پڑے تھے۔

یورپ کے اس دورِ جاہلیت میں مسلمانوں نے قدما کے علمی سرمائے کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ مامون الرشید عباسی نے نسطوری عیسائیوں، حران کے صابیوں، ہندوستان کے پنڈتوں اور مسلمان علما کی مدد سے یونانی، سنسکرت، پہلوی اور سریانی زبانوں سے مختلف علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرایا۔ تالیف و ترجمہ کے لئے بیت الحکمت قائم کیا گیا جو کم و بیش دو صدیوں تک کام کرتا رہا۔ مترجمہ علوم میں ارسطو کی منطق، افلاطون کے اشراق، فلاطینوس کے عرفان، بقراط کی طب، آریا بھٹ اور بطلیموس کی ہیئت نے عربوں کو خاص طور سے متاثر کیا۔ فلسفہ و منطق کے ذوق نے اہلِ علم کو از سرِ نو اپنے مذہبی اعتقادات کا جائزہ لینے کی تحریک کی اور معتزلہ نے جنھیں اس دور کے مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے، عقائد میں غور و فکر کرنے کی ابتدا کی اور علمِ کلام

---

[1] Scholasticism عقلی دلائل سے مذہبی عقائد کی تائید و توثیق کرنے کی کوشش کا تعلق علمِ کلام سے ہے۔ جو شخص اس قسم کے استدلال سے کام لے، اسے متکلم کہا جاتا ہے۔

[2] A History of Western Philosophy

کی ترویج کا باعث ہوئے۔ رفتہ رفتہ اعتزال سے فلسفہ کی جانب گریز ہوا۔ چنانچہ یعقوب اسحٰق الکندی جو مسلمانوں میں ارسطا طالیسی فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے، معتزلی العقیدہ ہی تھا۔

معتزلہ نے قدر و اختیار، جمہوریت، انصاف و عدل اور آزادیٔ فکر و نظر کی دعوت دی، اس لئے متوکل عباسی جیسے مستبد سلاطین اور کم سواد اور تنگ نظر فقہا اُن کے افکار کو اپنے تسلط و تصرف کے لئے خطرناک خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں جدید فلسفیانہ افکار کا پنپنا مشکل تھا۔ بہرحال بغداد میں بنی بویہ اور شام میں بنو حماد کے برسراقتدار آجانے سے ذوقِ تفکر نے سنبھالا لیا اور فارابی، ابن سینا، البیرونی، ابن مسکویہ، اخوان الصفا نے ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں فیثا غورثی اور نو فلاطونی انداز نظر سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی۔

مغرب میں ابن ماجہ، ابن طفیل اور ابن رشد نے یونانی حکما کے نظریات کی ترویج کی۔ ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں صدیوں میں ابن سینا اور ابن رشد کی تالیفات لاطینی میں ترجمہ ہو کر مغربی ممالک میں عام طور سے شائع ہو گئیں۔ اس زمانے میں جب کہ مغرب ہزار سالہ جہالت و جمود کی گہری نیند سے بیدار ہو رہا تھا تاتاریوں کے خروج نے مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا شیرازہ بکھیر دیا اور اس کے ساتھ ہی ممالکِ اسلام میں فکر و نظر کا خاتمہ ہو گیا۔

عقل و نقل یا فلسفہ و مذہب کی تطبیق یا دوسرے الفاظ میں علم کلام ہی اس دور کا رجحانِ غالب ہے۔ عیسائیوں میں البرٹ اعظم، طامس اکوئنس، بیلارڈ، ولیم آکم وغیرہ نے مذہبی عقاید کی ترجمانی عقلی نقطۂ نظر سے کی۔ ہندوستان میں یہ کام شنکر اچاریہ نے انجام دیا۔ دنیائے اسلام میں متکلمین نے فلسفۂ یونان اور مذہب اسلام کے اصول و عقاید میں مطابقت کا آغاز کیا لیکن فلاسفۂ یونان کے جن افکار سے وہ روشناس ہوئے اُن پر نو فلاطونی شرح کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ "الہیات ارسطو" فلاطینوس کی اینیڈز کی آخری تین جلدوں کی تلخیص تھی۔ اس کا ترجمہ عربی میں ہوا تو مسلمان حکما اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ ارسطو کی تصنیف ہے۔ یہ غلط فہمی ابن رشد تک باقی رہی۔ الہیاتِ ارسطو کے ساتھ ارسطو کی کتاب "الروح" کی شرح جو اسکندر افرودیسی نے مذہبی رنگ میں لکھی تھی، مسلمانوں میں مقبول ہوئی اور اس طرح ارسطو کے نظریات کے پردے میں جو فلسفہ مسلمانوں میں عام طور سے رواج پذیر ہوا وہ دراصل نو فلاطونی یا اشراقی فلسفہ تھا جس کا ارسطو کے افکار کے ساتھ محض واجبی سا ہی تعلق تھا۔

جیسا کہ مختصراً ذکر ہو چکا ہے، مسلمانوں میں معتزلہ کی آزادیٔ فکر کی تحریک کو متوکل عباسی اور اس کے حاشیہ نشین فقہا نے کچل دیا تھا۔ ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کے نظریۂ قدر و اختیار کی تردید کے جوش میں قانونِ سبب و مسبب سے ہی انکار کر دیا جس سے علمی تحقیق کو ناقابل بیان صدمہ پہنچا کیونکہ یہی قانون سائنٹفک تحقیق کا سنگِ بنیاد سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ غزالی نے باطنیہ اور صوفیہ کے عقاید کو اسلامی تعلیمات میں ممزوج کر دیا۔ متصوفانہ افکار کی اشاعت نے مسلمانوں کے عقلی اور فکری قویٰ کو یکسر مضمحل کر دیا۔ اسی بنا پر البیرونی کی "الآثار" کے ایڈیٹر نے کہا ہے کہ اگر مسلمانوں میں اشعری اور غزالی نہ ہوتے تو آج تک اُن میں سینکڑوں گلیلیو اور نیوٹن پیدا ہو چکے ہوتے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی سائنس صرف تجربات و مشاہدات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ قدیم یونانی تجربات کے قائل نہیں تھے صرف قیاسی استدلال سے علمی نتائج کا استخراج کرتے تھے۔ دوسری انتہا یہ تھی کہ مسلمان سائنس دانوں نے فقہا کے خوف سے سائنس کے تجربات سے نظریات اخذ کرنے کی جرأت نہ کی۔ اہل مغرب نے نشاۃ الثانیہ کے بعد ان دونوں پہلوؤں کو یکساں اہمیت دی جس سے سائنس کو حیرت ناک ترقی نصیب ہوئی۔

اس دور کی دو شخصیتیں فکر و نظر کے اعتبار سے ممتاز مقام کی مالک ہیں۔ ابن رشد اور ابن خلدون لیکن یہ مفکر اس وقت پیدا ہوئے جب دنیائے اسلام میں ہر طرف ادبار و تنزل کا دور دورہ ہو چکا تھا۔

ابن رشد کو مشرقی ممالکِ اسلام میں اس لئے مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی کہ اس نے اپنی تالیف "تہافۃ التہافہ" میں غزالی پر کڑی تنقید کی تھی۔

یہاں تک کہ اُس کی خرد دشمنی کے باعث اسے "مرتدِ فلسفہ" کہا تھا۔ ابن رشد متکلمین کا مخالف تھا کیونکہ وہ فلسفہ کو مذہب کی کنیز تصور کرتے تھے۔ اُس نے ارسطاطالیسی نظریات پر سے فلاطونی شرحوں کے دبیز پردے اُٹھانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈینٹے نے اسے "ترجمانِ ارسطو" کا خطاب دیا ہے۔

مشرق نے ابن رشد سے استفادہ نہیں کیا لیکن مغربی ممالک میں اس کے افکار بڑی سرعت سے پھیلے۔ فلپ ہٹی لکھتے ہیں:

"دورِ وسطیٰ کے مغربی عیسائی متکلمین اور اہلِ قلم کے ذہنوں میں جتنا ہیجان ابن رشد نے برپا کیا اور کسی نے نہیں کیا تھا۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی سے لے کر ۱۶ ویں صدی عیسوی کے اواخر تک ابن رشدیت یورپ بھر میں سب سے غالب مکتبِ فکر شمار ہوتی رہی۔"

ابن رشد کے حقیقتِ دوگونہ کے نظریے نے خاص طور پر اہلِ مغرب کو متاثر کیا۔ اُس نے کہا تھا کہ حقیقت کے دو رخ ہیں ایک مذہبی اور دوسرا فلسفیانہ یا عقلی۔ لہٰذا مذہبی عقاید میں فلسفہ کو دخیل نہیں ہونا چاہیئے اور فلسفہ کے مسلمات کو مذہبی عقاید کی روشنی میں نہیں جانچنا چاہیئے اُس کا خیال تھا کہ قرآن مجید تصفیۂ اخلاق کے لیے نازل کیا گیا تھا۔ وہ فلسفے کی کتاب نہیں ہے جیسا کہ متکلمین سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ متکلمین کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآنی آیات کی فلسفیانہ تاویلیں کریں۔ حقیقتِ دوگونہ کا یہ نظریہ "ابن رشدیت" کی تحریک کے نام سے یورپ میں شائع ہوا۔ سائگر برے بانٹ اُس کا بڑا معتقد تھا۔ اُس کی ہمنوائی میں پیرس اور پیڈوا کے ابن رشدیوں نے کلیسائے روم کے اِس ادعا سے شدید اختلاف کیا کہ فلسفہ مذہب کی کنیز ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فلسفیانہ افکار کا مطالعہ مذہبی عقاید سے قطع نظر کر کے کرنا چاہیے۔ ابن رشد کے ان خیالات کی اشاعت سے مغرب کی عقلی تحریکوں کو بڑی تقویت ہوئی اور علم کلام کا زور ٹوٹ جانے سے نشاۃ الثانیہ اور سائنس کی ترقی کے لیے زمین ہموار ہو گئی۔ رینانؔ لکھتا ہے

"دارالعلوم پیڈوا صدیوں تک ابن رشدیوں کا مرکز بنا رہا۔ گریموٹی رشدی نے چالیس برس تک وہاں ابن رشد کی تعلیمات کا درس دیا تھا۔ وہیں عربوں کی طب کا ذوق پیدا ہوا۔ ابالو پیڈوا ہیں ابن رشدیت کا بانی ہے ۔ ۔ ۔ ایک دفعہ پٹرارکا نے ایک ابن رشدی کے سامنے پال ولی کا ایک مقولہ پیش کیا۔ اُس شخص نے نفرت سے سر اٹھا کر کہا "اس قسم کے عالموں کا ذکر بس اپنے تک ہی رہنے دیجئے میرا اُستاد تو دوسرا ہے۔ اچھا ہے تم بد عقیدہ رہو۔ مجھے ان کتابوں میں سے کسی ایک پر بھی ایمان نہیں۔ تمہارا پال، تمہارا آگسٹائن بالکل گپی اور بکواسی ہیں۔ کاش تم ابن رشد کو پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ ان بدمعاش لفنگوں سے وہ کس قدر عالی اور افضل تھا۔ ایک دفعہ چند ابن رشدیوں نے بحث مباحثے سے پٹرارکا کو ہم خیال بنانا چاہا لیکن وہ اپنے عقاید پر ڈٹا رہا۔ آخر اُن میں سے ایک نے کہا "تم اچھے آدمی ہو لیکن جاہل ہو۔"

ابن رشد واحد مسلمان مفکر ہے جس نے مرد و عورت کی مساوات پر بحث کی ہے۔ مسلمانانِ اندلس کے زوال کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ اِس تنزل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے ملک کی نصف آبادی یعنی عورتوں کو حرم کی چار دیواری میں قید کر رکھا تھا اور عورت کو محض "گلے کا پھول" سمجھتے رہے۔ اُس کے خیال میں عورتیں ہر پیشے میں مرد کے دوش بدوش کام کر سکتی ہیں حتیٰ کہ جنگجوئی کے فرائض بھی ادا کر سکتی ہیں۔

ابن رشد کے یہ ترقی پرور افکار و نظریات اسلامی دنیا میں مقبول ہو جاتے تو ممکن تھا کہ مسلمان بھی آج سے صدیوں پیشتر ذہنی تقلید و جمود

History of the Arabs ؎

؎ ابن رشد و فلسفۂ ابن رشد ترجمہ مشرقی علی خاں۔

کے طلسم سے آزاد ہو جاتے لیکن فقہار کی مخالفت نے اس امکان کا سدِ باب کر دیا۔

ابنِ خلدون نے دنیائے علم میں سب سے پہلے فلسفہ "تاریخ و عمران کے اصول مرتب کئے اور اپنے مشہور مقدمے میں قوموں کے عروج و زوال کے وجوہ پر محققانہ بحث کی اور عمل تاریخ کا جائزہ جغرافیائی، اقتصادی اور عمرانی اسباب کی روشنی میں لیا۔ ابنِ خلدون کے مقام کا اندازہ مندرجہ ذیل آرار سے کیا جا سکے گا۔

فان کرامر[۵۱] لکھتے ہیں:

"ابنِ خلدون نے آب و ہوا کے جو اثرات تمدن پر ہوتے ہیں اُن سے بحث کی ہے۔ بکل نے اسی نقطۂ نظر کو اپنی تصنیف "تاریخ تمدن" میں پیش کیا ہے۔ انگریز مورخ نے فی الحقیقت عرب مفکر کے نظریے کا ہی اثبات کیا ہے۔"

رابرٹ فلنٹ[۵۲] کے خیال میں:

"ازمنۂ وسطیٰ میں ابنِ خلدون کو وہی مقام حاصل ہے جو شاعری میں ڈینٹے کو اور سائنس میں روجر بیکن کو۔"

جارج سارٹن[۵۳] نے ابنِ خلدون کو میکیاویلی، بودن، ویچو، کومٹ اور کرنو کا پیش رو قرار دیا ہے۔ چارلس اسّاوی[۵۴] کہتا ہے:

"ورخیم سے پہلے ابنِ خلدون نے بتایا کہ محنت کی تقسیم معاشرتی نظام کو مضبوط کرتی ہے۔ کارل مارکس کی طرح اُس نے سیاسی اور عمرانی زندگی پر اقتصادی عوامل کا گہرا اثر تسلیم کیا ہے۔"

مشہور معاصر مورخ پروفیسر ٹائن بی[۵۵] ان الفاظ میں ابنِ خلدون کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

"فلسفۂ عمران میں ابنِ خلدون کا کوئی پیش رو نہیں ہے۔ کسی معاصر نے ابنِ خلدون سے استفادہ نہیں کیا۔ بعد میں آنے والوں نے اس سے کسب فیض کیا۔ اپنے مقدمۂ تاریخ میں اُس نے جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا عظیم ترین فلسفہ ہے جس کی کہیں بھی مثال نہیں ملتی۔"

ابنِ خلدون[۵۶] کا اندازِ نظر سائنٹفک ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ خود عرب نژاد تھا اور اپنا شجرۂ نسب ماقبل اسلام کے عربوں تک پہنچاتا تھا۔ اس کے باوجود کہتا ہے کہ عرب تہذیب و تمدن کے دشمن ہیں اور دنیائے اسلام میں اہلِ عجم علوم و فنون کے حامل رہے ہیں۔

ابن رشد کی طرح ابنِ خلدون نے حقیقتِ دوگونہ کا ایک نیا تصور پیش کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ انبیار کی تعلیمات کی ضرورت صرف انہی کاموں میں پڑتی ہے جن کا تعلق اس زندگی سے نہیں بلکہ آخرت کی زندگی سے ہے۔ جہاں تک اس زندگی کے مسائل کا تعلق ہے انسان انبیار کی تعلیمات کا محتاج نہیں ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ دنیا میں غیر مسلم اقوام بھی ترقی کر رہی ہیں بلکہ ان میں سے بعض دنیوی ترقی کے معاملے میں مسلمانوں سے بھی گوئے سبقت لے گئی ہیں۔

فلسفۂ ابن رشد کی طرح اس عظیم مفکر کے نظریات بھی اہلِ مشرق میں مقبول نہیں ہو سکے۔ مسلمان اہل قلم اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرتے وقت ابنِ خلدون کا نام تو گنا دیتے ہیں لیکن اُس کے مقرر کئے ہوئے اصولِ اجتماع و عمران کی روشنی میں آج تک کسی مسلمان مورخ نے تاریخ اسلام کا جائزہ نہیں لیا، نہ تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے وقت اقتصادی اور جغرافیائی عوامل و موثرات سے بحث کی ہے۔

---

۵۱ Politics in Islam

۵۲ History of History of Philosophy

۵۳ Introduction to the History of Science

۵۴ An Arab History of Philosophy

۵۵ A Study of History Vol. III

۵۶ ایضاً

ان صدیوں کے دوران، چین و ہندوستان میں قنوطیت اور تشاؤم کا دور دورہ رہا اور بدھ مت کی ہمہ گیر اشاعت نے ان ممالک کے باشندوں کو جنھوں نے کسی زمانے میں علوم و فنون کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں، جوشِ اقدام اور اجتہادِ فکر سے محروم کر دیا۔

چین میں لاؤتسے کے تاؤمت کی اشاعت کنفیوشس سے پہلے ہوئی تھی لیکن کنفیوشس کے افکار کی مقبولیت سے تاؤمت کو زوال آ گیا تھا۔ کنفیوشس کے مسلک کو چین خاندان کے اوائلِ حکومت تک یعنی دو ہزار برس تک فروغ حاصل رہا۔ تیسری اور چوتھی صدیوں (ب۔م) میں چین اور جاپان میں بدھ مت کے مہایانا فرقے کے مذہب کی اشاعت ہوئی اور اسی زمانے میں تاؤمت کا احیاء عمل میں آیا۔ یہ دونوں مذاہب سلبی اور قنوطی تھے۔ مہایانا فرقہ گوتم بدھ کے جوشِ ابلاغ اور اعلیٰ اخلاق سے محروم ہو چکا تھا۔ مہایانا بھکشوؤں کی پیروی میں تاؤمت کے پیروؤں نے بھی اپنے بانی لاؤتسے کے بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ یہ زمانہ چین کے عمرانی تنزل و انحطاط کا ہے۔ اس لئے تاؤمت کے نظریۂ حیات کو مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس زمانے میں چین میں شاعری کو بے شک فروغ حاصل ہوا لیکن یہ شاعری اجتماعی فرار کی غمازی کرتی ہے اور بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کے تنزل پذیر عہد کی اردو شاعری کی طرح زندگی کے ولولے سے محروم ہے۔

تاؤمت میں علمی تجسس یا فلسفیانہ تفکر کو مطلق اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کا اصل اصول یہ تھا کہ "دانش کا آغاز خاموشی سے ہوتا ہے۔" لاؤتسے روسو کی طرح فلسفیانہ تعمق کو زندگی کے حق میں زہرِ قاتل سمجھتا تھا اور اسی کی طرح تحصیلِ علم کا سخت مخالف تھا۔ اس کا قول ہے "اپنے غرور کو دور کرو۔ جاہ پسندی اور بلند نگہی اور خواہشِ ترقی کو کچل دو۔ بلند پرواز نصب العینوں کو چھوڑ دو۔ ان چیزوں سے تمہارے کردار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میری تلقین یہی ہے۔" لن یوتانگ[1] تاؤمت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تاؤمت نظری اور عملی پہلوؤں سے ایک قسم کے لاابالیانہ پن اور تخریبی تشکک کا نام ہے۔ اس میں انسانی کوششوں کی بے چارگی، انسانی اداروں، قوانین، حکومت کے نظم و نسق، شادی بیاہ وغیرہ کی بے حاصلی کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ کسی قسم کی مثالیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے پیروؤں میں عملی اقدام کا مادہ نہیں ہوتا بلکہ اس لئے کہ انہیں کسی چیز پر اعتقاد ہی باقی نہیں رہتا۔۔۔۔ تاؤمت تارک الدنیا لوگوں کا نظریۂ حیات ہے جو پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ تاؤمت میں روح کے تصفیہ سے دنیوی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

تاؤمت کے احیاء سے اہلِ چین کی شاعری کو بے شک ترقی ہوئی لیکن معاشرے پر اس کے اثرات ایسے ہی حیات سوز ہوئے جیسے کہ ایران کے صوفی شعراء کے کلام کے اسلامی معاشرے پر ہوئے تھے۔ عمرانی تنزل کے اس دور میں انھوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ فطرت سے روحانی تعلق پیدا کرنے سے سکونِ قلب میسر نہیں آتا بلکہ اس کے خلاف کشمکش کرنے اور اس کی تسخیر کرنے سے یہ دولت ارزانی ہوا کرتی ہے۔

ہندوستان میں شنکر اچاریہ نے نویں صدی عیسوی میں بدھ مت کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا اور اپنشدوں کے نظریات، گیتا اور بادرائن کے برہم سوتر کی متکلمانہ ترجمانی کی۔ شنکر اچاریہ بدھ مت کا مخالف تھا۔ اس کے باوجود اس کے نظریۂ ویدانت کے اصول و مبادی مہایانا بدھ مت ہی سے ماخوذ ہیں یہی وجہ ہے کہ آج بھی بعض پنڈت اس کو نقاب پوش بدھ سمجھتے ہیں۔ اس کے نظریہ میں مایا کے تصور کو بنیادی مقام دیا گیا ہے اور یہ تصور بدھوں کے شونیا (خلا نیستی) کے نظریے کی بازگشت ہے۔ بدھوں کے خیال میں کائنات کے جن مظاہر کو ہم حقیقی سمجھتے ہیں

---

[1] My Country and My People

وہ محض فریبِ نگاہ اور نیرنگِ خیال ہے۔ ہر شے ہر وقت تبدیل ہو رہی ہے۔ کائنات میں کوئی ہمہ گیر قانون کار فرما ہے تو وہ یہی ہے کہ کسی شے کو کسی حالت میں بھی ثبات و قرار نہیں ہے۔ شنکر نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ اس مایا یا فریبِ نظر کے پس پردہ ایک حقیقتِ کلی موجود ہے جسے وہ برہمن کا نام دیتا ہے۔ برہمن اور آتما (روحِ انسانی) کی نوعیت اور اصل ایک ہے۔ آتما مادی دنیا میں گرفتار ہو کر برہمن سے اپنے ربط و تعلق کو بھول جاتی ہے۔ یہی فراموش کاری اور نسیان اور جہالت (اودیا) فریبِ نظر کا باعث ہوتی ہے۔ شنکر کے خیال میں آتما کے اپنے مبداءِ حقیقی یعنی برہمن کو دریافت کرنے اور اس میں کھو جانے کا نام موکش یا نجات ہے۔ باطنیہ کی طرح شنکر کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ معرفت کی تعلیم خواص کے لئے ہے۔ عوام پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اپنے دیوتاؤں کی پرستش جاری رکھیں چنانچہ اس نے خود بھی شیو، وشنو وغیرہ دیوتاؤں کی مناجات میں پرجوش بھجن لکھے ہیں۔

بدھ مت کی طرح شنکر اچاریہ کا نظریہ بھی زاویہ نشینی، ترکِ علائق اور رہبانیت کی تلقین کرتا ہے۔ اس کی ملک گیر اشاعت نے اہلِ ہند کے قوائے عمل کو ماؤف کر دیا۔ آج کل جدید ہندو مت کے مبلغ پنڈت رادھا کرشنان[1] اور ان کے ہمنوا نظریۂ ویدانت کی ترجمانی جدید سائنس اور فلسفے کی روشنی میں کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ کرم کی جبریت اور ذات پات کی تمیز کے جواز میں دلائل بھی دیئے جاتے ہیں۔ یہ امر چنداں تعجب کا باعث نہیں ہے کیونکہ متکلم اور احیائی ہمیشہ حال اور مستقبل کے تقاضوں اور قدروں کو ماضی کی روایات پر قربان کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ گف نے جو اعتراضات اپنشد پر کئے ہیں وہی ویدانت پر بھی صادق آتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"ہندوستان کے اہلِ دانش، جیسا کہ اپنشدوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے، حیاتِ ابدی میں شرکت کرنے کے لئے پاکیزہ جذبات، اعلیٰ تفکر اور عملی جد و جہد کو شش پیہم اور راستی روی کو بروئے کار نہیں لاتے بلکہ اس مقصد کے لئے وہ جمود، بے عملی اور از خود رفتگی سے کام لیتے ہیں۔"

ازمنۂ وسطیٰ کی شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی مذہبی رجحان کار فرما ہے۔ اس روحِ عصر کا مطالعہ ڈینٹے کی طربیہ خداوندی، شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ، عطار، رومی اور عراقی کی متصوفانہ شاعری، اسورواس اور تکارام کے بھجنوں سے مصر اور اندلس کی مسجدوں، جرمنی اور فرانس کے گاتھک کلیساؤں اور جنوبی ہند کے مندروں میں ہر کہیں کیا جا سکتا ہے۔

نشاۃ الثانیہ

تاریخِ عالم میں ۱۵ویں اور ۱۶ویں صدیاں بعد از مسیح بڑی اہم سمجھی جاتی ہیں۔ ان صدیوں نے مغرب میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کو نیا جنم دیا اور مشرق کو ازمنۂ تاریک میں دھکیل دیا۔ شسٹری لکھتے ہیں:

"۱۷ویں، ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدیاں ایشیا کے ازمنۂ تاریک یا عہدِ جاہلیت کی صدیاں ہیں۔ سیاسی قوتوں کے تنزل کے ساتھ ایشیائی ممالک میں اخلاقی و معاشرتی انحطاط کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ ہر طرف خانہ جنگی، احساسِ کمتری، انتشار و خلفشار، جہالت، کم سوادی، وہم پرستی اور اندھی تقلید کا تسلط تھا۔ علم و فضل کی مشعل مشرق سے مغرب کو جا چکی تھی۔"

چین، ہند، ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں برہمنوں، پنڈتوں اور فقہا کا اقتدار ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ قدما کی کتابوں کی شرحیں لکھتے رہیں اور بال کی کھال اتارتے رہیں۔ پہلے ان کتابوں کے خلاصے لکھے جاتے پھر ان خلاصوں کی شرحیں لکھی جاتیں۔ پھر ان شرحوں

---

[1] Indian Philosophy Vol. 2.

کے فتاوے لکھے جاتے اور طلبہ کو زدوکوب کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں فکر و نظر کے نشو و نما کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عربی کا مشہور شاعر ابوالعلا معری کہتا ہے:

"اسلاف کی بدولت کس قدر عظیم الشان سرمایہ کتابوں میں ایسا موجود ہے جس کی تمام روشنائی ضائع گئی۔"

مدعیانِ علم و فضل اجتہادِ فکر سے بیگانے ہو چکے تھے۔ اسی شاعر نے کہا ہے:

"لوگ ایک امامِ حق کے منتظر ہیں
جو اُن کے لشکر کی قیادت کرے
یہ اُن کو خیالِ خام ہے
عقل کے سوا کوئی امام نہیں
جو ہر آن انسان کو صحیح مشورہ دے
اور اُس کی رہنمائی کرے"

عقلی استدلال کو ہر طرف بدعتِ سیئہ سمجھا جاتا تھا۔ مزید برآں ہمہ گیر یاسیت اور جبریت نے جو سیاسی اور اخلاقی تنزل کے واضح علامات ہیں، دلوں میں تحقیق و تجسس کے ولولے سرد کر دیئے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ جدال و قتال جاری رہا۔ یہ جنگیں بظاہر مذہبی بنا پر لڑی گئی تھیں لیکن ان کی تہہ میں تجارتی اور اقتصادی مقاصد کارفرما تھے۔ اہلِ مغرب کو شروع سے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں اور عراق و ایران کے ممالک میں دلچسپی رہی ہے کیونکہ چین کو جانے والی "شاہراہِ ریشم" انہی میں سے ہو کر گذرتی تھی۔ صلیبی جنگوں کی ناکامی کا داغ اہلِ مغرب کے سینوں میں سلگ رہا تھا۔ کہ ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے انہیں مشرقِ بعید کے بری تجارتی راستوں سے محروم کر دیا۔ اسی زمانے میں قطب نما کی ترویج ہوئی جس کی مدد سے اہلِ مغرب نے مشرقِ بعید کے ممالک تک پہنچنے کے لئے بحری راستوں کی دریافت پر کمرِ ہمت باندھی۔ قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے بھی یونانی زبان کے علما ارسطو، دیاستھنیز، یوری پیڈیز وغیرہ کے مسودات لے کر اطالیہ پہنچ چکے تھے۔ ۱۳۹۶ء میں ایک یونانی عالم کرسولورس فلورنس کی یونیورسٹی میں آ کر مقیم ہوا اور وہاں اُس نے یونانی ادب و زبان کے خطبات دیئے جس سے فلورنس کے اربابِ دانش میں یونانی زبان کا چرچا ہونے لگا۔ اس وقت فلورنس کا شہر کلاسیکی علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ وہاں کے امرا و روسا بڑے علم دوست تھے اور اہلِ علم و ذوق کی قدر دانی اور ہمت افزائی میں پیش پیش تھے۔ ان میں دمیچی خاندان علم و فن کا سب سے بڑا مربی ثابت ہوا۔ ڈینٹے، بوکاچیو اور داونچی فلورنس کی خاک سے ہی اٹھے تھے۔ دمیچی خاندان میں کوسیمو، لورنیزو، پوپ لیو دہم اور پوپ کلیمنٹ ہفتم نے علوم و فنون کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کوسیمو نے فلورنس میں اکادمی افلاطون قائم کی جس میں افلاطون کے فلسفے کی تدریس شروع ہوئی۔ تسخیر قسطنطنیہ کے بعد یونانی علما جوق در جوق اطالیہ کے شہروں میں پہنچ گئے۔ اطالیہ ۱۴ ویں صدی کے اواخر تک تمام یورپ کے طلبہ کا مرجع بنی رہی۔ لوگ تحصیلِ علم کے شوق میں سینکڑوں میل کا سفر کر کے روم، فلورنس اور پیڈوا آنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تحریکِ تجدیدِ علوم تمام بلادِ مغرب میں پھیل گئی۔ اطالیہ میں یہ تحریک ادبیات اور فنونِ لطیفہ کی اشاعت تک محدود رہی لیکن شمالی و مغربی یورپ میں اس کے سائنٹفک پہلو کو فروغ ہوا۔ جرمنی میں اس کی روح، آزادیٔ فکر و نظر کا اظہار اصلاحِ مذہب کی صورت میں ہوا۔

اسی دور میں کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن، کیپلر، وسے لیس، دے کارت اور فرانسس بیکن نے جدید فلسفہ اور سائنس کی تاسیس کی۔ اُن کی تحقیقات اور انکشافات سے علم ہیئت، جغرافیہ، طبیعیات، منطق، مابعد الطبیعیات اور طب کے قدیم و فرسودہ نظریات میں ترمیم ہوئی جس سے کلیسائے روم کے متشکلانہ افکار و نظریات کا طلسم ٹوٹ گیا اور انسان کے ذہن و فکر پر سے اوہام و خرافات کے دبیز پردے اُٹھ گئے۔ کوپرنیکس نے ثابت کیا کہ زمین ایک سیارہ ہے جو دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتا ہے۔ گلیلیو نے دوربین کی مدد سے جو مشاہدات کئے اُن سے کوپرنیکس کے نظریے کی تائید و توثیق ہوئی جس سے مقتدایانِ مذہب برافروختہ ہو گئے اور سائنسدانوں پر تشدد اور تعدی کا آغاز ہوا۔ جب گلیلیو نے دوربین کی مدد سے مشتری کے چاندوں کا مشاہدہ کیا اور اہلِ مذہب سے اس کا ذکر کیا تو وہ خفا ہو گئے اور گلیلیو کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ گلیلیو نے کہا آؤ میں دوربین میں سے تم کو دکھاؤں لیکن انھوں نے دوربین میں سے دیکھنے سے انکار کر دیا اور کہا یہ ناممکن ہے، جھوٹ ہے۔ اس سے سائنس اور کلیسا کے درمیان اس آویزش اور پیکار کا آغاز ہوا جس کا انجام کلیسا کی شکست پر ہوا۔ گلیلیو پر الحاد و زندقہ کا فتویٰ لگایا گیا اور عدالتِ کلیسا میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ اس لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ جب اُسے سرِ عدالت اپنے علمی نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا گیا تو وہ زیرِ لب بڑبڑاتا رہا "لیکن زمین گردش کرتی ہے۔ زمین گردش کرتی ہے"۔ آزادیٔ نظر کا سدِ باب کرنا مقتدایانِ مذہب کے بس کی بات نہیں تھی۔ احتساب کی بے پناہ دار و گیر بھی انسانی ذہن و فکر کو متشکلانہ نظریات کے حصار میں مقید رہنے پر مجبور نہ کر سکی اور رفتہ رفتہ کلیسا کو بھی احساس ہونے لگا کہ سائنس کے فاتحانہ اقدام کا مقابلہ محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ نئے نئے اصولِ پیکار وضع کئے گئے۔ مثلاً جب کبھی کوئی سائنس داں ایک نیا علمی انکشاف کرتا تو مقتدایانِ دین جھٹ اپنی کتبِ مقدسہ کی ورق گردانی کرنے لگتے اور اُن میں سے کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا ڈھونڈ نکالتے جس کی تاویل کر کے کہنے لگتے "دیکھو یہ انکشاف کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اصول تو صدیوں سے ہماری مقدس کتابوں میں موجود ہیں"۔ یہ پوچھنے کی جرأت کسے تھی کہ اگر تمام انکشافات و ایجادات کے اصول آپ کی مذہبی کتب میں موجود تھے تو وہ کیوں سائنس دانوں کی تحقیقات سے قبل معرضِ اظہار و ترجمانی میں نہ آ سکے اور اُن کی بنا پر آج تک کیوں کسی اہلِ مذہب نے سائنس کا کوئی انکشاف نہیں کیا۔ کلیسا کا یہ اندازِ تحقیق آج بھی باقی و برقرار ہے۔ اُس نے ارتقار اور اضافیت جیسے جدید نظریات کے اصول و مبادی بھی اپنی کتابوں میں ڈھونڈ نکالے ہیں۔

فرانسس بیکن نے ارسطو کی قیاس پر تنقید لکھی اور استقرار کی اہمیت واضح کی۔ استقرار خالص سائنٹفک تحقیق کی نمائندگی کرتی ہے اور قیاس کی بہ نسبت مشاہدے کو زیادہ اہم سمجھتی ہے۔ ہابس اور دے کارت نے سائنس کے جدید انکشافات سے متاثر ہو کر اُن کی روشنی میں فلسفۂ جدید کو مرتب کیا۔

دنیائے ادب میں پیٹرارک اور بوکاچیو نے انسان دوستی کی روایت کا احیا کیا۔ پیٹرارک کو سمجھنا گویا نشاۃ الثانیہ کی روح کو سمجھنا ہے۔ والدین نے اسے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دانش گاہ میں بھیجا وہ بجائے قانون کا مطالعہ کرنے کے مشاہیرِ قدما ورجل، سیسرو، سینیکا وغیرہ کی کتب پڑھنے لگا جس سے کلاسیکی ادب و شعر کے ساتھ اُس کا شغف بڑھتا گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُس نے اپنے تمام احباب سے کہا کہ وہ اُس کے لئے لاطینی اور یونانی زبانوں کے مسودات ڈھونڈ کر جمع کریں اور اُس کے لئے خرید لیں۔ رینان کا قول ہے کہ پیٹرارک پہلا موڈرن انسان ہے۔ اُسے احیار العلوم کا ابوالآبار اور پہلا انسان دوست سمجھا جاتا ہے۔ پوپ انوسنٹ ششم نے پیٹرارک پر جادوگر ہونے کا الزام لگایا تھا کیونکہ وہ ورجل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ پیٹرارک یونانی اور لاطینی مسودات کے متعلق کہا کرتا تھا "وہ معصوم قیدی

تھے جنھیں وحشیوں نے صدیوں تک پابند طوق و سلاسل رکھا۔

اِس زمانے میں کلیسائے روم کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گرجوں اور خانقاہوں میں فسق و فجور کا دور دورہ تھا۔ لیکی نے "تاریخ اخلاق یورپ" میں مقتدایانِ مذہب کی عیش و عشرت کے بڑے شرمناک حالات لکھے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے کے ادبا اور دانشوروں کی تحریروں اور تقریروں میں اہلِ کلیسا کی گندم نما جو فروشی اور دروغ آرائی کا خوب خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ ساونا رولا نے برسرِ منبر کہا "روم کے لئے ایک ہزار، دس ہزار، چودہ ہزار کسبیاں بھی ناکافی ہیں کیونکہ روم میں ہر عورت اور مرد کو کسبی میں تبدیل کر دیا گیا ہے" مشہور مصوّر اور سنگ تراش میکال آنجلو ساونا رولا سے متاثر تھا۔ ایک دن اُس کے نگار خانے میں دو پادری آئے اور اُس کی تصویروں میں نقائص نکالنے لگے۔ ایک کہنے لگا تم نے ولیوں کے چہرے کچھ زیادہ ہی سرخ دکھائے ہیں۔ میکال آنجلو نے جواب دیا "ٹھیک ہے لیکن یوم محشر کو آپ جیسے بدکاروں کو اپنے زمرے میں کھڑا دیکھ کر کیا اُن کے چہرے شرم سے سرخ نہ ہو جائیں گے"۔ بوکاچیو نے بھی اپنی کہانیوں میں پادریوں کی بڑی تضحیک کی ہے۔

میکال آنجلو سنگ تراش پہلے تھا اور مصوّر بعد میں۔ ناقدین فن نے اُسے دنیا کا سب سے عظیم فن کار قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رفائیل بطلیان۔ ویلاسکا تھ۔ کلاڈ لورین۔ داونچی وغیرہ نے مصوری کی درخشاں روایات قائم کیں۔ داونچی کی شخصیت حیرت انگیز طور پر جامع حیثیات تھی۔ وہ ایک بلند پایہ مصوّر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑا ریاضی داں، مہندس، معمار، شاعر، سنگ تراش، موسیقار اور موجد بھی تھا۔ اس نے تارپیڈو، ٹینک اور مشین گن کے ماڈل بنائے تھے۔ اور کیمیا اور نجوم کی مخالفت کی تھی۔ اُس نے طوفان نوحؑ کو ماننے سے انکار کیا اور کہا کہ سدوم اور گمورہ کو عذاب الٰہی نے برباد نہیں کیا تھا بلکہ وہ طبیعی اسباب کے باعث تباہ ہوئے تھے۔ اُس نے قدیم زمانے کے جانوروں کے جسمانی آثار کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کرۂ زمین کو وجود میں آئے کروڑوں برس ہوئے ہیں۔ اس پر پادری بڑے جز بز ہوئے۔ اُس کی ذات میں تحریک احیاء العلوم اپنی تمام جامعیت کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی تھی۔

دُنیائے ادب میں ایرازمس، مور، مانتین اور شیکسپیر نے اسالیب بیان میں تنوّع اور موضوع میں وسعت پیدا کی۔ ایرازمس علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھا۔ اُس کے لڑکپن کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک دفعہ اُس نے اپنے لاطینی کے ایک اُستاد کو ایک خط لکھا۔ اُستاد صاحب کم سواد تھے۔ جواب میں لکھا "عزیزِ من، آئندہ لاطینی میں خط لکھنا ہو تو ساتھ اُس کی شرح بھی لکھ بھیجا کرو تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو" اُس کا مقالہ "حماقت کی تعریف میں" آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

مور نے اپنی اٹوپیا میں افلاطون کی طرح ایک مثالی اشتمالی معاشرے کا خواب دیکھا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے "امرا نے سازش کر رکھی ہے کہ وہ دولت مشترکہ کے نام پر اجناس فراہم کر لیں"۔ اس کی بعض تجاویز دلچسپ ہیں۔ مثلاً کہتا ہے کہ اس کی مثالی ریاست میں "شادی سے پہلے دولہا اور دولہن کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو مادرزاد برہنہ دیکھ لیں"۔

مانتین مختصر مقالہ نگاری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مقالات میں کہیں کہیں کلبیت کا رنگ آ گیا ہے لیکن ان میں وسعتِ قلب اور نفسیاتی بصیرت کے نادر نمونے بھی ملتے ہیں۔

شیکسپیر کو تمثیل نگاری میں وہی مقام حاصل ہے جو علم و فضل میں ایرازمس کو اور فنون لطیفہ میں داونچی کو۔ اُس نے انسانی سیرت و کردار کا اُستادانہ تجزیہ کیا ہے اور انسانی فطرت کے ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جن تک بہت کم شعرا و ادبا کی نگاہ پہنچ سکی تھی۔ وہ یونانی مشاہیر

اسکیلس اور سوفوکلیز کے فلسفیانہ علو نظر اور آفاقیت سے محروم ہے لیکن نفسیاتی بصیرت میں اُن پر سبقت لے گیا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے خاتمے کے ساتھ فنِ تعمیر میں گاتھک طرزِ تعمیر کو بھی زوال آگیا۔ ڈوناٹو برامانٹ جیسے معماروں نے قدیم روم کے اسالیب تعمیر کا احیار کیا اور اُن کے نمونے پر اطالیہ کے شہروں میں عمارتیں تعمیر کیں۔ ورسائی کے محلات کلاسیکی طرزِ تعمیر کے نہایت حسین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں مغرب کی کلاسیکی موسیقی کے موسس سٹریڈی ویریس نے وائلن نوازی کو ترقی بخشی بلکہ وائلن کو اس شکل میں مرتب کیا جس شکل میں وہ آج ہمیں دکھائی دیتا ہے۔

تحریکِ اصلاحِ کلیسا جس نے کلیسائے روم کے صدیوں کے روحانی اور ذہنی تسلط کا خاتمہ کیا تحریک احیاء العلوم کی ہی ایک فرع سمجھی جا سکتی ہے۔ چھاپے خانے کی ایجاد کے ساتھ کتبِ مقدسہ اور اُن کی تدریس و تعلیم پر اہلِ مذہب کا اجارہ ختم ہوگیا۔ کلیسائے روم کے ساتھ جو کام چھاپے خانے نے کیا تھا وہی بارود نے جاگیرداری نظام کے ساتھ کیا۔ سلاطین مغرب نے اُبھرتے ہوئے وسطی طبقے اور بارود کی مدد سے جاگیرداروں کا خاتمہ کر دیا۔

اطالوی احیار العلوم کی تحریک کو پیدائش نو کا نام دیتے ہیں کیوں کہ ایک ہزار برس تک وحشت و بربریت کا دور دورہ ہونے کے بعد کلاسیکی علوم و فنون کا احیار عمل میں آیا تھا اور ایک ہزار برس کی ذہنی غلامی کے بعد اہلِ مغرب کو آزادیٔ فکر و نظر نصیب ہوئی تھی۔ انھوں نے پاپائے روم کے روحانی تسلط کے ساتھ متکلمین کے ذہنی استبداد کو بھی خیرباد کہا اور سر اُٹھا کر آسمان کی وسعتوں، پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندر کی پہنائیوں کو اعتمادِ نفس کی نگاہ سے دیکھا اور انھیں تسخیر کرنے پر کمربستہ ہوگیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں:

"لوگوں کو ایک بار پھر محسوس ہوا کہ زندگی بڑی نعمت ہے اور محض زندہ رہنا ہی بہت بڑی مسرت کا باعث ہے۔ یہ نتیجہ تھا یونانی فلسفے کے احیار کا جس نے ذہنوں پر صدیوں سے جمی ہوئی رہبانیت کی پھپھوندی کو دور کر دیا۔ عیسائیوں نے روما اور یونان کی قدیم اور دلکش تہذیب کو تعزِ فنا سے باہر نکالا اور اس کارنامے پر نازاں ہوئے اور اسے تہذیب کے نئے جنم کا نام دیا۔ نشاۃ الثانیہ کسی سیاسی یا مذہبی تحریک کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔"

آزادیٔ فکر و نظر کے اس ولولے سے سرشار ہو کر کولمبس، واسکوڈاگاما، میگیلان اور والٹر ریلے دور دراز کے پرخطر بحری سفروں پر روانہ ہوگئے۔ اس پرجوش ہماہمی کا اظہار اس عہد کے ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی ولولۂ حیات اور یہی جوششِ زندگی نشاۃ الثانیہ کی روح ہے۔ اربابِ نظر نے حجروں اور خانقاہوں میں زاویہ نشیں ہو کر طلبِ نجات کرنے کی بجائے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے دلچسپی لینا شروع کر دی اور اس کے مسائل اور عقدوں کو سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کا آغاز کیا۔ وہ نگاہیں جو ایک ہزار برس سے فلاح و بہبود کی جستجو میں آسمان کی طرف لگ رہی تھیں، پھر زمین کی طرف لوٹ آئیں، اور اسی زمین پر فردوسِ گم گشتہ کی تلاش شروع ہوگئی۔

(مسلسل)

ڈاکٹر وحید قریشی

ہمارے ادب کا نیا دور

(۱)

سرسید نے مسلمانانِ ہند و پاکستان کے لیے اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کی مدد سے نئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا شعور پیدا کیا لیکن علی گڑھ تحریک کا دائرۂ عمل سیاسی اور تعلیمی مقاصد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ سیاسی معاملات میں اس مسلک کی بنا حکومتِ برطانیہ اور مسلم آبادی کے درمیان مفاہمت اور مصالحت پر تھی۔ تعلیمی ترقی کا رخ ایک طرف مادی ترقی اور اقتصادی استحکام کی طرف تھا اور دوسری طرف سرکاری ملازمت کے مسئلے کی طرف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں فکری سطح پر ایک تبدیلی آگئی۔ مغل حکومت کے دورِ زوال میں جو انفعالی رجحانات مسلمان معاشرے میں کارفرما تھے، ان کی بہت کچھ روک تھام ہو گئی اور روحانی قدروں کی جگہ مادی قدروں سے محبت کو فروغ حاصل ہوا۔ تحریک سرسید کا یہ مثبت فائدہ ہوا لیکن اس کا منتہا اور مقصود چونکہ سیاسی مسائل میں حکومتِ برطانیہ کی امداد و اعانت اور تعلیمی لحاظ سے مسلمانوں کی پسماندگی کا علاج تھا، اس لئے علی گڑھ تحریک کا واضح پہلو بہرحال سیاسی اور تعلیمی رہا۔ وہ معاشرتی تبدیلیاں جن کے سرسید تمنائی تھے، علی گڑھ کی بجائے دوسرے مراکز کی مرہونِ منت رہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی کے تقاضوں کو تعلیم، اکبر اور شرر نے کچھ اس ڈھب سے پورا کیا کہ ان کا پیش کردہ حل ہماری جدوجہد آزادی کی اساس ہو گیا۔ مسلمانوں کی عام مجلسی زندگی اور تہذیبی قدروں کی بنیاد وطنیت کے جغرافیائی تصورات سے آزاد ہو کر نشوونما پانے لگی اور وہ دینی رنگ جس کا نقش سرسید اپنی درس گاہ میں نہ ابھار سکے تھے، آئندہ چل کر ہماری جدوجہد کا نمایاں رنگ قرار پایا۔ اقبال نے اکبر اور شبلی کے تصورات کو اس کی سیاسی آلائشوں سے پاک کر کے ملتِ اسلامیہ کے وسیع تر مفادات کے سانچوں میں ڈھالا اور فکر و عمل کے خارجی مظاہر عام سیاسی بیداری سے ہم کنار ہو کر برسرِ کار دکھتے رہے لیکن ان کی تہہ میں تعلیمی تصورات پھلتے پھولتے رہے۔ اس لئے اقبال، اکبر اور شبلی کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ سرسید کے بعد علی گڑھ کے مرکز میں بھی سیاسی اعتبار سے تبدیلی آئی۔ ان کے انتقال کے بعد عالمِ اسلام جس ابتلا کا شکار ہوا اس سے برصغیر کے مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خود علی گڑھ کالج کے طلبہ میں، جہاں آغاز میں مسلمانوں کے اہلِ ثروت گھرانوں کی اولاد کی کثرت تھی اور اس لحاظ سے ملازمتوں کا مسئلہ اور برطانوی وفاداری کا سبق دراصل انہیں گھرانوں کے مفادات کا مسئلہ تھا، اب مسلمانوں کے متوسط طبقے کی کثرت ہو گئی۔ اس لئے علی گڑھ کی سیاست کا رخ بھی غیر مشروط وفاداری کے بجائے مشروط وفاداری اور بعد میں آزادی کی جدوجہد کی طرف ہو گیا۔ ترقی کی دوڑ میں نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے نے اکثریت حاصل کی تو برطانوی اطاعت کا نقش دھندلا گیا لیکن برطانوی ملازمت کا بیشتر حصہ اب بھی علی گڑھ ہی سے پورا ہوتا تھا اس لئے کہ باقی علاقوں کے مسلمانوں کا تعلیمی کعبہ بھی علی گڑھ تھا اور اسے مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ لامحالہ ملازمتوں کی بھرتی اسی حلقے سے ہوتی رہی۔ سرسید کے بعد کم و بیش ہر دور میں مسلمانوں کی جدوجہد کا ایک مرکز ملازمتوں کا حصول اور ہندو اکثریت کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہا، بالخصوص سر ضیاء الدین کے زمانے میں بنارس

یونیورسٹی کے مقابلے میں علی گڈھ کا بڑا کارنامہ ملازمتوں میں علی گڈھ کے ہونہار طلبہ کی بہ سرعت بھرتی پر منحصر ہے۔ البتہ اسی مرکز نے سیاسی جد و جہد میں دوسرے متضاد عنصر کی حوصلہ افزائی بھی کی لیکن یہ کہنا شاید بے محل نہ ہوگا کہ ہماری جد و جہد آزادی کی مساعی کا بیشتر حصہ ملازمتوں کے حصول کے مسئلے کی نذر ہو کر رہ گیا۔ تاہم مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا کارنامہ خاص تعلیمی اور ان کے جانشینوں کا سیاسی رہا۔

(۲)

سرسید کی مغرب پرستی کے سطحی تصور کے مقابلے میں اکبر اور اقبال کا [illegible] حقائق کا بہتر ترجمان اور ہمارے مسائل کا بہتر حل تھا۔ عام علمی بیداری تعلیمی رنگ و روپ، سائنسی علوم کی ترویج بلاشبہ سرسید کے تصورات کا عکس ہیں لیکن افکار کی اس بیرونی سطح کے نیچے مسلمانوں کے افکار کی جو دنیا تعمیر ہوئی اس میں اکبر اور اقبال کا حصہ کہیں زیادہ ہے۔ سرسید کے رفقا میں حالی اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت کا احساس زیادہ رکھتے تھے لیکن علی گڈھ تحریک کا عام رُخ دنیاوی ترقی اور مادی مسائل ہی میں سمٹ کر رہ گیا اور تہذیبی اقدار کے مسائل اور اخلاقی قدروں کی تربیت میں علی گڑھ نے مسلمانان برِ اعظم ہند کی رہنمائی کا حق ادا نہیں کیا۔ اکبر کے بعد اقبال نے مذہب کی اہمیت اور تہذیبی قدروں کی مذہبی تعبیر پر زور دے کر مسلمانوں کی پاک و ہند میں ہزار سالہ زندگی کو ہند و مسلم تصادم کے تناظر میں دیکھ کر جو حل پیش کیا وہ دو قوموں کے نظریے، حصولِ پاکستان کے نصب العین، دینی ریاست کے تصور اور وطنیت کے مغربی تصورات کی نفی کی صورت میں سامنے آیا۔ علی گڑھ کے فرزندوں نے سیاست کے میدان میں جب تک اس حل کو قبول نہیں کیا انہیں مسلم سیاست میں برتری حاصل نہ ہو سکی۔

جس طرح ابتدا میں علی گڑھ نے تہذیبی سطح پر اس حل کو نظرانداز کیا اسی طرح اردو ادب کی عام رَو بھی ان تصورات کو ابتدا میں قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں جیسے جیسے بیداری کی لہر تیز ہوئی اور مغربی تعلیم کے اثرات پھیلتے گئے، اردو ادب پر اکثریت کے مذہب اور اس کے عقائد کی چھاپ واضح ہوتی چلی گئی۔ اس لیے دینی ریاست کے تصور پر وطنیت کے مغربی پیمانوں کی مخالفت کی جگہ یا تو کانگرس کی جد و جہد آزادی کی چھاپ گہری تھی یا پھر ترقی پسند تحریک کی وجہ سے مذہب سے بیزاری اور سیاسی و سماجی مسائل کا حل طبقاتی کش مکش کی اصطلاحوں میں ہوتا رہا۔ اس پس منظر میں اقبال رجعت پسند اور فرقہ پرست سمجھے گئے اور فکری پہلو سے ان کا اثر ادبا پر محدود ہو کر رہ گیا۔ اکثریت کے فرقے کا رویہ اردو سے ہمدردانہ نہ تھا لیکن ہندی کے حامی ادیب اردو کی مخالفت تو اردو زبان ہی میں کرتے تھے اور اس کی آبیاری اور عوام سے تعلقات کی عمارت بھی اردو کے شانوں پر قائم تھی۔ دو جنگوں کے درمیانی زمانے میں کانگرس کی جد و جہد آزادی کا رنگ اردو ادب پر چڑھتا رہا۔ اس کے نتیجے میں قومیت کے تصور نے دھرتی پوجا اور آریائی علم الاصنام کو ادب میں بے حد مقبول اور محبوب کر دیا۔ ترقی پسند تحریک نے بھی دینی اور تصوراتی رشتوں کی جگہ ارضی رشتوں پر زور دیا اور "مثالی ریاست" کا ایک اچھوتا تصور پیش کیا۔ ادب میں ارضی رشتوں کی اہمیت بڑھ گئی اور یہ اکثریت کے تفوق اور ان کی ادبی برتری کا بڑا ثبوت تھا۔ ترقی پسند تحریک نے زندگی کی مادی اور اقتصادی تعبیر و تاویل کی مدد سے دینی افکار و تصورات کو ادب میں زیادہ پنپنے نہ دیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی جد و جہد آزادی اور اردو ادب کے عام خد و خال کے درمیان افتراق و اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ ادب کے دھارے ایک طرف بہہ رہے تھے اور ہماری جد و جہد آزادی کی تحریک مختلف خطوط پر استوار ہوتی رہی۔ کانگرسی ادیبوں کی گہری چھاپ اردو ادب کے قومیت والے تصور کا رنگ اُبھار رہی تھی جس میں ہندوستانی متحدہ قومیت کا نعرہ تھا اور مذہبی تصورات کو فرقہ پرستی کہا جاتا تھا۔ ہندو اکثریت کی قوت کا دار و مدار اسی پر تھا کہ وہ قومیت کا دعویٰ کریں۔ ان کے حقوق کی حفاظت کی ضمانت ان کی تعداد میں تھی اس لیے انہیں قومیت کے مغربی تصور سے کیا خوف ہو سکتا تھا۔ اردو ادب کا بنیادی رنگ اس زمانے میں ارضی رشتوں اور قومیت کے مغربی تصور پر منحصر ہو گیا۔ مسلمان شعرا و ادبا پر بھی ہندی

دیومالا اور برج بھاشا کے اثرات کچھ کم گہرے نہ تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کا ذور ٹوٹنے پر مسلمانوں میں ایک عجیب مایوسی اور بے مقصدی کا دور دورہ ہو چکا تھا۔ ادب کی رومانی تحریک کو فروغ اسی دور میں حاصل ہوا۔ فرار کے عناصر ادب پر حاوی ہو گئے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے وقت ادبی تصورات اہم تھے۔ ان پر "عینی تصورات" کا اضافہ ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک ایک اصلاحی اور مقصدی تحریک تھی جس کا مطمحِ نظر فکر و عمل میں انقلاب پیدا کرنا تھا۔ اس کی توجہ "کیا ہے" سے زیادہ "کیا ہونا چاہیئے" پر تھی۔ اس لحاظ سے اس تحریک کے ادبا و شعرا کے لئے عینیت پرستی کی وجہ سے نہ تو دینی تصورات کی اہمیت تھی اور نہ دو قوموں کے نظریے کی ان جڑوں ہی سے انھیں آگاہی حاصل تھی۔ حالانکہ ہند و پاکستان کے فکر و احساس کو یہ بات برابر متاثر کر رہی تھی۔ کانگرس کے نعرے سے یہ لوگ بھی متاثر ہوتے رہے جس کے مطابق مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے برطانوی اشارے کے رہینِ منت سمجھے گئے۔ مسلم لیگ کو ادیبوں کی کثیر جماعت نے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا اور اسے نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت کہا جاتا رہا۔ مسلمانوں کی لیڈر شپ بلا شبہ ابتدا میں نوابوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ آئی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ابتدا میں انھیں پر منحصر تھا۔ لیکن جب علی گڑھ کے فرزندوں نے اس میں سرگرمی دکھائی تو اصل قوت نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ۱۹۴۰ء تک یہ طبقہ بھی مسلمانوں کے اضطراب اور بے اطمینانی کا اصل حل تلاش نہیں کر سکا تھا اور اپنے طبقے کے مفادات کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس کا مطمحِ نظر بھی مفاہمت کے اصولوں پر گامزن رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مسلمان عوام کے اصل مسائل سامنے آئے تو پھر لیگ کی قوت سرمایہ دار طبقے پر نہیں، عوام کے احساسات پر مبنی ہو گئی۔ اس تبدیلی کا احساس نہ کانگرس نے پورے طور پر کیا، نہ ترقی پسند تحریک کے "عینیت پسندوں" نے۔ ترقی پسند تحریک کے ادبا کے مقاصد کی جہت اور عام باشندوں کے احساسات کے درمیان بڑی مغائرت رہی۔

(۳)

جب پاکستان بن گیا تو ادیب اور عوام کے ٹوٹتے ہوئے رابطے پوری طرح سامنے آ گئے۔ تاریخی عوامل کی طرف سے ان لوگوں کی یہ غفلت جو سائنٹفک تجربے کے دعویدار تھے، بڑے افسوس ناک نتائج کا سبب بنی۔ پاکستان بننے کے بعد ترقی پسند تحریک کا اکثر حصہ پاکستان کو ذہنی طور پر اپنا ملک کہنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس آزادی کو آزادی تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا اور اسے انگریزوں کی تخلیق کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔[۱]

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے ۔۔۔ اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک ۔۔۔ ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

(نظم "مفاہمت": از ساحر لدھیانوی)

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

---

[۱] ساحر لدھیانوی تو خیر اب ہندوستانی شہری ہیں لیکن ہم فیض کی نظم اور عبادت بریلوی کی تحریر کے بارے میں فاضل مصنف کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتے۔ ماونٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے مسلمانانِ برصغیر کے ساتھ جو دھوکا کیا اور پنجاب و بنگال کی تقسیم کے سلسلے میں انھوں نے جو نقصان کشی روا رکھی، اس سے خود قیامِ پاکستان میں حصہ لینے والوں کے دلوں میں بھی شدید بیدا ہوئی اور اگر فیض نے اشعار میں اور عبادت نے نثر میں ان ابتدائی ایام کا تاثر محفوظ کر دیا ہے تو انھوں نے اپنے آپ سے بد دیانتی نہیں برتی اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ (ادارہ)

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

(نظم "سحر" از فیض احمد فیض)

ترقی پسند نقاد بھی اسے برطانوی استعمار کا کرشمہ قرار دیتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے رسالہ "ادبِ لطیف" کے سالنامہ ۱۹۴۷ء میں تنقیدی جھلکیاں کے عنوان سے لکھا:

"اس تباہی کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ایک ساحر نے ایک کھیل کھیلا تھا، ہم سب اس کی زد میں آگئے۔ ایک جال بچھایا تھا ہم سب اس میں پھنس گئے۔ تقسیم، تقسیم کی تقسیم، ریڈکلف ایوارڈ، باؤنڈری فورس، ملازموں کے تبادلے، یہ سب ایک ساحر کی شعبدہ بازیاں نہیں تو اور کیا تھا؟ ہمارے رہنما سب کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ انھوں نے مزاجِ یار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مزاجِ یار میں جو کچھ بھی آیا وہ کرتا رہا۔ فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کے لئے حالات پیدا کیے گئے۔ وہ آگ بھڑکی اور اس طرح بھڑکی کہ اس نے سب کچھ خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالا۔ جن لوگوں کو اس آگ کے بجھانے کے لیے بلایا گیا تھا، انھوں نے اب "حق نمک" دوسری طرح ادا کیا۔ اب وہ ایک نئے روپ میں سامنے آئے۔ کل تک جو کھلم کھلا کسی کے دربر ناصیہ فرسائی اپنا ایمان سمجھتے تھے اب یکایک مختلف مذہبیات (ہندو۔ مسلمان) کے سب سے بڑے علمبردار ہوگئے۔ ساحر نے ان سے کہہ دیا انھیں مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ دھرم کی رکھشا نہیں کر رہے تھے۔ ان کا مقصد "حق نمک" ادا کرنا تھا جب لاہور میں آگ بھڑک رہی تھی جب امرتسر، جالندھر، اور لدھیانے میں گولیاں برس رہی تھیں، جب دلّی پر خون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس وقت ساحر کسی پہاڑ کی اونچی چوٹی پر گھوڑے اڑانے میں مصروف تھا۔ جو سیلاب اس کو بہائے لے جانے والا تھا، جو آندھی خود اس کی بنیادوں کو اکھاڑ کر رکھ دینے والی تھی۔ اس نے ان کو اپنے "سحر" سے ٹکرا دیا۔ ساحر، اس کے مہرے اور ان کی سحر کاریوں کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مستقبل کا مورخ جب ان تمام چیزوں کو بے نقاب کرے گا تو آئندہ نسلیں اس کو پڑھ کر کانپ اٹھیں گی، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جایا کریں گے اور سالہا سال ان کی آنکھوں سے خون بہتا رہے گا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ہماری زندگی کی موجودہ عام الجھنوں کا سرچشمہ وہ فرقہ پرستی ہے، جس کا زہر ہماری زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے[۵]"

یہ حقائق کا حقیقت پسندانہ تجزیہ نہیں تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں پاکستان عالمِ وجود میں آگیا۔ بھارت کی نام نہاد سیکولر ریاست کے مقابلے میں پاکستان کا قیام اسلامی قدروں کی حفاظت کا ضامن تھا۔ یہاں وطنیت کو ایک نفسیاتی حقیقت اور معصوم جذبے کی سطح پر پہچاننے کی سعی کی گئی اور وطن کو سیاسی بت کے روپ میں اسلامی اقدار و افکار کے منافی قرار دیا گیا۔ وہ ادیب جو ۱۹۴۷ء تک ادب کے عام دھارے پر بہہ رہے تھے، اس حل کو ذہنی اور جذباتی طور پر قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ ادیب کے "خود تراشیدہ خول" اور ماحول کے درمیان تصادم دور رس نتائج کا حامل ہوا۔ نئے حالات نے ادب اور ادیب سے وفاداری کے مسائل کا حل طلب کیا۔ اس کا جواب کبھی انکار کی صورت میں دیا گیا اور کبھی جاگیرداری نظام کی باقیات قرار دے کر حقائق سے روگردانی کی گئی۔ یہ حالت حالات کے سامنے ادیبوں کی بے بسی اور جذباتی انتشار کی آئینہ دار تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں ہمارے معاشرے میں بعض منفی

۵۔ ادبِ لطیف (سالنامہ ۱۹۴۸ء) صفحہ ۱۱، ۱۲

رجحانات بھی اُبھرے اور اُنھوں نے حالات کو زیادہ پیچیدہ اور ادیب کو زیادہ ڈانواڈول کر دیا۔

(۴)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک پاکستان کی مملکت کئی دشوار مسائل سے دوچار رہی۔ مسائل اور انکار نے سیاسی اور معاشی استحکام پر شدید اثر ڈالا۔ سر سید کے زمانے سے ہماری سیاسی جدوجہد کا دائرہ سرکاری ملازمتوں اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی تک محدود رہا تھا۔ اور ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۵ء کے دستور انھیں مسائل کے حل تک محدود رہے تھے، اس لئے پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد ان مسائل کی شکل و صورت کا ادراک بھی بے موقع نہ ہوگا۔ یہ مسائل ہماری سیاسی زندگی کے مرکزی رجحانات رہے ہیں۔ تقسیم برصغیر کا فوری اثر ملازمین پر یہ پڑا کہ افواج اور دوسرے اہم اداروں میں بھی کانگریس کی غیر دانشمندانہ پالیسی اور ہندو اکثریت کے طرزِ عمل سے اختلافات کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اس لئے جب پاکستان کے حصے کے دوسرے ساز و سامان تقسیم کرنے کی نوبت آئی تو ملازمین کو بھی اختیار دیا گیا کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ آیا پاکستان کی ملازمت کریں گے یا ہندوستان کی۔ فسادات کے زیر اثر وسیع پیمانے پر آبادی کے منتقل ہونے سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام شدت سے متاثر ہوئے۔ مسلمان ملازمین کے لئے ہندو آبادی کا طرزِ عمل کچھ کم تکلیف دہ نہ تھا۔ افواج اور حکومت کے دوسرے محکموں کے مسلمان ملازمین کی ایک کثیر تعداد نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمان ملازم بھی پاکستان آگئے اور انھوں نے اس خلا کو پورا کیا جو پاکستانی علاقوں سے جانے والے ہندوؤں نے پیدا کیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں کی دوڑ میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور سابق پنجاب جیسے مسلم آبادی کی اکثریت والے علاقے میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی چالیس فی صد سے زیادہ نہ تھی حالانکہ یہاں مسلمانوں کی آبادی اس شرح سے کہیں زیادہ تھی۔ یہی حال کم و بیش دوسرے صوبوں میں تھا۔ ان مہاجر ملازمین کی آمد سے یہ خلا پُر ہوگیا۔ مسلم اقلیت والے علاقوں کے مسلمان ملازمین بیشتر کلیدی عہدوں پر حاوی ہوئے اور مجموعی اعتبار سے مقامی آبادی کے مقابلے میں ان کی برتری قائم ہوگئی۔ پاکستانی اور مسلم نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہ تھی اور کسی مقامی اور مہاجر میں کوئی اختلاف نہ ہوسکتا تھا لیکن ہندوستان کے مسلسل معاندانہ رویے کی وجہ سے وہاں کی مسلم آبادی جبر و تشدد کا شکار ہوکر پاکستان مسلسل آتی رہی۔ اس نقل مکانی نے پاکستان کی مملکت کے لیے مہاجرین کے مسئلے کو بہت پیچیدہ اور لاینحل بنا دیا۔ مسلم اقلیتی علاقوں میں مسلمان ہندو اکثریت کے مقابلے میں ہمیشہ معاشرتی اور اقتصادی سطح پر پریشان ہوتے رہے تھے۔ دو سو برس کی ہندو برتری نے نفسیاتی اعتبار سے ان علاقوں کے مسلمانوں کو پارٹی بازی کی شکل میں منظم رہنے کا مسلسل احساس دلایا۔ اس وراثت[1] کے ساتھ اقلیتی آبادی پاکستان آئی تو مقامی اور مہاجر کا احساس گہرا ہونے لگا اور مہاجرین کو جب تک پوری طرح آباد نہیں کیا گیا، مقامی اور مہاجر کا امتیاز حکومت کے لئے مشکلات کا سبب بنتا رہا۔ ملازمین میں بھی حکومت کے نظم و نسق کے خراب ہو جانے سے اقربا پروری کا رجحان فروغ پاگیا۔ ۱۹۵۸ء تک ہندوستان کے فساد زدہ اور مظلوم مہاجرین کے ساتھ ساتھ قسمت آزما اور تعلیم یافتہ لوگ آتے چلے گئے اور رشتہ داری کے بل پر یہاں کی معیشت میں شریک ہوتے رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مارشل لا سے پہلے ملازمتوں میں دھاندلی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ مقامی باشندوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کا احساس اسی سے پیدا ہوا۔ اسی کا ردِعمل وہ خطرناک رجحان تھا جسے علاقائیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس پر پہلی کاری ضرب پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبوں کی انتظامی شکل توڑ کر مغربی پاکستان کا صوبہ بنانے سے پڑی۔ اس طرح ملازمتوں کا وہ عدم توازن ایک حد تک جاتا رہا اور پسماندہ علاقوں کے باشندوں کے لیے بھی

---

[1] برصغیر کے مسلم اقلیتی علاقوں سے آنے والے مسلمانوں میں بیشتر ہمارے رائے میں، اس الزام سے بری الذمہ ہیں۔ ممکن ہے چند لوگ وہ ذہنیت رکھتے ہوں جس کی طرف فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے مگر ایسے لوگ مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ پارٹی بازی کا الزام کسی ایک طبقے پر نہیں لگایا جاسکتا ــــــ ادارہ

ترقی کے مواقع مہیا ہو گئے اور سماجی سطح پر وہ صوبائیت کے جراثیم بھی مجروح ہو گئے جو پاکستان کی سالمیت کے لئے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ مارشل لاء نے دوسری کاری ضرب لگائی اور اس طرح منفی رجحانات کا رستا عارضی طور پر بند ہو گیا اور موجودہ جنگ نے اسے اور بھی کمزور کر دیا ہے لیکن ملازمتوں کی سطح پر بے اطمینانی کا کوئی پائدار و مؤثر حل ابھی حکومت کے ذمے ہے اور بعض منفی اقدامات سے ممکن نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ایک طرف مقامی تعلیم یافتہ طبقے میں اعتماد پیدا کیا جائے اور انھیں ملازمتوں کے معاملے میں اس احساسِ کمتری سے نکالا جائے جو مارشل لاء سے قبل کی حکومتوں نے ان میں پیدا کر دیا ہے۔ اس وقت کہ پاکستان کی سالمیت مضبوط بنیادوں پر اٹھائی جا رہی ہے۔ ملازمتوں کے مسئلے کا آبرومندانہ حل یقیناً اس سالمیت کو زیادہ پائدار اور موثر کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

ملازمتوں کے مسئلے کے بعد دوسرا اہم مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری تھا۔ ایک مدت تک اس کا صحیح بندوبست نہیں ہو سکا۔ اس سے پہلے ملک کی سماجی زندگی میں کئی اخلاقی اور مذہبی برائیاں پیدا ہوئیں۔ کمزور حکومتوں کی پے در پے آمد و رفت نے اسے اور بھی مہلک بنا دیا۔ اس کے اثرات حصول پاکستان کے بعد کے دس برس کے ادب میں پوری طرح اُجاگر ہوئے ہیں۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ اب حل ہو چکا ہے اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل اور اختلافات اب قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد سے سماجی سطح پر بھی ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ ایک نیا متوسط طبقہ اُبھرا اور اقتصادی ترقی کے نئے جائز و ناجائز ذرائع دریافت کرنے لگا۔ اسمگلنگ کا روبار وسیع پیمانے پر ہوا۔ ابتدائی حکومتوں کے عدم استحکام، دنیاوی ترقی پر ضرورت سے زیادہ اصرار، برسرِاقتدار جماعتوں کی اخلاقی قدروں سے غفلت اور ملازمین کے طبقے پر غیر ملکی اثر و رسوخ نے سماجی زندگی میں بے مقصدیت اور انتشار کو ترقی دی ملازمت پیشہ افراد اور تجارت پیشہ اشخاص کے عام رویے کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں کئی خرابیاں واقع ہوئیں تا آنکہ مارشل لاء کے بعد سیاسی زندگی اور خارجہ پالیسی میں توازن اور اعتدال عود کر آیا۔ لیکن معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی سطح پر مختلف نظریات کا تصادم اور طبقات کی کشمکش زندگی کے ہر شعبے میں جاری رہی تا آنکہ موجودہ جنگ نے ان عناصر کی روک تھام کر دی اور پاکستان کو ایک نیا عزم، نیا حوصلہ اور نئی استقامت حاصل ہوئی۔

(۵)

حصول پاکستان سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے حالات کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں چند رجحان نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اردو ادب کے آئینے میں ان افکار و خیالات نے جو صورتیں دور رس نتائج کی علمبردار ہو سکتی ہیں، انھیں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) جن ترقی پسند ادیبوں کے بخشتے داں شاگرد یا دوست اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، ان کے قصور معاف ہو گئے اور وہ ملازموں کی ملک گیر برادری کا حصہ ہو گئے۔ یہ تبدیلی مارشل لاء سے قبل کے زمانے میں اقربا پروری کی لعنت سے ہوئی۔ اس کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ وہ لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے جو دس برس کی پاکستانی زندگی میں اپنے ماضی کو خیرباد کہہ کر جذباتی اور ذہنی طور پر پاکستان کے نظریے کو قبول کر چکے تھے۔ ان شعراء و ادباء کے یہاں ایک شدید احساسِ کمتری نمودار ہوا اور اس کا اظہار ان کی تحریروں میں مسلسل ہوتا رہا۔

(۲) اسلامی ادب اور اسلامی قدروں کی بحالی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کا احساس بھی بعض طبقوں میں ہوا۔ ان میں سے بعض طبقے ان اقدار کے خارجی روپ پر زیادہ اصرار کرتے رہے۔ سیاسی سطح پر یہ رجحان دینی ریاست اور دنیاوی ریاست کے تنازع

کی صورت میں ظاہر ہوا۔ غیر ملکی اثرات نے دنیاوی ریاست کے تصور کو اچھالا۔ ملک کے اندر اس احساس کو مزید تقویت قومیت کے قدیم تصور سے حاصل ہوئی۔ ہند دیومالا اور ارضی رشتوں کو زندگی کی بنیادی قدر ماننے کا خیال اس دنیاداری کے رجحان کو کئی دوسری سمتوں کی طرف لے گیا۔

(۳) اس کی کوکھ سے ایک طرف علاقائیت کا فتنہ اٹھا اور دوسری طرف ارضی رشتوں میں گم ہونے کا رجحان پیدا ہوا۔ مہاجر اور مقامی کی ملازمتوں میں سرد جنگ نے مارشل لا سے قبل کی سماجی اور ادبی زندگی میں بہت خلفشار پیدا کیا۔ علاقائیت اور علاقائی زبانوں سے محبت کے رجحانات اس کی واضح تصویریں ہیں۔ سماجی بے اطمینانی نے تصورات کی دنیا میں وسیع تر قومی تصورات کی جگہ محدود قسم کی جغرافیائی حدبندیوں کو جگہ دینی شروع کی۔ کلچر کی جگہ سب کلچر پر انتہا پسندانہ اصرار ادب میں ایک خوفناک جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔ صوبوں کے امتیاز مٹا دینے سے علاقائیت کے رجحان کو خاصا ضعف پہنچا۔ سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد یہ دیو مقامی کلچر، عوامی ناچوں، لوک گیتوں، لوک کہانیوں، علاقائی زبانوں، علاقائی رسم و رواج اور دیہاتی زندگی کی طرف لوٹنے پر منتج ہوا۔ قومی زبانوں اور علاقائی زبانوں کا تصادم بھی اس صورت حال کا نتیجہ تھا۔ ادیبوں کے وہ گروہ جو کے تصور معاف نہیں ہو سکتے تھے۔ اس طلسماتی فضا میں پھنس گئے۔ ادب میں اس رجحان کے آثار کئی روپ رکھتے ہیں۔

(۴) نسبتاً کم انتہا پسند ادبا کا گروہ جو قومیت کے اسلامی تصور کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کے نزدیک ماضی کے رشتے اہم تھے۔ یہ گروہ علاقائیت کی بجائے تاریخ کی مدد سے تمدنی قدروں کے ہفت خواں کو طے کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ ایک ہزار برس کی تاریخ اس موقف کی تردید کرتی ہو تو اسے اپنا ماضی محمد بن قاسم سے ابوظفر بہادر شاہ تک کے دور کو نظر انداز کر کے ہندو دور عروج اور قبل از تاریخ کی باقیات سے جوڑنا پڑتا ہے۔ قومی وراثت کے نام پر ہڑپا اور موہنجو داڑو اور ٹیکسلا کے حوالے سے ادیب باتیں کرنے لگے۔ یہ ماضی بھی ہند دیومالا اور ہندو رسم و رواج، بدھ مت اور اہنسا کے رشتوں سے ملا ہوا تھا۔ موہنجو داڑو جانے والے قافلے کاشی سے گزرنے لگے۔ ارضی رشتوں کی یہ تعبیر اس اہم سوال سے دوچار ہوئی کہ اگر ہمارا ماضی اور بھارت کا ماضی ایک ہے اور ہمارے تمدنی رشتے بھی یکساں قدر و قیمت رکھتے ہیں تو پھر پاکستان کے الگ وجود کی وجہ جواز کیا ہے۔ ہڑپا اور موہنجو داڑو اور ٹیکسلا کو ماضی کی تاریخ کا حصہ سمجھنے کی بجائے ان ادبا نے اسے حال کی چار دیواری میں زندہ کر کے دھرتی پوجا کا ایک ایسا خطرناک سبق دیا جو ہماری ملی جدوجہد کے مادو سال کو متزلزل کرنے کے لئے کافی تھا۔[1]

(۵) دوسری طرف ترقی پسند تحریک کی ناکامی کے بعد ادبا فکری طور پر مختلف گروہوں سے وابستہ ہو گئے۔ بعض نے زندگی اور ادب کے عام دھاروں سے کٹ کر فلمی دنیا میں پناہ لی۔ بعض نے اونچے طبقے کی معاشی لوٹ کھسوٹ میں شرکت کر کے شعر و ادب کو ترک کر دیا۔ بعض نے مقصدیت اور افادی قدروں کی بجائے داخلیت پسندی اور ابہام کے راستے شعر و شاعری کی دنیا آباد کی۔ بعض نے مغربی ممالک میں جاری ہونے والی تحریک کا سہارا لے کر بین الاقوامیت کا نعرہ لگایا۔ انسان دوستی، عدل، انصاف جیسے مجرد تصورات کو عمومیت کے پنجرے میں بند کیا۔ یہ "دین الٰہی" اور "صلح کل" کا مسلک اکبری تدبر کی معراج ہے۔ اور اس کی حقیقت کو موجودہ جنگ نے پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ دراصل یہاں بھی مذہب سے دامن بچا کر نکلنے کا رجحان کارفرما ہے۔

(۶) ادب میں مقصدیت اور افادی قدروں کے خلاف شعراء و ادبا کے ایک طبقے میں ردعمل یوں نمودار ہوا کہ انھوں نے حرف و صوت کے پیمانوں کو ادب کی اصل قدر قرار دیا اور زندگی کو داخلی پیمانوں سے ناپنے کی سعی کی۔ یہ طبقہ ادب کے جدید ترین رجحانات کا نقیب ہے۔

---

[1] شاید قومیت کو اسلامی تصور قبول کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ ہم اپنی بہت قدیم تاریخ اور اس دور کے کلچر پر ہمیشہ کے لئے خط تنسیخ کھینچ دیں۔ —— ادارہ

(۶)

اقتصادی زندگی میں عدم توازن نے ادب کو بھی بحران سے دوچار کر دیا۔ واضح مطمحِ نظر کی غیر موجودگی، معاشرے میں اخلاقی قدروں کی بے قدری، سماجی لوٹ کھسوٹ، نو دولتے طبقے کے وجود میں آنے سے پیدا شدہ سماجی برائیاں جہاں عام معاشرتی زندگی میں بر سرِ کار رہیں وہاں ادب بھی ان سے متاثر ہوتا رہا۔ دنیا داری اور دین داری کے تصادم میں ادیب کا دو دلا پن بھی ادب کو عجیب بحران سے دست آزما کر گیا۔ قدروں کی شکست و ریخت کے اس عمل میں اعلیٰ درجے کا ادب تو کیا پیدا ہوتا۔ ادب میں ریاضت، فن سے لگن جیسے ضمنی اور ذیلی مطالبات بھی انتشار کا شکار ہوئے۔ سہل انگاری، خارجی دنیا سے بے تعلقی، مسائل کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھنا، قومی اور ملی مفادات پر ذاتی اغراض کی برتری، ادیب بھی اسی سطح پر اُتر آئے جس پر اونچے طبقے کار بند تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی ادیب ایک بار پھر پاکستان کے عام باشندے اور اس کے احساسات سے کٹ گیا۔ اس کی دنیا یا تو خیالی تھی یا ذاتی اور شخصی۔ ان حالات میں پاکستان پر بھارت کا جارحانہ حملہ ہوا۔ بھارت کے اس اقدام نے زوال آمادہ ادیب کو خوابِ غفلت سے جگا دیا۔ وہ قومی وحدت جو سرکاری اداروں اور سماجی کارکنوں کی شبانہ روز محنت سے بھی پیدا نہ ہو سکی تھی، اس ایک ضرب سے پیدا ہو گئی۔ پاکستان بیدار ہو گیا۔ پاکستان کا ہر فرد احساسِ فرض سے آمادۂ عمل ہوا۔ ادیبوں اور شاعروں نے اس مرحلے پر اپنے فرض کو پہچان لیا۔ ریاست سے وفاداری کی ساری بحثیں مٹ گئیں اور ملی وحدت نے تمام افراد کو ایک مرکز پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ادیب اب اپنی شخصیت کے غلاف سے باہر جھانکنے لگے اور خارجی زندگی سے رشتہ استوار کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ زندگی کی داخلی تعبیروں کے مقابلے میں حقائق کی دنیا زیادہ واضح قطعی اور مثبت نتائج دعواقب کی حامل تھی۔ یہ سالمیت بیرونی ڈر اور خوف کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس کی تہہ میں حفظ و بقا اور مدافعت کے علاوہ حق و باطل کی کشمکش کا ادراک بھی تھا اور یہاں اس کا رشتہ مذہب کے ساتھ نہایت گہرا نظر آتا ہے۔

لاہور ریڈیو سٹیشن کی چار دیواری سے باہر احباب پروری کا دور ختم ہو گیا۔ تاجروں نے غلہ اندوزی اور گراں فروشی سے یکلخت دست کشی اختیار کر لی۔ افسروں نے فرض شناسی کو شعار بنایا۔ عوام نے حکومت کو اور حکومت نے عوام کو اپنا رفیق و ہمدرد پایا۔ معاشرے میں جو اضطراب کی رو چل رہی تھی اور بے مقصدیت نے جمود و بے حسی کی جو فضا قائم کر دی تھی یک لخت اس کی جگہ ایک جوش، ولولے، استقامت، فرض شناسی، باہمی ہمدردی، تعاون اور اعلیٰ مقاصد کی خاطر قربانی نے لے لی۔ بھارت کو حالات کی اس تبدیلی کا احساس نہ تھا۔ وہ ان حالات کو اپنے ملک کے حالات پر قیاس کرتے تھے۔ جب بھارتی فوجوں نے پاکستان کی سرحد عبور کی کے پیش قدمی کی تو ان کا خیال ہو گا کہ زوال و انتشار کے عناصر ان کے لیے ممد و مددگار ثابت ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نظریاتی مملکت کے وہ داخلی عناصر جن کے خلاف سیکولرازم کی تحریک چل رہی تھی ابھر کر سطح پر آ گئے۔ بھارت کی مکاری نے ملک گیر پیمانے پر اخلاقی قدروں کے بچاؤ کا سامان کر دیا۔ بھارت نے اچانک اور رات کی تاریکی میں پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ پاکستان کشمیر کے رہنے والے مظلوم انسانوں کے حقِ رائے دہی کا حامی تھا۔ دشمن نے نہ صرف اس جائز مطالبے سے پہلو تہی اختیار کر رکھی تھی بلکہ خود پاکستان پر اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دیا تھا۔ اخلاقی قدروں سے روگردانی کا یہ دوہرا الزام بھارت پر ہے۔ بھارت کی اخلاقی ناداری نے پاکستان میں اخلاقی قدروں کے احیا کا کام کیا۔ قومیت کا تصور جنگ میں مختلف آستانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا تھا۔ کبھی مغربی تصورِ قومیت، کبھی ٹھیٹ دنیاداری، کبھی علاقائیت، کبھی ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ

ن گران ادیبوں میں سے ایسے بھی تو ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے تو حالات کے تحت اپنے نقطۂ نظر کو صرف ملتوی کیا ہے بدلا نہیں ہے ـــــ "ادارہ"

دراثت کی نشان دہی ہورہی تھی لیکن آزمائش کی گھڑی آئی تو سارے فتنے خاموش ہوگئے۔ مذہب اور ملک، مذہب اور سیاست، مذہب اور اقتصادی نظام، مذہب اور عام معاشرتی زندگی میں ادبار کے لئے جو باہمی رشتے الجھ گئے تھے، وہ خود بخود سامنے آئے۔ قوم ایک Disillusionment سے دوچار ہوئی اور یہ Disillusionment اخلاقی قدروں کے حوالے سے ہوئی۔ ادیبوں اور شاعروں نے پاکستان کے عام باشندوں کے جذبات و احساسات کی تہہ میں کام کرنے والے عوامل کو پہچان لیا۔ اس سے وہ متحدہ قومیت کا تصور سامنے آیا جس کی تلاش و جستجو میں یہ معاشرہ بیس برس سے سرگرداں تھا۔ قومیت کا وہ تصور، جو جغرافیائی حدود سے نکل کر یکجہتی کی اقدار کی تلاش کشمیر کی وادی میں کرتا ہے، وہ تصور جو عالم اسلام سے اشتراک عمل کی داغ بیل ڈالتا ہے، وہ تصور جو چین کے ساتھ باہمی تعاون کی فضا بناتا ہے۔ وہ محدود جغرافیائی تصورات کا پابند نہیں ہوسکتا۔ اس کے رشتے آزادی کے سیکڑوں برس کی تگ و دو میں پیوست ہیں۔ یہاں جغرافیائی حدود محض مقامی تشخص کے لیے ہیں۔ وہ ایسی تصورات جن سے علاقائی عصبیت کا فتنہ اٹھ رہا تھا اپنی موت آپ مرگئے۔ قربانی و ایثار، انصاف پسندی اور دوسری اخلاقی اقدار نے اسلامی ضابطۂ حیات کے حوالے سے اپنا آپ دکھایا محض مجرد تصورات کی مدد سے کسی بین الاقوامی مکتبۂ فکر کی بنیاد نہیں رکھی۔ اس سے پاکستانی ادب میں فکر و نظر کی سطح پر ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے۔

(۷)

اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے ادب پاروں سے قطع نظر بھارت کے پاکستان پر حملے کے بعد سے اب تک نثر و نظم کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے چار پمفلٹ، بڑھے چلو مجاہدو، ایثار کا ہوا آغاز، لاہور کی گواہی اور آگ میں پھول، شائع ہوئے محکمۂ اطلاعات مغربی پاکستان نے قومی ترانے، انجمن ترقی ادب ماڈل ٹاؤن نے اذانِ کارزار، ملک منظور حسین منظور نے جہاد نامۂ پاک، میاں بشیر احمد نے پاکستان ہمارا ہے، قدرت اللہ باسط نے مجاہد بڑھے چلو، ادارۂ ایوانِ اردو نے کھیا تک جہاد و ترتیب زیادہ احمد کے علاوہ ریڈیو سے نشر ہونے والے ترانے اثر دہلوی اور فرخ رشید نے چار حصوں میں چھاپے۔ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے شعراء اور نثر نگاروں نے برابر کام کیا ہے۔ ان میں شاعروں کا پلہ بھاری رہا۔ مذکورہ کتابوں سے یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ نثر سے زیادہ نظم کو وسیلہ اظہار بنایا گیا۔ لاہور کی گواہی، اور آگ میں پھول، کے سوا سارے پمفلٹ اور کتابچے نظم میں ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت کا تعین کرنے سے پہلے اس کا اقرار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل اور افادی و اصلاحی مقاصد میں کوئی بیر نہیں ہے۔ فرق وہاں نمودار ہوتا ہے جہاں اصلاح اور پیغام فن کار کی جذباتی زندگی سے متعلق نہ رہیں یا وقتی تقتضیات ذہن و احساس کو ہم آہنگی کا موقع دینے کی بجائے صاحب فن کو اپنے خیالات کے فوری اظہار پر مجبور کردیں۔ موجودہ حالات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کم و بیش دونوں طرح کا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ ان تخلیقات میں اور جنگ سے پہلے کے ادبی رجحانات کے درمیان فکر و عمل کے کئی جداگانہ راستے اور کئی باہمی رشتے پائے جاتے ہیں۔

شعراء نے افکار کی محدود دنیا اور اپنی ذات کے تنگ حصار سے نکل کر پاکستان کے عام باشندوں کے طرزِ عمل کو جاننے کی کوشش کی۔ جنگ سے قبل کی انتہا پسندانہ انفرادیت پسندی کا بت پاش پاش ہوگیا۔ دھرتی پوجا اور سیکولرازم کے بادل بھی چھٹ گئے۔ اور شعرا و ادبا نے بیرونی زندگی سے ایک نئی سطح پر تعلق استوار کیا جب اپنی ذات سے نکل کر شعراء نے مشاہدہ کیا تو انھیں کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔

ہمارے شعراء جس دوراہے پر کھڑے ہیں اس میں انھیں بعض مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ اگر ہمارا اور بھارت کا ورثہ ایک تھا تو پاکستان کے حصول کی جدوجہد اور موجودہ تصادم کی اصل نوعیت کیا ہے؟ حب الوطن اور دینی افکار کے درمیان کیا تعلق ہے؟ علاقائی کلچر اور پاکستانی کلچر کا باہمی ربط کیا ہوسکتا ہے؟ پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک میں کیا فکری اور دینی اشتراک ہے؟ عدل و انصاف، انسان دوستی، نیکی اور سچائی کے

مجرد تصورات کا ہماری خارجی زندگی سے کیا ربط بنتا ہے؟ ان مسائل پر غور و فکر سے ادب کی آئندہ شاہراہوں کو منور ہونا ہے۔ اصلاحی اور مقصدی ادب کی ابتدائی دلچسپی تو فوری تقاضوں سے ہوتی ہے۔ ہمارے موجودہ ادب نے بھارت کے حملے کی مذمت، کشمیری مسلمانوں کے حقوق کی طرفداری، افواج پاکستان کو خراجِ عقیدت اور وطن کی حفاظت کے عزم کا اظہار کھل کر کیا ہے اور اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جذبات کی ترتیب و تہذیب اور زندگی کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلوں کا احساس ابھی پوری شدت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوا۔

بعض جگہ حب الوطنی کو مذہب سے جدا اور متضاد قرار دینے کا ہلکا ہلکا رجحان بھی موجود ہے۔ فکر و احساس کی یہ معمولی فروگذاشتیں، بہرحال رفتہ رفتہ دور ہوں گی اور ان کی اصل قدر و قیمت کا احساس اس وقت ہو گا جب ہمارے شاعر اور ادیب موجودہ مسائل کا رشتہ ملی زندگی کے مختلف دھاروں سے استوار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جب وہ مسائل کی تہہ میں پنہاں اصولوں اور ان کے دور تک جانے والے نتائج و عواقب کو اپنی گرفت میں لے لیں گے تو عظیم ادب تخلیق ہو گا۔

(۸)

جو ادب تخلیق ہوا ہے اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جس میں ہنگامی حالات و واقعات کو ان کے وقتی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ دوسرا وہ حصہ جس میں مذکورہ بالا مسائل کا حل تلاش کرنے کی تگ و دو کی گئی ہے اور افکار کا رشتہ ماضی سے بھی ڈھونڈا گیا ہے، موجودہ مسائل کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور مستقبل کے بارے میں بھی فکری یا جذباتی سطح پر رائے زنی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ادب کا زیادہ سرمایہ پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ اس دور میں شاعری پر زیادہ توجہ صرف ہوئی ہے اس لئے شعر کی بحث تک گفتگو کو محدود کر کے کہا جا سکتا ہے کہ ہنگامی ادب میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ فکری پہلو سے گریز، تجربات کی دور تک جاتی ہوئی شاخوں سے روگردانی اور تلازمات کے وسیع سلسلوں سے اجتناب کر کے جذبے کی شدت اور تندی کو خارجی واسطوں سے بیان کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس حالت میں نظمیں کبھی تو محض نیوز بلیٹن ہو جاتی ہیں اور کبھی آس پاس کے تجربات سے مانگے تانگے کا چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ خطابت کی اعلیٰ صلاحیتیں عام طور پر اردو ادب میں ہنگامی اور اصلاحی ادب سے خاص سمجھی جاتی ہیں حالانکہ عظیم اور اعلیٰ اقدار کا حامل ادب بھی ان ذرائع کو استعمال میں لا سکتا ہے اور اس کا آفاقی لب و لہجہ بھی خطابت سے کام لے سکتا ہے۔ سبب شاید یہ کہ خطابت کو اردو ادب میں زیادہ تر خطیبوں اور مقرروں نے برتا ہے یا اقبال کی شاعری کی نقل اتارنے والوں نے۔ شعر و ادب کی گاڑی اس حربے سے بچ بچا کر چلتی رہی ہے، لیکن جنگ وہ بڑا تجربہ تھا جس نے ادب کی ان مصنوعی حد بندیوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس دور میں ہنگامی اور دوامی دونوں طرح کے ادب میں خطابت کی لے نمایاں رہی۔

اپنے خول سے نکلنے کے بعد شعراء کے لئے بیرونی دنیا سے رابطے کا مسئلہ انھیں ایک نئے امکان سے دوچار کرتا ہے۔ اس سے قبل کبھی اتنے وسیع پیمانے پر اردو کے شعراء اور عوام کے درمیان جذبات کا اشتراک ممکن نہیں ہوا۔ یہ صورتِ حال شعراء کے لئے بالکل نئی اور یہ تجربہ بالکل انوکھا تھا۔ اس لئے نئی راہ پر قدموں کے ڈگمگانے کا ڈر بھی ہوا۔ اپنے تجربے پر بھروسا کرنے کی بجائے قوافی پر تکیہ کرنے، بندھی ٹکی تراکیب کا سہارا لینے، ایک دوسرے کے تجربات کو گرفت میں لینے، بیرونی سہاروں اور وسیلوں سے مصرعے گھڑنے اور ہر تجربے کو دوسرے تجربات سے گھل مل کر ایک ہو جانے کے رجحان سے بچنے کی شعوری اور غیر شعوری کوشش موجودہ ادب میں وافر مقدار میں موجود ہے۔ اسی لئے میں نے ادب کی اس نئی جہت کو "خوشگوار تبدیلی" کے نام سے یاد کیا ہے اور اسے منزل نہیں نشانِ منزل قرار دیا ہے۔

شاعری اچھی ہو یا بری اس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں پر ضرور ہوتا ہے۔ جذبے اور احساس سے خالی بات کو بھی اگر بار بار دہرانے

چلے جائیں تو وہ بھی عام ذہن کے لیے موثر ہو جاتی ہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے زیادہ تر نغمے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان سے قومی بیداری کا حق ادا ہوا۔ اس سے قوم میں جوش اور ولولہ پیدا ہوا لیکن ادبی لحاظ سے ان میں سے اکثر کی اثر پذیری مشکوک اور محل نظر ہے۔ ریڈیائی ادب کے بیشتر سرمایے کو پروپگنڈا شمار کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایسا کیوں ہوا جب کہ ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹوڈیوز سے باہر شعرا نے زیادہ جاندار اور اچھی شاعری کی، اس کا صحیح جواب تو ریڈیو والے ہی دے سکتے ہیں لیکن ریڈیائی ادب کے چار مجموعوں میں سے اچھی اور معیاری چیزیں صرف مندرجہ ذیل نکلتی ہیں:۔

(۱) خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام (رئیس امروہوی)
(۲) پاکستانی عساکر کے حضور ترانۂ عقیدت (احسان دانش)
(۳) اے وطن کے سجیلے جوانو میرے نغمے تمہارے لئے ہیں (جمیل الدین عالی)
(۴) اس سے روشنِ فلک ہے زمینِ وطن (صوفی تبسم)
(۵) ضمیرِ جہاں جاگ (ایس۔ اے۔ رحمٰن)

اخبارات اور رسائل کی وسیع دنیا میں یونیورسٹی میگزین "محور" کا جہاد نمبر اپنے دامن میں اچھا بُرا سبھی طرح کا مواد رکھتا ہے۔ ہفت روزہ "چٹان" ہفت روزہ لاہور، ہفت روزہ "قندیل" میں بعض عمدہ چیزیں شائع ہوئیں۔ روزناموں میں چھپنے والی نظموں کا تو کچھ شمار نہیں۔ کتابوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ البتہ چند اچھی نظموں کی نشان دہی ضروری ہے۔ یہ نظمیں دونوں قسم کی شاعری کو محیط ہیں یعنی ہنگامی حالات والی شاعری اور اعلیٰ اقدار کے طول طویل رشتوں والی شاعری:

(۱) چھ ستمبر	احمد ندیم قاسمی	"محور" جہاد نمبر	(۱۴) میرا شہر	انیس ناگی	قلم کے سپاہی
(۲) بنامِ عدو	نعیم صدیقی	"نیارہ" لاہور	(۱۵) وہ رہ کے بیچ رہا ہے گجر جاگتے رہو	رضوی خیرآبادی	"
(۳) خیر مقدم	جیلانی کامران	حلقۂ اربابِ ذوق	(۱۶) آگاہی	جعفر شیرازی	"
(۴) سپاہی	مجید امجد	"فردا" عسکری	(۱۷) ہمارا رجز	ثاقب زیروی	"
(۵) وطن پہ سلام	منیر نیازی	قومی ترانے	(۱۸) رشتۂ جام و سبو	مصطفےٰ زیدی	یلغار کا ہوا آغاز
(۶) اسم اعظم	عارف عبدالمتین	گلبانگِ جہاد	(۱۹) خاک و خوں کا مجاہد	افتخار جالب	"
(۷) لہو	حمایت علی شاعر	"	(۲۰) شہید	سرمد صہبائی	"
(۸) اے پاک وطن	اختر اقبال کمالی	"	(۲۱) جینے کے لئے موت	الطاف احمد قریشی	"
(۹) افواج کو سلام	شورش کاشمیری	"چٹان"	(۲۲) لاہور	زاہد فارانی	"
(۱۰) رو یکہ گام	ادا جعفری	تیرے جاں نثاروں کو سلام	(۲۳) حیات و موت کی ٹھنڈی ہوا سے جاگ گی	سجاد باقر رضوی	بڑھے چلو مجاہدو
(۱۱) سیالکوٹ کی فصیل	صفدر میر	"	(۲۴) چھ ستمبر	قتیل شفائی	چھ ستمبر کے تاثرات
(۱۲) قیامت کی دھوپ	سید عابد علی	قلم کے سپاہی	(۲۵) چھ ستمبر	اختر احسن	"
(۱۳) جنگ کے احسان	حسین خاہد	"			

ان نظموں کو بغور دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تعداد ان نظموں کی ہے جو نظم آزاد کی ذیل میں آتی ہیں۔ سبب شاید یہ ہے کہ بیرونی سہارے کی ضرورت کا احساس پابند شعرا کو زیادہ تر قافیے اور تراکیب کی طرف لے گیا ہے۔ خطابت کے چلتے ہوئے ذرائع بھی بعض اوقات دامنگیر ہوئے ہیں۔ شعرا کو ان اوگھٹ گھاٹیوں میں ٹھوکریں بھی کھانی پڑیں۔ چند مجروحین کی سرگذشت سنیے :۔

اقبال

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی

(اقبال)

روش روش چمن چمن بڑھے چلو
مجاہدینِ صف شکن بڑھے چلو

(احسان دانش)

مستعار لینے والے

ڈٹ جاؤ شیرو سیسہ پلائی دیوار بن کر
اللہ اکبر اللہ اکبر

(انجم رومانی)

تم مردِ میدان تم جانِ لشکر
اللہ اکبر اللہ اکبر

(احسان دانش)

تمہارے دم قدم سے ہیں دلاورانِ تیغ زن
بہادرانِ صف شکن بزن بزن بزن بزن

(شفیق کوٹی)

مجاہدو اٹھو چلو بڑھو کہ منزل آگئی

(اختر جالندھری)

بڑھو بڑھو دلاورو ستم کی تیغ توڑ دو
عدو کی گردنوں کو اب پکڑ کے تم مروڑ دو

(حسن بخت)

جنگاہ میں وہ تیرے جیالوں کا بانکپن
کتنے جری ہیں تیرے جوانانِ صف شکن

(طاہر شادانی)

بڑھے چلو مجاہدو اجل بدوش ساتھیو!

(شاعرہ وحید)

اے فخرِ قوم و نازشِ ملت بڑھے چلو
بے خوف زیرِ سایۂ رحمت بڑھے چلو

قائم تمہارے دم سے ہے آزادیٔ وطن
ہمت رہے بلند جوانانِ صف شکن

محسن بھوپالی

صف شکن زور آورو آگے بڑھو آگے بڑھو
چھڑ گئی دشمن سے جنگ اے قاہرو آگے بڑھو

(عبدالرشید مبسم)

یہ زندگی کی بات کیا
حیات کیا ثبات کیا
بڑھے چلو بڑھے چلو مجاہدو!

(عاطر ہاشمی)

بڑھے چلو بڑھے چلو دلاورو مجاہدو
محاذِ کفر توڑ دو
ستم کے رخ کو موڑ دو
سرِ عدو کو پھوڑ دو

(حبیب سبحانی)

مجاہدانِ تیغ زن بہادرانِ صف شکن
بڑھے چلو بڑھے چلو

(ملک منظور حسین منظور)

صف شکن مجاہدو، بڑھے چلو، بڑھے چلو کی یہ گردان شعرا نے اس لیے اختیار کی ہے کہ انھیں اپنے احساسات پر کامل بھروسا نہیں۔ اپنے جذبے اور احساس کے بارے میں وہ ولازمیاں نظموں کی کمزوری کا سبب ہو گیا ہے۔ خارجی سہاروں کی تلاش ایک دوسرے سے مستعار خیالات کی صورت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس کی ایک دو نہیں بہت سی مثالیں ان کتابچوں میں مل جائیں گی۔ اس کے علاوہ دوسرے شعراء کے مصرعوں کی گونج بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

(اقبال)

کھول آنکھ ذرا ہوش میں آ رنگِ فضا دیکھ
جنگاہ میں ہر سمت قیامت سی بپا دیکھ

(آسی ضیائی)

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

(حالی)

اے سرورِ کونینؐ شہِ ارض و سما دیکھ
امت پہ تری آج ہے کیا وقت پڑا دیکھ

(خلیق قریشی)

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے

(اختر شیرانی)

جنت سے حسین ہیں ترے پرکیف نظارے
عظمت کا نشاں ہیں یہ ترے چاند ستارے

(قمر صدیقی)

جاؤ بھارت کے خونی لیڈرو
اپنے آقاؤں سے جا کے کہدو
یہ لاہور ہے۔ گیدڑو
شیر ہشیار ہے

رات گمبھیر اور تیرہ و تار ہے
قوم بیدار ہے

(اکرم طاہر)

(محمد صفدر)

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

(اقبال)

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جائیں گے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جائیں گے

(حبیب اللہ اوج)

[کلامِ اقبال کی گونج]

یہ ہواؤں کے مسافر یہ سمندروں کے راہی
مرے سربکف مجاہد مرے صف شکن سپاہی

(تبسم)

کبھی کبھی شعرا نے یہ خارجی سہارا مقبول عام فلمی گانوں یا معروف و مقبول دیہاتی گیتوں سے بھی لیا ہے۔ پنجابی ادب کی بعض تخلیقات انھیں بیساکھیوں کے سہارے چلائی گئی ہیں۔ صوفی تبسم کی "کرنیل نی جرنیل نی"، "میریا ڈھول سپاہیا" دیہاتی سرچشمے سے فیض حاصل کرتی ہیں اور ان میں اور دیہاتی گیتوں میں ایک اور مشترک قدر بھی ہے اور وہ ایک غیر عسکری جذبے کا اظہار ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تیرے قدموں کو دا دی میرے جہیاں لکھاں
میریا ڈھول سپاہیا
جناں راہواں نوں جاویں جناں راہواں توں آویں
اوہناں راہواں دی مٹی چمن میریاں اکھاں
میریا ڈھول سپاہیا
گھر آیا دل دا جانی ہو گئی میری شام سہانی
مینوں چڑھیاں خوشیاں رنگ لال ہوئے کدی پیلا
او ماہی رنگ رنگیلا کرنیل نی جرنیل نی

مجاہد کے بارے میں اس طرح کا نقطۂ نظر کسی طرح بھی حقیقت پسندانہ نہیں ہو سکتا اور اس کا سبب مشاہدے کی کمی ہے جس کی تلافی بآسانی ممکن تھی مگر وہ شاعری ہی ہے جس کا مسئلہ محض مستعار لینے، لفظوں کا کرتب دکھانے کا نہیں۔ اس میں بعض اوقات کہنے والے کے احساسات اور وقتی ضرورت کی مجبوری سے بھی افتراق و انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ عقلی سطح پر انسان ایک حل کو قبول کر سکتا ہے لیکن جذباتی ہم آہنگی کی نوبت نہیں آتی۔ اس سے شاعری بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ پاکستان پر بھارت کے حملے نے عوام کے احساسات و جذبات کو مذہبی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے اور پاکستان کا عام فرد اس جنگ کو جہاد قرار دیتا ہے اور اس سے اخلاقی قدروں کو متعلق کرتا ہے۔ شاعر اگر اس مذہبی بنیاد سے کنارہ کش ہے اور ان کا اظہار محض فرض پورا کرنے کے لیے کرتا ہے تو اس کی شاعری بے اثر ہوگی۔ بات اپنے اپنے جذباتی رویے اور اس کے مخلصانہ اظہار

کی ہے۔ یہ دیانت داری ہر ادبی کارگزاری کی بنیاد ہے اور جہاں منافقت اس کی جگہ لے لے وہاں فن رخصت ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ شعبدہ گری کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہو تو نظم اور نیوز بلیٹن میں کوئی فرق نہیں رہتا:

پلا ساقیا بادۂ لالہ فام — کہ شمشیر اپنی ہوئی بے نیام
نکل آئیں فوجیں بھی میدان میں — ہے قوت بہت ان کے ایمان میں
اُڑے ہیں فضا میں ہوائی جہاز — ہمیں جن پہ ہے فخر جن پر ہے ناز
بڑھے مثلِ شاہیں عدو کی طرف — نئے عزم کے ساتھ اور سر بکف
ہوئے ان کے سینوں میں دل ناصبور — "ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور"
سمندر میں نیوی نکل آئی ہے — نگاہوں میں اک برق لہرائی ہے
ہیں جوئے کہستاں یہ فوجیں نہیں — یہ پایاب دریا کی موجیں نہیں
"چلیں جب تو سل چیر دیتی ہیں یہ" — "پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہیں یہ"
پلا ساقیا خونِ دشمن کی مے — کئی منزلیں مجھ کو کرنی ہیں طے
ابھی راہ میں ہیں کئی مرحلے — دھواں سا ہے کچھ سرحدوں سے پرے
اُٹھا اس قرینے سے تلوار کو — نہ بھولے جہاں اپنی یلغار کو
ابھی جنگ جاری ہے میدان میں — ابھی جی میں آئی اُلٹ دیں صفیں
خدا بخش دے ہم کو فتح و ظفر — نکلتے ہیں شعلے اِدھر اور اُدھر

(شہزاد احمد)

اس نظم میں جن جذبات کا اظہار ہے وہ اپنی جگہ صحیح اور قابل قدر ہیں لیکن نہ تو اقبال کے اشعار کی برکت ان مردوں کو زندہ کر سکی اور نہ بحر کی روانی مقلبوں کے تن ڈھانپنے کا موجب ہوئی ہے۔ جذبے اور شاعر کے درمیان جو خلا ہے وہی نظم کی بالیدگی میں رکاوٹ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہاں شاعر کا دل اس کے دماغ کا ساتھ نہیں دے رہا[1]

مجھے انکار وصل غیر پر کیوں کر نہ شک گزرے — زباں کچھ اور بے پیرہن کچھ اور کہتی ہے

(محمد علی جوہر)

میں نے یہ پہلے عرض کیا تھا کہ جس وقت مسائل کی تہہ میں پنہاں اصولوں اور ان کے دور تک جانے والے نتائج و عواقب کو شعراء اپنی گرفت میں لے لیں گے اس وقت عظیم ادب تخلیق ہو گا، ابھی تو محض ایک خوشگوار تبدیلی کا آغاز ہوا ہے

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

---

[1] فاضل مصنف کی خدمت میں بڑے ادب سے گزارش ہے کہ ہماری رائے میں اس نظم سے متعلق دل و دماغ کے اختلاف کا جھگڑا پیدا نہیں ہوتا بلکہ جب روزانہ دو ایک نظمیں لکھنے کا فرض اپنے اوپر عاید کر لیا جائے تو عجلت کے سبب نظم بے کیف رہ جاتی ہے اور بے کیفی کی واحد وجہ اظہار کی خامی ہوتی ہے۔ شاعر کا خلوص کہیں بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرتا! ——— ادارہ

انتظار حسین

ادب، جنگ کے بعد

داگہ وہ مقام ہے جہاں عہد تمام ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں۔ اب سے اٹھارہ برس پہلے اس مقام پر ایک عہد تمام ہوا تھا اور ایک عہد نے ظہور کیا تھا۔ اب اسی مقام پر وقت پھر برجِ گل سے گزرا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک عہد نے دم توڑا اور ایک عہد نے جنم لیا۔

زمانہ زمین سے رشتہ پیدا کر کے بدلتا ہے۔ زمین بہت پرانی ہے مگر انسانی وارداتوں کے اثر میں آ کر وہ بار بار قالب بدلتی ہے اور نئی حقیقت بن جاتی ہے اور اٹھارہ برس سے ہمارے لئے یہ مسئلہ چلا آ رہا تھا کہ اس نئی حقیقت کو جسے پاکستان کہتے ہیں، کیسے ورک کریں، کیسے اسے اپنے شعور کے دائرے میں لائیں۔ شاید واردات بڑی تھی اور ہم چھوٹے تھے، ہم اس میں کھو سے گئے تھے۔ پاکستان کی صورت میں زمین سے جو ہماری نئی رشتہ داری قائم ہوئی تھی، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور آخر آدمی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ مٹی سے اپنا رشتہ اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے خود اپنی ذات، اپنی سمجھ سے باہر نظر آتی ہے۔ اس صورت حال نے چند نئے سوالات کو جنم دیا۔ ہم کیا ہیں؟ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ زمین سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ پاکستان سے پہلے کے دور میں ہم معاشرتی اور سیاسی مسائل سے نبرد آزما تھے۔ انھیں مسائل نے ہمارے ادب میں رجحانات کا تعین کیا تھا۔ پاکستان میں ہم معاشرتی اور سیاسی مسائل سے تو خیر نبرد آزما تھے ہی، مگر اس سامنے میں کچھ روحانی سوالات سے بھی دوچار ہو گئے۔ ہمارے ادب میں نئے رجحانات ان روحانی سوالات کا نتیجہ تھے۔ ایک طور سے دیکھئے تو وہ سارا ادب جو ان نئے رجحانات کے تحت پیدا ہوا اور جسے اس عہد کا نمائندہ ادب کہنا چاہیئے، ذات کی تلاش ہے۔ مگر ذات اور زمین میں وہ پراسرار طاقتیں ہیں جو کسی واردات سے گزرے بغیر شعور کی گرفت میں نہیں آتیں۔

اس سرزمین پاک و ہند کا نقشہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں بدلا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم کر کے ہم زمین پر وارد ہوئے تھے۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو یہ زمین ہم پر وارد ہوئی۔ جب زمین کے چپہ چپہ کے لئے جانیں نذر کرنی پڑیں، جب سرحدوں کی مٹی غازیوں کے سانس میں رچ گئی، جب جنگل شہیدوں کی خوشبو سے بس گئے، تب یہ زمین ہمارے لئے روحانی واردات بنی، ہمارے سینوں میں منکشف ہوئی، ہم پر نازل ہوئی۔

یہ روحانی واردات احساسِ تحیر لئے ہوئے ہے۔ حیرت بھرے سوالوں نے ہمیں گھیرا ہے۔ کیا یہ زمین مادے سے بڑھ کر کوئی روحانی حقیقت ہے؟ کیا اس زمین سے ہمارا رشتہ اتنا گہرا اور اتنا سچا تھا؟ کیا یہ غازی، یہ پراسرار بندے اپنے اندر اتنا طوفان لئے بیٹھے تھے؟ کیا یہ ہم میں سے ہیں؟ کیا یہ ہم ہیں؟ ہم مٹھی بھر بے آسرا لوگ ہیں جنھوں نے آگ اگلتے آہن میں ڈوبے صف بصف لشکروں کو الٹ دیا؟ کیا یہ سب ہمارا لہو ہے جس نے اس سرے سے اس سرے تک سرحدوں کی مٹی کو مہکتا ہوا گلشن بنا دیا ہے؟ ہمارے اندر اتنا خون تھا؟ اپنی دریافت ایک حیرت بھرا واقعہ ہے۔ ہم مقامِ حیرت میں ہیں۔ اور توجیہیں اور تفسیریں کر کے اس حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اپنے خواب سناتے ہیں، اپنے اپنے مشاہدے بیان کرتے ہیں۔ کسی نے آنحضرت صلعم

کو خواب میں دیکھا ہے کسی نے حضرت علی کو سفید گھوڑے پر سوار، سر پہ عمامہ باندھے، ہاتھ میں تلوار لئے میدان جنگ کی طرف جاتے دیکھا ہے، کسی نے کسی سفید پوش بزرگ کو بم کے گولے لپکتے اور راوی میں غرق کرتے دیکھا ہے۔ ہمارے اندر سوئے ہوئے منظر جاگ رہے ہیں۔ یہ ہمارے عرفان کے ظہور کا وقت ہے۔

یہ عظیم روحانی واردات ہمیں کس منزل پر لے جائے گی، یہ ہم ابھی کیسے جانیں۔ واردات ابھی جاری ہے۔ ہم اس کے وسط میں کھڑے ہیں۔ اس کے اور چھور کا اندازہ ہمیں نہیں ہے۔ اس وقت اہم وہ ہے جو ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے۔ ادب کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس وقت اولین حیثیت سپاہی کی ہے۔ تخلیقی سرگرمی اس وقت وہ کر رہا ہے۔ اس نے اس عہد کی رزمیہ اپنے خون سے لکھی ہے۔ ادیب کا کام اس وقت صرف اتنا ہے کہ وہ سپاہی کو سہارا دے اور اس تخلیقی سرگرمی کو تقویت پہنچائے۔ ادیب عام حالات میں خود مختار ہوتا ہے۔ کم از کم میں اسی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو وابستہ جانتا ہوں جس کے تحت ادیب اپنے قاری یا کسی ادارے کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جس انسانی تجربے، جس واردات سے وہ تخلیقی سطح پر دوچار ہے کیا اس نے اس کی ساری پیچیدگیوں اور گہرائیوں کے ساتھ اظہار کر دیا ہے اور اس کی تفسیر کر دی ہے۔ یہ اظہار اور یہ تفسیر قاری تک پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی، اس کے لئے قابل قبول ہے یا قابل قبول نہیں ہے، یہ لکھنے والے کا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن یہ وہ وقت ہے جب ہم نے اپنے انداز نظر کو ملتوی کر دیا ہے۔ جب زندہ رہنے نہ رہنے کا مسئلہ ادب کے مسئلہ سے زیادہ اہم بن جائے تو ادب کی خود مختاری کو معطل کر دینا چاہئے۔ اب تحریر کے اچھے اور برے کا معیار ایک ہے کہ جو لفظ لکھا گیا ہے وہ عام معنوں میں موثر ہے۔ کیا وہ اس عام آدمی تک پہنچتا ہے اور اس پر اثر کرتا ہے۔ جو زبان و بیان کی باریکیوں کو اور ادب کے علائم و رموز کو کچھ زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس سرگرمی میں تحریر ادب بنتی ہے یا نہیں بنتی، یہ ادیب کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ کوئی تحریر ادب بن جائے تو یہ اس کی قسمت ہے۔

ممکن ہے بعض دانشوروں کو لکھنے لکھانے کی یہ سرگرمی محض ہنگامی مقصد پورا کرتی نظر آئے، مگر شاید یہ سرگرمی فوری قومی مقاصد پورا کرنے کے علاوہ ایک پائیدار ادبی مفہوم بھی رکھتی ہے۔ جو لکھنے والے اس سرگرمی میں مصروف ہیں، جو لکھنے والے محاذ پر جا کر سپاہیوں سے مل چکے ہیں کیمپوں میں جا کر مہاجروں سے دکھ درد سن رہے ہیں، اور امدادی مرکزوں میں گھوم پھر کر چندہ دینے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کے امڈے ہوئے سیلاب کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ بالواسطہ طور پر اس عہد کی واردات سے آشنا ہوتے ہوئے اسے اپنے شعور کے دائرے میں لانے کے لئے غیر شعوری طور پر مصروف ہیں۔ یہ بات آئندہ کے ادب کے لئے ایک معنی رکھتی ہے۔ اس واردات کو سپاہیوں نے جنم دیا ہے۔ مگر جب جنگ منزل مقصد پر پہنچ کر ختم ہو گی اور سپاہی مورچوں سے چھاؤنیوں میں واپس جائیں گے تو پھر بار امانت ادیبوں کو سنبھالنا ہو گا۔ آگے چل کر ہی سہی، مگر بہرحال اس واردات کا مفسر تو ادیب ہی کو بننا ہے۔

آگے چل کر ادب کیا شکل اختیار کرے گا، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس واردات کو ہماری قوم کس طرح قبول کرتی ہے اور کس طرح اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ شاید اس درد کے عمل سے کوئی نئی بصیرت جنم لے، زندگی میں بھی اور ادب میں بھی، مگر کیا کہا جا سکتا ہے۔ پیش گوئی موسم کے متعلق آسانی سے کی جا سکتی ہے، ادب کے متعلق نہیں کی جا سکتی۔ ویسے ایک بات ہے، ہم تبدیلی کے ایک عمل کی زد میں تو آ گئے ہیں۔ یہ عمل ہمارے باہر بھی جاری ہے اور ہمارے اندر بھی جاری ہے۔ جب تک جنگ ختم ہو گی اس وقت تک شاید ہم بہت بدل چکے ہوں گے، ہمارا گردو پیش بدل چکا ہو گا۔ اطمینان کی نئی صورتیں ہوں گی اور نئی بے اطمینانیاں ہوں گی۔ دو نئے غم اور نئی مشکلیں ہوں گی جو ہر بڑی واردات اپنی نشانی کے طور پر پیچھے چھوڑ جایا کرتی ہے اور پھر اس دکھ درد کے عمل سے گزر کر ہمارے احساسات و جذبات کی شکل کتنی بدل چکی ہو گی۔ شاید اس سب کے گھال میل سے کوئی نیا طرز احساس جنم لے۔ اس وقت ہر اس لکھنے والے کے لئے، جو اپنے عہد میں زندہ رہنا چاہتا ہے، یہ کڑا سوال ہو گا کہ اسی طرز احساس کو کس طور پر گرفت کیا جائے اور کس طور پر عہد کی روح تک رسائی حاصل کی جائے۔ اس طور شاید کل کا ادب، کل تک کے ادب سے بہت مختلف ہو۔

محمد خالد اختر

کیانی کے پریشان افکار

آج کل "عظیم" کا لفظ کثرتِ استعمال سے بہت حقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے اپنے سب معنی کھو دیئے ہیں۔ اس بابرکت ملک میں ہم یہ لفظ ہر کہ ومہ کے ساتھ چسپاں کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ عظیم رہنما، عظیم فنکار، عظیم شاعر، عظیم عالم۔ اگر اس لفظ کے کچھ معنی باقی ہیں تو میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رستم کیانی مرحوم ایک عظیم انسان تھا۔ اس کی موت نے فی الواقع ہمیں مفلس کر دیا اور ہم اس کا ثانی شاید پھر نہ دیکھیں گے۔ ایک تھوڑی سی مدت میں اپنی چند چلبلی باتوں سے اس نے ہزاروں کا دل موہ لیا۔ اس نے ہمیں ایسے وقت ہنسایا جب ہم ہنسنا تقریباً بھول چکے تھے۔ وہ ہمیشہ کڑوی سچی بات برملا کہتا تھا اور ہم آستینوں میں ہنستے ہوئے اُسے داد دیتے تھے۔ اس نے ایسی باتیں کہیں جو کوئی اور نہ کہہ سکتا تھا اور اگر کوئی اور وہی باتیں کہتا، تو وہ ہمیں شاید بے حد ناگوار گذرتیں اور ہم انہیں نہ سنتے۔ اس کی باتیں نہ صرف یہ کہ ہمیں ہنساتی تھیں بلکہ وہ ہمارے دلوں کو گرماتی بھی تھیں اور جا رج آرویل کی اس نامٹینی ایٹی فور" دنیا میں ہم یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ ہمارا ایک رفیق اور ساتھی ہے۔ انجیل کے الفاظ میں وہ ہمارا خون کا خون اور گوشت کا گوشت ہے اور یہ کہ ہم تاریک راستوں پر اکیلے نہیں۔ اس میں ایک ایریل کی رُوح تھی ——

اس کی تصویر کو دیکھو، ایک دبلا نحیف آدمی، پچکا ہوا نزار چہرہ۔ سر پر گھنے بالوں کا گچھا اور بڑے مارکس برادرز کی مونچھیں، مگر آنکھوں میں کتنی بلا کی تیزی، شوخی اور ذہانت ہے۔ یہ ایک پیدائشی ظریف الطبع شخص کا چہرہ ہے۔ میں نے رستم کیانی کو کبھی اصلی زندگی میں نہیں دیکھا، اگرچہ ٹ۔ اور میں اکثر اس سے ملنے اور اسے ایک پیارے بھائی کی طرح سینے سے لگانے کے منصوبے بناتے رہتے، مگر اپنی تصویر میں وہ مجھے کچھ کچھ امریکی مزاح نگار مارک ٹوین کی یاد دلاتا ہے۔ اپنے مزاج کے مزاح و رنگ میں بھی دونوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے" ان ٹسنٹس ایبراڈ" کے ٹوین کی ساری شوخی، ظرافت اور معصوم شرارت، کیانی کی تقریروں میں موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض لحاظ سے وہ اپنے بے مثل پیشرو سے بہتر تھا۔ مگر ٹوین کی خوش بختی یہ تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوا، پیشہ ور مصنف بنا اور اس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکیں۔ بے چارا رستم کیانی اس ملک میں پیدا ہوا جہاں کتابوں سے کوئی اپنی گذر نہیں کر سکتا آخر میں اسے جج کا چغہ اور بالوں والی ٹوپی پہننی پڑی اور جج کی کرسی پر بیٹھنا پڑا لیکن اپنے اونچے منصب کی متانت اور تحمل بھی اس کی ایریل کی سی نہ دبنے والی شوخی کو نہ کچل سکے۔ وہ تقریریں کرتا تھا اور جو کچھ کہنا چاہتا تھا ایک خوبصورت طریقے سے کہہ جاتا تھا۔ اب کیا کسی نے ایک جج کو خود اپنے اوپر ہنستے ہوئے سنا ہے؟ جج اتنے متین اور سنجیدہ اور مدبر ہوتے ہیں اور جب ایک آدمی اس منصب کی خلعت اوڑھ کے بیٹھتا ہے تو اسے ایسا ہونا ہی پڑتا ہے مگر رستم کیانی ہر حال میں رستم کیانی ہی رہا۔ اس کی فطرت اتنی آزاد اور کھلی تھی کہ وہ اس سانچے میں نہ ڈھلا۔ وہ بحیثیت ایک جج بڑا قابل اور فرض شناس تھا —— شاید ان لائق ترین ججوں میں سے ایک جو ہائی کورٹ کے بنچ پر بیٹھے ہیں۔ مگر اس نے اپنی انسانیت کو کبھی نہ کھویا۔ وہ دوسروں کے [illegible] پر ہنس سکتا تھا کیونکہ وہ خود اپنے آپ پر ہنستا تھا۔ وہ اپنے دل میں ایک سپنا لئے رہا کہ جج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے آبائی مکان میں آرام کرے گا اور گلابی

کو پیوند لگایا کرے گا، اور جب کوئی اسے کسی تقریب میں مدعو کرنے آئے گا تو وہ اس کی باتیں سن کر نلکے کے پاس جا کر ایک چینی فلسفی کی طرح اپنے کان دھو ڈالے گا۔۔۔۔۔ اگر وہ امریکہ میں پیدا ہوتا تو دوسرا مارک ٹوین ہوتا (امریکہ والوں کو بھی اس وقت دوسرے مارک ٹوین کی ضرورت ہے) وہ بالوں والی ٹوپی اور رنگین فیتوں والا چغہ نہ پہنتا اور تقریریں نہ کرتا۔ وہ ایک مزاح نگار ہوتا اور بہت سی کتابیں لکھتا۔ رستم کیانی ایک جینیئس تھا۔ مزاح اور طنز میں بجھی ہوئی ایسی تقریریں ایک جینیئس ہی کر سکتا ہے اور اس کا جینیئس (مجھے یقین ہے) مارک ٹوین یا برنارڈ شا کے پائے کا تھا۔ ایک ہی بھٹی میں تپا ہوا اور جوہر دیا ہوا۔

اس کی تقریروں کو کہیں سے پڑھ لو، وہ ایک بڑا کامیڈین ہے۔ چلبلا، شوخ و شنگ، ظریف۔ ان کو اب چھپی ہوئی صورت میں پڑھتے ہوئے آدمی ان میں تسلسل نہیں پاتا۔ اور وہ ایک میوزک ہال آرٹسٹ کی پُرلطف پرفارمنس لگتی ہیں۔ ہم میں سے بعض کو شاید وہ بہکی ہوئی اور بے ربط معلوم ہوں۔ مگر اس بے ربطی میں بھی ہیملٹ کی دیوانگی کا سا ایک مقصد ہے۔ ہر فقرے میں ایک حرارت ہے اور ہر فقرہ اپنے اندر ایک بھالے کی تیزانی لئے ہوئے ہے۔ اس کی ظرافت ایک وسیع آتش بازی کے تماشے کی طرح ہے ——— پھلجھڑیوں کے شرارے کبھی ہماری سماجی زندگی کے ایک پہلو پر جھڑتے ہیں اور دوسرے لمحے کسی اور پہلو یا شعبے پر برستے ہیں۔ آٹھ دس فقروں میں بھی وہ ہمیں ننگا کر دیتا ہے۔ اور ہمارے قومی اور سماجی ڈھانچے کے کھوکھلے پن اور ریاکاری کو بے پردہ دکھا دیتا ہے۔ ہم ہنستے ہیں لیکن کچھ احساسِ جرم اور شرمندگی کے کرب کے ساتھ۔ ہم اپنے دلوں میں جھانکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ رستم کیانی ایک تباہ کن ظرافت کا مالک کامیڈین ضرور تھا لیکن سب سچے کامیڈینوں کی طرح وہ اپنے دل میں ایک ٹریجیڈین تھا۔ زندگی کے غم و الم اور اس کے اندوہ سے بے حد آشنا۔ اس کے سب مذاق ایک سلجھے ہوئے دردمند دل سے نکلے ہوئے ہیں، ہر ایک پر گہری فکر کا سایہ ہے۔ ایک نیزے کے ڈنکیلے پھل کی سی چبھن۔ میں دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مجھے ان تقریروں کو دوبارہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے کہ اس کے قہقہوں کے پیچھے آنسو رُکے ہوئے ہیں اور اس بڑے کامیڈین کا دل بڑا ہی سنجیدہ تھا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے، حقیقتاً ہنسنے کی بات نہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور ہمیشہ دعوت دینے والوں کو جتا دیتا تھا کہ اسے ان قومی اور سماجی تقریبوں میں صدارت کے لئے اس لئے مدعو کیا جاتا ہے کہ وہ چیف جسٹس ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ رستم کیانی ہے۔ وہ یہ بڑے شگفتہ اور شرارت بھرے طریقے سے کہتا اور ہر کوئی ہنستا، مگر ان تقریبات کے سیکرٹری ضرور اس کی بات کی حقیقت سے اپنی کرسیوں میں بے آرام ہوتے ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کیانی چیف جسٹس ایم آر کیانی نہ ہوتا بلکہ محض کوئی رستم کیانی ہوتا تو اس کی ظریفانہ قابلیتوں کے باوجود، تقریبات منعقد کرنے والے اسے بھولے سے بھی یاد نہ کرتے۔ اس ملک میں ایک آدمی کی بڑائی اس کے سرکاری عہدے اور اس کے بینک بیلنس سے تولی جاتی ہے۔ تم ہیں والیٹر کا ثانی ہو۔ یا تم جان کیٹس کے سے آسمانی شعر لکھتے ہو۔ اگر تم حکومت کی کسی بھاری کرسی پر نہیں بیٹھے ہو تو کوئی تمہیں آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ بہت سے لوگوں کے لئے اقبالؔ اس دن سے قابلِ اعتنا شاعر بن گیا جب برطانوی حکومت نے اسے نائٹ بنا دیا۔ ہمارے ایک بزرگ اقبال کو ہمیشہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کہا کرتے۔ ان کی نظروں میں اقبالؔ کو اپنی ڈاکٹری اور سری سے اصل فضیلت ملی تھی۔ کیانی کو ان تقریبات کی صدارت کے معیار کا احساس تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات اسے رنج پہنچاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے رستم کیانی کی حیثیت سے مدعو کیا جائے۔ اس لئے نہیں کہ وہ چیف جسٹس ایم آر کیانی تھا۔

مگر اس کے چیف جسٹس ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ سکتا تھا جو دوسرے نہیں کہہ سکتے تھے یا کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ ایک معمولی ضلع کا وکیل ہوتا تو چند دوست یا محلے والے اس کے تماشا اس کی شوخ باتوں سے محظوظ ہوتے اور بس۔ وہ ہمارے عہد میں بذاتِ خود ایک ادارہ نہ بن سکتا، اور نہ ہی غالباً یہ تقریروں کی کتاب چھپ پاتی اور یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا! ان تقریروں نے (جو اخباروں کے ذریعے ایک وسیع حلقے تک پہنچیں، آخر وہ ایک چیف جسٹس کی تقریریں تھیں) بے شمار لوگوں کو ہنسایا اور کیانی غالباً اس ملک کی سب سے محبوب شخصیت بن گیا۔ جب اخبار اس کی موت کی خبر کو سیاہ حاشیوں میں لئے ہوئے چھپے تو ہم سب کو اتنا رنج ہوا جتنا ایک قریبی دوست اور عزیز کی موت کا ہوتا ہے۔

ہم نے محسوس کیا کہ اب ہمیں کوئی بھی اپنے sense of humour سے خوش نہیں کرے گا اور ہم نامنتین ایٹی فوز دنیا میں اکیلے اور بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ کون اب اتنے شگفتہ، پر مذاق سلجھے ہوئے انداز میں سچی بات کہے گا؟

خواہ ہم مانیں یا نہ مانیں، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ کیانی ایک چیف جسٹس تھا۔ یہ ہمارے سماجی نظام اور اقدار پر کتنی بڑی طنز ہے!

ہمارے پیارے رستم کی تقریروں کی یہ کتاب اس کے رخصت ہونے کے تین چار سال بعد چھپی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ اس سے بہت پہلے کیوں نہ چھپ سکی۔ پھر بھی ہمیں اس کے ناظرین کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ہمیں یہ بے مثل تقریریں ایک کتابی شکل میں مہیا کر دی ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے ہر ایک کے پاس ہونا چاہیئے اور جسے ہر ایک کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنا چاہئے۔ یہ ایک حقیقی طور پر بڑے انسان کی کتاب ہے۔ ایک چیز مجھے اس کے متعلق اچھی نہیں لگی (چھپائی اور گٹ اپ کے متعلق نہیں جو فسٹ ریٹ ہیں) وہ اس کا دیباچہ ہے۔ یہ غالباً عجیب ترین دیباچہ ہے جو کسی کتاب کا ہو سکتا ہے۔ دیباچہ سارے کا سارا آگے آنے والی تقریروں کے مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ مصنف کے تعارف یا کتاب کی خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ کے بغیر اگر دیباچہ یہی کچھ ہونا تھا تو آخر دیباچے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کتاب دیباچے کے بغیر بھی چھپ سکتی تھی۔

کیانی اپنی تقریروں کی وجہ سے اپنی موت سے چار پانچ سال پہلے ایک "ہاہاکار" بنا۔ ہم اس سے پہلے اسے نہیں جانتے تھے، اور یہ ایک معما ہے کہ وہ اتنا عرصہ خاموش کیوں رہا۔ غالباً کسی سیکرٹری نے اسے کسی تقریب کی صدارت کے لئے مدعو نہیں کیا کیونکہ وہ چیف جسٹس نہ تھا۔ پہلی تین تقاریر لاہور اور لائلپور کی بزم اقبال میں اس کے صدارتی خطبے ہیں۔ اور کتنے پر مسرت خطبے ہیں! یہ تقاریر اقبال کے سوا ہر ایک چیز کے بارے میں ہیں — ایسی بزموں کے بارے میں، انھیں منعقد کرنے والوں کے بارے میں، سیاست اور معاشرے کے بارے میں، ایسے خطبے کیانی کو ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں پر بھرپور وار کرنے کے موقعے بہم پہنچاتے تھے اور وہ اپنے آپ پر اور دوسروں پر کھل کر ہنستا تھا۔ لیوس کیرل کی کہانی "ایلس ان ونڈر لینڈ" میں ایک والرس کا کہنا ہے اور والرس کی طرح کیانی بھی یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا ہے:-

وقت آگیا ہے، والرس نے کہا
بہت سی باتیں کرنے کا
جہازوں، جوتوں اور مہر لگانے کی موم کے متعلق باتیں
اور گوبھی کے پھولوں اور بادشاہوں کی باتیں۔

اور چاند کیوں جل رہا ہے
اور آیا سور کے پر ہوتے ہیں یا نہیں!

وہ الم غلم بہت سی چیزوں کی باتیں کرتا تھا۔ بزم اقبال میں صدارتی خطبہ بظاہر بڑا عالمانہ، بصیرت افروز اور محققانہ ہونا چاہیئے جس میں خودی اور نیطشے اور طائر لاہوتی وغیرہ کا بار بار اعادہ ہو، سنجیدگی اور بلاغت و فصاحت کا حامل۔ اس قسم کا خطبہ جس میں مسکرانے کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہ ہو اور جسے سن کر لوگ اونگھنے لگیں اور یہ سوچنے لگیں کہ انھوں نے دوپہر کو کیا کھایا تھا۔ اقبال کے گرد ہم نے جو تقدیس اور حکمت کا ہالہ بنایا ہوا ہے، اس نے اقبال کو بڑا ٹھوس بڑا خشک موضوع بنا دیا ہے۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی پر شکوہ شاعری کو پڑھنے کا بے حد شائق تھا۔ بانگ درا اور بال جبریل اور ضرب کلیم کے کئی اشعار مجھے ازبر تھے۔ افسوس کہ اب وہ اقبال یوم اقبال اور بزم اقبال کے باوجود غائب ہو گیا ہے۔ اقبالیات پر محققانہ کتابیں لکھنے والوں نے اور دوسری طرف ریڈیو پاکستان نے اسے مکمل طور پر غائب کر دیا ہے۔ اقبال ایک بڑا اچھا اور قابل قدر شاعر ہے لیکن صبح، دوپہر اور شام ریڈیو پاکستان سے اس کی نظموں کی قوالیاں سن سن کر ہمارے کان پک چکے ہیں۔ یوم اقبال اب منائے جاتے ہیں۔ حکیم الامت کو

خراجِ پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے چند اشعار اب بھی مناسب موقعوں پر دوہرائے جاتے ہیں لیکن کوئی اس کی شاعری کو نہیں پڑھتا۔ یہ افسوس کی بات ہے کیونکہ یہ بہت خوبصورت شاعری ہے۔ ہمارے ملک میں فن یا ادب و شعر کی کوئی حقیقی قدر نہیں۔ یہاں ہر چیز، خواہ وہ متقدر اشخاص ہوں یا ادارے "اکسپلائٹ" کئے جاتے ہیں۔ لوگ ان کے وسیلے سے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور ان کے سب آنسو مگرمچھ کے آنسو ہوتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد جتنا بیچارے اقبال کو اکسپلائٹ کیا گیا، غالباً کسی کو بھی نہیں کیا گیا۔ اور وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ اس کی گردان کرتے تھے، بیشتر اس کی شاعری سے بیگانہ اور بے پروا ہوتے تھے۔ اسی لئے کیانی جب یوم اقبال میں اپنا خطبہ پڑھتا تھا وہ اقبال کی خودی کا فلسفہ بیان کرنے کی بجائے اپنے سننے والوں سے کڑوی کچی باتیں کرتا تھا۔ والرس کی طرح جہازوں اور جوتوں اور مہر لگانے والی موم کی باتیں۔

کیانی کے یوم اقبال کے خطبے کے کچھ اقتباسات سنئے:۔

"میں سوچ رہا تھا کہ یہ تقریر کیسے شروع کروں، سوائے اس کے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے اور کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور قائد اعظم پر نگاہ پڑتی ہے ——— دنیائی سیاست پر اس وقت بھینسا حاوی ہے ——— اگر میں فارسی یا اردو ادب کا پروفیسر ہوتا تو آپ توقع رکھ سکتے تھے کہ اقبال کے متعلق کوئی ایسی بات کروں گا جو طالب علموں کی بھی سمجھ میں نہ آسکے مگر یہ صاحبان جو مجھے یہاں لائے ہیں، خود جانتے ہیں کہ میرا سرمایۂ ادب کس قدر محدود ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی جاننے کے سبب اگر میں دو چار شعر فارسی کے پڑھ دوں تو بھی اس موقع کے لئے کافی ہوگا۔ حضرات اس لئے میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نو وارد ہوں۔ صرف بچاس سال ہوئے کہ یہاں آیا ہوں۔ (اگر آپ نے برنارڈ شا کا کھیل Back to Methuselah پڑھا ہوگا تو آپ میرے نووارد ہونے پر متعجب نہیں ہوں گے) اور اس عرصے میں اقبال کے تین شعر بھی میں نے یاد کرلئے ہیں اگر یاد رہا تو آپ کو سنا دوں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک سردار صاحب کے تین راگ یاد آرہے ہیں۔ سردار صاحب کے دوستوں میں علم موسیقی سے ان کی واقفیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ سردار جی آپ کتنے راگ جانتے ہیں؟ سردار جی نے جواب دیا، تین۔ ایک تو مالکونس ہے۔ دوسرا کوئی اور ہے اور تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کتنے اچھے لوگ تھے، خود چلے گئے اور قصے چھوڑ گئے بلکہ کچھ قصے پٹھانوں کے سپرد کر گئے مگر اس ڈر سے کہ کہیں سردار جی کے تین راگوں کا قصہ یہاں نہ دہرایا جائے، میں نے تینوں شعر نئے سرے سے یاد کر لئے ہیں۔ سناؤں گا بعد میں اگر یاد رہا۔ اور وہ شعر بھی یاد رہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ میں اقبال جرم کر رہا ہوں: اور یہ جرم اقبال کی شاعری کے متعلق ہو تو بڑا جرم ہے ——— حسنِ طلب کے لئے شعر ضروری نہیں۔ مجھے سوال کا یہ طریقہ پسند ہے کہ مطلب بھی حاصل ہو جائے اور خودی بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ وہ خودی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے۔ خودی جو خود کی کوشش ہے، مگر میں رہتی ہے اور شاید اسی لئے اس پردہ نشین کی حفاظت ضروری ہے۔ القصہ تلاش میں کتابوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی اس کا نام تھا ترجمانِ اسرار، اور یہ اسرار خودی کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جسٹس شیخ عبدالرحمٰن جنھوں نے رحمٰن کا بندہ بننے سے پہلے یہ تین ہفت خوان سر کئے ہیں۔ وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر ان سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اشارتاً بھی نہیں بتایا کہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں .... ورنہ میں خود ان کے پاس جاتا اور ان تین اشعار میں سے جو میں نے یاد کئے ہیں ایک آدھ مصرعہ پڑھ کر ان کی طبیعت میں اضافہ کرتا اور ان کو موقع دیتا کہ میرے متعلق بھی کچھ لکھیں۔ مگر ان صاحبان کو سوائے فلسفے اور برگساں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ میں جا کر لارڈ ڈیننگ نظر آنے لگتا ہے ...... میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم کرم کتابی"

پر ہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتابیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ کرم کتابی اس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اوراق کو چاٹ جاتا ہے۔ استعارے میں اس پڑھنے والے کو بھی کہتے ہیں جو کتابیں ہی پڑھتا رہے اور زندگی کی حرارت سے اور دنیا کے سوز و ساز سے ناآشنا رہے۔ پانچ شعر کی نظم آپ بھی سن لیجئے .... زندگی جس چیز سے زندہ رہتی ہے وہ تپش ہے۔ گرمی ہے۔ محبت ہے۔ جس ہے۔ زندگی کی مشکلوں سے لڑنا ہے اور یہ باتیں کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتیں۔ سر آغاز میں جسٹس رحمن نے جس خواب سے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اتنے میں جسٹس رحمن پہنچ جاتے ہیں ایسی جگہوں میں پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو اقبال نے خود ان کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی۔ وہ حمید نظامی کو آیا۔ انھوں نے کچھ دن بعد جسٹس رحمن کو خط لکھا جس میں اسرار خودی کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اصرار تھا۔ حمید نظامی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ خواب کی تعبیر بنے ورنہ جسٹس رحمن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔ میں نے سوچا شاید میں بھی کوئی خواب دیکھوں مگر نہیں دیکھا۔ میں خواب دیکھتا ہوں تو اور چیزوں کے۔ بہت سال ہوئے جب ہندوستان میں جنگ آزادی جاری تھی تو کسی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آزادی آ رہی ہے گھوڑے پر سوار۔ یاد نہیں کہ اس نے گھوڑا کہا تھا یا بھیڑیا۔ بعد میں بھیڑئیے بھی کافی آئے۔"

اسی طرح اس کی ان شگفتہ، بظاہر بے ربط اور آرسی والی باتوں میں اینٹوں کے روڑے دائیں اور بائیں اور ہر طرف گرتے ہیں اور جن کو وہ لگتے ہیں وہ جملے کی لطافت اور معصومیت کے سامنے اپنے زخم سہلانا بھول جاتے ہیں۔ وہ اسے معاف کر دیتے ہیں کیونکہ کیانی سب سے زیادہ خود اپنے حال پر ہنستا ہے اس تقریر میں —— اس کی ہر تقریر کی طرح —— قومی زندگی کے کئی گوشے اپنی ساری بد نمائی میں منور ہو جاتے ہیں اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ غالباً سب سے سلجھا ہوا اور ہوشمند سوشل نقاد تھا جو اس ملک نے پیدا کیا ہے۔ اسی تقریر میں آگے چل کر اس بزم کے کارپردازوں کی جس لطیف اور خوبصورت انداز سے خبر لی گئی ہے وہ ہمیں مسرت سے بھر دیتا ہے۔ بے چارے کارپردازان!

"اب سوال یہ ہے کہ جب میں نے نہ خواب دیکھا، نہ خلعت کا اعزاز پایا، تو پھر کس حیثیت سے اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ حضرات یہ مجھے پسند نہیں کہ آپ کسی کو محض اس کے عہدے کے لحاظ سے یہاں کھڑا کریں۔ یہ ہم دونوں کی خودی کے منافی ہے۔ آپ اس چیز کی قدر کریں جو کسی کو یہاں خطاب کرنے کا اہل بناتی ہے۔ ایک رسالے کے مدیر نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے متعلق میرے خیالات معلوم کر کے اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے لکھا کہ تھوڑے عرصے تک میں اپنی میعاد ملازمت ختم کر کے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر گلابوں میں پیوند لگایا کروں گا۔ اگر اس وقت بھی مدیر صاحب مجھے اس قابل سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پوچھیں تو مجھے لطف آئے گا۔ اس وقت تو میری رائے سرکاری ہوگی۔ مدیر صاحب نے پھر نہیں پوچھا، اور نہ پھر گاؤں میں پوچھیں گے۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا عہدے کے، یا اعزاز کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہتا؟"

واقعی نہیں مسٹر جسٹس کیانی اس ملک میں عہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہتا۔ مانا کہ تم اپنی ظرافت اور خوش بیانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن اگر تم چیف جسٹس نہ ہوتے تو کسی کو تمہیں اس جلسے سے خطاب کرنے کے لئے دعوت دینے کا خیال بھی نہ آتا۔

اسی تقریر میں آگے چل کر یہ ٹکڑا۔

"صاحبان میں پھر بے ربطی کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے 'پیغام مشرق' پڑھی ہے۔ مگر اس کتاب کو مونث باندھنا دل نے گوارا نہ کیا کیونکہ پیغام نہایت مردانہ ہے (اس باعث پر کہیں خواتین مجھ سے بدظن نہ ہو جائیں، حقیقت یہ ہے کہ تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں اکثر مبتلا رہتا ہوں

کتابوں کی نمائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ایک اردو ڈکشنری نظر سے گذری۔ میں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈبلیو ڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈبلیو ڈی سے مراد ہے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کا محکمہ۔ ہر ڈکشنری میں لکھا تھا "مؤنث" یعنی پی ڈبلیو ڈی کا لفظ مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہوئی کہ یہ محکمہ ابھی مؤنث ہے۔ اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گذرتے......

ہاں تو ذکر تھا پیام مشرق کا......"

اور یہ تقریر جو ایک شگفتہ، تباہ کن، دردمندانہ معاشرتی طنز ہے اس طرح ختم ہوتی ہے۔

"گو یچ پوچھیے تو قصے کا باعث گندم کا دانہ ہے اور ہم اب بھی گندم کو نہیں چھوڑتے بلکہ اس فکر میں لگے ہیں کہ کس طرح کسی کھاد کے استعمال سے اس کی پیداوار بڑھائیں۔ البتہ بنگال والے تو اس دن سے ایسے ڈرے ہیں کہ اگر قحط سالی بھی ہو تو چاول ہی مانگتے ہیں۔ اور سنا ہے کہ بعض اوقات تو وہ موت کو گندم پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جو اختلاف مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہے۔ وہ دراصل زبان کا نہیں چاول کا ہے اور چاول بہشت میں نہیں ملتے۔ مگر اب تو یہ چاولوں کا جھگڑا ہے نہ زبان کا اختلاف۔ نہ اس بات کا کہ کراچی مرکز کے نیچے ہو یا مرکز کے اوپر۔ نہ اس بات کا کہ ایک یونٹ اچھا ہے یا چار۔ اب۔ لڑتے بھی ہیں آگن باتوں پر مگر اب تو سے

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیے نکال"

صرف کیانی ہی اس فضا اور اس ماحول میں ایسی باتیں اس سلیقے سے کہہ جاتا تھا، جو کسی اور کو کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ چیف جسٹس تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ہر ایک کو ہنسا دیتا تھا۔ وہ ایک jester تھا اور jester کو مضحکہ اڑانے کا پورا لائسنس ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کے وہ دوست بھی جنہیں اس کی باتوں سے صدمہ پہنچتا تھا اسے معاف کر دیتے تھے۔ ایسے آدمی کے خلاف کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ہماری سول سروس، انتظامیہ اور حکومت میں بعض دفعہ ایک قدرتی حادثے سے ایسے سلجھے ہوئے تربیت یافتہ اور آزادہ رو انسان گھس آتے ہیں جنہیں بظاہر وہاں نہیں ہونا چاہیئے جس سرکاری عہدے پر وہ تعینات ہوتے ہیں اسے ان کے وہاں ہونے سے زینت ملتی ہے۔ اس عہدے میں امتیاز کی شان پیدا ہو جاتی ہے لیکن آدمی محسوس کرتا ہے کہ ان کی فکروں اور کارکردگیوں کا میدان زیادہ وسیع ہونا چاہیئے تھا۔ ایک طریقے سے سوچیں تو ان کی زندگیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی ایک شخص پطرس تھا بڑی ظرافت، کشش اور صلاحیت کا مالک، وہ دیپلومیٹ بن گیا اور پھر اقوام متحدہ میں۔ لیکن یہ ادب و فن کی دنیا کے لئے کتنا بڑا نقصان تھا۔ ایسا ہی شخص رستم کیانی تھا جس کے انتظامیہ اور ریخ پر جانے سے شاید ادب کا ایک بڑا مزاح نگار، اور سوشل نقاد کھو یا گیا۔ ایسا ہی شخص غالباً "ذلفی" بھٹو ہے جو کہنے کو ہمارا فارن منسٹر ہے۔ مگر ہم سب کو ہمارے بھائی سے زیادہ پیارا ہے۔

اس کتاب میں تیرہ تقریریں ہیں۔ تین یوم اقبال کے خطبے ہیں (اگر مزاح، غیر سنجیدگی اور شوخی کے ان گلدستوں کو خطبے کہا جا سکتا ہے۔ تو) باقی ادبی اور سماجی اکادمیوں، بزموں، انجمنوں میں کی ہوئی تقریریں ہیں۔ ایک خطبۂ الوداعیہ ہے جو کیانی نے چیف جسٹس کے عہدے سے سبکدوشی پر شہریوں کی دی ہوئی دعوت میں دیا۔ بعض تقریریں دوسری تقریروں سے زیادہ اچھی ہیں لیکن ناقابلِ تقلید اچھوتی۔ طنز و ظرافت کی چاشنی ہر جگہ رہی ہے۔ یہ خطبے یا تقریریں وہ سب کچھ ہیں جو ایسے خطبوں اور تقریروں کو نہ ہونا چاہیئے۔ لوگ انھیں کیانی سے اس کے جیسٹر کے لائسنس کی وجہ سے سن لیتے تھے۔ کسی اور سے نہ سنتے ان میں دیوانگی کا ایک عنصر ہے جو سب اچھے مزاح کی جان ہوتا ہے۔ ان میں کوئی فصیحانہ بلیغانہ pronouncement نہیں۔ کوئی نصیحت آموز، عبرت انگیز واقعات نہیں۔ لمبے چوڑے مروجہ علمیت کا سکہ بٹھانے والے ٹکڑوں سے وہ بالکل عاری ہیں۔ ان میں ظرافت اور شرارت اور بے ساختگی ہے۔ اور وہ والرس کی باتوں کی طرح جہازوں، جوتوں اور مہر لگانے والی موم کے بارے میں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اپنی بے ربطی کے باوجود وہ ایسے موتیوں

پر مستند جستہ جستہ تقریروں سے کہیں بڑھ کر اپنے نشانے پر پہنچتی ہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتا ہے۔ لوگوں سے وہ باتیں کرتا ہے جو ان سے کرنی چاہئیں خواہ بڑی تلخ اور کڑوی باتیں ہی کیوں نہ ہوں۔ رستم کیانی ایک بے حد غیر رواجی آدمی تھا اور یہ تقریریں حد درجہ غیر رواجی ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کافی وقت تک چمکتے ہوئے سوشل تنقید کے مضامین کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ پچھلے اٹھارہ برس میں غالباً ہزاروں خطبوں میں سے یہی خطبے ہیں جو زندہ رہیں گے اور جو ادب کے اتنے نزدیک ہیں۔

اس کی مقبولیت کا راز کیا تھا؟ بلاشبہ ہم ایک اچھے Humourist اور Jester کو پسند کرتے ہیں۔ اور اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر اس کی مقبولیت صرف اس کی اس صفت کی وجہ سے ہی نہ تھی۔ اپنی ساری قومی خود فریبی، بے حسی، قول و فعل میں تضاد اور Inconsequence کے باوجود جس کے ہمارے خطبے پوری طرح غماز ہیں ہم پھر بھی کبھی کبھی چاہتے ہیں کہ کوئی سچ بات کہے۔ کیانی سچ بات کہتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہمیں ہنساتا بھی تھا اور پھر ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کی ہنسی خالی خولی ظالمانہ ٹھٹھے بازی نہیں بلکہ وہ ہمارے لئے اور ہمارے معاشرتی حالات کے لئے درد رکھتا ہے اور اس کا دل الم زدہ ہے کہ چیزیں اس طرح کیوں ہیں اور اس سے بہتر کیوں نہیں ہو سکتیں۔ یہاں ہر ایک چیز خواہ ادب ہے، خواہ قومی نعرے، خواہ انجمن سازی ہو سب نمود و نمائش اور دکھلاوے کی خاطر ہے اور لوگ وہ باتیں بار بار کرتے جاتے ہیں جو ان کی زبان سے نیچے نہیں اترتیں۔ اصل مقصد کرسی یا تمغے یا شہرت و رسوخ حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اسی لئے کوئی چیز اس ملک میں ڈھنگ سے، خوش سلیقگی سے، دیانتداری سے نہیں ہو پاتی۔ کیونکہ اس چیز کو حقیقت میں کوئی نہیں چاہتا۔ یہی ہمارے ملک میں سب بیماریوں کی جڑ ہے اور اسی لئے ڈائننگ کار کا کھانا باسی ہوتا ہے۔ ریڈیو کے پروگرام اتنے بے جان اور اکتا دینے والے ہوتے ہیں اور بجلی اور ٹیلیفون کے کنکشن حاصل کرنا ایک تقریباً ناممکن "اچیومنٹ" ہوتی ہے۔ اسی غلطی مرض کی بدولت ہمارے بعض سرکاری دفاتر تباہ شدہ درگاہوں کا منظر پیش کرتے ہیں جن پر مجاوروں کی فوج کا قبضہ ہو۔

ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان تقریروں کی ادبی حیثیت کیا ہے اور ہم انھیں طنز و مزاح کے ادب میں کس مقام پر رکھ سکتے ہیں۔ میری رائے میں بظاہر پریشاں خیالی اور بے ربطی اور زبان کی خامیوں کے باوجود یہ تقریریں ادب کے دامن کو چھوتی ہیں اور شاید شگفتہ ترین معاشرتی اور سیاسی طنزوں کی حیثیت سے وہ ہمارے نثری سرمایے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جو کچھ اکبر الٰہ آبادی نے نظم میں کیا کچھ اسی قسم کی چیز کیانی نے چلبلی نثر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دونوں "سپر جسٹرز" (Super Jesters) تھے اور دونوں سے متانت کی توقع رکھنا عبث تھا۔ کیانی ان زمانوں کا "باغی" تھا، اس لئے اس کی ظرافت ہمارے لئے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے اور ہم اسے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ اکبر کی ظرافت ابھی تک "ڈیڈ" نہیں ہوئی اور اس کے بعض شعری تیر اس ماحول میں بھی بھرپور وار کرتے ہیں۔ پھر بھی صاحب لوگ اب چلے گئے ہیں اور ہمارا معاشرہ نئے افقوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے ہائی بروز کا لقب دیا جائے گا۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو ادب کا انگریزی یا کسی غیر ملکی زبان کے ادب سے موازنہ کرنا بے معنی سی بات ہے۔ انگریزی اعلیٰ طنز و ظرافت کا بے پایاں ذخیرہ ہے۔ وہاں سوئفٹ اور آرویل جیسے اس فن کے "پریکٹیشنرز" ہیں۔ سڈنی سمتھ اور ہوریس والپول جیسے خطوط نویس۔ آسکر وائلڈ کے جیسے ڈرامہ نویس۔ پنچ میگزین کے پچھلے نمبروں میں اصل ظرافت اور مزاح کے بے شمار لطیفے ملتے ہیں اور انہیں پڑھتے ہوئے طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ تب ہمیں اردو کی مفلسی اور محرومی کا خیال آتا ہے۔ صرف طنز و مزاح ہی میں نہیں بلکہ ادب کی دوسری اصناف (سوانح، تاریخ، سفرنامے) میں بھی ہم ماسوا چند ایک گنی چنی کتابوں کے تقریباً تہی دامن ہیں۔ اس قلیل مزاحی متاع میں رستم کی تقریریں منفرد اور اکیلی ہیں۔ ہم اسے آستانِ ادب کے بالانشینوں میں تو جگہ نہیں دے سکتے لیکن جس گوشے میں وہ بیٹھا ہے وہ یقیناً صرف اسی کے لئے مخصوص ہے۔

یہ ایسی شگفتہ تقریریں ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے میں ان میں سے کوٹ کرتا چلا جاؤں۔ کم از کم میرے لئے ان میں دائمی مسرت ہے مگر "فنون" کے حدود کے

خیال سے میں اس کوٹ کرنے کی ترغیب کی مزاحمت کروں گا۔ میں نے ایک نمونہ دیا ہے اور اس کتاب کے متامل خریداروں کے لئے یہ کافی ہونا چاہئے مگر ایک نمونہ میں اور ضرور دوں گا۔ یہ دکھانے کی خاطر کہ کیسے بڑا [illegible] خود اپنے آپ پر بھی بغیر کسی رحم کے ہنس سکتا ہے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ایک نئے ڈھلے ہوئے سکّے کی طرح اصلی اور کھرا تھا۔ اور اس کی [illegible] میں بناوٹ یا تصنع یا جھوٹ کا شائبہ نہ تھا۔ ہمارے اس موجودہ [illegible] میں ایسے آدمی کتنے کمیاب ہیں۔ آدمی ان سے کبھی کبھار ملتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر حیران ہوتا ہے :

"لاہور سے آ رہا تھا اور یہ اچھا موقع تھا کیونکہ سوائے ڈرائیور کے اور کوئی پریشان خاطری کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ڈرائیور نے مجھے پریشان کیا ایک گدھے سے جو اچھا بھلا سڑک کے درمیان جا رہا تھا ٹکر لگا دی۔ جیسے پہلے اس کے راستے میں گدھے نہیں آتے تھے۔ ہمارے تجربے میں تو بہت سے گدھے آتے ہیں اور ہر گدھا سڑک کے درمیان چلتا ہے۔ یہ قومی سڑکیں تو آخر گدھوں کے لئے ہی بنی ہیں۔ ڈرائیور میں یہ نئی بات دیکھ کر کہ گدھوں کو برداشت نہیں کر سکتا، میں نے خود موٹر ہاتھ میں لے لی۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک اور گدھا جس کی شکل و صورت ہماری ہی طرح کی تھی، بالکل سامنے آ گیا۔ اس سے موٹر بچانے کی غرض سے میں نے پہیہ زور سے گھمایا تو موٹر شیطان کی طرح جس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اور اس شخص کی مٹی سے اور ناراض ہو کر احتجاجاً سڑک سے باہر نکل گئی۔ جہاں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے کارکن مٹی نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کی موٹر سڑک سے باہر نکلے تو اچھی طرح سے گرے۔"

پھر بے چاری پی۔ ڈبلیو۔ ڈی! کیانی زندہ رہتا تو کبھی وہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی پر پوری کتاب لکھتا۔ اسے اس محکمے کے خلاف کئی "ذاتی" رنجشیں تھیں مگر یہ اقتباس دینے سے میرا کچھ اور مطلب ہے۔ کیانی کیسی معصومیت کیسے بے ساختہ پن سے ہم سب کو گدھے کہہ جاتا ہے اور اپنے آپ کو بھی اس زمرے میں شامل کر لیتا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے آپ کو گدھے کا بھائی کہہ سکیں اور اس پر خوش ہوں؟ ہمارے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں میں کتنے ہیں جو گدھے سے اپنی مشابہت (یا اس سے اُلٹ) کا اس گرم جوشی، اس معصومیت سے اظہار کر سکیں۔ ہم اشرف المخلوقات بننے میں اتنے مصروف اور اینٹھے ہوئے ہیں کہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم میں سے بیشتر اپنی فکر و نظر میں محض گدھے ہیں۔ گدھوں میں پھر بھی مزاح کی حِس ہے، ہم میں وہ بھی نہیں۔

اور یہ رہا ایک اور چھوٹا سا ٹکڑا۔ ملتان اکاڈمی کے خطبے سے لیا ہوا :

"بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام بلند صر خان تھا (اور آپ کے فائدے کے لئے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام ملتان خان تھا) جب پانچ چھ برس کی عمر تھی تو عید کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لئے بوٹ منگوائے لیکن ہمیں تسمے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارش والد سے کہا کہ بچوں کو تسمے باندھنے سکھایئے۔ انھوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں تمہارے لئے دوسری ماں لاؤں تو تم اُس کو سلام کروگے؟ بڑے بھائی نے کہا ہاں۔ اور والد مرحوم نے اس کے تسمے باندھ دئے۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کان میں کہا "کہہ دو نا۔ اس میں کیا ہے۔ تمہارے سلام سے سچ مچ سوتیلی ماں تو نہیں آ جائے گی" پر میں نے کہا اگر آ گئی تو؟ تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا سلام تو نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ میرے تسمے کھلے ہی رہ گئے اور میں غصے میں باہر نکل آیا اور رونے لگا۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد صاحب ان دنوں شاہنامہ پڑھتے تھے اور "من وگرز و میدان و افراسیاب" والا مصرعہ ان کو پسند تھا۔ میرے نکلنے کے بعد کھلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے۔ یہ بھی بڑا رستم بنا پھرتا ہے اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

اس دن سے بلند صر خان کی بجائے میں رستم خان ہو گیا اور جب ذرا مہذب ہوا تو نام کے ساتھ محمدؐ لگا لیا اور خان کاٹ دیا۔ مگر میرے بوٹوں کے تسمے ابھی تک کھلے ہیں۔"

اور ایک معنوی انداز میں واقعی اس کے بوٹوں کے تسمے ہمیشہ کھلے ہی رہے۔ اس وقت بھی جب وہ جسٹس تھا۔ رستم کیانی رستم کیانی ہی رہا۔ اپنے عہدے کی پوشش اور ساز و سامان کے باوجود کیا آپ کسی اور کی بابت سوچ سکتے ہیں جو یہ اقرار کر سکے کہ اس کا اصلی نام جلندھر خاں تھا۔ اپنے آپ پر ہنس سکنے کی اہلیت ایک بڑی کمیاب صفت ہے اور کیانی میں وہ تھی۔ اسی لئے ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے سب دوست اور ساتھی اس سے محبت کرتے تھے۔

ان تقریروں میں کیانی نے اپنے ساتھی اور دوست جسٹس رحمان سے کافی نوک جھونک کی ہے۔ اصل میں وہ گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ جب وہ ولایت میں اکٹھے تھے تو ایک روز رحمٰن صاحب نے کیانی کا "مرثیہ" لکھا۔ اس "مرثیے" میں کتنا پیار اور کتنا حسن ہے اور ہمارے رستم کی ساری اس وقت کی شخصیت ان بندوں میں ڈھل گئی ہے۔

سوچتا تھا کدھر گیا رستم
آئی آواز مر گیا رستم

اک کیانی جہاں میں تھا موجود
ہائے اب وہ بھی ہو گیا مفقود

علم و آداب میں یگانہ تھا
اس کا ہر قول تازیانہ تھا

اس پہ طرہ کہ فیلسوف بھی تھا
گرچہ تھوڑا سا بیوقوف بھی تھا

حسن کی شمع کا تھا شیدائی
عشق تھا اس کا آرٹ آبائی

ناک بھی اس کی تھی اینٹھا سی
مگ گیا ہاتھ گر تو بہنے لگی

اللہ بخشے اسے عجیب تھا وہ
رہتا گم سم مرے قریب تھا وہ

جب کبھی یاد اس کی آئے گی
اس کی شوخی مجھے ستائے گی

ریٹائرمنٹ کے بعد رستم کیانی زیادہ دن نہ جیا۔ اس کی اپنے دیہاتی گھر میں گلابوں میں پیوند لگانے کی تمنا دل ہی میں رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک عوامی ہیرو تھا۔ اس کی مقبولیت اور شہرت اوج پر تھی اور ہم سب کو توقع تھی کہ اب اپنے عہدے کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جانے کے بعد وہ ہماری پبلک اور معاشرتی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرے گا۔ مگر جن سے دیوتے محبت کرتے ہیں وہ جلد مر جاتے ہیں۔ پندرہ نومبر ۱۹۶۲ء کو چٹاگانگ کے ایک ہسپتال میں شوخ و شنگ رستم ہمیشہ کے لئے چلا گیا اور ہم اپنی تاریک راہوں میں بھٹکنے کے لئے اکیلے رہ گئے۔

کاش وہ ان پر اضطراب دنوں میں ہمارے درمیان ہوتا اور وہ کیسی کیسی باتیں کہتا!

منیر احمد شیخ

نئیں رِیساں شہر لہور دیاں

لاہور پر حملے کی خبر سنتے ہی مجھ پر پہلا ردعمل یہ تھا کہ اس وقت میں لاہور میں کیوں نہیں، پنڈی میں کیا کر رہا ہوں، پنڈی میں مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا، لیکن جو کچھ بھی کر رہا تھا اُس سے مجھے اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر یہ سمجھانے کی بار بار یہ کوشش ہو رہی تھی کہ جنگ کا صرف ایک ہی محاذ نہیں، ہزاروں محاذ ہیں۔ آپ جس جگہ بھی ہیں اپنا کام دیانتداری اور زیادہ شدت سے کرتے رہیئے، اور گھر کے اندر کے محاذوں کو مضبوط کیجئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دورانِ خون تیز ہو گیا ہے، گال تپ گئے ہیں، یہ بات قطعاً میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انہیں یہ ہمت کیسے ہوئی کہ وہ لاہور کا رُخ کریں؟ اور اگر خدانخواستہ لڑائی لاہور شہر تک پہنچ گئی تو پھر کیا ہوگا؟ کیا پھر بھی مجھے پنڈی ہی میں بیٹھے رہنا ہوگا؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ لاہور کی گلیوں کی لڑائی میں مجھے بھی لڑنا ہے۔ یہ گلیاں مجھ سے حساب مانگیں گی۔

فوراً بہت سے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ ٹی ہاؤس میں یارانِ محفل کیا کر رہے ہوں گے؟ گورنمنٹ کالج کی ڈھلوان پر ڈاکٹر نذیر کھڑے کیا سوچ رہے ہوں گے؟ ناصر کاظمی جو اپنا خون نہیں دیکھ سکتا اور ہر صبح شہر کے درختوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ انتظار حسین — جو ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جنگ ایک نہ ایک دن ہونی ہی چاہیئے یا ہم نہ رہیں یا وہ نہ رہیں۔ یہ روز روز کی بک بک ختم ہو۔ غزل گو احمد مشتاق، جو دوستوں سے لڑتا ہے تو اپنا سارا اسلحہ ایک ہی راؤنڈ میں ختم کر دیتا ہے۔ سجاد باقر رضوی — جسے یوں دیکھو تو ہر وقت چیلنج دینے اور قبول کرنے کو تیار مگر ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ شفقت تنویر مرزا — جو ہتھیار ڈالنے پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ سیز فائر ہوا ہو تو پلان بناتا رہتا ہے کہ اگلا حملہ کس طرف سے کرنا ہے۔

دوست بھی یاد آئے اور وہ بھی جو کبھی دوست ہوا کرتے تھے، اور پھر ایک دم سے اپنا چار برس کا بھتیجا منّا یاد آیا، جو فلم میں کسی ایکٹرس کا نمایاں سینہ دیکھتا ہے تو کرسی پر اچھل کر چلانا شروع کر دیتا ہے "اودودھو! او-او- دودھو!" اور اُس کی ماں اُسے تھپڑ مار کر بڑی مشکل سے چپ کراتی ہے۔

اور جب منّا یاد آیا تو میں نے یہاں سے بھائی کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی۔ ٹیلیفون کے تار مصروف تھے۔ بڑی مشکل سے رابطہ قائم ہوا تو میں نے کہا کہ اگر بہت خطرہ ہے تو منّے وغیرہ کو......

ابھی میں نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ اُس نے کہا "کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ہماری لاشوں پر سے گزریں گے تو منّے تک پہنچیں گے۔ اب یہاں سے کہیں جانے کا کیا سوال، منّے کی تم فکر نہ کرو۔ وہ اپنے منہ سے خطرے کا سائرن بجا بجا کر بچوں کو خبردار کرتا رہتا ہے، اور وہ جب چھپنے لگتے ہیں تو تالیاں بجا کر کہتا ہے: "اوے میں تے مخول کرناں پیا ساں"

منّا، وکی، ماؤں، اجی، گوگی سبھی منہ سے خطرے کا سائرن بجا بجا کے ایک دوسرے سے "مخول" کر رہے تھے اور میں نے ایک وقفے کے لئے سوچا کہ میرے دونوں بھائی لاہور میں ہیں، وہ نہ رہے تو دنیا میں میرے لئے کیا رہ جائے گا۔ پھر مجھے اپنی خودغرضی اور کمینگی کا احساس ہوا۔ میں نے بھائیوں اور ان کی بیویوں

اور ان کے بچوں کو ذہن سے بالکل صاف کر دیا۔ لاہور میں کون میرا نہیں؟ پتہ پتہ بوٹا بوٹا میرا ہے، میری دیواریں، میرے راستے، بڈھا دریا، راوی روڈ، بھاٹی، ٹی ہاؤس اور لارڈز برسوں میرے ہمراہی رہے ہیں۔ شاہی مسجد کی دیواروں سے اترتی ہوئی دھوپ میری ہے، قلعہ کا دروازہ میرا ہے، لاہور کے تانگے میرے ہیں۔ دفتر سے گھر واپس آیا تو ریڈیو لگایا۔ ابھی نئے ترانے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ایک پرانا ریکارڈ لگا:

نئیں ریساں شہر لہور دیاں

اس آواز پر بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے۔ یوں لگا جیسے یہ گانا زندگی میں پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔ دوسرے روز بستر پر پڑے ہوئے میرے ماموں کا خط لاہور سے ملا۔

"کئی روز سے بیمار ہوں، کمزوری خاصی ہو گئی ہے۔ مجھے اپنی فکر نہیں، لاہور نہ رہا تو کیا رہ جائے گا۔ خدا سے دعا کرو کہ ہمیں فتح و کامیابی سے ہمکنار کرے۔"

اسی رات بھارت کا ایک کنبرا پنڈی پہ حملہ آور ہوا۔ رات کے کوئی ایک ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ ایک ایسے زور کا دھماکا ہوا کہ میں پلنگ سے اچھل گیا۔ اپنے ملازم کریم کو آواز دی۔ اس نے کہا کمرے کے کسی کونے سے لگ جائیے، بمباری ہو رہی ہے، اور خود باہر صحن میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اسے آواز دی کہ کیوں تیری موت آئی ہے۔ کونے میں تو بھی لگ جا۔ اس نے کہا، آپ نے صرف دھماکا سنا ہے، میں نے جنگ لڑی ہوئی ہے، تو بچی رہا ہوں۔ میں جہاز کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اتنے میں ایک اور دھماکا ہوا اور گھر کی کھڑکیاں اور دروازے ہل گئے۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر دھوئیں کے موٹے بادل اٹھ رہے تھے اور "ایک ایک گن" کی آواز آ رہی تھی۔ جہاز کے نشانے کے لئے روشنی کے "ٹریسرز" کی لمبی قطار تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اور کریم کہہ رہا تھا۔ واقعی بم گر رہے ہیں۔ صبح اذان کے وقت لوگ ٹولیاں بنا کر گلی کی نکڑوں پر کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بھارتی کنبرا نے صادق آباد کے محلہ پر بم گرائے ہیں اور تین چار گھر اپنے مکینوں سمیت ڈھیر ہو گئے ہیں۔ کریم لاشوں کو دیکھ کر آیا اور کہا کہ صاحب! سلام علیکم مجھے چھٹی دو، میں ریزرو میں ہوں اور اپنے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنے توپ خانے میں جا رہا ہوں۔ اس گھر میں رہوں گا تو جہاز بچ کے گزرتے رہیں گے۔ میرا تو کبھی ایک نشانہ بھی نہیں چوکا۔ کریم اسی روز چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد ہوائی حملے کے سائرن دن رات بجتے رہے لیکن کوئی بھارتی طیارہ دار الحکومت پر نہ آیا۔ آنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ اس لئے کہ بھارتی ریڈیو کی اطلاع کے مطابق ان کے ایک کنبرا نے چک لالے کے ہوائی اڈے کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ اور غیر ملکی نامہ نگار چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اتر کر صادق آباد کے محلے میں لاشوں کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بھارتی پائلٹ کو مکانوں پر جہازوں کا گمان ہوا تھا اور سڑکیں "رن وے" نظر آنے لگی تھیں۔

لیکن ان دھماکوں پر زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد لوگ پوچھ رہے تھے۔ لاہور کی کیا خبر ہے؟

لاہور سے رابطہ رکھنے کے لئے میں نے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر سوئی روک دی تھی اور لاہور کی آواز سے مجھے اس کے ولولوں کا مسلسل اندازہ ہوتا رہتا تھا۔

پھر خبر آئی کہ صفدر میر نے انتظار حسین کو گلے لگایا ہے اور اردو میں زوردار نظمیں لکھی ہیں اور اس کی ابلتی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور وہ باہر نکل کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہو کر ان سے مخاطب ہو رہا ہے۔ صفدر کی پرانی آواز میرے کانوں میں گونجی

جیوے شہر لہور

جیون اس دے جتے جائے

تے جیون اس دیاں گلیاں

صفدر کی آواز میں للکار تھی اور اس کی آنکھوں میں خون اترا آیا تھا۔

چلو واہگے کی سرحد پر
وطن پہ آج کٹ جانے کا یارو وقت آیا ہے
چلو واہگے کی سرحد پر

علی حیدر کی گونج چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ انتظار حسین نے اطلاع دی کہ ادب واہگے کی سرحد پر تخلیق ہو رہا ہے۔

منیر نیازی نے ٹی ہاؤس کے باہر کھڑے ہو کے کہا "یہ وقت ظہور کا وقت ہے۔ جو کوئی بھی جو کچھ ہے اُسے اب ظاہر ہونا ہے۔ بُرے شعرا اور بُرے فقرے کی بددعا سے بچو۔"

پنڈی میں ضیا جالندھری نے ایک نظم لکھی اور پھر اطلاع دی کہ نظم لکھی تھی۔ پھاڑ دی ہے۔ میں ابھی بڑا شاعر نہیں ہوا کہ بُری تحریر پر نادم نہ ہوں نظم لاہور والے لکھ رہے ہیں۔ میں نے بندوق داغی تھی، گولی نشانے پہ نہیں بیٹھی، لیکن بندوق نہیں پھینکوں گا۔

مختار صدیقی نے بھارت سے کہا:

سنو!

اور بھارت نے سُنا کہ لاہور اس سے نہیں مر سکتا۔

قاسمی نے چھ ستمبر کا پہلا مصرعہ کہا۔

شفقت تنویر مرزا کا میں نے اِدھر اُدھر بہت پوچھا۔ ایک صاحب نے بتلایا، اُس نے عام معافی نامے کا اعلان کر دیا ہے۔ پنجابی گیت، پنجابی سپاہی کی طرح سینوں میں لہو گرماتے ہیں اور سجاد باقر رضوی، عنایت حسین بھٹی کی جگنی گاتا پھرتا ہے "جگنی نام علی دا لیندی اے۔ نام علی دا، نام علی دا، نام علی دا۔" اور انتظار حسین، نور جہاں کے پنجابی گیت اپنی نانی اماں کی طرز میں گنگناتا ہے۔ "وے میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں۔"

شفقت تنویر نے کہا۔ اب میں کچھ نہیں کہتا۔ فیصلہ میدان میں ہوگا۔ پنجابی گیتوں نے سوئے ہوئے جذبوں کو اس طرح اُبھارا کہ بڑے بڑے کافروں نے اس زبان کی معجزاتی کیفیتوں کو تسلیم کیا۔ میرے ایک بنگالی دوست نے کہا کہ یہ قصور میں کیا بات ہے۔ نور جہاں نے اس کو اس طرح یاد کیا ہے کہ ہمارا کلیجہ نکال لیا ہے۔ ہم نے سالا بہت وقت ضائع کیا، ہمیں پنجابی پڑھاؤ۔ میں نے اُس سے کہا پنجابی نور جہاں نے کافی پڑھا دی ہے۔ اب بھی کوئی نہیں سیکھ سکتا تو اُسے اور کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ اور قصور نور جہاں کا شہر ہے لیکن اُسے جس طرح اُس نے یاد کیا ہے کون ہے جو اپنے شہر کو قصور رشتہ ہے۔ اس جنگ نے جہاں اور بہت سی چیزیں طے کیں، وہاں ایک سبق ہمیں یہ بھی ملا ہے کہ آخر میں انھیں چیزوں نے ہمارا ساتھ دیا جن کو اپنا کہتے ہوئے ہم شرمایا کرتے تھے۔ پنجابی زبان کی قوت اور تاثیر اُن میں سے ایک ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پنجابی سپاہی تو بے جگری سے لڑے اور نور جہاں کے گیت دیں پر جادو پھونک دیں اور پنجابی زبان سینوں کے پار نہ ہو۔ اور گیتوں کا یہ عالم تھا کہ ہر گیت سننے کے بعد لاہور جانے کی خواہش اور تیز ہوتی تھی۔ ایک رات بلیک آؤٹ کی خاموشی میں میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی (اور سُر میں): "لالا جی! میں کہیا جان وی دیو۔ ایہہ گل تواڈے وس دی نئیں۔ میں کہیا جان وی دیو۔" میں نے دروازہ کھول کے کہا "اے شخص ہرلی بجانی بند کر۔ تو رات کے اس اندھیرے میں کہاں سے آیا ہے؟" وہ مجھ سے لپٹ گیا اور اتنا زور سے اپنے ساتھ دبایا کہ میری سانس رُک گئی۔ میں نے کہا "ہُن جان وی دیو" اُس نے کہا "یہی تو میں کہہ رہا تھا" حافظ اسلم لاہور سے پاکپتن کا ہوتا آیا تھا۔ اُس نے جیب سے ایک بھارتی طیارے کا ٹکڑا نکالا اور کہا "محمود بوٹی بند"

ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ میں نے کہا "کوئی بات سناؤ" اُس نے گا کر کہا: "نی میرا سوہنا شہر قصور نی"۔ وہ بہت دیر تک گاتا رہا۔

پھر اُس نے گانا ختم کرتے ہی کہا "نور جہاں نے آخر جنت کھٹ ہی لی۔"

میں نے اُسے کہا کہ تم جنت کی بشارت دینے آئے ہو یا کوئی اور بات بھی سناؤ گے لیکن پوچھنے تک وہ اپنے سوہنے شہر قصور کو یاد کرتا رہا اور کچھ بینڈ مُرکیاں ایسی بھی لگاتا رہا جو اُس کے خیال میں نور جہاں کو لگانی چاہئے تھیں۔ اُس نے کہا وہ ایک ویرانے میں نوکری کرتا ہے لیکن جب لاہور پر حملے کی خبر سُنی تو ساری زنجیریں توڑ کر کئی سو میل کا سفر طے کرتا ہوا بھاگم بھاگ لاہور پہنچا لیکن شالامار سے آگے اُسے روک دیا گیا۔ وہ بہت سینٹیلا وٹی سے لوٹا محمود بوٹی بند کے پاس بھارتی طیارے کو گرتے دیکھا اور اُس کے ٹکڑے جیب میں ڈال کے واپس چلا آیا۔ اُس کے سوا محاذ کی کوئی نشانی اُس کے پاس نہیں تھی۔ نور جہاں کے گیت، بھارتی جہاز کے ٹکڑے اور دکھ اور محبت کے آنسو لئے وہ اسی ویرانے کی طرف چلا گیا جہاں اس نے لاہور پر حملے کی خبر سُنی تھی۔

منو بھائی ریڈیو پر بھارت نامے پر بھارت نامہ لکھ رہا تھا اور اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ تم ان دنوں کیا کر رہے ہو؟ تو کہتا طوطا توپ چلا رہا ہے۔

ایک شاعر کو صفدر میر کی نظموں کی "پاپولیرٹی" پر بڑی تشویش تھی اور وہ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا۔ یار کیا اس کے مصرعے وزن میں ہیں؟

مجھ سے بھی جب اس نے سوال کیا تو میں نے کہا۔ صفدر میر انہیں وزن میں ہی پڑھتا ہے۔ اس جواب پر اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی لیکن وہ اس فکر میں غلطاں تھا کہ صفدر لاہور میں "ہٹ" گیا ہے، کیا پنڈی میں بھی ہٹ جائے گا؟ بہر حال مجھے یہاں بیٹھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ لاہور کے محاذ پر ہمارا نثار سپاہی "ہٹ" جا رہا ہے۔ اپنے وجود پر شرمساری کا احساس روز بروز بڑھ رہا تھا۔ بلیک آؤٹ کے اندھیروں میں مجھے یقین تھا کہ داتا کی نگری میں داتا ضرور جاگ رہا ہے اور داتا جاگ رہا ہے تو لاہور پر دشمن کے ناپاک قدم ہرگز نہیں آ سکتے۔ اندرون شہر کے لوگ ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ لاہور داتا کے دم سے کھڑا ہے۔ میں نے نہ کبھی اس وقت اس پر شک کیا اور نہ ان دنوں میں جب بھارتی "سورما" لاہور پر قابض ہونے کے لئے پورا "تان" لگا رہے تھے۔ لاہور کا ادیب اور داتا دونوں بیدار تھے ؎

داتا کی نگری میں ناصر   میں جاگوں یا داتا جاگے

"لاہور زندہ ہے، شاہی مسجد کی دیواروں کی ڈھلتی دھوپ سلامت ہے۔ میرے سنگی ساتھی میرے پیارے سبھی سلامت ہیں۔ لوہاری اور بھاٹی زندہ ہے۔ مال کی شامیں آباد ہیں لیکن جنرل چوہدری "جمخانہ" میں بھارت کا جام صحت پینا چاہتا ہے اور اُس کے سپاہی فتح کے نشے میں میری بہنوں اور بیٹیوں سے جشن فتح منانے کی فکر میں ہیں۔ وہ کرم فرما جو یہ کہتے ہیں کہ صاحب جنگ بڑی گھناؤنی شے ہے ایک انسان دوسرے کو مارتا پھرتا ہے، وحشت اور بربریت ختم ہونی چاہئے، جنگ بند کرو، تو یہ بزدل ہیں بے حس لوگ ہیں جو باعزت زندگی کی کوئی قیمت دینے کی ہمت نہیں رکھتے، جو صرف زندہ رہنا چاہتے ہیں، بہر حال میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، رکتے ہیں کر بھی زندہ رہنا پڑے تو وہ زندہ رہیں گے۔ جان انہیں پیاری ہے اور موت کا خوف ان کی رگوں میں سیاہی بن کے رات کے اندھیرے کی طرح اُتر گیا ہے۔ بین الاقوامی سیاست میری سمجھ سے بالاتر ہے اور میرے پیارے دوست کیپٹن صغیر حسین شہید کی سمجھ سے بھی بالاتر تھی جو دلگے کی سرحد پر لڑتا ہوا بہادر کی موت مرا اور جو زندہ تھا تو کہتا تھا کہ بین الاقوامی سیاست کے ہوتے ہوئے میں جی کا غم نکال کے نہیں لڑ سکتا۔ میں لڑتا ہوں تو کبھی بیچ میں امریکہ آ جاتا ہے اور کبھی روس اور کبھی کوئی اور کبھی کوئی اور۔ یہ کیا بکواس ہے۔ دلگے کی سرحد پر اس کا خون ہم سے یہ پوچھ رہا ہے کہ یہ زمین جو میں نے اپنے خون سے سرخ کی ہے، اس کی تابانی کو آپ قائم رکھیں گے یا بین الاقوامی سیاست کی سیاہی اس تابانی کو ختم کر دے گی؟ شہید کا خون ہم سے سوالی ہے؟ لاہور زندہ ہے، سیالکوٹ زندہ ہے، قصور زندہ ہے، پاکستان زندہ ہے لیکن میرے بچپن کے یار صغیر حسین شہید کا خون مجھ سے سوالی ہے، وہ مجھے رات کو سونے نہیں دیتا، وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ لیکن میں کیا کہوں؟ کیا بتلاؤں؟ سامنے دیوار پر اشتہار لگا ہوا ہے۔

"کانا پھوسی قومی وقار کے خلاف ہے"

سٹاپ پریس

گوجرانوالہ سے میری ماں کا خط آیا: بیٹا! ہوائی حملے ہو رہے ہیں، گھر میں خندق ضرور کھدوا لینا۔ میں نے لکھا: ماں! حوصلہ نہیں پڑتا کہ جیتے جی اپنی قبر کھدواؤں اور مرنے سے پہلے اُس میں جا بیٹھوں۔

انگریزی: ایوور براؤن
اردو: فہمیدہ ریاض

کچھ مفہوم کی وضاحت کے بارے میں

(مسٹر آئیور براؤن کا نام لندن کے ادبی حلقوں کے لئے اجنبی نہیں۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۱۶ء میں چھپا تھا مگر بعد میں وہ "تنقید کی طرف مائل ہوگئے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۴ء تک ان کی "تنقید کا زمانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ آبزرور کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔)

آج کل کے ادب میں یہ رسم چلی ہے کہ اپنا مطلب آپ بھی نہ سمجھو اور جب کوئی آزمائے" تو بے پروائی سے کندھے جھٹک کر کہہ دو کہ بس جو میں لکھتا ہوں سو لکھتا ہوں اور پڑھنے والے آپ ہی مطلب پیدا کریں۔ لکھنے والے کے مشاہدات حاملہ ہیں، پڑھنے والا دائی بنے اور بچہ جنوائے! لطافت بھلا کہیں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے!! ۱۹۴۹ء کی بات ہے: "دی کاک ٹیل پارٹی" کی اشاعت کے بعد جب ایڈنبرا کے آرٹ فیسٹیول میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے ایک انٹرویو لیا گیا تو انہوں نے بھی کچھ اسی قسم کا رویہ اختیار کیا تھا۔ مذکورہ کھیل، جو بعد میں لندن اور نیویارک میں بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا، میرے خیال میں اصل ڈرامے کی اچھی خاصی کاٹ چھانٹ کے بعد ہی پیش کیا گیا ہوگا۔ لیکن یہ امر اپنی جگہ ہے کہ جب ایلیٹ پر مبہم ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ لکھنے والے پر واضح ہونے کا فرض تو عائد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خیالات، محسوسات اور تصورات پیش کرتا ہے۔ ان کا مطلب اخذ کرنے کا بوجھ اٹھانے کے لئے عوام کو اپنی ذکاوت کو بروئے کار لانا ہوگا۔

جواباً عرض ہے کہ یہ رویہ تو کاہلی ظاہر کرتا ہے اور یا بناوٹ اور تصنع۔ اس طرح آپ حق تصنیف سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بے شک مصنف پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیال کو پہلے کھولے اور پھر بوئے۔ ایلیٹ صاحب بھی تو انسان اور انسانی تعلقات کے کچھ مسائل کو ڈرامائی انداز میں ہی پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک نفسیاتی معالج کو اخلاقی معلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ ایسے خیالات کی آورد تھی جو اتنے گہرے ہیں کہ ان کے لئے آنسو بھی نہیں بہائے جا سکتے ——— بلکہ وہ ہمیں قسمت اور نجات کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے جو ایسے اہم موضوعات ہیں کہ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کے بارے میں واضح ہدایات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ جاننے کا حق پہنچتا ہے کہ ان عظیم موضوعات پر ایلیٹ صاحب کی کیا رائے ہے۔ یہ کھیل کم و بیش مکالماتی نظم کی صورت میں لکھا گیا تھا۔ مگر اس امر سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ نافہم ہونے کا مطلب ایک مصنف کی اپنی ذمہ داریوں سے غفلت ہے۔

سوئفٹ نے کیا عمدہ بات کہی تھی کہ طرزِ تحریر کی صحیح تعریف ہے: "مناسب لفظ مناسب جگہ پر"۔ اس میں میری طرف سے یہ اضافہ کر لیجئے: "مناسب خیالات مناسب سلسلے کے ساتھ" یہ بات ناممکن تو نہیں ہے۔ میرے نزدیک ہمارے دور کے عظیم ترین نثر نگار ہیں برنرڈ شا اور سمرسٹ ماہم کیا ان دونوں میں سے کسی نے ایک بھی جملہ ایسا لکھا ہے جو مبہم ہو؟

آپ اگر شا کے خلاف ہیں تو شاید یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ اس نے ہر قسم کی بڑ ہانکی ہے لیکن وہ کس قسم کی بڑ ہوتی ہے یہ معلوم کرنے کے لئے شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا پڑے۔ اسی طرح ایک زندگی کے تجربات اور اس کے نتائج کی صاف و شفاف جانچ کے لئے ماہم کی "دی سمنگ اپ" بے مثال ہے۔

چلیئے مزدوری نہیں کہ آپ اس کے فیصلوں اور قدروں سے متفق ہوں لیکن یہ تو کم از کم آپ اچھی جان لیں گے کہ وہ قدریں ہیں کیا۔

دیکھئے اب اس گنجلک تحریر کی ایک مثال لیجیے جس کو لکھنے کے لئے میرے خیال میں کوئی بہانہ نہیں چل سکتا۔ محترم ہنری گرین کی کتابیں پڑھنا آج کل انگلستان کے طبقوں کے فیشن میں داخل ہے۔ غالباً اس لئے کہ وہ انتہائی نخوت سے صرف ونحو، جملوں کی ترکیب اور مروّج اوقاف پر تھوکتے بھی نہیں اُن کی ایک شہرۂ آفاق کہانی ہے جس کا نام انھوں نے مارے انکسار کے رکھا ہے "کچھ بھی نہیں" ایک مخصوص مثال کے لئے اس کہانی کے صفحہ نمبر ۱ سے یہ ٹکڑا لیجئے

It was wet then, did she remember he was saying, so wet like this he said, and turned his face to its dazzle of window, it had been dark with sad tears on the pane and streets of canals as he sat by her fire for Jane liked dusk, would not turn on the lights until she would not see to here, while outside a single street lamp was yellow, reflected over a thousand rain drops on the glass, the fire was rose and Penelope came in.

وہ کیا ہے جو اس سے زیادہ اُلٹ پلٹ ہوگا۔ کوئی اسکول کا لڑکا ایک مصیبت مول لے گا۔ اگر اس کی تحریر ایسی طفلانہ اور گدلی ہو جس میں اوقاف کی اغلاط ہوں، واوین کا سیلاب آیا ہوا ہو اور مضمون کے تمام تر اصولوں کے لئے ایسی حقارت کا اظہار ہو۔

یہ اصول لکھنے والوں کو تنگ کرنے اور ستانے کے لئے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ قاری کے لئے مددگار ثابت ہونے کے لئے ڈھالے گئے تھے۔

اگر یہ گڑبڑ آپ میرے سر پر ٹھونس دیں تو میں ایک قاری کی حیثیت سے زبردست اعتراض کروں گا۔

ایلیٹ صاحب کو لیجیے جنھوں نے "ثقافت کی تعریف کی جانب" نامی مضمون رقم کیا ہے۔ ذرا عنوان کے جھجک بھرے لہجے پر غور کیجئے۔ وہ ثقافت کی تعریف کرنے کی پیش کش نہیں کر رہے۔ وہ ۱۲۴ صفحات صرف تعریف کے ارد گرد الجھنے کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کچھ ایسے جملے شامل کئے ہیں

"ثقافت اور مذہب پر نظر ڈالنے کا وہ زاویہ جس کی تصویر کشی کی میں کوشش کرتا رہا ہوں۔ اتنا دشوار ہے کہ مجھے یقین نہیں کہ میں بعض جھلکیوں کے علاوہ خود بھی اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں یا اس کے تمام تر معانی کو جانتا ہوں"

غرض یہ ہے کہ اگر ایک مصنف صرف "تصویر کشی کی کوشش" کرے اور اس پر بھی اپنی نااہلیت کا اعتراف کرے کہ وہ خود بھی اپنا نقطۂ نظر نہیں سمجھتا تو اسے میرا ناچیز مشورہ ہوگا کہ جب تک وہ اپنی الجھن صاف نہیں کر لیتا اس کے لئے خاموشی بہتر ہوگی۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ فلسفے اور انگریزی کا ایک جید عالم یوں لڑکھڑا لڑکھڑا کر، جھجک جھجک کر بات کرے گا!! بات یہ ہے کہ ذہن پر مسلط دھند کو چھانٹنا آج کل گری ہوئی اور دوسرے درجے کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اس دھند میں بھٹکنا اور اپنی لاغری اور لاچاری کا اعتراف کرنا بہت عمیق خیال کیا جاتا ہے۔

کوئی بھی یہ جھوٹا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پچھلی ایک صدی کے آخری چوتھائی حصے میں لکھی ہوئی شاعری زیادہ تر مبہم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں اُس کے ڈھیر کے ڈھیر ناقابلِ فروخت رکھے ہیں۔ لندن کے ناشر احتجاج کرتے رہے ہیں کہ ایلیٹ اور دوسرے دو ایک شعراء کو چھوڑ کر کسی بھی شاعر کو شائع کرنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ درماندہ اور پریشاں حال سخن پردازوں نے آرٹ کونسل سے عرض حال کیا ہے اور آرٹ کونسل بڑی تندہی سے اس غور و فکر میں مصروف ہے کہ بے چاری فکرِ سخن کی دق زدہ بیوی کے لئے کیا کیا جائے۔ کیا وہ عوام پر اس شاعری کی اشاعت کا خرچ مسلط کرے گی جسے وہ بالکل پڑھنا نہیں چاہتے؟

یہ مبہم شعرا جو صرف و نحو، قواعد داوین، گرامر اور معانی کی رتی برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ اپنے زریں تخیلات کو صفحۂ قرطاس پر موتیوں کی طرح بکھیر دیتے ہیں، اپنے بچاؤ کے لئے ادھر اُدھر کی وجوہ پیش کرتے ہیں۔ کچھ تو اس الزام کو ماننے سے سرے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ جھٹکے کھاتے ہوئے فن کاروں کی اُلجھی ہوئی تخلیق نہیں سمجھتے وہ یا تو سست ہیں یا بیوقوف ہیں، اور یا دونوں ہیں۔ یہ الزام بھی اس کند ذہن اور غبی قاری پر عائد ہوتا ہے جو لفظوں کا یہ معمہ حل نہیں کر پاتا اور اس گورکھ دھندے کو سمجھنے کا اہل ہی نہیں۔

دوسرا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آج کل دنیا میں ہر طرف ایک الجھاؤ ہے، ایک پیچیدگی ہے، اقتصادی مسئلے، اخلاقی مسئلے، سیاسی مسئلے — سب کچھ ایسے گڈ مڈ ہیں کہ اس دنیا میں رہنے والا ہر وہ شخص جو وقت کا ساتھ سچائی سے دینا چاہتا ہے۔ اس دور کے اظہار میں واضح ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلا بہانہ محض غلطی کو نہ ماننا ہے جو کسی قانونی عدالت میں بھی نہیں چلے گا۔ دوسرا فنی بے بضاعتی کا اقرار ہے اور اس کا دفاع بھی ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ اس طرح مصنف حقِ تصنیف سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہماری مشکلات کا انبار جتنا پیچیدہ ہے اس بات کی اتنی ہی زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے ذہن چاقو کی طرح الجھاوے کو کاٹ ڈالیں اور مہمل سے نجات حاصل کر کے معنی تک پہنچیں۔

وہ لوگ جو اظہار کی درست قوت سے محروم ہیں ایک اور عادتِ بد کا شکار رہیں۔ وہ عادت ہے کسی ایسے لمبے سے ثقیل لفظ میں پناہ ڈھونڈنے کی جو لوگوں میں چل رہا ہو۔ مثلاً "خود وجودیت"۔ جب بھی کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ "فلاں فلاں خود وجودیت پر لکھتے ہیں" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں مارے عقیدت اور ہیبت کے ان کے سامنے سجدے میں گر پڑوں تو میں فوراً انہیں چیلنج کرتا ہوں کہ ذرا "خود وجودیت" کی تعریف تو کیجئے — مجھے تو آج تک کسی اچھے جواب کی مبادیات سے بھی سابقہ نہیں پڑا۔

ان خود وجودی ڈراموں کے اداکاروں اور پروڈیوسروں سے ذرا یہ پوچھئے کہ اس خرافات سے قطع نظر، آپ حقیقت میں کہنا کیا چاہتے ہیں تو ان کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ یہی حال ادب کے نقادوں کا ہے۔ وہ بڑے دھندلے پاتالوں میں بھٹکتے ہیں اور ادب کی روح کا لفظ زبان پر لاتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہو کہ ٹھیک ٹھیک بتائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں تو انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

ابہام ایک طرح کی مقبولیت کے لئے ایک شارٹ کٹ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک قابل بحث نکتہ دے دیتا ہے اور انسان ایک بحث کرنے والا جانور ہے۔ ایسی نظم، کتاب یا ڈرامہ لکھنا جو دقتِ طعام موضوعِ گفتگو بنے۔ اچھا خاصا سودمند مشغلہ ہے۔ ان انٹلکچوئیل مغروروں کے لئے تو گویا اجارہ مرتبہ مہیا ہو جاتا ہے۔ جو آپ کو یہ بتاتے ہوئے چٹخارے لیتے ہیں کہ مصنف دراصل کیا کہنا چاہتا تھا۔ آپ اگر نہیں جانتے اور نہ ہی یہ دھوکا دے سکتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں، تو آپ ایک اُجڈ دیہاتی ہیں۔ مبہم لکھنے والے ادراونی مفاخرین کی تاریخ پر تو ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ جب براؤننگ نے کہا کہ "سارڈیلو" کا مطلب صرف اس کے مصنف کو معلوم تھا اور وہ اب خود بھی اسے بھول چکا ہے تو اس زمانے کی براؤننگ سوسائٹیاں فرطِ انبساط سے فوراً معنی اخذ کرنے میں جٹ گئیں اور اس طرح انہیں اپنی اپنی خداداد ذکاوت اور قوتِ اختراع کے اظہار کا ایک نادر موقع ہاتھ آیا۔

یہ امر تو تسلیم شدہ ہے کہ شاعر اور نثر نگار کی حیثیت میں فرق ہوتا ہے۔ شاعر سوچ سے زیادہ تصور اور جذبیت سے زیادہ جذبات کو استعمال کرتا ہے لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ الفاظ سے اپنے جذبات اور تصورات کی درست مرقع کشی کے قابل نہ ہو۔ بہترین شعراء کو لیجئے۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ "نائٹنگیل" یا "گریشین ارن" کے بارے میں کیٹس کے کیا احساسات تھے؟ ہاں — ہم جانتے ہیں۔ اسے صرف دکھ سے جنگِ عظیم شروع نہیں کرنی پڑی تھی۔ نہ ہی اس نے اپنے کلام میں کسی ماہرِ قواعد کا جنازہ نکالا تھا۔

اے۔ ای۔ ہاؤس مین کی شیریں اداسی پر مجھے کبھی اپنا سر نہیں کھجانا پڑا، نہ ہی ٹیٹی سن کی کسی نظم کے معنی کھوجنے کے لئے اپنی دکھتی ہوئی پیشانی کے گرد

بھیگے ہوئے تولیے لپیٹنے کی ضرورت پیش آئی۔ کبھی کبھی مصنف کے خیالات اس کے ہاتھ کی نسبت بہت سرعت سے حرکت کرتے ہیں اور یوں ایک دوسرے میں گھس جاتے ہیں جیسے ٹرین کے حادثے میں گاڑی کے ڈبے۔ شیکسپیئر کی بے تحاشا قوتِ تخلیق کا کبھی کبھی یہ نتیجہ ہوتا تھا لیکن کوئی بھی عظیم شاعر اپنے بہترین کلام میں مبہم نہیں ہوتا۔

تمام عوام — یعنی "انٹلکچوئل سناب" قسم کے اصحاب کو چھوڑ کر تمام عوام اتنے سمجھ دار ہیں کہ ان فن کاروں کو ترجیح دیں جن کے پاس ایسی صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ ہم کو اپنے مطلب سے آگاہ کریں اور بلا تاخیر آگاہ کریں۔ وہ فن کار جسے اپنے ارادوں کا کچھ علم نہیں مگر گا نٹھ رہا ہے، اور اگر اسے علم ہے لیکن وہ اظہار نہیں کر پاتا، تو وہ نا اہل ہے۔ امید ہے کہ میں نے اپنا مطلب واضح کر دیا ہوگا۔

کلاسیک

سید سبطِ حسن

طوفانؔ سے پہلے

(۲)

"طوفان سے پہلے" کی پہلی قسط "فنون" کی سہ ماہی اشاعت ۱۹۷۷ء دورِ اول میں شامل تھی ہمیں افسوس ہے کہ قارئین کو ہومر کی تخلیقات کے اس کی دوسری قسط کا طویل انتظار کرنا پڑا۔ پہلی قسط میں شاہزادی ہیلن اور اس کے شوہر مینلاس کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس قسط میں ٹرائے کے شاہی خاندان کی داستان درج ہے۔ (ادارہ)

اور جب آبادی بڑھی اور خوراک کی قلت ہونے لگی تو بحرِ اسود کے شمالی علاقوں میں رہنے والے قبیلوں نے ترکِ وطن کا تہیہ کر لیا۔ ان لوگوں کے قد لمبے، رنگ گندمی اور بال سنہرے تھے۔ وہ بڑے جفاکش اور دلیر تھے۔ جنگلی پھل پھول اور جانوروں کا گوشت ان کی غذا تھی۔ تیر کمان، بھالے اور نکیلے پتھر ان کے آلات و اوزار تھے۔ گائے بیل بھینس اور بکری ان کے مویشی تھے۔ وہ ہزاروں برس سے دریائے وولگا کی وادی اور گھاس کے میدانوں میں آباد تھے مگر ان علاقوں میں اب گنجائش باقی نہ تھی۔

خانہ بدوشوں نے اپنے برتن بھانڈے، اناج کے ذخیرے، آلات و اوزار غرضیکہ اپنا سارا اثاثہ مویشیوں پر لادا اور آبائی وطن کو خیر باد کہا۔ جن قبیلوں نے جنوب مشرق کی راہ لی وہ افغانستان، ایران، عراق اور وادیٔ سندھ تک پہونچے۔ جن قبیلوں نے جنوب مغرب کی سمت اختیار کی۔ وہ وادیٔ ڈینوب، بلقان اور یونان میں جا بسے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ پانچ ہزار برس گذرے، شروع ہوا اور صدیوں جاری رہا۔

مگر بعض قبیلوں نے یونان کے بجائے ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور یورپ کو ایشیا سے ملانے والی آبنائے کو عبور کر کے جزیرہ نما کے مغربی ساحل پر پھیل گئے اس علاقے کی آب و ہوا بڑی خوشگوار اور معتدل تھی۔ جگہ جگہ میوہ دار درختوں کے جھنڈ کھڑے جھومتے تھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے ابلتے تھے اور سمندر کی مچھلیاں جل پریوں کی مانند سطحِ آب پر رقص کرتی تھیں۔ تھکے ہارے بنجاروں کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ انھوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔

اُن کی بستیوں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے بڑی بڑی ریاستوں کی شکل اختیار کر لی۔ اِن میں فریگیا کی ریاست بہت مشہور ہوئی۔ وہ بڑی دولت مند ریاست تھی۔ اس کے پاس سونے چاندی اور تانبے کی کانیں تھیں۔ خوش حال شہر تھے جن میں دیس بدیس کا مال دستیاب ہو سکتا تھا۔ تربیت یافتہ فوج تھی جس کی دہشت سے دشمن کانپتے رہتے تھے۔ فریگیا کے گھوڑے اپنی پھرتی اور تیز رفتاری کے لئے دنیا بھر میں مشہور تھے اور اُن کے تجارتی جہازوں کو دیکھ کر یونانیوں کو بھی رشک آتا تھا۔

بہت دن گذرے دَرَدانَس نام کا ایک شہزادہ قسمت آزمائی کرتا فریگیا پہونچا۔ وہ تھریس کا رہنے والا تھا۔ فریگیا کے فرمانروا طیوسَر نے دَرَدانَس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اُسے اپنی فوج میں اعلیٰ عہدہ عطا کیا۔ دَرَدانَس نے میدانِ جنگ میں بڑے کارنامے دکھائے اور فریگیا کے کئی دشمنوں کو زیر کیا۔ تب طیوسَر نے خوش ہو کر اپنی بیٹی دَرَدانَس سے بیاہ دی اور دَرَدانَس کا علاقہ جو سمندر کے پاس، آبنائے کے قریب واقع تھا، انعام میں دے دیا۔ دَرَدانَس نے آبنائے سے چند میل

کے واسطے پر یہاں ٹرو اس نام کا گاؤں پہلے سے موجود تھا ایک شہر بسایا اور اس کا نام دردانیا رکھا۔ مگر آنے والی نسلوں نے آبنائے کو دردانیا کے نام سے یاد کیا اور شہر کا نام ٹرائے پڑا (جو ٹروآس کی بگڑی شکل ہے) ایلیوسر کی وفات پر دردانس پورے فریگیا کا بادشاہ ہوگیا۔

دردانس کے منجھلے بیٹے آئی لس نے باپ کی شہرت کو چار چاند لگائے اور بڑا نام پیدا کیا۔ وہ ابھی شہزادہ تھا کہ ایک دن شکار کھیلتے کھیلتے اس کا گذر ایک نئے شہر میں ہوا۔ وہاں کوئی قومی تہوار منایا جا رہا تھا اور بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ زرق برق پوشاک پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کھیل کا میدان رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا اور ہزاروں آدمی اکھاڑے کے گرد قطار اندر قطار بیٹھے کشتی دیکھ رہے تھے۔ آئی لس بھی تماشائیوں میں شامل ہوگیا۔

پہلوانوں کی جوڑیاں آتیں اور اپنا ہنر دکھا کر لوگوں کو خوش کرتیں۔ جو فتحیاب ہوتا۔ بادشاہ سے خلعت و انعام پاتا۔ جو ہارتا، سرنیہوڑا کر اکھاڑے سے باہر نکل جاتا۔ آخر وہاں کا سب سے نامی پہلوان اکھاڑے میں اترا۔ اس نے پہلے بادشاہ کو جھک کر سلام کیا۔ پھر خم ٹھونک کر نعرہ لگایا: "ہے کوئی سورما جو مجھ سے کشتی لڑے؟" اس کی گونج سے میدان میں سناٹا چھا گیا اور جب دیر تک کوئی پہلوان مقابلے کے لئے اکھاڑے میں نہ آیا تو آئی لس کے خون نے جوش کھایا اور وہ لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں کود پڑا۔ پہلوان نے آئی لس کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ پھر ہنس کر بولا: "اے نوجوان! پہاڑ سے ٹکر لینے کا خیال چھوڑ دے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے لڑنے والے مہینوں بستر پر پڑے ہلدی پیاز کا لیپ کرتے رہتے ہیں؟" آئی لس نے جواب دیا: "اے پہلوان! فریگیا کے عقاب پہاڑ کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے ہیں اور ہوا کے رخ پر گھونسلے بناتے ہیں۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ہمارے حریفوں کا بستر رزم گاہ کی زمین ہوتی ہے؟" یہ کہہ کر آئی لس پہلوان پر عقاب کی مانند جھپٹا۔ دونوں میں دیر تک قوت آزمائی ہوتی رہی۔ اور پھر مجمع یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جواں کا گھٹنا غرور کے سینے پر ہے اور پہلوان بے حس و حرکت چت پڑا ہے۔

بادشاہ نے رسم کے مطابق آئی لس کو زیتون کے پتوں کا تاج پہنایا اور خلعت و انعام کے علاوہ ایک گابھن گائے بھی عطا کی اور کہا کہ جس جگہ یہ گائے بچہ جنے وہیں اپنے نام کا ایک شہر بسانا تو بڑی شہرت پاؤ گے۔ پھر ایسا ہوا کہ گائے نے کوہ آئیڈا کے دامن میں بچہ دیا جو شہر ٹرائے کے قریب واقع تھا۔ آئی لس نے وہیں اپنے نام پر ایلم کا شہر آباد کیا جو رفتہ رفتہ ٹرائے کا حصہ بن گیا۔

آئی لس کے عہد میں ٹرائے کو بہت عروج ہوا۔ اور وہ مغرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا۔ خشکی سے آنے والے قافلے ہوں یا سمندر میں چلنے والے جہاز سب کی آخری منزل ٹرائے ہوتی۔ بیوپاری دور دراز سے آتے اور ٹرائے کی منڈیوں میں خرید و فروخت کرتے۔ پھر وہاں ہر سال ایک عالمی تجارتی میلہ بھی لگتا تھا جس میں مہذب دنیا کے سبھی ملک شریک ہوتے .. اپنی مصنوعات کی نمائش کرتے تھے۔

یونان والوں کو ٹرائے کا یہ فروغ بالکل پسند نہ تھا۔ وہ اس شہر کی دولت و ثروت کو بڑی للچائی نظروں سے دیکھتے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ کب موقع ملے اور ٹرائے پر قبضہ کر لیا جائے۔

ایک بار یونان کا مشہور سورما ہیراکلیس کسی مہم سے واپس آرہا تھا کہ ٹرائے کے ساحل پر اسے ایک نہایت حسین لڑکی چٹان سے بندھی نظر آئی۔ لڑکی کے بدن پر کپڑے کا ایک تار نہ تھا۔ البتہ وہ قیمتی زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔

ہیراکلیس نے پہرہ داروں سے پوچھا کہ یہ کون لڑکی ہے اور اسے یہ سزا کیوں دی گئی ہے۔ پہرہ داروں نے جواب دیا کہ یہ لڑکی ہمارے بادشاہ آئی لس کی بیٹی ہیسیون ہے۔ کچھ عرصے سے ہمارے شہر میں ہر سال طاعون پھیلتا ہے اور ایک سمندری اژدہا پانی سے نکل کر ہمارے مویشیوں کو کھا جاتا ہے۔ خداوند پوس کے پروہتوں کا خیال ہے کہ سمندر کا دیوتا پوسی دان ناراض ہوگیا ہے اور جب تک کوئی بڑی قیمتی بھینٹ نہ چڑھائی جائے ٹرائے کو ان آفتوں سے نجات نہیں مل سکتی اور نہ سمندر کا دیوتا ہم سے خوش ہو سکتا ہے۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے اپنی چہیتی بیٹی کو قربانی کے لئے

پیش کیا ہے۔

ہیراکلیس نے دیوتا کی خفگی کی پروانہ کی۔ حسینہ کی زنجیریں کاٹیں۔ اسے کپڑے پہنائے اور ساتھ لے کر شاہی محل میں آیا۔ آئی لس نے جب سُنا کہ ہیراکلیس نے اس کی جان بچائی ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور ہیراکلیس سے کہا کہ اے یونان کے سورما! میں تیرا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ مگر تجھ سے میری ایک درخواست ہے۔ اگر تو سمندری اژدہے کو قتل کرے تو میں تجھے گھوڑوں کی ایسی جوڑی دوں گا جو ہوا میں اُڑتی اور پانی پر دوڑتی ہے ہیراکلیس ان گھوڑوں کی تعریف سُن چکا تھا۔ اس نے آئی لس کی شرط مان لی۔

ہیراکلیس نے سمندر کے کنارے ایک اونچی دیوار بنوائی تاکہ اژدہا شہر میں داخل نہ ہو سکے اور خود دیوار پر بیٹھ گیا۔ جب اژدہا پانی سے نکلا اور منہ کھول کر دیوار کی طرف لپکا تو ہیراکلیس تلوار سمیت اُس کے منہ میں کود پڑا۔ اژدہے نے ہیراکلیس کو نگل لیا۔ مگر ہیراکلیس نے تلوار سے اژدہے کا پیٹ چاک کر دیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ لیکن کہتے ہیں کہ آئی لس اپنی بات سے پھر گیا اور ہیراکلیس کو ہوا میں اڑنے والے اور پانی پر دوڑنے والے گھوڑوں کے بجائے دوسرے گھوڑے دیئے اور رخصت کر دیا۔

ہیراکلیس کو آئی لس کی یہ وعدہ خلافی بہت بُری لگی اور اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ ایک دن فوج لے کر آؤں گا اور آئی لس کو اس بدنیتی کا مزا چکھاؤں گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ ہیراکلیس نے وطن پہونچ کر ایک زبردست لشکر تیار کیا۔ اٹھارہ بڑے بڑے جنگی جہاز بنوائے۔ دوسری یونانی ریاستوں سے بھی مدد لی اور ٹرائے پر حملہ کر دیا۔ ٹرائے کی فوجوں نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر آخر کار شکست کھائی۔ آئی لس اور اس کے چار جوان بیٹے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ یونانیوں نے شہر کو خوب لوٹا اور ہزاروں عورتیں اور مرد غلام بنائے۔ انھیں میں آئی لس کی بیٹی ہیسیون اور سب سے چھوٹا بیٹا پیرام بھی تھے۔ ہیراکلیس نے ہیسیون کو مشہور یونانی سورما تلاموں کے حوالے کیا۔ تب ہیسیون نے ہیراکلیس سے درخواست کی کہ میرے چھوٹے بھائی پیرام کو آزاد کیا جائے اور ٹرائے کا بادشاہ بنایا جائے۔ ہیراکلیس نے ہیسیون کی درخواست منظور کر لی اور پیرام کو ٹرائے کا تخت عطا کیا۔

پیرام بادشاہ ہوا تو اس نے شہر کو از سرِ نو تعمیر کیا اور بلا دیگر ایک مضبوط چہار دیواری بھی بنوائی تاکہ ٹرائے حملہ آوروں سے محفوظ رہے۔ یہ چہار دیواری کئی گز چوڑی تھی اور اس پر جگہ جگہ برجیاں اور دیدبان بنے تھے تاکہ سمندر سے آنے والے دشمن دور سے دکھائی دیں۔

پیرام کے پچاس بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ اُن میں اُنیس[19] ملکہ ہیکوبا کے بطن سے تھے۔ بقیہ محل کی کنیزوں اور داشتاؤں کے پیٹ سے۔ لیکن بادشاہ ان سب سے برابر کا سلوک کرتا تھا۔ سب سے بڑا بیٹا ہکٹر تھا۔ جو ولی عہد اور فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس سے چھوٹا پیرس تھا۔ یہ وہی پیرس ہے۔ جو یونان کی ملکہ ہیلن کو بھگا کر لایا اور ٹرائے کی آخری جنگ کا بہانہ بنا۔

کہتے ہیں کہ پیرس کی ولادت سے ایک دن پہلے ملکہ ہیکوبا نے خواب دیکھا کہ اس کے پیٹ سے لکڑیوں کا ایک گٹھا نکلا ہے اور بے شمار آتشیں سانپ ان لکڑیوں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ اس دہشت ناک خواب سے اس کی چیخ نکل گئی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پیرام نے اُسے سمجھایا کہ خوابوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے اور خوب دلاسا دے کر سلا دیا۔ لیکن صبح ہوئی تو اس نے اپنے بیٹے الیساکس کو جو غیب داں مشہور تھا، طلب کیا اور ہیکوبا کے خواب کی تعبیر پوچھی۔ الیساکس نے کہا کہ ہیکوبا ایک ایسا بچہ جنے گی جو ٹرائے کی تباہی کا باعث ہوگا۔ پس میری درخواست ہے کہ اس بچے کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔

پیرام نے بیٹے سے کہا کہ تم نے خواب کی تعبیر میں بڑی عجلت دکھائی ہے۔ جاؤ خوب غور کرو اور پھر مجھے بتاؤ۔

الیساکس دو دن کے بعد باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ جہاں پناہ میں نے خوب غور کیا اور احتیاطاً سورج دیوتا اپالو کے بڑے پروہت

سے بھی مشورہ کیا اور ہماری رائے ہے کہ ملکہ اور اس کا بچہ دونوں فوراً ہلاک کر دیئے جائیں۔ مگر پیرام اس کے لئے بالکل آمادہ نہ تھا آخر یہ طے پایا کہ بچہ جونہی پیدا ہو اُسے شاہی گڈریے کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ خفیہ طور پر اُسے ٹھکانے لگا دے اور جب پیرس پیدا ہوا تو بادشاہ نے شاہی گڈریے کو بلا کر حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور قتل کر دو۔ مگر بوڑھا گڈریا بہت نرم دل تھا۔ وہ دودھ پیتے بچے کو قتل نہ کر سکا بلکہ پیرس کو کوہ آئیڈا کی چوٹی پر چھوڑ آیا۔ وہاں ایک بھیڑیے کی مادہ اُسے دودھ پلاتی رہی۔ پانچ دن کے بعد جب گڈریا بچے کی خبر لینے گیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ بچہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ گھاس پر پڑا کھیل رہا ہے۔ گڈریے کو پیرس پر بڑا رحم آیا اور وہ اسے بھرتے کے تھیلے میں چھپا کر گھر لے آیا اور بیوی کے حوالے کیا اور کہا کہ خبردار کسی کو پتہ نہ چلنے پائے کہ یہ بادشاہ کا بیٹا پیرس ہے۔

لیکن یہ راز بہت دن پوشیدہ نہ رہ سکا، پیرس کا حسن، اُس کی ذہانت، اُس کی تنومندی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔

ایک دن پیرس جنگل میں مویشی چرا رہا تھا کہ ڈاکو آئے اور مویشیوں کو پکڑ کر لے جانے لگے۔ بارہ تیرہ سال کے لڑکے نے ان کی بڑی منت سماجت کی کہ ہم غریب لوگ ہیں، ہمیں نہ لوٹو مگر ڈاکو نہ مانے۔ تب اس نے اپنا نیزہ سنبھالا اور مرنے مارنے پر تل گیا۔ ڈاکو ڈر کر بھاگ گئے۔

پیرس دن بھر دوسرے ہمسن چرواہوں کے ساتھ مویشی چرایا کرتا۔ اسے بیلوں کی لڑائی کا بڑا شوق تھا۔ کبھی اپنے بیلوں کو آپس میں ٹکراتا اور تماشا دیکھتا۔ کبھی دوسرے لڑکوں کو للکارتا کہ اپنے بیل لاؤ اور میرے بیلوں سے مقابلہ کرو۔ جو بیل جیتتا اس کی سینگوں کو پھولوں سے سجاتا۔ جو بیل ہارتا اس کی سینگوں پر گھاس کا گچھا باندھ دیتا۔ ایک بار اُس نے بڑی محنت سے ایک خوبصورت تاج بنایا اور ساتھیوں سے کہا کہ جو بیل میرے شاہ بیل کو ہرائے گا یہ تاج اُس کو پہناؤں گا۔

جنگ کا دیوتا آریز لڑکوں کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اُسے ہر لڑائی اچھی لگتی تھی خواہ دیوتاؤں کی ہو، انسانوں کی یا جانوروں کی۔ اُس کو دل لگی سوجھی جھٹ بیل کا روپ دھارا اور پیرس کے بیل سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ پیرس کا بیل بھلا دیوتا سے کیا مقابلہ کرتا۔ لڑائی ہوئی اور پیرس کا بیل ہار گیا۔ لیکن پیرس کے تیور پر بل نہ آیا۔ اُس نے سنہرا تاج آریز دیوتا کو پہنا دیا اور خوب تالیاں بجائیں۔ دیوتاؤں میں پیرس کی فراخ دلی اور دیانت داری کی دھوم مچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوہ اولمپس کی دیویوں میں اس بات پر جھگڑا ہونے لگا کہ کون دیوی سب سے حسین ہے تو خداوند زیوس نے تصفیہ کے لئے پیرس کو منتخب کیا۔

ایک دن پیرس کوہ آئیڈا کی سب سے اونچی چوٹی پر اکیلا مویشی چرا رہا تھا کہ خداوند زیوس کا سفیر ہرمیز دیوتا آیا، طلائی سیب لے کر پیرس کے پاس آیا۔ اُس کے پیچھے اولمپس کی تین سب سے حسین دیویاں تھیں۔ خداوندی ملکہ خاص ہیرا، ہنر اور دانائی کی دیوی ایتھنا، اور حسن و محبت کی دیوی ایفرودتی۔ ہرمیز نے پیرس سے کہا: اے پیرس! خداوند زیوس نے تجھے حکم دیا ہے کہ تو یہ فیصلہ کر کہ ان دیویوں میں کون سب سے زیادہ حسین ہے۔ خداوند نے تجھے دنیا کا سب سے حسین اور حسن شناس انسان بنایا ہے اور خداوند کو یقین ہے کہ تو فیصلہ کرنے میں کسی کی رعایت نہیں کرے گا۔ یہ کہتے ہوئے ہرمیز نے طلائی سیب پیرس کی طرف بڑھایا اور بولا: یہ سیب لے اور جس دیوی کو سب سے حسین سمجھے اُس کو دے دے۔

پیرس حیرت سے کبھی ہرمیز کو دیکھتا، کبھی دیویوں کو جو ایک طرف کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ اُس نے طلائی سیب تو ڈرتے ڈرتے لے لیا مگر معذرت خواہ ہو کر ہرمیز سے کہنے لگا کہ میں غریب چرواہا ہوں۔ میری کیا مجال جو دیوی دیوتاؤں کے جھگڑے چکاؤں یا اُن کا حسن پرکھوں۔ البتہ آپ اجازت دیں تو میں یہ سیب تینوں دیویوں میں برابر برابر بانٹ دوں۔

"نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔" ہرمیز گھبرا کر چیخا۔ "تم خداوند زیوس کا حکم نہیں ٹال سکتے اور نہ مجھے اجازت ہے کہ تمہیں کوئی مشورہ دوں۔ بس تم اپنی

خداداد ذہانت سے کام لو اور فیصلہ کر دو۔"

چار و ناچار پیرس کو دیوتاؤں کا حکم ماننا پڑا۔

اب پیرس دیویوں سے مخاطب ہو کر بولا: آپ جانتی ہیں کہ میں خداوند کے حکم سے مجبور ہوں اور جو خدمت مجھے سونپی گئی ہے۔ اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ میں ایک سیدھا سادہ چرواہا ہوں اور بہت ممکن ہے کہ فیصلہ کرنے میں مجھ سے غلطی ہو جائے مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ غلطی دانستہ نہیں ہوگی اور نہ میں کسی کی رعایت کروں گا۔ میں تو آپ لوگوں کے نام بھی نہیں جانتا اور نہ میں نے اس سے پہلے آپ کو کبھی دیکھا ہے۔ لہٰذا آپ دیویوں سے میری درخواست ہے کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو آپ مجھے معاف کر دیں اور مجھ سے ناراض نہ ہوں۔

دیویوں نے کوئی جواب نہ دیا تو پیرس نے ہرمیز سے پوچھا "یہ بتایئے دیویاں کپڑے پہنے رہیں گی یا اتار دیں گی؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

ہرمیز معنی خیز انداز میں مسکرایا: "مقابلے کی شرطیں تم خود مقرر کر سکتے ہو۔"

"اچھا تو میں دیویوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کپڑے اتار دیں اور باری باری میرے سامنے آئیں۔"

ہرمیز نے دیویوں کو اشارہ کیا اور خود پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

پیرس کے الفاظ سن کر ملکۂ عالم ہیرا کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا اور وہ منہ پھیر کر اپنی عرق آلود پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگی لیکن ایفرودتی ذرا نہ جھجکی اس نے اپنی پوشاک اتار کر دور پھینک دی۔

"اپنا بالہ سحر بھی تو اتارو" ایتھینا تلملا کر بولی: "اسی سے تو تم لوگوں کے دل موہتی ہو ورنہ تم میں اور کیا خاص بات ہے۔"

ایفرودتی نے جل کر جواب دیا: "مجھے منظور ہے مگر اس شرط پر کہ تم بھی اپنا خود اتار دو، برا نہ ماننا۔ خود کے بغیر تم بالکل چڑیل معلوم ہوتی ہو۔"

ایتھینا کچھ کہنے والی تھی کہ پیرس بول اٹھا: "آپ لوگ صبر سے کام لیں تاکہ میں جلد فارغ ہو جاؤں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی اور نے دیویوں کو اس حال میں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔" پھر اس نے ہیرا سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ ذرا ادھر آئیں۔

ہیرا جو اب بالکل برہنہ تھی، شرماتی لجاتی آگے بڑھی اور پیرس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے جسم کو گردش دی تاکہ بدن کا کوئی خوبصورت خط اور زاویہ، کوئی نشیب و فراز پیرس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ جائے۔ "یاد رکھو! میں کوہ اولمپس کی ملکہ ہوں۔ اگر تم نے میرے حق میں فیصلہ کیا تو میں تمہیں پورے ایشیا کی بادشاہت بخش دوں گی اور دنیا کا سب سے دولت مند انسان بنا دوں گی۔" ہیرا نے چپکے سے کہا۔

"اس عنایت کا شکریہ مگر ملکۂ عالم! اتنی بڑی رشوت تو بڑے آدمی ہی ہضم کر سکتے ہیں۔ میں غریب اس لائق کہاں۔ اچھا اب آپ کپڑے پہن لیں۔" یہ کہہ کر وہ ایتھینا کی طرف متوجہ ہوا۔

فن کی دیوی ایتھینا ہوا میں رقص کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور پیرس کے کان میں کہنے لگی: "اگر تم نے طلائی سیب مجھے دیا تو میں تمہیں ہر لڑائی میں جتواؤں گی اور دنیا کا سب سے دانشمند انسان بنا دوں گی۔"

"مقدس دیوی! میں سپاہی نہیں ایک حقیر چرواہا ہوں مجھے لڑائی سے کیا سروکار۔ یوں بھی ہمارے ملک میں ہر طرف امن و عافیت ہے اور کسی کی ہمت نہیں جو ہمارے بادشاہ پیرآم کے خلاف سر اٹھا سکے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ فیصلہ حق و انصاف کے مطابق کروں گا، جایئے کپڑے پہن لیجیے۔"

اب ایفرودتی کی باری تھی۔ سورج کی روشنی میں اس کا بدن کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اتنا آگے بڑھی کہ اس کے

حسن کی آنچ سے پیرس کا سارا جسم پگھلنے لگا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

ایفرودتی بولی "گھبراؤ نہیں پیرس! مجھے خوب جی بھر کر دیکھ لو کیونکہ شاید دوبارہ ایسا موقع نہ ملے۔" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی "مگر تمہیں حسن سے کیا دلچسپی۔ تم اپنی جوانی مویشیوں میں برباد کر رہے ہو۔" پیرس کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رعب حسن سے اس کے ہونٹ ہل کر رہ گئے۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ایفرودتی بھانپ گئی کہ جادو چل گیا ہے کہنے لگی "جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو دل نے فوراً کہا، یہ ہے فریگیا کا سب سے خوبصورت نوجوان۔ لیکن یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ چرواہوں کے بیچ میں تمہارے حسن کی کون قدر کرے گا۔ اس کے لئے تو ہیلن جیسی حسین شہزادی کی نظر چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ ہیلن اگر ایک بار تمہیں دیکھ لے تو گھر بار چھوڑ کر تمہارے ساتھ بھاگ جائے۔"

ایفرودتی نے دیکھا کہ پیرس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی ہیں اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ بڑی معصومیت سے بولی "تم نے ہیلن کا نام تو سنا ہوگا؟"

"نہیں دیوی۔ آج سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ مگر وہ ہے کون؟" پیرس کی آواز میں اشتیاق اور اضطراب تھا۔

"کیا سچ مچ تم نے ہیلن کا نام نہیں سنا؟ ارے وہ تو دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہے" یہ کہہ کر ایفرودتی نے ہیلن کی پوری داستان جلدی جلدی بیان کر دی۔ آخر میں بولی "ہیلن اور بادشاہ مینلاس کی شادی کو کئی سال ہو چکے ہیں اور گو ہیلن دو بچوں کی ماں ہے مگر تم دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ اگر کبھی اسپارٹا جانے کا اتفاق ہو تو ہیلن کی زیارت ضرور کرنا۔" پھر تھوڑی دیر رک کر بولی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ "اور اگر تم ہیلن سے شادی کرنا چاہو تو میں اس کا بندوبست کر سکتی ہوں۔"

"ہیلن سے شادی! مگر دیوی۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ ملکہ میں چرواہے کا بیٹا۔ پھر وہ شادی شدہ بھی تو ہے۔"

"خداوندا! ارے تم تو بہت ہی بھولے آدمی ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ دو دلوں کو ملانا میرا کام ہے۔ اس میں امیر غریب، کنوارا اور شادی شدہ کسی کی قید نہیں۔ اگر تم یونان جانا چاہو تو میں اپنے بیٹے ایروز کو، جو عشق کا دیوتا ہے، تمہارے ساتھ کر دوں گی۔ بس ایک بار تم اسپارٹا پہونچ جاؤ۔ پھر ہیلن کو تمہارے عشق میں دیوانہ بنانا میرا کام ہے۔"

"آپ قسم کھایئے اور وعدہ کیجئے" پیرس نے گھبرا کر کہا۔

ایفرودتی قہقہہ مار کر ہنسی۔ پھر اس نے عہد کیا کہ وہ ہیلن کو پیرس کے عشق میں مبتلا کر دے گی۔ پیرس نے بلا سوچے سمجھے طلائی سیب اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر ہیرا اور ایتھینا کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے آپس میں طے کیا کہ پیرس کو اس کی گستاخی کی سزا دیں گی۔

پھر ایسا ہوا کہ شاہی گڈریے کو بادشاہ کا پیغام ملا کہ سالانہ قربانی کے لئے سب سے اچھا بیل لے کر حاضر ہو۔ پریام یہ قربانی اپنے بیٹے پیرس کی برسی منانے کے لئے بڑی دھوم دھام سے کرتا تھا۔ شاہی ایلچیوں نے اتفاق سے وہی بیل چنا جسے پیرس بہت چاہتا تھا۔ اس پر پیرس ضد کرنے لگا کہ میں اپنا بیل لے کر خود دربار میں جاؤں گا۔ بوڑھا گڈریا ڈرا کہ اگر ٹرائے میں کسی نے پیرس کو پہچان لیا تو غضب ہو جائے گا۔ اس نے پیرس کو بہت سمجھایا کہ تم شہر جا کر کیا کرو گے مگر پیرس نہ مانا۔ آخر گڈریا مجبور ہو گیا اور پیرس کو اپنے ساتھ ٹرائے لے آیا۔

تہوار کے دن ٹرائے میں طرح طرح کے کھیل اور مقابلے ہوتے تھے۔ ایک رسم یہ تھی کہ جونہی رتھ دوڑ کا ہنگامہ ختم ہو تکے بازوں کی جوڑیاں میدان میں اترتیں اور بادشاہ کے تخت کے روبرو اپنے ہنر دکھاتیں۔ پیرس تکے بازی نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی مقابلے میں شریک ہو گیا اور بے ہنری کے باوجود فقط اپنے پھرتیلے پن اور دلیری کے بدولت سب میں ممتاز رہا۔ پیدل کی دوڑ میں بھی وہ سب پر سبقت لے گیا۔ تب پریام کے بیٹوں نے اس کو للکار کر کہا

کہ آؤ ہمارے ساتھ دوڑو۔ پیرس یہ دوڑ بھی جیت گیا۔ اس طرح اُسے یکے بعد دیگرے تین تاج انعام میں ملے۔ اب تو پیرآم کے بیٹوں کو بہت غصہ آیا۔ خفت مٹانے کے لئے اُنھوں نے پیرس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شہر کے پھاٹکوں پر مسلح سپاہی بٹھا دیئے کہ اگر پیرس بھاگنے کی کوشش کرے تو اُسے جان سے مار دیا جائے اور خود ہکٹر اور دی فوبس تلوارے کر پیرس پر جھپٹے۔ نہتے پیرس کو بچنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو بھاگ کر زیوس کی قربان گاہ میں پناہ لی۔ جب بوڑھے گڈریے نے دیکھا کہ پیرس کی زندگی خطرے میں ہے تو دوڑتا ہوا شاہی تخت کے سامنے آیا اور چیخ چیخ کر کہا: "جہاں پناہ! شہزادہ ہکٹر جس لڑکے کی جان کے درپے ہیں وہ آپ ہی کا بیٹا پیرس ہے۔ میں نے اُسے قتل کرنے کے بجائے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اُس کی جان بخشی جائے۔"

بادشاہ نے پیرس کو اپنے روبرو طلب کیا اور ملکہ ہیکوبا سے کہا کہ پہچانو یہ تمہارا بیٹا ہے یا نہیں۔ ملکہ کو یہ راز پہلے سے معلوم تھا مگر اس نے انجان بن کر گڈریے سے پوچھا: "تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟" گڈریے نے اپنی جھولی سے ایک جھنجھنا نکال کر ملکہ کے سامنے پیش کیا۔ یہ وہی جھنجھنا تھا جو اس وقت پیرس کے ہاتھ میں تھا جب بادشاہ کے آدمی اُسے گڈریے کے پاس اٹھا کر لے گئے تھے۔ بس پھر کیا تھا، ملکہ نے دوڑ کر بیٹے کو چھاتی سے لگایا۔ اور خوب پیار کیا اور گڈریے کو بہت سا انعام واکرام دیا۔ پیرآم نے بیٹے کے واپس آنے کی خوشی میں چراغاں کیا۔ دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی اور شہریوں کو تین دن تک شاہی لنگر خانے سے کھانا کھلایا۔

اپالو کے پروہتوں نے جب سُنا کہ پیرس زندہ سلامت محل میں واپس آگیا ہے تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ پیرس کو فوراً قتل کر دینا چاہیئے۔ ورنہ ٹرائے کی خیر نہیں۔ پیرام کو خبر ملی تو اُس نے کہا: "ٹرائے بے شک برباد ہو جائے مگر میں اپنے بیٹے کو ہرگز قتل نہ ہونے دوں گا۔"

پیرس کے بھائیوں نے اُسے بہتیرا سمجھایا کہ شادی کر لو اور عیش کی زندگی گذارو، مگر پیرس نے کہا کہ ایفرودتی مجھ سے چاند سی بیوی کا وعدہ کر گئی ہے۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔ بھائیوں نے سمجھا پیرس مذاق کر رہا ہے اور بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن پیرس دن رات ہیلن کے تصور میں محو رہتا۔ ایفرودتی کے مندر پر بھینٹ چڑھاتا اور اس فکر میں رہتا کہ کیسے موقع ملے اور میں اسپارٹا پہونچوں۔

جب پیرآم کو بادشاہت کرتے بہت دن ہو گئے تو اُسے اپنی بہن ہیسیون کا خیال آیا جس کو یونانی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اُس نے درباریوں کو مشورے کے لئے بلایا اور کہا: میرا ارادہ ہے کہ فوج لے کر یونان جاؤں اور اپنی بہن کو یونانیوں کی قید سے رہائی دلواؤں۔ در اصل وہ اپنے باپ کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ سن رسیدہ درباریوں نے کہا کہ پرانے زخموں کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ یوں بھی ہیسیون اب تلاموّن کی بیوی ہے، اُس کے جوان جوان لڑکے ہیں، وہ اپنا گھر بار، آل اولاد چھوڑ کر یہاں کیوں آنے لگی۔ آخر یہ طے پایا کہ ٹرائے کے ایلچی یونان جائیں اور تلاموّن کو پیرآم کی خواہش سے آگاہ کریں۔

پیرس نے جب یہ سُنا کہ ٹرائے کی سفارت یونان جانے والی ہے تو باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ مجھے بھی سفارت کے ہمراہ یونان جانے کی اجازت دی جائے۔ مگر پیرام نے اُس کی درخواست رد کر دی اور کہا کہ سفیر بن کر جانا شہزادوں کی شان کے خلاف ہے۔

ٹرائے کے سفیروں نے جب اپنے بادشاہ کا پیغام تلاموّن کو پڑھ کر سنایا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ کسی یونانی کے لئے اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی کہ اپنی بیوی کو روایتی دشمنوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر وہ پیرآم جیسے طاقتور بادشاہ کو ناراض کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ٹرائے کے سفیروں کو تو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا اور اپنے ہرکارے یونانی ریاستوں کے سربراہوں کے پاس دوڑائے کہ ان لوگوں کی رائے معلوم کریں۔ سب نے یہی جواب دیا کہ تم ہیسیون کو ہرگز واپس نہ کرنا اور اگر پیرآم نے حملہ کیا تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

تب تلاموّن نے پیرآم کے سفیروں کو دربار میں طلب کیا اور ان سے کہا کہ اپنے آقا کو میرا یہ پیغام پہونچا دینا کہ ہم نے ہیسیون کو بزور شمشیر حاصل

کیا تھا۔ اگر تم میں طاقت ہے تم اپنی بہن کو بزورِ شمشیر چھڑا کر لے جاؤ۔

سفیروں نے پیرآم کو تلامون کا پیغام سنایا تو وہ غصّے سے آگ بگولا ہو گیا اور درباریوں کو دوبارہ مشورے کے لئے طلب کیا۔ پیرس نے بادشاہ کو حملے کی رائے دی اور کہا کہ اگر مجھے اجازت ملے تو میں جنگی جہاز لے کر جاؤں اور اپنی پھوپھی کو یونانیوں کی قید سے نکال لاؤں لیکن تجربہ کار درباریوں نے اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی اور پیرام کو حملے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

اتفاقاً اسی دن اسپارٹا کا بادشاہ مینلاس ٹرائے میں وارد ہوا اور جب پیرس کو پتہ چلا کہ اسپارٹا میں طاعون پھیلا ہے اور مینلاس اس غرض سے آیا ہے کہ اپالو کے بڑے مندر میں بھینٹ چڑھائے تاکہ اس موذی وبا سے نجات ملے تو اس نے مینلاس کی بڑی خاطر مدارات کی اور کہا کہ میں نے منت مانی تھی کہ دن پھرے تو اسپارٹا کے بڑے مندر میں چڑھاوا چڑھاؤں گا۔ مینلاس پیرس کی باتوں میں آ گیا اور اس نے پیرس کو اپنے ہمراہ اسپارٹا چلنے کی دعوت دے دی۔ اب پیرس باپ کے پاس آیا اور عرض کی کہ مینلاس نے مجھے اسپارٹا کی دعوت دی ہے اور میں نے یہ دعوت قبول کر لی ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں مینلاس کے ہمراہ یونان جاؤں اور خفیہ طور پر ہیسیون کے حالات بھی معلوم کروں۔ پیرآم نے اجازت دے دی۔

تب پیرس نے اپنے لئے ایک نہایت خوبصورت جہاز بنوایا اور مستول پر حسن کی دیوی ایفرودتی اور عشق کے دیوتا ایروز کے مجسّمے نصب کئے اور سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ جب پیرس کی چھوٹی بہن کسندرا کو جو بڑی غیب داں تھی، خبر ملی کہ پیرس اسپارٹا جانے کی تیاریاں کر رہا ہے تو اس نے اپنے بال نوچے اور کپڑے پھاڑ کر چیخی اور پیشین گوئی کی کہ پیرس کا یہ سفر ٹرائے پر بڑی تباہی لائے گا، مگر پیرآم نے اس کی باتوں پر دھیان نہ دیا کیونکہ کسندرا ہمیشہ ٹرائے کی بربادی کی پیشین گوئی کیا کرتی تھی۔ اس نے بیٹے کو مینلاس کے ہمراہ ہنسی خوشی رخصت کیا۔

بادِ ہوا موافق آئی اور مہمان اور میزبان ساتویں دن اسپارٹا پہنچ گئے اور پیرس نے ہیلن کو وہ بیش بہا تحفے پیش کئے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ مینلاس نے پیرس کو اپنے محل میں ٹھہرایا اور نو دن تک اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ پیرس کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ وہ روز رات کے کھانے پر ہیلن سے ملتا۔ موقع پا کر کبھی نگاہوں کی زبان سے محبت کا اظہار کرتا۔ کبھی ہیلن کی بے رخی پر ٹھنڈی سانسیں بھرتا۔ بعض اوقات وہ عالمِ کیف میں ہیلن کی شراب کا پیالہ اٹھا کر پینے لگتا اور اپنے ہونٹ وہاں رکھتا جہاں ہیلن کے لبوں کا نشان ہوتا مگر مینلاس کو پیرس پر بالکل شبہ نہ ہوا۔ ایک بار تو ہیلن یہ دیکھ کر گھبرا گئی کہ پیرس نے اپنی انگلی شراب میں ڈبوئی اور میز پر "میں تم سے محبت کرتا ہوں" لکھ دیا۔ لیکن اس نے پیرس کی ان حرکتوں کا ذکر مینلاس سے نہیں کیا۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ مہمان ہے دس پانچ دن میں خود ہی چلا جائے گا۔ اس کی ناشائستہ باتوں کا ذکر کر کے بدمزگی کیوں پیدا کی جائے۔ یا شاید وہ دل ہی میں پیرس کی ان باتوں سے لطف لیتی ہو۔

قضارا انھیں دنوں مینلاس کو اپنے دادا کی برسی میں شرکت کے لئے کریٹ جانا پڑا۔ اس نے ہیلن سے کہا کہ پیرس کا خیال رکھنا اور اس کی مہمان نوازی میں فرق نہ آنے دینا۔

پیرس کو سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ وہ ایفرودتی کے مندر میں گیا اور گڑگڑا کر التجا کی کہ اے حسن و محبت کی دیوی۔ تیرے ایفائے عہد کا وقت آ پہنچا۔ ہیلن کے دل میں محبت کی شمع جلا اور میری دیرینہ آرزو پوری کر۔ ایفرودتی نے بشارت دی کہ مطمئن رہو مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔

اب پیرس دن رات ہیلن کے پاس رہنے لگا۔ کبھی ہیلن کو لے کر سمندر میں نہانے جاتا۔ کبھی شکار کے بہانے جنگل کی سیر کرتا۔ رات کے کھانے پر شراب کا دور چلتا اور وہ ٹرائے کی دولت اور خوش حالی کے قصے سناتا، اس کے چشموں اور مرغزاروں کے گیت گاتا۔ اور ہیلن سے کہتا کہ تم کس

اجاڑ دیس میں پڑی ہو میرے ساتھ چلو اور دیکھو ٹرائے کی دنیا کتنی حسین ہے۔ آہستہ آہستہ ہیلن پر پیرس کی باتوں کا اثر ہونے لگا۔ یوں بھی پیرس اور میلاس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میلاس نہایت خشک اور کور ذوق انسان تھا۔ رقص و سرود، سیر و شکار، شعر و شاعری، غرضیکہ لطافت و جمال کی کسی شے سے بھی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس کے سر، بھوں اور داڑھی کے بال سُرخ تھے، جسم بھدا تھا اور چہرے پر حسن اور ذہانت کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس ہنس مکھ اور زندہ دل پیرس حسن و جمال کا پیکر تھا اور جوانی کی اُمنگوں سے بھرپور۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے پھول سے رس اور رنگ کا آخری قطرہ چوس لے گا۔ ہیلن آخر عورت تھی۔ اور کون عورت ہے جس کو محبت اور خوشامد کی باتیں بُری لگتی ہوں۔ وہ پیرس کے دامِ عشق میں گرفتار ہو گئی۔

پیرس نے اپنے جہاز کو تیاری کا حکم دیا۔ سفر کا ضروری سامان خریدا۔ ایفرودتی کے مندر پر بھینٹ چڑھائی اور ایک رات ہیلن کو لے کر فرار ہو گیا۔ ہیلن نے اپنی نو سال کی لڑکی کو آیا کے پاس چھوڑا البتہ چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیتی گئی۔ اُس کے ہمراہ پانچ کنیزیں بھی تھیں لیکن اس نے زیور اور جواہرات میں سے ایک پیسے کی چیز بھی نہ لی۔ اور جب اُن کا جہاز صبح کے وقت جزیرہ کرانا کے ساحل سے لگا تو ہیلن پیرس کی بیوی بن چکی تھی۔

آسمانی دیویوں کے جھگڑے اور پیرس کے فیصلے کا قصہ تو یونانی داستان طرازوں نے زیب داستان کے لئے وضع کیا تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ہیلن کے حسن کا شہرہ دور دور تک پہونچا تھا۔ ممکن ہے کہ جواں سال پیرس نے بھی اس کا ذکر سُنا ہو اور ہیلن کو دیکھنے کے شوق نے اُسے ٹرائے جاتے پر مجبور کیا ہو۔ یہاں یہ بتا دینا بھی نامناسب نہ ہو گا کہ قدیم افسانہ نویسوں اور شاعروں نے رزمیہ عہد کے جن یونانی بادشاہوں کو شان و شوکت کے زمرّدیں تاج پہنائے ہیں وہ دراصل چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کے مالک تھے۔ یہ ریاستیں خیرپور اور سوات سے بڑی نہ تھیں اور نہ اُن کی آمدنی ہماری اوسط درجے کی زمینداریوں سے زیادہ تھی۔ وہاں نہ کوئی قصرِ جمشید تھا نہ ایوانِ کسریٰ۔ یونانی بادشاہ عالی شان محلوں کے بجائے معمولی مکانوں میں رہتے تھے اور پہرہ چوکی کا بھی دستور نہ تھا کہ بادشاہ تک رسائی دشوار ہو۔ مثلاً بادشاہ میلاس کے مکان میں فقط دو تین کمرے تھے۔ بڑا کمرہ بادشاہ کی خوابگاہ اور بیٹھک دونوں کا کام دیتا تھا۔ وہیں دیوار پر اس کے ہتھیار لٹکے رہتے تھے۔ کمرے کے سامنے ایک سائبان تھا جس میں بیٹھ کر ہیلن چرخہ چلاتی تھی۔ شاہی خوابگاہ سے ملا ہوا ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں اس کی بیٹی اپنی آیا کے ساتھ سوتی تھی۔ چھوٹا بیٹا ہیلن کے ساتھ ہی سوتا تھا۔

یونانی بادشاہوں کا رہن سہن بھی دوسرے شہریوں سے زیادہ مختلف نہ تھا اور نہ اُن میں اور دوسرے سرداروں میں کوئی خاص فرقِ مراتب تھا۔ وہ بادشاہ سے برابری سے ملتے تھے اور ریاست کے انتظام میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

ابھی پیرس نے آدھا سفر بھی طے نہ کیا تھا کہ سمندر میں زبردست طوفان آیا اور جہاز کو مشرق کے بجائے جنوب کی سمت بہا لے گیا۔ ٹرائے کے کہنہ مشق ملاح کئی دن تک آندھی کے تھپیڑوں اور بحرِ روم کی خشمگیں موجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بارے ہوا کا زور ٹوٹا اور زمین نظر آئی تو پتہ چلا کہ مسافر مصر کے ساحل کے قریب آ پہونچے ہیں۔ پیرس نے دو چار دن مصر میں قیام کیا اور جب سفر کی تھکن کم ہوئی تو جہاز کو لنگر اٹھانے کا حکم دیا اور فنیقیا کا رخ کیا۔ شہر سدان میں چند روز رکنے کے بعد یہ قافلہ قبرص ہوتا ہوا آخرکار ٹرائے کی بندرگاہ داخل ہوا۔ ہیلن کے اغوا کی خبر وہاں اس سے پہلے پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ سارا شہر یونان کی حسین و جمیل ملکہ کا منتظر تھا۔

ٹرائے کے باشندوں نے پیرس اور ہیلن کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کا جواں سال شہزادہ ایک شادی شدہ عورت کو بھگا کر نہیں لایا ہے بلکہ یونانی فوجوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے کر لوٹا ہے۔ اور جب انھوں نے خوبصورت ہیلن کو دیکھا تو وہ فرطِ مسرت سے دیوانوں کی طرح سڑکوں پر ناچنے لگے کیا بوڑھے کیا جوان سبھی ہیلن کے عشق میں گرفتار تھے۔

پیرام بھی خوش تھا کہ جو کام اس کی فوجی طاقت سے نہ ہو سکا وہ پیرس نے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر سرانجام دیا اور ہیسیون کے

بدلے یونان کی سب سے حسین ملکہ کو اٹھا لایا۔ اس نے عہد کیا کہ ہیلن کو اپنے جیتے جی واپس نہ جانے دے گا۔ پیرس اور ہیلن کی شادی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی اور وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

اب اسپارٹا کا حال سنئے۔ صبح کے وقت جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہیلن پیرس کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو شہر میں کہرام مچ گیا۔ کوئی مینلاس کو بُرا بھلا کہتا تھا کہ اس سادہ لوح نے ایک اجنبی پر اعتبار کیا۔ کوئی ہیلن پر خفا ہوتا کہ اس بدذات نے مینلاس جیسے شریف شوہر سے بے وفائی کی۔ رہا پیرس، سو اُس سے تو نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ مل جاتا تو اسپارٹا والے اس کا خون پی لیتے۔ مگر لوگوں کو ہیلن کے فرار سے زیادہ یونان کی رسوائی کا خیال دکھ دیتا تھا۔ دنیا یہی تو کہے گی ناکہ یونان کی ایک عورت دشمن کے ساتھ بھاگ گئی اور یونان والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔

اس حادثے کی اطلاع مینلاس کو ملی تو دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ وہ سیدھا ریاست آرگوس کی راجدھانی مکینی پہونچا اور اپنے بڑے بھائی اگیممنان سے، جو یونان کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا، سارا ماجرا بیان کیا۔ اگیممنان نے بھائی کی دل جوئی کی اور کہا کہ تم غم نہ کرو۔ میں ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور ہیلن کو واپس لا کر دم لوں گا۔

اگیممنان مدت سے ٹرائے پر حملے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر اس کو کوئی معقول عذر نہ ملتا تھا۔ یہ عذر پیرس نے فراہم کر دیا۔ اگیممنان نے یونانی ریاستوں کو خط لکھا کہ ٹرائے کا شہزادہ پیرس مینلاس کی بیوی ہیلن کو بھگائے گیا ہے اور یونان کی جگ ہنسائی کا سبب بنا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہیلن کو واپس لائیں اور وطن کی عزت و ناموس کو دھبا نہ لگنے دیں۔ مکینی میں یونانی بادشاہوں کی بیٹھک ہوئی اور یہ طے پایا کہ اتمام حجت کے طور پر پہلے پیرآم سے ہیلن کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے اور اگر پیرآم ہیلن کو واپس نہ بھیجے تو پھر ٹرائے پر حملہ کر دیا جائے۔ سفارت کے فرائض ریاست اتھاکا کے عیار بادشاہ یولی سیس اور اوڈیس کے عیاش سردار آجیکس کے سپرد ہوئے۔ ٹرائے والوں کو سفارتی مہم کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس خبر پر کوئی توجہ نہ دی۔

جس وقت پیرس ہیلن کو لے کر ٹرائے پہونچا تھا اس کا بڑا بھائی اور پیرآم کا دست راست ہکٹر کسی فوجی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ یونانی سفیروں سے کچھ دیر پہلے ہی ٹرائے واپس آیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے اپنی حسین بیوی اینڈروماک سے جو حاملہ تھی وعدہ کیا تھا کہ یہ میرا آخری معرکہ ہے۔ اس کے بعد میں کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گا، اور نہ ٹرائے کو کسی جنگ میں حصہ لینے دوں گا۔ ہکٹر کا شہر میں استقبال ہو رہا تھا اور محل میں اس کی محبوب بیوی ہکٹر کی غیب داں بہن کسندرا کے پاس بیٹھی اپنے نیک سیرت شوہر کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

(مسلسل)

انشائے لطیف

شکور حسین یاد

نادانی کا شعور

دنیا میں نادانوں کا ہمیشہ قحط رہا ہے۔ جس طرح دانائی کہیں نہیں ملتی اور دانا ہر جگہ مل جاتے ہیں، اسی طرح نادان کہیں نہیں ملتے اور نادانی ہر جگہ مل جاتی ہے۔ انسان خود کو دانا تو بلا تکلف سمجھنے لگتا ہے لیکن نادان سمجھنے کے لئے اسے ہزار طرح کے درد و کرب اور کڑے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے مطلب یہ ہے کہ ناتجربہ کاری ہمیں دانا بنا کر بٹھا دیتی ہے اور تجربہ ہمیں نادان ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

علم ایک بوجھل شے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے تھوڑا سا حاصل کر کے بھی انسان خود کو بڑے بوجھ تلے محسوس کرتا ہے۔ یہاں کم و بیش کے مسئلہ کی ایک صورت قابلِ غور ہے۔ کسی چوہے کے ہاتھ ہلدی کی ایک گرہ آ گئی تھی اُس نے اپنے آپ کو پنساری سمجھ لیا۔ یہ کہاوت طنز کے طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اگر چوہے کی نظر میں اتنی وسعت تھی کہ اُس نے ہلدی کی ایک گرہ میں پنساری کی پوری دوکان کو دیکھ لیا تو کون سا گناہ کیا۔ لوگ تھوڑے کو بہت سمجھنا تنگ نظری خیال کرتے ہیں حالانکہ بہت کو تھوڑا سمجھنا بھی وسعتِ نظر کی دلیل نہیں ہے۔ سیر چشمی اشیا سے بے تعلقی نہیں سکھاتی بلکہ اُن کے صحیح مقام سے آگاہ کرتی ہے — اس آگاہی کی بدولت امکانات کے دروازے کھلتے ہیں اور امکانات کا احساس انسان کو کم و بیش کے خدشے اور رعب سے بلند کر دیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم موجوداتِ عالم کی تعداد، مقدار اور صفات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ایک پردہ ہے۔ اصل میں اگر کوئی چیز وجود رکھتی ہے تو یہی پردہ ہے۔ لوگ عدم اور وجود کی بھول بھلیاں میں کھو جاتے ہیں، اس پردے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ کائنات کے تمام تر اثبات کا انحصار اسی پر ہے۔ جس نے اسے دیکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس نے اس پردے کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اُس نے کائنات کے وجود سے انکار کر دیا۔ (ظاہر ہے کہ منکرِ کائنات سے بڑا کافر کون ہو سکتا ہے) یہ پردہ کیا ہے؟ آج اور کل کی درمیانی مدت۔ یہ مدت کیا ہے؟ امکانات کے ظہور کا عرصہ۔ ہر لمحہ ایک پردہ اُٹھتا ہے اور امکانات کے سہارے کائنات وجود میں آتی رہتی ہے۔ وہ دانا جسے اپنے نادان ہونے کا یقین نہیں ہوتا کبھی اس پردے کو اٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔

وجود کی لذت نے انسان کے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کیا ہوا ہے کہ وہ عدم کے بارے میں سوچنے کی سعی بھی کرے تو کچھ نہیں سوچ سکتا۔ تخلیق ہونے کے بعد پہلا سانس ہی اُسے ہستی کے ذائقے سے اس بھرپور انداز میں آگاہ کرتا ہے کہ پھر وہ اس آگاہی سے دم بھر کے لئے جدا ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اب اُسے کوئی لاکھ سمجھائے کہ میاں ہونے کی لذت کے علاوہ نہ ہونے کی ایک لذت ہے اور وہ اس ہونے کی لذت سے کہیں زیادہ وسعت و انبساط کی حامل ہے لیکن انسان اسے ہرگز تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہستی کو جاوداں ثابت کرنے کے لئے وہ طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے۔ طرح طرح سے ذہن کو بقائے دوام کا یقین دلاتا ہے۔ بقائے دوام بُری چیز نہیں ہے لیکن جب ہونے کی لذت، نہ ہونے کے احساس کو فنا کرنے لگے تو پھر ارتقائے ہستی کا رک جانا یقینی ہے۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ ہستی کا ارتقا رک جائے تو نظامِ ہستی میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ عام طور پر افراد کی زندگیاں اسی خلل کا شکار ہو کر بے نام و نشان ہو رہ جاتی ہیں۔ انسان کو ہوش سنبھالتے ہی اپنی دانائی کا احساس تو ہو جاتا ہے کیونکہ دانائی کا احساس وجود کی لذت سے بہرہ یاب ہونے میں مدد کرتا ہے لیکن اپنی

نادانی کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل نادانی کا احساس دانائی کے احساس سے بہت بعد کی چیز ہے، بالکل اسی طرح جیسے نہ ہونے کا احساس ہونے کے احساس سے بہت بعد کی چیز ہے۔

جو کچھ ہو چکا ہے اس کی مثال ایک ذرہ سے بھی کم دی جا سکتی ہے اس کے مقابلے میں جو کچھ کہ ابھی نہیں ہوا۔ گویا وجود کے مقابلے میں عدم کا پلہ بھاری ہے لیکن عدم کے اس حقیقت افروز احساس کو انسان اس وقت تک اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا جب تک اس کو اپنی نادانی کا شعور نہیں ہو جاتا۔

انسان نادان پیدا نہیں ہوتا، نادان مرتا ہے۔ پیدائش کے وقت فطرت اسے اتنا کچھ بتا دیتی ہے جتنا کچھ جاننے کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ آگاہی اور بے خبری کا سوال تو اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے اسی لئے نادانی کا تعلق بچپن سے کم اور بلوغت سے زیادہ ہے۔ بچوں کو نادان کہہ کر ہم اپنی نادانی کا اظہار کرتے ہیں ورنہ بالغ ہونے سے قبل انسان کو نادانی کی ہوا تک نہیں لگتی۔ دنیا کو سطحی طور پر دیکھنے والے اشخاص کے لئے عالم اور دانا بن جانا آسان ہے لیکن جو لوگ سطح سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ہمیشہ نادان رہتے ہیں۔ بچپن سطحوں سے کھیلنے کے زمانے کو کہتے ہیں اور شباب سطحوں کو توڑنے کی قوت کا نام ہے۔ بڑھاپے میں اگر انسان ہر شے کی بیکرانی کے تصور سے لطف اندوز ہوتا ہے جسے اخیر وقت میں بھی نادانی نصیب نہ ہو اس کی بدقسمتی پر جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ نادانی کے شعور کے ساتھ زندگی کی صداقتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر کسی کو ساری عمر میں ایک بار بھی اپنے نادان ہونے کا احساس ہو گیا تو سمجھ لیجئے وہ زندگی کی تنگ دامانی کا کبھی شکوہ نہ کرے گا۔

نادانی زندگی کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی ہے لیکن لوگوں کو اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ وہ ہمیشہ دانائی کے بوجھ تلے کیوں دبے رہتے ہیں؟ انہیں اپنی گردن میں علمیت کا جوا ڈال کر کیوں خوشی حاصل ہوتی ہے؟ وہ نادانی کی لطافتوں میں کیوں نہیں کھو جاتے؟ — ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ انسان جس چیز کو زیادہ پسند کرتا ہے اسی سے وہ زیادہ خائف بھی رہتا ہے لہٰذا اسے جب اپنے پسند کی یہ چیز تھوڑی مقدار میں بھی دستیاب ہوتی ہے تو وہ اسے بہت سمجھ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ زیادہ حاصل کرتے ہوئے اس لئے ہچکچاتا ہے کہ اول تو اس میں محنت درکار ہے، دوسرے یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں ساری کے پیچھے دوڑنے میں آدھی بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ہاتھ سے نکل جانے کا یہی خدشہ تھوڑی چیز کو بہت بنا دیتا ہے چنانچہ انسان بہت کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن جب اسے بہت کچھ کی بجائے صرف کچھ کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو بہت سمجھتے ہوئے علمیت کے فریبِ مسلسل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نادانی کے شعور کی پہلی ضرب اسی فریب پر آ کر پڑتی ہے۔ یہ شعور انسان کو بتاتا ہے کہ اب تک جو کچھ اسے علم حاصل ہوا ہے، اس کی حیثیت نہایت معمولی ہے ابھی اسے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ جیسے جیسے علم بڑھتا ہے نادانی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا جاتا ہے اسی لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سب سے بڑا دانا سب سے بڑا نادان ہوتا ہے۔ "ہم کچھ جانتے ہیں" کہنا جس قدر آسان ہے "ہم کچھ نہیں جانتے" کہنا اتنا ہی دشوار ہے۔ کچھ نہیں جاننے کا اعتراف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے جاننے کی بہت سی کڑی منزلیں طے کی ہوتی ہیں۔ بہت کچھ جان کر کچھ نہ جاننے کا اظہار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ علم و آگہی کے لامتناہی سلسلوں کو محسوس کر لیا گیا ہے گویا کچھ نہ جاننے کا اظہار کرنے والا شخص کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلۂ امکانات پر یقین رکھتا ہے۔

علم اور نادانی ہمرکاب رہیں تو آگہی کا سفر دلچسپ ہو جاتا ہے اور مسافر کو تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اس ہم سفری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ غرور کو حائل ہونے کا موقع میسر نہیں آتا جس کی بنا پر بہت سے کٹھن مرحلے خود طے ہو جاتے ہیں لیکن علم اور نادانی کو یکجا محسوس کرنا آسان بات نہیں ہے۔ علم ایک حاصل کی ہوئی چیز ہے اور نادانی جسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک چیز ہماری خودی کو تسکین پہنچاتی ہے اور دوسری اس پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ اسی لئے انسان خود کو نادان محسوس کرنے میں تامل سے کام لیتا ہے۔ نادانی کو سمندِ شوق کے لئے تازیانہ خیال کرنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

علم چونکہ طاقت ہے اس لئے ایک نشتر بھی ہے اور زہر بھی۔ نادانی کا شعور اس طاقت کے نشتر اور زہر کو موقع و محل کے مطابق برتنے کا [illegible] ہے۔ مطلب یہ ہے کہ علم کے بوجھ کو برداشت کرنے کی قوت نادانی کے گرانقدر اعتراف کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اعتراف انسان کے ظرف کو عالی کرتا ہے۔ اس میں وسعتیں بھرتا ہے اور اس کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافوں کا باعث بنتا ہے۔ جو افراد مسلسل علم حاصل کرنے کے باوجود اپنے نادان ہونے پر اصرار کرتے رہتے ہیں ان کے لئے زندگی ایک ایسے ابلتے ہوئے چشمے سے مشابہت رکھتی ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔

عابد علی عابد



پہلو میں کوئی یارِ طرح دار بھی نہیں
سر پر کسی کا سایۂ دیوار بھی نہیں

برتی نہیں کبھی خلشِ خار کی ادا
تو کم نظر ہے محرمِ گلزار بھی نہیں

موجِ حنا کا میل ہے رنگِ چمن کے ساتھ
لعلِ لبِ نگار کہ گلنار بھی نہیں

کچھ جلوہ گاہِ ناز ہے پھیکی پڑی ہوئی
کچھ اپنے دل میں حسرتِ دیدار بھی نہیں

آہنگِ طائرانِ غزل خواں تو اک طرف
گلشن میں لحنِ مرغِ گرفتار بھی نہیں

کچھ یہ کہ ہم ہیں رنگ کی زنجیر میں اسیر
کچھ یہ کہ وا دریچۂ گلزار بھی نہیں

اے دوستو، وہ باغِ رفاقت ہے سامنے
پھولوں کا ذکر کیا کہ یہاں خار بھی نہیں

جلووں کے ہیں جو محرمِ اسرار تو ہیں
حاصل ہمیں کو طاقتِ دیدار بھی نہیں

بندِ قبا، ادائے حیا، نکہتِ حنا
اس جنس کا تو کوئی طلب گار بھی نہیں

سید عابد علی عابد

○

چمن گزیدۂ بادِ سحر ہے کیا کہیے
ہر ایک پھول گُلِ نیلو فر ہے کیا کہیے

کبھی جنوں کبھی دل خوں ہوا ہے دیدہ ورو
یہی حقیقتِ عرضِ ہنر ہے کیا کہیے

ہمیں بھی یاد تھے اندازِ خوش کلامی کے
رگِ گلو میں نہاں نیشتر ہے کیا کہیے

گزر نہیں ہے کسی کا حریمِ معنی میں
کہ لفظ حلقۂ بیرونِ در ہے کیا کہیے

بہارِ جلوہ فشاں ہے کہ مارِ زہر چکاں
یہ سیلِ خوں ہے کہ گل برگِ تر ہے کیا کہیے

بیانِ مہر و وفا بے اثر ہے کیا کیجیے
زبانِ اہلِ ہوس معتبر ہے کیا کہیے

کوئی وسیلۂ اظہارِ غم نہیں یارو
وہ نقش ہو کہ نوا، بے ثمر ہے کیا کہیے

نصیبِ ہم سفراں تیرا سایۂ دیوار
کہ آگے راہ بہت پُر خطر ہے کیا کہیے

نہ پوچھ عابدِ آشفتہ سر کا حال کہ وہ
تڑپ اُٹھا ہے۔ تو آخر بشر ہے کیا کہیے

باقی صدیقی



وہ مرحلہ بھی غمِ صبر آزما کا تھا
قدم قدم پہ ہمیں بجلیوں نے تاکا تھا

یہ اور بات کہ ہم خار و خس نہ تھے ورنہ
ہمارے سامنے طوفان کس بلا کا تھا

قدم قدم پہ جلائی ہے شمعِ حق ہم نے
اگرچہ زور بہت کفر کی ہوا کا تھا

ہمارے سائے میں آکر سکون سے سویا
ہمیں خیال حریفِ شکستہ پا کا تھا

محاذِ جنگ پہ بھی دوستی کی بات چلی
وہاں بھی سامنا دیرینہ آشنا کا تھا

ہوائے تند چلے اور شمعِ گل نہ بجھے
خدا کے دَر پہ جھکو، فضل یہ خدا کا تھا

شفق کا رنگ تھا آبِ حیات پر باقیؔ
کہ خوں میں ڈوبا ہوا قافلہ صبا کا تھا

باقی صدیقی

موجوں کی طرح رواں رہے ہیں
آزاد رہے جہاں رہے ہیں
دشمن ہی سے پوچھ لیجیے، ہم
دشمن پہ بہت گراں رہے ہیں
بجلی کی چمک کہاں نہیں تھی
بیدار کہاں کہاں رہے ہیں
دل اُن کے ہیں، حوصلے ہیں اُن کے
جو آگ کے درمیاں رہے ہیں
اک سانس بھی جس جگہ کٹھن تھی
ہم مثلِ صبا وہاں رہے ہیں
ہم گُل ہیں، مگر عدو کے سر پر
مثلِ برقِ تپاں رہے ہیں
سُن لے کوئی داستان اپنی
ہم حاصلِ داستاں رہے ہیں
ہر معرکۂ حیات میں ہم
بن کر اپنا نشاں رہے ہیں
ہر امرِ حیات کہہ رہا ہے
ہم صورتِ آسماں رہے ہیں
ہر شاخ متاعِ گلستاں ہے
ہر شاخ پہ نغمہ خواں رہے ہیں
ہر پھُول میں، ہر کلی میں باقیؔ
بن کر گلشن کی جاں رہے ہیں

قتیل شفائی



میں دن ہوں اور تو سورج ہے، تجھ سے روشن میں ہوں
تیری دھوپ نہ چمکے تو اک سونا آنگن میں ہوں

تیری آنچ سے میرے دل میں رنگ برنگ امنگیں
تو ہو مجھ سے دُور تو اک جوگی کا جیون میں ہوں

میں نے دل کے مول کیا ہے تجھ سے پیار کا سودا
جس کو دیکھ کے جل جائیں دھوَاں وہ زر دھن میں ہوں

بھری ہے تیرے انگ انگ میں پیار کی مستی میں نے
یہ مت بھول کہ تُو رادھا ہے اور مدھوبن میں ہوں

تو اک اَن چھائی بدلی تھی، میری چاہ سے پہلے
جس نے گھٹا گھنگھور بنایا ہے تجھے، وہ ساون میں ہوں

آج نہیں تو کل ہوگا احساس تجھے او پگلی!
تیرے سینے میں جو دل ہے اس کی دھڑکن میں ہوں

مانگ دعا تیرا آنچل میرے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹے
تیرا گجرا، تیرا گجرا، تیری جھانجن میں ہوں

جو کچھ بھی ہوں میں تیرا ہوں، مجھ سے پیار نبھانا
سو باتوں کی ایک بات ہے، تیرا ساجن میں ہوں

قتیل شفائی



جب درمیاں ہمارے ، یہ سنگدل زمانہ ، دیوار بن رہا تھا
میں ضبط کی حدوں میں ، تیری خموشیوں کی ، گفتار سن رہا تھا

عرض و طلب کا نغمہ ، کل رات جب چھڑا تھا ، اک سازِ بے صدا پر
تھا محو میں بھی لیکن ، سرِ بیخودی میں تو بھی ، ہر بار دُھن رہا تھا

روزِ ازل سے مجھ کو ، بتخانۂ وفا سے ، تھی اس لیے عقیدت
بکھرے ہوئے بتوں سے ، میں اپنی عظمتوں کے ، شہکار چُن رہا تھا

معلوم تھا یہ کس کو ، غم کی سیاہ راتیں ، کاٹے نہ کٹ سکیں گی
میں آس پاس اپنے ، ہالا تسلّیوں کا ، بیکار بُن رہا تھا

جب پو پھٹی تو بڑھ کر ، کچھ نااُمیدیوں نے ، مجھ سے قتیلؔ پوچھا
کیا تو ہی ہے جوابتک ، موہوم آہٹوں کی ، جھنکار سُن رہا تھا

ناصر کاظمی

○

نویدِ فتح لیے سالِ نیک فال آیا
ہزار سال فدا جس پہ ہوں، وہ سال آیا

اُگل دیئے ہیں زمیں نے دفینے برسوں کے
یہ آج گردشِ دوراں کو کیا خیال آیا

نئے گلاب کی لو سے دمک اٹھی ہے فضا
نئی امنگ لیے موسمِ وصال آیا

ترس گئی تھی نظر جس کو ایک مدت سے
دیارِ دل میں وہی ماہِ لازوال آیا

دلِ حزیں اسے دیکھا ہے آج عمر کے بعد
تجھے قسم ہے جو لب پر کوئی سوال آیا

کدھر سے آیا، کدھر کو گیا، کسے پوچھوں
کچھ اس ادا سے نظر میں وہ خوش خصال آیا

تماشا گاہِ طلوع و غروب میں ناصرؔ
اسے غرور نہ آیا جسے کمال آیا

فارغ بخاری

○

عجیب موسمِ گل ساز لے کے آتا ہے
اداس نہروں کا پانی بھی گنگناتا ہے
سوادِ شامِ غریبی میں اشک بن بن کر
یہ کون میرے خیالوں میں مسکراتا ہے
کبھی کبھی غمِ افتادگی میں خود انساں
بڑے خلوص سے اپنی ہنسی اڑاتا ہے
یہ تابناک مہ و مہر ڈھلتے سائے ہیں
ہر اک عروج، زوال اپنے ساتھ لاتا ہے
ہزار ظلمتِ شب ہو مگر نہ بھٹکیں گے
جنھیں چراغِ نظر راستہ دکھاتا ہے
وفا کی راہ میں ہم موجِ خوں میں ڈوب گئے
زمانہ دیکھیے کیا کیا ابھی دکھاتا ہے
اک ایسا دور بھی دیکھا ہے عشق میں فارغؔ
خود اپنے دل کی عبادت میں لطف آتا ہے

جمیل ملک



راہِ طلب میں آج یہ کیا معجزہ ہوا
خوابِ عدم میں جو بھی گیا، جاگتا ہوا

میداں میں ہار جیت کا یوں فیصلہ ہوا
دنیا تھی اُن کے ساتھ، ہمارا خدا ہوا

برسوں کی دوستی کا چلن کیا سے کیا ہوا!
کس منہ سے ہم ملیں گے اگر سامنا ہوا

صدیوں کا درد، وقت کی آواز بن گیا
پھر سے بپا وہ معرکۂ کربلا ہوا

لایا ہے رنگ خونِ شہیداں بفیضِ شوق
نظروں کے سامنے ہے گلستاں کھِلا ہوا

پتھر بنے ہوئے تھے، زباں دے گیا ہمیں
احساس کی رگوں میں لہو بولتا ہوا

راہیں سمٹ سمٹ کے نگاہوں میں آگئیں
جو بھی قدم اٹھا، وہی منزل نما ہوا

آنکھوں میں مشعلیں ہیں فروزاں دوام کی
دل میں ہے تیری یاد کا کانٹا چبھا ہوا

ق

تو منزلِ حیات سے آگے نکل گیا
میں آ رہا ہوں تیرا پتہ پوچھتا ہوا

جاں نذر کی تو دونوں جہاں مل گئے ہمیں
طے مرگ و زندگی کا ہر اک مرحلہ ہوا

یوں دل میں آج نور کی بارش ہوئی جمیلؔ
جیسے کوئی چراغ جلا دے بجھا ہوا

صادق نسیم



بھرم کھلا تو جہاں کا عجیب منظر تھا
جو ہاتھ غنچہ بکف تھا، اُسی میں پتھر تھا

مجھے ذرا بھی نہ زنجیر سے ہوئی اُلجھن
کہ میرے پاؤں میں پہلے بھی ایک چکر تھا

چراغِ شب تھے تو شمعوں کے ساتھ کیوں نہ بجھے
سحر ہوئی تو یہ الزام بھی ہمیں پر تھا

کسی سے کوئی کرن مستعار کیوں لیتا
میں اپنی روشنیٔ فکر سے منور تھا

میں اشکِ خوں سے جسے مدتوں سجاتا رہا
وہ میری شدتِ احساس ہی کا پیکر تھا

نکھارتا رہا اک عمر نقشِ نادیدہ!
خود اپنا جوہرِ اندیشہ ہی صنم گر تھا

نظر کو آج ترے روپ میں دکھائی دیا
ازل سے جو صدفِ آرزو کا گوہر تھا

قدم تو کیا، تری جانب نگاہ بھی نہ اُٹھی
کہ میری راہ میں حائل مرا مقدر تھا

خوشی کی ایک ہی موج آئی اور ڈوب گیا
یہ دل کہ درد کے ہر بحر کا شناور تھا

جو دل کے زخم تھے آنکھوں میں آ گئے صادق
وصالِ یار سے تو ہجرِ یار بہتر تھا

خلیل رامپوری

○

آنکھوں سے دیکھتا ہوں تماشہ خیال کا
ذرّے میں نور آگیا کس کے کمال کا

دیوار و در کی دھوپ چھتوں پر پہنچ گئی
مجھ کو بھی کچھ عروج دے لمحہ زوال کا

کالک ہے ماہتاب میں کس کے گناہ کی
یہ گل کھلا ہے رات میں کس کی مثال کا

تنہائیوں کے غار سے نکلوں تو سانس لوں
سورج دکھائی دے تو مڑے رُخ خیال کا

دنیا دُکھوں میں ہے تو بہت خوش ہوں آجکل
جی میں اُتار لوں کوئی خنجر ملال کا

جب اس کو دیکھ لو گے سمجھ جاؤ گے خلیلؔ
اک شخص اور بھی ہے تمھاری سی چال کا

○

دریا کا رُخ نہ موڑ مرے اعتبار پر
میں بھی تو اک حباب ہوں پانی کی دھار پر

ہر انقلاب میرے مقدّر میں لکھ دیا
جو فیصلہ کیا مرا، خنجر کی دھار پر

تیری طلب میں ہوں کہ معلّق ہوا میں ہوں
کب سے لٹک رہا ہوں تحیّر کی دار پر

منزل مری جہاں ہے وہ منظر نظر میں ہے
بجلی کڑک رہی ہے سفر کے غبار پر

پل میں تمام جسم کی رنگت بدل گئی
کیا پاؤں پڑ گیا کسی بجلی کے تار پر

بُو باس اُس صنم کی بھی میری طرح کی ہے
وہ پھول بھی کھلا ہے کسی نوکِ خار پر

انور شعور



نہ سہہ سکوں گا غمِ ذات کو اکیلا میں
کہاں تک اور کسی پر کروں بھروسا میں

ہنر وہ ہے کہ جیوں چاند بن کے آنکھوں میں
رہوں دلوں میں قیامت کی طرح برپا میں

وہ رنگ رنگ کے چھینٹے پڑے کہ اس کے بعد
کبھی نہ پھر نئے کپڑے پہن کے نکلا میں

مجھے سمیٹنے آیا بھی تھا کوئی؟ جس وقت
دیار و دشت و دمن میں بکھر رہا تھا میں

مآل تھا یہی آوارگی تو آخر کیوں
اسی کے ساتھ نہ ہر مرحلے سے گزرا میں

نہ صرف یہ کہ مجھی کو نہ تھی امید ایسی
مجھے بھی علم نہیں تھا کہ یہ کروں گا میں

میں خاک ہی سے بنا تھا تو کاش یوں بنتا
کہ اس کے ہات سے گرتے ہی ٹوٹ جاتا میں



ٹوٹا طلسمِ وقت تو کیا دیکھتا ہوں میں
اب تک اسی جگہ پہ اکیلا کھڑا ہوں میں

یہ کشمکش الگ ہے کہ کس کشمکش میں ہوں
آتا نہیں سمجھ میں، بہت سوچتا ہوں میں

میں اہل تو نہیں ہوں کہ دیکھے کوئی، مگر
دنیا! مجھے بھی دیکھ، ترا آئینہ ہوں میں

مجھ سے نہیں، اُسے مرے فردا سے ہے اُمید
منزل ہے کوئی اور، فقط راستہ ہوں میں

اکثر، غرورِ فکر جب اُترا دماغ سے
میں دنگ رہ گیا کہ یہ کیا لکھ گیا ہوں میں

کیا فائدہ مجھے، جو پلٹ کر جواب دُوں
اپنے لیے کہاں ہوں، بُرا یا بھلا ہوں میں

کیا یہ وہی جگہ ہے کہ جس کی تلاش میں
دن رات شہر شہر بھٹکتا پھرا ہوں میں

صدیق افغانی

○

عقل کہتی ہے کوئی بھید نہ کھولا جائے
عشق کہتا ہے بڑے زور سے بولا جائے

کیا قیامت ہے کہ پتھر تو سجے معبد میں
اور انسان کو بازار میں رولا جائے

کیسے ممکن ہے کہ ہو آبِ رواں سا شیریں
ٹھہرے پانی میں اگر شہد بھی گھولا جائے

میکدہ جائے مسرت ہے کہ حیرت کا مقام
جو یہاں آئے، وہ بدلے ہوئے چولا جائے

بار گزرے گی گراں بارئ گل بھی صدیق
اُس حسیں جسم کو پھولوں میں نہ تولا جائے

○

فضا پہ سحر ہے طاری شفق کے رنگوں کا
ہے یہ بھی شعبدہ شاید حسین چہروں کا

ہوا نے شاخ کا رشتہ شجر سے توڑ دیا
بجھا ہوا ہے ہرا رنگ زرد پتّوں کا

چلے نظر سے جو دل کی طرف تو جگ بیتے
یہ فاصلہ تو بظاہر تھا چند لمحوں کا

چٹان کوئی گراؤں گا ٹھہرے پانی میں
کسی طرح جو نہ ٹوٹا جمود لہروں کا

بہار آئی تو صدیق خون بھی چھلکا
خزاں نے رنگ اُڑایا تھا سرخ پھولوں کا

زاہد فارانی

○

خشک لمحات کے دریا میں بہا دے مجھ کو
مرگِ احساس کی سُولی پہ چڑھا دے مجھ کو

کون آ کر ترے انصاف کا مصداق بنے
بے گناہی پہ اگر تو نہ سزا دے مجھ کو

ایک پل میں یہ مرا رنگ اُڑا دیتے ہیں
راس آتے نہیں خوش رنگ لبادے مجھ کو

یوں مجھے دیکھ کے چہرہ نہ چھپا ہاتھوں سے
میں ترا جسم برہنہ ہوں قبا دے مجھ کو

نہ ملی کوچہ و بازار میں ڈھونڈے سے کہیں
جو نظر نقش بدیوار بنا دے مجھ کو

تو ہیولا جو نہیں ہے تو مرے سامنے آ
گنبدِ درد میں چھپ کر نہ صدا دے مجھ کو

○

پیکرِ رنگ ہے، رفتارِ صبا رکھتا ہے
وہ مجھے سارے زمانے سے جدا رکھتا ہے

ہے بجا شہرِ تمنا میں اگر تیرا خیال
دعوۂ ہمسریِ بالِ ہما رکھتا ہے

کیا سلیقہ ہے اُسے مصلحت آمیزی کا
بے دلی کو تہِ ملبوسِ حیا رکھتا ہے

کب سے پھرتا ہے پریشاں صفتِ دودِ چراغ
دل کہ ہر دم ترے کوچے کی ہوا رکھتا ہے

رشکِ فردوس و ارم کنجِ قفس بھی ہے اُسے
اپنے دروازۂ دل کو جو کھُلا رکھتا ہے

صورتِ دشت مرا شہر ہے سنسان مگر
اِک ترا شوق مجھے نغمہ سرا رکھتا ہے

اقبال ساجد

○

پیاسے کے پاس رات سمندر پڑا ہوا
کروٹ بدل رہا تھا، برابر پڑا ہوا

باہر سے دیکھیے تو بدن ہیں ہرے بھرے
لیکن لہو کا کال ہے اندر پڑا ہوا

دیوار تو ہے راہ میں سالم کھڑی ہوئی
سایہ ہے درمیان سے کٹ کر پڑا ہوا

اندر تھی جتنی آگ وہ ٹھنڈی نہ ہو سکی
پانی تھا صرف گھاس کے اُوپر پڑا ہوا

ہاتھوں پہ بہہ رہی ہے لکیروں کی آب جُو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

یہ خود ہی آسمان کی وسعت میں قید ہے
کیا دیکھتا ہے چاند کو چھت پر پڑا ہوا

جلتا ہے روز شام کو گھاٹی کے اس طرف
دن کا چراغ جھیل کے اندر پڑا ہوا

مارا کسی نے سنگ تو ٹھوکر لگی مجھے
دیکھا تو آسماں تھا زمیں پر پڑا ہوا

○

سائے کی طرح بڑھ نہ کبھی قد سے زیادہ
تھک جائے گا، بھاگے گا اگر حد سے زیادہ

ممکن ہے ترے ہاتھ سے مٹ جائیں لکیریں
اُمید نہ رکھ گوہرِ مقصد سے زیادہ

لگ جائے نہ تجھ پر ہی ترے قتل کا الزام
بدنام تو ہوتا ہے بُرا، بد سے زیادہ

خواہش ہے بڑائی کی تو اندر سے بڑا بن
کر ذہن کی بھی نشوونما، قد سے زیادہ

دیکھوں تو مرے جسم پہ شاخیں ہیں نہ پتّے
سوچوں تو گھنا چھاؤں میں، برگد سے زیادہ

رہنے دو، خلاؤں میں مری قبر نہ کھودو
ہے پیار مجھے خاک کی مسند سے زیادہ

آنکھیں تو لگی رہتی ہیں دروازے کی جانب
ملتی ہے خوشی اپنی ہی آمد سے زیادہ

کیا جانیے کیا بات ہے اک عمر سے ساجدؔ
ویران ہے ٹوٹے ہوئے مرقد سے زیادہ

محسن بھوپالی

○

جامِ تہی قبول نہ تھا، غم سمو لیے
پھولوں کے انتظار میں کانٹے چبھو لیے

محرومئ دوام بھی کیا لطف دے گئی
یہ سوچ کر ہنسے ہیں کہ اک عمر رو لیے

ہم ہیں وہ سادہ لوح کہ پا کر رضائے دوست
خود اپنے ہاتھ اپنے ہی خوں میں ڈبو لیے

پچھلا پہر ہے شب کا، کہ ہے شام کا سماں
وہ کیا بتا سکیں گے جو اک نیند سو لیے

کیا جبر ہے، ثبوتِ وفا پیش کیجیے
اور ان کا نام آئے تو پھر لب نہ کھولیے

محسن زبان دیجیے بزمِ خموش کو،
مہمل ہے آج نطقِ سخن، کچھ تو بولیے

احمد ہمدانی

○

جو ذکر آج چلے تھے وہ کچھ نئے بھی نہ تھے
مگر یہ بات کہ دل اس طرح دکھے بھی نہ تھے

کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے، جو ہم سے پہلی بار
ملے تو یوں، کبھی جیسے الگ رہے بھی نہ تھے

ہمارے نام سے لوٹے رہے ہیں زخم وہاں
دکھوں کی بات جہاں لوگ جانتے بھی نہ تھے

نیا ہے عشق کا قصہ، نہ زندگی ہے نئی
مگر یہ کرب جو پہلے کبھی سنے بھی نہ تھے

خود اپنے شہر میں پھرتے ہیں اجنبی جیسے
وہ لوگ کیا ہوئے جو ہم سے چھوٹتے بھی نہ تھے

کسی کی یاد میں وحشت بجاں رہے لیکن
ہم اس سے پہلے کبھی رائیگاں ہوئے بھی نہ تھے

تاج سعید

○

میرے گھر میں چاند اترا تھا — تو تھی یا تیرا سایہ تھا
سرہانڈی میں نوکا ڈالے — میں یادوں میں کھویا ہوا تھا
تیرے روپ کا ہر نظارا — ہر پل ہر چھن نیا نیا تھا
پھیلی نیل امبر پہ دھنک تھی — رنگوں کا دریا بہتا تھا
دیکھ کے سج دھج بازاروں کی — موہ نے من چھلکا سا دیا تھا

میٹھے پھل اور میٹھا پانی — میں اک ایسے دیس گیا تھا
پیڑ سپاری کے دیکھے تھے — ڈاب کا پانی میں نے پیا تھا
ہریالی اور کھیت کی شوبھا — پیپل کا اک پیڑ کھڑا تھا
کھویا کھویا سا، گم سم سا — جیسے اس کو گیان ہوا تھا
یا پھر کوئی گوتم آ کر — اس کے سائے میں بیٹھا تھا

سکھ کی سیج چتا کی صورت — دیکھ کے میں کچھ ڈر سا گیا تھا
تاج پیا کی آنکھ کا بادل
کل ایکا ایکی برسا تھا

روحی کنجاہی

○

دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ صحرا ہوں میں
حادثہ یہ ہے کہ ویران چمن تنہا ہوں میں
جانے کب اہلِ چمن یاد کریں گے مجھ کو
اسی گلزار کا اجڑا ہوا حصہ ہوں میں
لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں موجوں کی طرح
دل سمندر ہے کوئی، اس کا کنارا ہوں میں
ہر گھڑی جس کا باندازِ دگر خون ہوا
آرزو ہوں کوئی ایسی ہی تمنا ہوں میں
پہلے بھی آیا تھا اس شہر میں اب فرق یہ ہے
جب تماشائی تھا، اس بار تماشا ہوں میں
میری فطرت میں ٹھہرنا نہیں لیکن فی الحال
منجمد ہو کے جو رہ جائے وہ دریا ہوں میں
لوٹ جاؤں ترے دروازے سے کیسے کہ مجھے
یاد کچھ بھی نہیں کس راہ سے آیا ہوں میں
اُس کے دامن نے جگہ دی نہ جسے اے رُوحی
اُس کی آنکھوں سے وہ ٹوٹا ہوا تارا ہوں میں

خالد طور

○

خود میں رہتا تھا مگر میں دیکھتا کچھ بھی نہ تھا
آپ سے پہلے مجھے اپنا پتا کچھ بھی نہ تھا

یا تو ہے ایسی گراں جانی کہ جلتا ہے دماغ
یا مری آشفتگی کا سلسلا کچھ بھی نہ تھا

دوست کے چہرے پہ حسنِ دوست نے کھینچے نقوش
موجِ گل کچھ بھی نہ تھی، رنگِ صبا کچھ بھی نہ تھا

آگہی پر چھا گیا اندیشۂ ذوقِ جمال
ہوش کیا آتا کہ جب دیکھا ہوا کچھ بھی نہ تھا

اب کہاں لے خواہشِ لا انتہا لے جائے گی
یہ جہاں میرا، بجز اک نقشِ پا کچھ بھی نہ تھا

مر گئے خالد تو دیکھا، زندگی اور موت میں
دوریاں ہی دوریاں تھیں، فاصلا کچھ بھی نہ تھا

صمد انصاری

○

وہ طاقِ آرزو کہ تھا بامِ جمال بھی
جلتی نہیں ہے اب وہاں شمعِ خیال بھی

احساسِ منزلت ہے کہ نقصِ کمال ہے
اپنے کمال پر نہیں اہلِ کمال بھی

ڈوبا ہے اپنی لَو میں ہر اک شعلۂ چراغ
جل جائے اپنی آگ میں دودِ ملال بھی

آیا حصارِ شب میں کہاں آفتابِ شام
پھیلے تھے آسماں پہ ستاروں کے جال بھی

آخر کو آ گئے ہیں سرِ کوچۂ اجل
آسودۂ مرام بھی آشفتہ حال بھی

انگارے دب گئے ہیں صمد اپنی راکھ میں
اک دن ہٹا کے دیکھیے گردِ خیال بھی

صفدر شفق

○

رنگ تھا ڈوبتے سورج کا سا، چال غزالوں جیسی تھی
وہ لڑکی تو یارو بالکل میرے خیالوں جیسی تھی

اُس کا کندن روپ کچھ ایسے ساری فضا میں پھیل گیا
جیسے اُس کی آنکھ بھی اُس کے دیکھنے والوں جیسی تھی

چاند کی کنواری کرنیں جھانک رہی تھیں آنکھوں سے
رنگت اُس کے رخساروں کی، برف کے گالوں جیسی تھی

اُس سے پہلے ایک برس بھی اک پل میں کٹ جاتا تھا
اُس کے بعد کی ایک گھڑی بھی کتنے سالوں جیسی تھی

پہلی بار اُسے جب دیکھا آخری بار بھی دیکھ لیا
ایک کرن جو اس سے ملی تھی، لاکھ اُجالوں جیسی تھی

وحید اختر

○

پہلے بات اپنی سناؤ لوگو
پھر مرا درد بٹاؤ لوگو

ہم تو ہیں اُس کے پجاری، لیکن
تم اُسے ہم سے چھپاؤ لوگو

پرسشِ غیر کرو گے کب تک
زخم اپنے بھی دکھاؤ لوگو

میں تو خود بھول چکا ہوں خود کو
تم بھی اب بھول ہی جاؤ لوگو

گر نہیں اس کا مداوا کوئی
کیوں میرا درد بٹاؤ لوگو

یاد کی آگ میں جلتا ہے بدن
راکھ ہونے سے بچاؤ لوگو

انتظار حسین

آخری خندق

اس روز بھی کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ پیشکار صاحب روز کی طرح اس روز بھی گذرتے گذرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے ٹھٹھکے رہ گئے۔ مگر کوئی ایسی لمبی چوڑی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ لمبی چوڑی باتیں تو جنگ کے دنوں میں ہوا کرتی تھیں۔ پیشکار صاحب گذرتے گذرتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے ٹھٹھکتے اور کہنے لگتے "مرزا صاحب رات تو بہت توپ چلی ہے۔"

مرزا صاحب حقہ پیتے پیتے حقہ کی نے الگ کرتے اور کہتے "میرے خیال میں تو رات بھر چلی ہے۔ میں بارہ بجے کے بعد سویا ہوں۔ مگر آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر کھل گئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ زلزلہ آ گیا ہے۔"

"ہاں صاحب کچھ لمبا ہی کام ہوا ہے رات۔"

"میرا خیال یہ ہے پیشکار صاحب کہ اپنے شیر امرتسر پہنچ گئے۔"

"اماں نہیں۔"

"مت مانو جی۔ آ جائے گی کل تک خبر۔ خود پتہ چل جائے گا۔"

یوں ان دنوں بھی پیشکار صاحب مرزا صاحب کی رایوں سے کچھ بہت زیادہ اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپس میں مفاہمت تھی۔ کشیدگی تو اس کے بعد شروع ہوئی ہے اور عجب طرح سے شروع ہوئی۔ مگر خیر ذکر تو اس روز کا ہے۔ اس روز تو پیشکار صاحب نے کوئی ایسی بات نہیں ہی تھی۔ بات تو بس ایک ہی کہی تھی جو روز رستہ چلتے چلتے کہا کرتے تھے۔ اور رستہ چلنے کا پیشکار صاحب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ بات یہ ہے کہ پیشکار صاحب اب خاصے عرصے سے ریٹائر ہیں۔ مگر وہ جو صبح صبح گھر سے تیار ہو کر نکلنے کی عادت تھی وہ قائم ہے۔ اب وہ کچہری نہیں جاتے تو ڈاکٹر صاحب کی دوکان پر جاتے ہیں۔ اور جب تک دوپہر نہیں ہو جاتی اور ڈاکٹر صاحب دوکان سے اٹھتے نہیں گئے وہ وہاں مستقل ڈٹے بیٹھے رہتے ہیں اور مرض کے بہانے اور بے بہانے آنے والوں سے سیاست پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ خیر بیٹھ کر ہی گفتگو کریں۔ مگر انہیں تو باتیں کرنے کا ایسا چسکا ہے کہ چلتے چلتے کسی بھی نکڑ پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کسی کو روک کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ تو کبھی اس نکڑ پہ کھڑے ہو جانا کبھی اس نکڑ پر ٹھٹھک جانا۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا۔ رستہ میں مرزا صاحب کا کوارٹر بھی آتا تھا۔ تو مرزا صاحب کو برآمدے سے باہر احاطہ میں بیٹھا دیکھ ان سے بھی ڈیڑھ بات کر لیا کرتے تھے اور اس روز بھی ڈیڑھ بات ہی ہوئی تھی۔ رہا خندق پر اعتراض تو خندق پر تو پیشکار صاحب کو اعتراض اسی روز سے چلا آ رہا تھا جس روز سے انہوں نے اپنی خندق پٹوائی تھی۔ خندقیں اس کالونی میں اچھی خاصی تعداد میں کھدی تھیں۔ اور ایک خندق تو خود پیشکار صاحب ہی کی تجویز پر کوارٹروں کے سامنے والے اس میدان میں بھی کھدی تھی جہاں لڑکے بارہوں مہینے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کے بعد یہی خندق سب سے پہلے زد میں آئی۔ فائر بندی کے تیسرے دن لالو مہترانی اپنا ٹوکرا اس خندق میں الٹ گئی۔ پیشکار صاحب نے گذرتے گذرتے جب خندق کو یوں خراب دیکھا تو انہوں نے بہت شور مچایا۔ لالو مہترانی اس دن تو دہل گئی تھی، بلکہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ دہلی ہوئی رہی۔ مگر اس کے بعد اس نے الکساہٹ میں دور جانے کی بجائے پھر وہاں اپنا ٹوکرا الٹ دیا۔ اس بار کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ اس نے دوسرے دن بھی اپنا ٹوکرا وہیں الٹا اور دوسرے دن بھی کسی نے دھیان نہیں دیا۔ اور اب تو دھیان دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ خندق کوڑے کرکٹ سے لبالب بھر چکی ہے۔ بلکہ اب تو اونچی ہو گئی ہے۔ آس پاس کے کوارٹروں کی مرغیاں ہر پھر کر اسی مقام بلند پر آتی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی مرغا گردن ہلا کر لپکا کر کسی مرغی کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پھر اپنے پھیلے ہوئے پنجوں سے زور زور سے کوڑے کو کریدتا ہے اور بازو پھٹپھٹا کر بہت زور سے بانگ دیتا

ہے۔ مرغیوں کے پر یہاں خاصے ہی بکھرے پڑے ہیں۔ اور ایک دن تو یہاں ایک مری ہوئی بلی بھی پڑی ہوئی تھی۔ خیر وہ تو دوسرے ہی دن کوڑے کی گاڑی آنے پر اٹھ گئی تھی۔ مگر جنگ کے دنوں میں یہ خندق کتنی صاف ستھری تھی۔

ویسے دوسری خندقوں کی یہ صورت نہیں ہوئی۔ دوسری خندقیں تھیں بھی تو کوارٹروں کے اندر۔ یہ سب کوارٹر ایک جیسے ہیں۔ آگے مختصر سا برآمدہ۔ برآمدے کے آگے مختصر سا لان۔ لان کے آگے پست دیوار۔ جنگ کے دنوں میں ہر برآمدے کے آگے ایک خندق کھد گئی تھی۔ اور جنگ کے دنوں میں یہ خندقیں کتنی صاف ستھری تھیں اور تازہ کھدی ہوئی مٹی سے کیسی سوندھی سوندھی خوشبو نکلتی تھی۔ اب یہ سوندھی سوندھی خوشبو کہاں۔ اب تو انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ صدیوں پہلے یہاں کوئی جنگ ہوئی تھی اور خندقیں کھدی تھیں۔ اب خندقیں نہیں ہیں، خندقوں کے آثار ہیں۔ سوکھے سڑے پتے، پھٹی ٹوٹی پتنگیں، کبوتروں کے باسی پر، سرکنڈوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، کوئی ٹوٹی پھوٹی شیشے کی بوتل، کوئی زنگ آلود ٹین کا ڈبہ، کوئی پچکی ہوئی سگریٹ کی ڈبی، کوئی تڑا مڑا لیڈی شو، کوئی مٹی میں رلا لیر لیر دوپٹہ، کوئی صحیح وسلامت انڈرویر ———— سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انمل بے جوڑ چیزیں خندقوں میں کن کن رستوں سے پہنچیں۔ اور اب ہر خندق آثار قدیمہ کی روایت کا حصہ نظر آتی ہے۔ پہلی کوٹھی والوں نے اچھا کیا کہ فائر بندی ہوتے ہی اپنی خندق پٹوا دی۔ یوں تو اس کالونی میں کوارٹر ہی کوارٹر ہیں مگر اکا دکا کوٹھی بھی ہے ہی۔ اور پہلی کوٹھی والے تو بہت معزز لوگ ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ تیسرا بیٹا وظیفہ پر امریکہ گیا ہوا ہے۔ فائر بندی کے دوسرے ہی دن انہوں نے ڈرائیور سے کہا کہ کار کو اب دھلوا لو اور مالی کو بلوا کر کہا کہ لان بہت برا لگ رہا ہے، خندق کو پاٹ دو۔ مگر خیر ذکر تو مرزا صاحب کی خندق کا تھا۔ یہ خندق جتنی صاف ستھری جنگ کے دنوں میں تھی، اتنی ہی جنگ کے بعد کے دنوں میں بھی رہی۔ مگر پیشکار صاحب نے اس میں کونسا بھس ملا دیا۔ اس روز کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ اور خود پیشکار صاحب ہی اپنی خندق کب پٹوا رہے تھے۔ بس اچانک ہی ان پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ ہوا کیا کہ ایک روز صبح صبح جب وہ گھر سے نکلنے لگے تو برآمدے ہی میں تھے کہ انہیں خندق سے کچھ کھسر پھسر کی کچھ سانسوں کی آواز سنائی دی۔ وہ متجسس خندق کی طرف بڑھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ دو لڑکے اچک کر خندق سے نکلے اور تیز ہو گئے۔ پیچھے رہ جانے والے گورے چٹے لڑکے کا پاجامہ تھوڑا کھسک چلا تھا اور کمر بند زمین میں گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سڑک کے بیچ رک کر پاجامہ کو اوپر اکسا، کمر بند کو نیفے میں ٹھونسا اور پھر ایسا تیز دوڑا کہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید اس روز ڈاکٹر صاحب کی دوکان پر کسی جھکی مریض سے کہ خود کو سیاسی امراض کی تشخیص میں ماہر جانتا تھا، پیشکار صاحب نے سیکنڈ فرنٹ پر لمبی ہی بحث کر ڈالی۔ جب دوپہر کو واپس ہوئے تو تھوڑے سے جھلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے برا سا منہ بنا کر نذیرا کو آواز دی "ابے نذیرا، یہ خندق آج پٹے گی۔ حرامزادوں نے خندق کو بدمعاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔" برآمدے میں جاتے جاتے وہ رکے اور مڑ کر کہنے لگے "اور کوئی لڑکا یہاں قدم نہ رکھے .... حرامزادے۔" اور پیشکار صاحب منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

دوسرے دن پیشکار صاحب گھر سے نکلے تو چلتے چلتے مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے ٹھٹھکے۔ کہنے لگے "مرزا صاحب میں نے تو خندق پٹوا دی ہے تم بھی پٹوا دو۔ جنگ اب نہیں ہوگی۔"

مرزا صاحب کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ مگر پیشکار صاحب دوسرے دن گزرتے ہوئے پھر رکے۔ خندق کو غور سے دیکھا اور پھر بولے "مرزا صاحب سن جاؤ جی۔ بہت ہو گئی۔ خندق اب پٹوا دو۔"

مرزا صاحب نے مشورے کو پھر رد کر دیا۔ تیسرے دن پیشکار صاحب گزرتے گزرتے رکے۔ مشورہ تو انہوں نے کوئی نہیں دیا۔ بس حیرت سے خندق کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے "کمال ہے، ابھی تک خندق کھدی ہوئی ہے۔"

مرزا صاحب نے اس مرتبہ تو جواب دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خاموشی سے حقہ پیتے رہے اور پیشکار صاحب کو تکتے رہے۔ پیشکار صاحب نے خندق کو تھوڑی دیر تک بنظر حیرت دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بحث نہیں کرتے۔ شاید اسی لئے ان کی اور پیشکار صاحب کی گفتگو کبھی لمبی نہیں کھنچی۔ اور کبھی نہ دیکھا کہ پیشکار صاحب احاطہ میں آکر بیٹھے ہوں اور اطمینان سے باتیں کی ہوں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ پیشکار صاحب چلتے چلتے رکے۔ ایک بات ادھر سے ہوئی ایک بات ادھر سے ہوئی۔ اور آگے بڑھ گئے۔ دونوں ہی کو وضع دار دیکھا۔ مرزا صاحب نے کبھی اندر آنے اور بیٹھنے

کی دعوت نہیں دی۔ پیشکار صاحب کبھی اندر احاطہ میں آکر بیٹھے نہیں۔ مگر ان کا اب یہ روزمرہ بن گیا تھا کہ گذرتے گذرتے رکتے اور کہتے کہ "مرزا صاحب مان لو ہماری بات۔ خندق اب پٹوا دو۔"

اس مشورے نے مرزا صاحب پر کبھی اثر نہیں کیا۔ انہوں نے خندق کو اسی طرح صاف ستھرا رکھا جس طرح جنگ کے دنوں میں رکھا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ضرور ہوا تھا کہ آس پاس کے کوارٹروں کے دو نٹ کھٹ لڑکے خندق کے کنارے آکھڑے ہوئے اور اپنی اپنی دھار کا مقابلہ کرنے لگے۔ مگر مرزا صاحب نے تنت موقعہ پر انہیں دیکھ لیا۔ نٹ کھٹ لڑکے بھاگ لئے اور مرزا صاحب لالو مہترانی کو بلا کر لائے۔ اس نے نیچے اتر کر گیلی مٹی کو کھرچ دیا اور خندق پھر پاک صاف ہو گئی۔ ایک دفعہ انہیں نٹ کھٹ لڑکے ایک بلی کے بچہ کو بھی ڈھکیل گئے تھے اور وہ کئی گھنٹے اس میں گرا پڑا میاؤں میاؤں کرتا رہا۔ پھر جب مرزا صاحب نے جب اسے باہر نکالا تو وہ ضرور مٹی میں اٹ گیا تھا۔ مگر خندق کی مٹی اس کے گوموت سے خراب نہیں ہوئی تھی۔ البتہ برابر کے کوارٹر کی اس چتی بلی نے تھوڑی خرابی ضرور کی تھی جو رات کے اندھیرے میں جانے کہاں سے ایک کبوتر منہ میں دبوچ کر اس خندق میں اتری اور سارا کبوتر چٹ کر کے پنجے پر اور پر وہاں چھوڑ گئی۔ صبح کو جب مرزا صاحب نے خندق کا یہ احوال دیکھا تو خود اس میں اترے اور بڑی احتیاط سے ایک ایک پر چن کر خندق سے باہر پھینکا۔ مگر کبوتر کے پروں اور پنجوں سے خندق خراب تو نہیں ہو سکتی تھی۔ خراب تو وہ اس لیے لجلجے چھیچھڑے سے بھی نہیں ہوئی تھی جو اوپر سے گذرتی ہوئی چیل کے پنجوں سے گر کر عین خندق کے اندر گرا تھا۔ ہاں خرابی یہ ہوئی کہ جب مرزا صاحب چھیچھڑے کو باہر پھینک کر خندق سے نکل رہے تھے تو پیشکار صاحب عین اس وقت اس طرف سے گذرے۔ مرزا صاحب کے مٹی میں اٹے کپڑوں کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے "مرزا صاحب میں پھر کہتا ہوں کہ اب یہ خندق بند کرا دو۔"

مرزا صاحب نے پھر ہنس کر بات ٹال دی۔ اور مونڈھے پر بیٹھ خاموشی سے حقہ پینا شروع کر دیا۔ مگر اس روز جانے انہیں کیا ہو گیا حالاں کہ اس روز بھی کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ بس یہی تو ہوا تھا کہ پیشکار صاحب حسب معمول گذرتے گذرتے رکے۔ خندق کو دیکھا اور ہنسنے لگے۔ جب خوب ہنس چکے تو کہنے لگے "مرزا صاحب اب فرماؤ جی۔ میں نہ کہتا تھا کہ خندق بند کرا دو۔ سن لیا نا۔"

مرزا صاحب نے حقہ پیتے پیتے خاموشی سے پیشکار صاحب کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب وہ گذر گئے تو اخبار وہیں مونڈھے پر چھوڑا اٹھے اور اندر چلے گئے۔ مرزا صاحب کا معمول ہمیشہ یہ رہا کہ صبح ہوئی اور وہ حقہ تازہ کر ہاتھ میں سنبھال اندر سے برآمدے میں آئے، برآمدے سے مونڈھا اٹھا باہر احاطہ میں آ بیٹھے۔ گرمی کے دن ہوئے تو چھاؤں میں، جاڑے ہوئے تو دھوپ میں مونڈھا بچھایا، حقہ سامنے رکھا اور گذرتے ہوئے ہاکر سے اردو کا اخبار لے پڑھنا شروع کر دیا۔ جب کہیں دوپہر ہوئی تو اندر چلے گئے۔ مگر آج تو وہ باہر آکر بیٹھے تھے کہ اخبار کی ایک ڈیڑھ خبر کو دیکھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اندر چلے گئے۔ شاید پیشکار صاحب کی بات سے ان کی طبیعت منغض ہو گئی ہو۔ یا شاید ان کی طبیعت ہی خراب ہو۔ بہر حال پیشکار صاحب نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں تھی۔

مرزا صاحب دوپہر بعد کہیں پھر باہر آئے مگر ابھی مونڈھے پر بیٹھے ہی تھے کہ انہیں بدبو آنی شروع ہوئی۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں سے بو آ رہی ہے۔ آخر انہوں نے خندق میں جھانکا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مرا ہوا چوہا پڑا ہے۔ سخت بے مزہ ہوئے۔ بھاگ دوڑ کر کے لالو مہترانی کو گھیرا اور اس سے چوہا نکلوایا۔

جب چوہا نکال پھینکا گیا تو مرزا صاحب خندق کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے نذیرا کو بلا کر کہا کہ "نذیرا آج یہاں اس خندق کو پاٹ دو۔ اب یہ نجس ہو گئی۔"

دوسرے دن صبح کو پیشکار صاحب معمول کے مطابق کوارٹر کے سامنے رکے۔ مگر وہ کچھ ٹھٹھک سے گئے۔ خندق سچ مچ بند ہو چکی تھی۔ اس روز مرزا صاحب سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ آنکھوں سے آنکھ نہیں ملی۔ بس پیشکار صاحب گذر ہی گئے۔

پیشکار صاحب کا معمول جاری ہے۔ وہی صبح صبح گھر سے نکلنا اور ڈاکٹر صاحب کی دوکان کی طرف چل پڑنا۔ کبھی اس نکڑ پہ رک کر اس سے بات کرنا۔ کبھی اس نکڑ پر ٹھہر کر اس سے گفتگو کرنا۔ ہاں اب وہ مرزا صاحب کے کوارٹر کے سامنے نہیں رکتے۔ مرزا صاحب اب بھی روز صبح کو مونڈھا بچھا کر اور حقہ سامنے رکھ کر اخبار ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں۔ مگر خندق اب وہاں نظر نہیں آتی۔ جہاں خندق تھی وہاں اب چھوٹی چھوٹی گھاس اگی ہوئی ہے۔

مسعود مفتی

رضائی

آج مجھے پھر ڈر لگ رہا تھا۔

بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ جنگ وقتی طور پر بند ہو چکی تھی۔ زخمیوں کے وارڈ سے میری ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ میں دفتر میں بیٹھ کر مختلف رجسٹروں میں اندراج کرتی اور رضائیاں، کپڑے اور تحفے وصول کرتی تھی۔ وقت گو رات کا تھا مگر چھوٹے سے کمرے میں بڑے بڑے بلب روشنی کر رہے تھے۔ اس روشنی کے باوجود مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

میں بچپن سے ہی ڈرپوک ہوں اور مجھے اکثر ڈر لگتا ہے۔ گھر والے میرا مذاق بھی اڑا دیتے ہیں —— عموماً ڈر اچانک پہنے کی وجہ سے لگتا ہے۔ اگر آدمی ذہنی طور پر کسی چیز کے لئے تیار نہ ہو اور وہ اچانک ہو جائے تو ڈر کر چیخ مار دیتا ہے۔ مگر آج والا ڈر ایسا نہ تھا —— میں بس کرسی پر بیٹھی بیٹھی سہم رہی تھی۔

ایک دفعہ پہلے بھی مجھے ایسا ہی ڈر لگا تھا، بغیر کسی وجہ کے۔ وہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات تھی۔ آدھی رات کو میری آنکھ بغیر کسی ڈراؤنے خواب کے کھل گئی مگر میں پسینہ میں شرابور تھی جیسے سخت وحشت میں ڈوبی ہوئی ہوں۔ کتنی دیر تک میں نے آنکھ کھول کر کروٹ بدلنے کی کوشش نہ کی۔ بالکل ساکت لیٹی کلمہ پڑھتی رہی مگر یوں کہ ہونٹ بھی نہ ہلیں، مبادا وہ انجانی طاقت جو مجھے خوفزدہ کر رہی تھی، ہلتے ہونٹ دیکھ کر مجھے دبوچ لے۔ کافی دیر بعد ابو صبح کی نماز سے کچھ پہلے اٹھے تو میرا دل چاہا کہ دوڑ کر ان سے لپٹ جاؤں مگر دوسرے شخص کو بیدار پا کر میں اپنی بے وقوفی پر خود ہی پشیمان ہونے لگی —— گو ڈر بدستور قائم تھا۔

اتنے میں یک لخت خطرے کے سائرن لاہور کی خاموش ٹھنڈی نیم روشن فضا میں گونجے —— میں ایک دم کمبل دور پھینک کر اتی سے جا لپٹی اور اپنی کپکپی سے ان کی چارپائی ہلا دی۔

پھر تھوڑی دیر بعد دور سے گولے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اب باقی سب ڈرنے لگے مگر میرا ڈر ختم ہو گیا —— جیسے مجھے اسی چیز کا انتظار تھا۔ اور اب اطمینان ہو گیا ہے۔

کچھ دیر بعد ہم مکان کی چھت پر چلے گئے۔ دور سے لگاتار گولیاں چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ جیسے کوئی پاس بیٹھا حقہ پی رہا ہو۔ گیارہ بجے ریڈیو پر اعلان ہونے سے پہلے ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ ہندوستان سے جنگ شروع ہو گئی ہے۔

مگر اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے —— پھر مجھے آج کیوں ڈر لگ رہا ہے —— میں نے ابھی ابھی ریڈیو پر خبریں بھی سنی تھیں تو حالات معمول پر تھے۔ کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

"او خدا!" میں نے سہم کر کمرے، دروازوں اور کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ وہ بند تھے۔ بلب بالکل خاموشی سے لٹکا ہوا روشنی دے رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ والا بنچ خالی اور ساکت تھا۔ کھڑکی کے پاس چھوٹی میز میں بھی کوئی جان نہ تھی۔ میری پشت پر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی پرانی رضائی بھی بے حس و حرکت پڑی تھی۔ یہ تھوڑی دیر پہلے مجھے ہلی تھی ——— کمرے کی سب چیزیں دم سادھے تھیں۔ میرے ذہن میں تشبیہہ ابھری۔ جیسے قبرستان کی خاموشی ——— اور قبرستان کا خیال آتے ہی ڈر کی ایک لہر دماغ میں گھوم گئی ——— میں نے سر جھٹک کر خیالات بدلنے کی کوشش کی اور دل کی تسلی کے لئے میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا لیا۔

اتنے میں ——— بڑی مدھم ——— مگر بڑی واضح ——— سسکی کی آواز کمرے کی خاموشی میں ابھری۔

میں اتنی سہم گئی کہ ہل بھی نہ سکی اور سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اوپر کی طرف چڑھتی محسوس ہوئی ——— گو میں ڈری اسی سسکی سے تھی تاہم میرے دہشت زدہ حواس بے صبری سے دوسری سسکی سننے کے منتظر تھے ——— اور چند لمحے بعد واقعی دوسری سسکی کی آواز ابھری۔

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں گھما کر سر ہلائے بغیر آنکھوں کے کونوں سے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ——— پھر بڑی احتیاط سے گردن موڑ کر کمرے کا جائزہ لیا ——— ہر چیز پہلے کی طرح ساکت اور خاموش تھی ——— قطعی کوئی حرکت نہ تھی۔ پراسرار سکوت میرے کندھوں کے پیچھے بے چینی پیدا کرنے لگا ——— کمرے سے کچھ دور کاریڈور میں لوگ گذر رہے تھے۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں کسی کو بلا سکوں۔

"تڑاخ" کمرے کی خاموشی کو اس آواز نے پاش پاش کر دیا۔

"اوئی!!" میں نیم مردہ چیخ مارتے ہوئے کرسی سے اچھلی۔

میں نے بے یقینی سے فرش پر گرے ہوئے پیپر ویٹ کو دیکھا، شیشے کی کرچیاں دیکھیں، اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا جن سے چھوٹ کر وہ گرا تھا اور اپنے دھڑکتے دل کو تسلی دیتے ہوئے شیشے کی کرچیاں چننے لگی۔

میرے ہلنے سے کمرے میں جو حرکت ہوئی اس سے تناہوا، لرزہ خیز، مسحور ماحول بکھر گیا اور میرے اعصاب کچھ حد تک اس کے جادو سے آزاد ہو گئے ——— چنانچہ میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا ———

کھڑکیوں کے پاس گئی ——— وہ بالکل بند تھیں۔

دروازہ جانچا ——— وہ کھلا تھا مگر اس کے عین سامنے بڑا بلب جل رہا تھا۔

بند الماری کھول کر دیکھی ——— اس کے اندر کوئی نہ تھا۔

بنچ کو چھو کر دیکھا ——— وہ بنچ ہی تھا۔

کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے رضائی کو بھی دیکھا ——— دونوں ہاتھوں میں اس کے دو کونے پکڑ کر اوپر اٹھائے اور اس کے پھیلاؤ پر نظریں دوڑانے لگی۔

اس وقت تک میری ہمت کافی مقدار میں واپس آگئی تھی۔

وہ ایک پرانی رضائی تھی جس کے کنارے میلے ہو رہے تھے۔ خصوصاً ایک کنارہ تو کافی میلا تھا۔ جس پر سر کی چکنائی لگتی رہتی

تھی۔ ایک آدھ جگہ سے دھاگے نکلے ہوئے تھے۔ اور ———

او خدا......!! ———

اس کے درمیان بالشت بھر کا خون کا دھبہ تھا۔

رضائی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ خوف سے میرا جسم سن ہو گیا۔ منہ بالکل خشک ہو گیا۔ میں اپنا پرس اور بنا جانے والا سویٹر اُٹھا کر کمرے سے باہر بھاگی۔ دروازے سے کافی دور جا کر گھڑی دیکھی اور اپنے بھائی کا انتظار کرنے لگی۔

میں نے جب سے ریلیف کیمپ میں رضا کارانہ طور پہ کام شروع کیا تھا۔ صبح سویرے یہاں آجاتی تھی۔ رات کو نو بجے بھائی گھر سے لینے آجاتا تھا، سوائے ان دنوں کے جب میری رات کی بھی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اس روز رات کی ڈیوٹی نہ تھی۔

شروع شروع میں تو مریضوں کی تیمار داری بھی کرتی رہی مگر بعد میں تربیت یافتہ نرسیں آنے کے بعد میں باہر دفتر میں آگئی تھی، کسی نرس وغیرہ کی غیر حاضری کی صورت میں اب بھی کبھی کبھار وارڈ میں ڈیوٹی لگ جاتی۔ آج میں نے کافی رضائیاں اور بستر وصول کئے تھے اور سب کیمپ میں دیئے جا چکے تھے صرف یہی رضائی بچ گئی تھی۔ بغیر کسی دلیل کے اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرا خوف رضائی کی وجہ سے ہے۔ اور میں کسی قیمت پر بھی اس کمرے میں جانے کو تیار نہ تھی جہاں وہ رضائی پڑی تھی۔

بھائی کی کار کا ہارن سنائی دیا تو میں بے اختیار بھاگی اور جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اس نے پوچھا بھی، کیا بات ہے؟ مگر میں گول کر گئی۔ گھر جا کر میں نے کھانا بھی واجبی سا کھایا۔ اور جب رات بستر میں گھسی تو مجھے اپنی رضائی میں بڑا ہی سکون ملا۔

اگلے دن میں پھر ڈیوٹی پر پہنچی۔ ہم لوگ رضا کارانہ کام کر رہے تھے مگر وقت کی پابندی کافی تھی۔ آج آصفہ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ آکر اپنا نام رضا کاروں میں لکھوا دے گی۔ آصفہ بھی میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی مگر اس کے والدین بیمار تھے اور وہ پہلے یہ قومی خدمت نہ کر سکی تھی۔ اب انہیں افاقہ تھا اور اس نے آج آنے کا وعدہ کیا تھا۔

مگر کمرے میں جا کر جب میں نے دیکھا کہ آصفہ نہیں آئی اور رضائی وہیں پڑی ہے تو مجھے پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ میں کسی نہ کسی بہانے کمرے سے باہر چلی جاتی اور پھر آجاتی، اس طرح مجھے کچھ تسلی محسوس ہوتی تھی۔

باہر آنے جانے میں ایک بوڑھی عورت مجھے نظر آئی جو دروازے سے تھوڑی دور بیٹھی تھی۔

"نانی تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بی بی"

"تو پھر ہال کمرے میں کیوں نہیں جاتیں؟"

ہال کمرے میں سب پناہ گزین رہتے تھے۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا۔ جس کے ساتھ والے کمروں کے دروازے کھول کر وسعت اور بھی بڑھائی گئی تھی۔ جب تک لوگوں کے لئے مکان وغیرہ کا بندوبست نہ ہو جاتا وہ وہیں ٹکے رہتے۔

"بی بی۔ وہاں ایک سے ایک دکھی پڑا ہے۔ انہیں دیکھ کر میری طبیعت خراب ہوتی ہے ——— میں ذرا اکیلا رہنا چاہتی ہوں۔"

"تو ادھر آ ——— اندر بیٹھ جا۔"

میں اسے کمرے میں لے آئی۔ ظاہر ہے خود غرضی ہے۔

وہ دعائیں دیتی ہوئی اندر آگئی اور بنچ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر کام کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے سر اٹھایا تو بوڑھی کی عجب حالت تھی۔ وہ بت بنی آنکھیں پھاڑے رضائی کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے سے دہشت برس رہی تھی۔ جسم بالکل ساکت تھا۔ اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھ پاؤں سامنے بنچ کے سرے پر ٹکائے ہوئے تھے جیسے عین اٹھنے سے پہلے وہ کسی جادو کے اثر سے جم گئی ہو۔

"مائی!" میں نے آواز دی۔

مگر اس نے کوئی جنبش نہ کی اور وہ اسی طرح ٹکٹکی باندھے رضائی کو گھورتی رہی۔

میرے جسم میں پھر سے کپکپی جاگ اٹھی ـــــ میں اپنے آپ کو ایسی بے جان اور بے بس محسوس کرنے لگی جیسے اسی کی طرح منجمد ہو رہی ہوں ـــــ کمرے کی خاموش فضا کا سارا بوجھ اور تناؤ جیسے میرے کندھوں اور کمر پر پڑنے لگا۔

بوڑھی عورت نے ایک دم چیخ ماری۔

میں دہل گئی اور کرسی کے بازوؤں کو زور سے پکڑ لیا۔

وہ عورت جھپٹی اور بالکل مسحور انداز میں جا کر رضائی سے لپٹ گئی ـــــ پھر اس میں اپنا چہرہ لپیٹ کر بے تحاشا رونے لگی۔

کمرے کی خاموش منجمد فضا ـــــ میرا خوفزدہ ذہن ـــــ سسکیوں کی دردناک آواز ـــــ میں تو جیسے نیم پاگل ہو گئی ـــــ اور جا کر اس عورت کا کندھا جھنجھوڑنے لگی۔ ساتھ ہی چلائی۔ "مائی ـــــ مائی ـــــ او مائی۔ کیا بات ہے؟"

مگر وہ روتی گئی ـــــ پھر اس نے رضائی کو الٹنا پلٹنا شروع کیا اور جب وہ خون کا دھبہ دیکھا تو اس میں اپنا چہرہ گاڑ دیا ـــــ اب اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔

میں خوف سے لرزتی ہوئی کمرے کے باہر دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ کبھی کا ریڈور کے پرلے سرے پر رضا کا روں کو گھومتے دیکھ کر تقویت حاصل کرتی اور کبھی گردن بڑھا کر اس بڑھیا کی طرف دیکھ لیتی۔

تھوڑی دیر بعد اس کا رونا تھم گیا اور وہ رضائی کو گود میں لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح گم سم ہو گئی۔

عین اس وقت آصفہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ میں نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم کہاں تھیں صبح سے؟"

"میں تو سویرے ہی آگئی تھی۔ انہوں نے میری ڈیوٹی عورتوں والے وارڈ میں لگا دی۔ وہاں کل ہی کچھ نئے لوگ آئے ہیں۔ بعض کی بہت بری حالت ہے۔"

"ہائے اللہ" میں نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تمہارے پاس کوئی رضائی ہے کیا؟"

"کیوں؟"

"وہاں ایک حاملہ عورت بڑی تکلیف میں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہارے پاس سے فوراً ایک رضائی لے آؤں۔"

"ہے تو ـــــ مگر وہ نہ ہی دو تو اچھا ہے۔"

"کیوں؟"
میں نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ "وہ تو ——— پتہ نہیں ——— کچھ منحوس سی ہے ——— یا کچھ سایہ ہے اس پر"
"چلو پاگل نہ بنو۔ لاؤ دو مجھے۔"
تب میں نے آصفہ کو بتایا کہ اس پر خون کا دھبہ ہے اور کل رات سے مجھے اس سے خوف آ رہا ہے اور اس میں سے سسکیوں کی آواز ابھرتی ہے، اور ابھی ایک بوڑھی عورت اس کو دیکھ کر مجنونانہ حرکتیں کر رہی تھی۔
"چھوڑو اس خرافات کو۔ ہمیں اس وقت رضائی کی بڑی ضرورت ہے۔" وہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔
اندر آ کر اس نے ایک نظر میں بھرپور جائزہ لیا اور پھر عورت سے رضائی مانگی مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔
آصفہ نے ایک دفعہ اور مانگنے کے بعد رضائی اس کی گود میں سے آہستہ سے کھینچی، مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی اور وہ رضائی لے کر چلی گئی۔
رضائی کے اٹھ جانے سے مجھے جیسے کچھ حوصلہ سا ہو گیا۔ میری ہمت عود کر آئی اور میں اس بڑھیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ تھوڑے پانی میں سپرٹ امونیا ڈال کر اسے پلائی۔ اٹھا کر بنچ پر لٹایا اور خود کمرے سے باہر نکل آئی ——— اور کچھ دیر اِدھر اُدھر گھوم کر وقت کاٹتی رہی۔
واپس آئی تو عورت پہلے سے بہتر تھی۔ وہ خاموش تھی مگر گیلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو چکی ہے۔ باوجود تشویش کے، میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں۔ اس نے بھی بات کرنے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ اپنی سوچ میں گم سم بیٹھی رہی ——— اس کی خاموشی سے فضا میں پھر سے تناؤ پیدا ہونے لگا جسے توڑنے کے لئے میں نے بالآخر پوچھا۔ "مائی تم کہاں سے آئی ہو؟"
اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا ——— اور دیکھتی رہی ——— جب میں مایوس ہو گئی تو اس نے ہولے سے کسی گاؤں کا نام بتایا۔
"یہ کدھر ہے؟"
"لاہور سے پرے۔ بالکل سرحد کے پاس ہے بی بی ——— میری تو زمینوں کے ساتھ ہی ہندوستان شروع ہو جاتا ہے۔"
"تم یہاں کب آئیں بی بی؟"
"جب پاکستان نے ہمارا گاؤں خنج کیا۔"
"تمہارا مطلب ہے ہندوستان نے؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس وقت آسکتی تو کیوں اتنی دکھی ہوتی۔"
میں کچھ نہ سمجھ سکی مگر خاموش رہی۔
لیکن بڑھیا کے دکھ کا دھارا بہہ نکلا تھا اس لئے وہ خود ہی بولنے لگی۔ "بی بی۔ ہندوستانیوں نے تو مہلت ہی نہ دی نکلنے کی۔ ——— میرا لڑکا صبح صبح کھیتوں کو پانی دینے گیا تھا۔ میں نے اسے دروازے کے طاق سے اپنی چادر اور پگڑی اتارتے دیکھا تھا اور وہ دبے پاؤں باہر نکلا تھا کہ میں جاگ نہ پڑوں۔ مگر میں تو دودھ بلونے کے لئے اٹھنے ہی والی تھی۔ بس اٹھ کر اندھیرے میں ٹٹول کر مٹکے میں متھانی ڈال رہی تھی کہ اتنے میں ایک دم گولیاں چلنے کی آواز آئی جیسے بھاڑ بھن رہا ہو۔ میرا تو سارا پنڈا جیسے سو گیا۔

تب گولیوں کی آوازیں بڑھنے لگیں اور میں اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی ـــــ سر نکال کر دیکھا تو کچھ نظر نہ پڑا۔ صرف لوگوں کا شور اور اندھیرے میں بھاگنے والے سائے تھے ـــــ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنے لڑکے کو پکارا۔ کئی آوازیں دیں۔ اسمٰعیل۔ وے اسمٰعیل۔ مگر جواب کون دیتا۔ وہاں تو قیامت آگئی تھی۔ میں کنڈی بند کر کے اندر آئی تو نازو سہم کر بستر میں بیٹھی تھی اور کانوں پہ ہاتھ رکھے مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے سینے سے لگا لیا۔"

"کیا عمر تھی نازو کی؟"

"دس سال بی بی۔ اگلے کاتک میں گیارہ پورے ہونے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا بچی۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے سمجھا کوئی ڈاکہ پڑا ہے۔ نازو کو بٹھا کر پھر باہر آئی اور ساتھ والے ماشکیوں کے گھر میں آوازیں دیں۔ بدرو۔ وے۔ بدرو۔ بدرو!!! مگر کون بولتا۔ ساری عورتیں اپنے دروازوں میں سے جھانک کر ایک دوسری سے باتیں کر رہی تھیں۔ کئی مرد بھی باہر نکل آئے تھے۔ اتنے میں صبح کا اجالا بھی پھیلنے لگا تھا۔ شور بڑھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے تو جتنے کلمے یاد تھے، پڑھ ڈالے۔

"اتنے میں گلی کے کونے سے چند فوجی بھاگتے ہوئے مڑے اور اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔ گلی میں جتنے لوگ اپنے دروازوں کے پاس کھڑے تھے ان میں سے اکثر تڑپ کر مر گئے۔ اور ساری گلی شور اور چیخوں سے بھر گئی۔

"میں تو ایسی سہم کر بھاگی کہ دروازے کو کنڈی لگانا بھی بھول گئی۔ جا کر نازو کو گود میں چھپا لیا اور اوپر رضائی ڈال کر زور زور سے کلمہ پڑھنے لگی۔ ساتھ ہی دل میں دعا کرتی جاتی تھی کہ یا اللہ۔ اسمٰعیل کو خیر سے جلدی واپس لا۔

"تھوڑی تھوڑی دیر بعد گولیوں کی آواز آجاتی یا کوئی موت کے کرب میں بے اختیار چیخ اٹھتا۔ اتنے میں ہمسایوں کے گھر سے بدرو کی بڑی بہن کے چیخنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی چند مردوں کی بھی۔ وہ چیخ رہی تھی کہ خدا کے لئے مجھے نہ گھسیٹو ـــــ پھر آہستہ آہستہ یہ آواز دور چلی گئی ـــــ میں نے نازو کو زور سے بھینچ لیا۔

"تھوڑی دیر بعد گولیوں کی آواز بھی تھم گئی۔ کبھی کبھار کوئی دھماکہ یا چیخ سنائی دیتی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسمٰعیل آجائے تو ہم کہیں چھپنے کا بندوبست کریں۔ ایسا نہ ہو میں چھپ جاؤں اور وہ آکر مجھے ڈھونڈتا پھرے۔ اتنے میں چار فوجی اندر داخل ہوئے اس وقت صبح بہت روشن ہو چکی تھی۔ مجھے ان کی خشمگیں نظروں سے خوف آنے لگا۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر مجھے زور سے کہا۔ "اے بڑھیا۔ کدھر ہیں تمہارے پیسے اور زیور۔"

"میں نے سہم کر بھوسے والی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا اور وہ ادھر لپکا۔ اتنے میں رضائی کے نیچے سے کسی کو نازو کا سفید پاؤں نظر آیا تو دوسرے نے رضائی اٹھا کر دور پھینک دی اور چیخ کر بولا۔ "اصل مال تو ادھر ہے تم کہاں بھاگے جاتے ہو۔"

"انہوں نے نازو کو پکڑ لیا۔ کسی نے ٹانگ پر ہاتھ ڈالا، کسی نے بازو پر، اور اٹھا کر بھوسے کی کوٹھڑی میں لے گئے۔

"میں واسطے ڈالتی رہی مگر ایک نے راکفل کا سرا مار کر مجھے گرا دیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا ـــــ میں نے دروازے سے لپٹ کر ان کی بیشمار منتیں کیں، نازو کی عمر بتائی مگر اندر سے ان کی ہنسی، شور اور نازو کی چیخوں کے سوا کوئی جواب نہ آیا۔

میں نڈھال ہو کر دہلیز پر گر گئی ——

کافی دیر بعد وہ ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں میرے زیور تھے۔ دوسرے نے ہنس کر مجھے دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "جا بڑھی۔ پل لے اپنی لڑکی سے"

"ایک اور نے مونچھوں میں بل دیتے۔ "پاکستان کا پہلا مزہ تو اچھا تھا۔ اب دیکھیں لاہور کا مزہ کیسا ہے؟"

"اچھا ہی ہوگا جی" ایک اور نے کہا۔ اور سب ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں اندر لپکی۔ بھوسے کے ڈھیر پر نازو بالکل برہنہ پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں خون میں لت پت تھیں۔ میں نے جھٹ سے یہ رضائی اس پر ڈال دی —— یہ خون کا دھبہ جو تم نے رضائی پر دیکھا۔ وہیں سے لگا تھا —— اس کی نبض دیکھی تو غائب تھی۔

"نازو —— نازو" میں نے آواز دی۔ مگر اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے سر گھما کر اس نے مجھے دیکھا۔ پھر اس کی کھلی آنکھوں میں کالے دائرے آہستہ آہستہ ماتھے پر چڑھنے لگے اور ساتھ ساتھ کانوں کی طرف تیرنے گئے —— میں نازو کو بلاتی رہی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف دو چار دفعہ ہلکی ہلکی سسکیاں لیں۔

میں بی بی باہر کو بھاگی کہ ہمسایوں کو خبر کروں مگر گلی میں تو ہر طرف لاشیں پڑی تھیں۔ کسی جگہ بارود سے جلا ہوا ہاتھ یا پاؤں۔ کہیں دھماکے سے اڑ کر آنے والی انگلیاں۔ ہر طرف خون تھا اور زخمی کراہ رہے تھے۔ دو ایک جگہ مکانوں کو آگ لگی تھی۔ میں کس کو مدد کے لئے کہتی۔ سبھی میرے جیسے تھے —— تب میں اسمٰعیل کو ڈھونڈنے کھیتوں کی طرف گئی۔ لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا مگر اس کا کوئی نشان نہ تھا۔ کئی انسانوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ کیا پتہ میرا لال بھی اسی طرح قیمہ ہو گیا ہو۔ اس دن کے بعد میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا —— واپس آکر میں نے اپنے صحن ہی میں کھگیر سے گڑھا کھودا اور نازو کو اس میں دبا کر پاس ہی قرآن پڑھنے بیٹھ گئی۔"

بڑھیا سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں نے اسے پانی پینے کو دیا تو وہ ذرا سنبھلی مگر گم سم بیٹھ گئی۔

"پھر مائی تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"دو دن بعد پاکستان نے گاؤں واپس لے لیا۔ اور ہمیں ٹرکوں میں ڈال کر یہاں لے آئے۔ دور سے میں نے دیکھا تھا کہ وہ ایک ٹرک میں یہ رضائی بھی ڈال رہے تھے۔"

"یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے تمہیں؟" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اس کی دلداری کروں۔

وہ ہنسی۔ بڑی زہریلی ہنسی۔ "تکلیف کاہے کی بی بی —— یہاں آکر دیکھتی ہوں تو ایک سے ایک دکھیا ہے۔ میرے ہی جیسی عورتوں نے اپنے چار چار گبھرو جوان پاکستان پر قربان کئے ہیں۔ میرے پاس تو صرف اسمٰعیل اور نازو تھے —— پر ایک بات مانو بی بی۔ وہ رضائی مجھے دلوا دو تو میں بڑی دعا دوں گی تمہیں۔"

میں بھاگی بھاگی وارڈ کی طرف گئی۔ آصفہ سے رضائی مانگی مگر اس نے انکار کر دیا۔ حاملہ عورت کو تکلیف تھی اور رضائی کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ مجبوراً واپس آکر بڑھیا سے کہا کہ تھوڑی دیر میں اور رضائیاں آجائینگی تو میں اسے وہ رضائی واپس دلوا دوں گی۔

وہ مجھے دعائیں دیتی چلی گئی۔
مگر اگلے دن صبح ہی صبح ایک رضا کار لڑکی میرے رجسٹر سے اُس کا نام کٹوانے آئی۔
"کیوں مکان مِل گیا اسے؟"
"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مرگئی ہے۔"

آصفہ نے بتایا کہ اس حاملہ عورت کو اب کافی سکون ہے ——— اگلے دن سے میری ڈیوٹی پھر سے وارڈ میں لگ گئی۔ ڈاکٹر خوش ہے کہ میں مریضوں کا خیال رکھتی ہوں مگر اسے کیا پتہ کہ جس حاملہ عورت کو بھی تکلیف ہوتی ہے میں اس پر وہی رضائی ڈال دیتی ہوں اور اسے فوراً سکون آجاتا ہے ——— عجیب حکمت ہے۔

محمد خالد اختر

ننّھا مانجھی

میں نے اپنے ننھے مانجھی کو پہلی بار چھوٹی گھونگھے جیسی کشتی کے پاس جون ۱۹۳۸ء کی ایک سہ پہر کو دیکھا۔ دریا اپنے پاٹ میں چار دریاؤں ستلج، سندھ، جہلم اور راوی کے پانی لئے بل کھاتی اور پھنکارتی ہوئی موجوں اور بھنوروں کا سمندر ہو رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی، اور ہم پرلا کنارہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹی دم کٹی سی ٹرین نے ایک گھنٹہ پہلے مجھے گنبدوں اور کھجوروں والے ٹرمینس ریلوے اسٹیشن پر اتارا تھا اور میں وہاں سے اپنا تھیلا کندھے پر رکھے اور ایک سوٹ کیس اٹھائے ایک دیہاتی باتونی لڑکے کی رہنمائی میں ریلوے لائن کی پٹڑی پر چلتا ہوا (کیونکہ ارد گرد طغیانی کی وجہ سے سب پانی تھا اور پٹڑی ہی سب سے اونچی جگہ تھی) اپنی ڈھیوڑی کی فیری لانچ کو پکڑنے دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ میری بد قسمتی کہ میں فیری لانچ کو نہ پکڑ سکا۔ ابھی ہم اس سے دو فرلانگ دور تھے کہ لانچ نے ایک ہانک سنائی دی اور ایک سبز اور سفید مکان نما چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔

"سائیں"۔ الجھے ہوئے بالوں والے دیہاتی لڑکے نے جس کا نام گامن تھا کہا۔ "بیڑی وینیدی پئی اے۔ تساں ہن کل فجر ای ونج سکدے او۔"

میں نے خواہ مخواہ کے غصے میں سارا الزام اس پر دھرا کہ اس نے اپنی باتوں میں مجھے دیر کرا دی ہے ورنہ میں فیری کو پکڑ لیتا۔ ہم کنارے پر پہنچے۔ فیری لانچ اب کافی دور جا چکی تھی۔ میں اس کے انجنوں کی چگ چگ کو سن سکتا تھا۔ مچھیروں کی مستولوں والی دو تین کشتیاں لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھیں اور ٹوکریاں بننے والے خانہ بدوش اپنی سرکنڈوں کی جھونپڑیوں میں کنارے پر پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ موم زدہ جھریوں والے بوڑھے اور چمکیلے سیاہ جسموں والے بے پروا نوجوان اور زنگار اٹھتی ہوئی چھینٹ کے گھگھروں میں صحتمند جسموں اور بکھرے چیتل کی سی رنگت والی عورتیں، جن کو دیکھنے سے دل میں گویا ایک پھانس سی اٹک جاتی تھی، اور لاتعداد الجھے ہوئے بالوں والے چھوٹے بچے جو اپنے بڑوں کی مصروفیات اور دھندوں سے بے خبر شور مچاتے ہوئے پانی میں کھیل رہے تھے۔

مجھے اس شام اپنے دریائی چچا احمد یار کے پاس پہنچنا تھا۔ اس گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں واپس اس سبز روضوں اور کھجور کے جھنڈوں والے گاؤں چاچڑاں میں رات بسر کرنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر فیری لانچ جا چکی تھی اور دریا کے پرلے کنارے پر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

"سائیاں"۔ گامن نے کہا۔ "رات اساڈے گھر رہو۔ تساڈی خدمت کریساں تے مٹھ مرونڈے ویساں۔ میرا بابا فرید سائیں دیاں کافیاں خوب سے نال گاندا اے۔ تے ساڈی بکری ہک گھر ہی اے۔ سائیں کوں اوندا کھیر پویساں۔ ڈھاڈا مٹھا اے۔ فجر ہن نال میں

سائیں کوں بیڑی تے چڑھا دیساں۔"

میں نے مستولوں والی کشتی کے ایک بوڑھے لمبی مونچھوں اور پٹوں والے مچھیرے سے دریافت کیا کہ آیا وہ مجھے دوسرے کنارے پر مٹھن کوٹ لے جائے گا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور دریا کی سمت اشارہ کیا جو اپنی ناچتی ہوئی شوریدہ لہروں سے واقعی خطرناک اور جان لیوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا "پندھ بھی بہت زیادہ ہے اور ہوا الٹے رُخ کی ہے۔ اس وقت کوئی تمہیں مٹھن کوٹ نہیں لے جائے گا۔"

میں مایوس ہو گیا میرے چچا نے میرے آنے کی خوشی میں اپنی ضرب المثل دریا دلی سے بڑا تکلف کر رکھا ہو گا اور اسے مایوسی ہو گی۔

تب میں نے اپنے ننھے مانجھی کو دیکھا۔

وہ اپنی اچھلتی ہوئی گھونگھے نما کشتی کے پاس ایک لمبا بانس لئے کھڑا تھا۔ بمشکل بارہ تیرہ برس کا لڑکا، ایک لنگوٹی میں، اس کے بال گھنے گھنگھریالے تھے، اور اس کا بدن چمکیلا اور لچکیلا اور سنہری تھا، اور وہ اپنے بانس کے ساتھ ایسی بے پروائی اور ایسے بانکپن سے کھڑا تھا جیسے وہ ایک چھوٹا سا دیوتا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دلیری اور خود اعتمادی تھی اور اس کا چہرہ خوبصورت اور مسکراتا ہوا تھا۔ جنگلوں، دریاؤں اور کھلے کھیتوں کی ایک مخلوق!

ایک لحظے کے لئے میں نے تأسف سے اپنے غلط خوراک پر پلے ہوئے، پلپلے، توندیلے، آرام کے عادی جسم کے بارے میں سوچا۔ شہروں میں رہتے ہوئے انسان نے خود کو غالباً خدا کی بدصورت ترین مخلوق بنا لیا تھا۔ آہ! یہ تہذیب کی نت نئی بڑھتی ہوئی آسائشیں! شہری آدمی کو آخر کس بات کا ناز تھا۔

ننھے مانجھی نے خود ہی مجھ سے پوچھا "سائیاں۔ پار جاسیں؟"

"تمہاری کشتی کمزور ہے۔ یہ ڈوب جائے گی چھوٹے لڑکے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی لوک گیتوں کا ایک سر تھی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانت چمکے۔

اپنے تمباکو سے میلے کچیلے پیلے دانتوں کا سوچ کر حسرت کی چھری سی میرے سینے میں اتر گئی۔

"واہ سائیاں واہ۔" وہ بولا۔ "میری بیڑی نہیں بڈدی (ڈوبتی) ایہہ پانی دی مچھی اے۔ دریا دی چھل تے اتوں پکھی وانگوں اُڈ جاندی اے۔"

اس نے بتایا کہ وہ ہر روز پرے ساحل سے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کشتی میں یہاں آتا ہے اور سرِشام لوٹتا ہے۔

"دریا میرا گھر ہے" اس نے سادگی سے کہا۔ "سائیاں میں دریا وچ پلیا ہویا آں۔ دریا میرا سنگتی ہے۔ وہ میری اور میری کشتی کی حفاظت کرتا ہے۔"

ایک جنگلی وحشی لڑکے سے اتنی عقل کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ کس نے اس کو یہ باتیں سکھائی تھیں!

"تم سکول میں پڑھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی دانائی صرف سکول میں سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بھولتے ہوئے کہ مادرِ فطرت خود بہترین استاد ہے۔

وہ پھر ہنسا اور اس کے جواب نے مجھے مزید حیران کر دیا۔ "میرا سکول سائیاں زمین ہے اور دریا ہے۔"

گامن مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ کبھی میرے کوٹ کو اور کبھی میرے بازوؤں کو کھینچتا۔ وہ خلوص سے چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شہر میں اس کے کچے مکان میں رات گزاروں، اس کی بکری کا تازہ سجرا دودھ پیوں اور اس کے بابا سے فریدؒ کی کافیاں سنوں۔

"سائیاں دریا ایکدم خطرناک ہے۔ میرے ساتھ آؤ ——" گامن بولا۔

اس پر ننھا مانجھی زور سے ہنسا۔ "خطرناک!" اور چھلانگ لگا کر اپنی کشتی میں سوار ہوگیا۔ "میں اب جا رہا ہوں تم آنا چاہتے ہو تو آ سکتے ہو۔"

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا آئی۔ نہ جانے یہ اپنے ہنس مکھ اشکرے کی آنکھ والے چچا کی میرے نہ پہنچنے پر مایوسی کی فکر تھی اور اس بھنے ہوئے مرغ کا خیال تھا جو وہ اپنی خاص نگرانی میں پکوا رہا ہوگا یا یہ دریا کا وسیع حسن وجمال تھا کہ یا پھر یہ اس جنگلی وحشی لڑکے کی خود اعتمادی سے بھری مسکراہٹ تھی۔ میں نے یک لخت اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی میں ایسے بہادر لمحے آتے ہیں جب آدمی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

"ٹھہرو، میں تمہارے ساتھ آ رہا ہوں۔"

"نہ نہ سائیاں، کملا نہ بنو ہا۔ ایہہ چھوکرا چوڑا ہے۔ کشتی بڈ ویسی۔" مگر میں تو اب اپنے تھیلے اور سوٹ کیس کے ساتھ کشتی میں تھا اور کنارے پر حواس باختہ گامن کو احتجاج کرتے چھوڑ کر ننھا مانجھی اپنی مچھلی جیسی کشتی کو ہنوز بپھرے، لپٹتے پانیوں میں لے جا رہا تھا۔ وہ ایک یونانی دیوتا کی طرح حسین لگ رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ دیر کے لئے میں اس کے اس دم سلادک والے انسانی حسن میں کھو گیا اور اس خطرے کو بھول گیا جس میں میں کود چکا تھا۔

جب میں نے اچھی طرح اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیا تو خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ پانی کی لہریں غصیلے سانپوں کی طرح کشتی کے کناروں پر شوکتی ہوئی آتی تھیں۔ میں پانچ منٹ کے اندر سرتاسر بھیگ گیا۔ کشتی میں بھی پانی بھرنا شروع ہوگیا۔ مگر ننھا مانجھی صرف مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی خطرے کی کوئی علامت نہ تھی۔ کشتی ایک نازک گھونگھے کی طرح کبھی ادھر اور کبھی ادھر ڈھلکتی جاتی کبھی اودھر، اور کبھی سر کے بل اپنی دو سواریوں سمیت پانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتی معلوم ہوتی۔ لیکن پھر یہ صحیح سلامت لہروں پر سوار نکل آتی۔ پہلے پندرہ بیس منٹ تک میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہا اور میری ہڈیوں کا گودا تک ڈر اور سہم سے گویا جم گیا۔ پھر لڑکے کی خود اعتمادی اور مسکراہٹ اور اس عجیب وغریب کشتی کی خطرے کے مقابلے میں چستی کو دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ میں نے اس عرصے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اور نہ ہی لڑکا کچھ بولا۔ اپنے مطمئن انداز کے باوجود اس کی رگ رگ چوکنا تھی۔ آنے والے خطرے کی بو وہ ایک جنگلی جانور کی طرح پا لیتا اور اپنے چپو کی مناسب جنبش سے وہ اس پر قابو حاصل کر لیتا۔ اپنے خوف سے کچھ خلاصی پا کر میں نے دریا کے منظر کو دیکھا۔ یہ ایک پرتحمل، ہولناک اور بے حد خوبصورت منظر تھا —— سہ پہر کے سونے سے رنگے ہوئے، اچھلتے، بپھرتے اور شوکتے ہوئے پانی۔ ہم ایک "دو جزیرہ دل" کے پاس سے گزرے۔ سیلاب میں آدھی ڈوبی ہوئی بستیاں۔ لوگ ڈھکیوں پر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے اور کھجوروں کی چوٹیاں پانی پر جھومتی ہوئی۔ میں نے سوہنے (یہ اس ننھے مانجھی کا نام تھا اور کتنا مناسب) سے پوچھا کہ یہ لوگ ڈرتے نہیں؟ اس نے کہا۔ "نہیں یہ لوگ دریائی ہیں اور دریا پر وہ اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے زمین پر۔"

اس وقت دریا میں سوائے سوہنے کی چھوٹی کشتی کے اور کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہم کبھی بانس اور کبھی چپو کی مدد سے پہلے ہوا اور بہاؤ

کی مخالف سمت گئے۔ پھر ننھے مانجھی نے کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ میں اپنا بانس گاڑ دیا اور سرکنڈوں سے بنا ہوا ایک بادبان جو اس نے کہیں تختوں کے نیچے رکھا تھا، نکال کر اسے مہارت سے اس بانس پر باندھ دیا۔ اس نے یہ سب کچھ مکمل اطمینان اور لاپروائی سے کیا جیسے یہ دنیا کی آسان ترین چیز ہو، محض بچے کا کھیل۔ اس کے لئے واقعی یہ کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ چین سے بیٹھ گیا اور میں نے اسے ایک سگرٹ سلگا کر دیا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور اسے ایک جوان کی طرح پینے لگا۔

"اب کوئی فکر کی بات نہیں، بیڑی ہمیں خود بخود دریا پار لے جائے گی سائیاں۔ دریا میرا بھی سگا ہے اور میری بیڑی کا بھی۔ سائیاں تم اب تک تو سمجھ گئے ہو گے۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں اور مٹھن کوٹ کس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نے اسے اپنے چچا کا نام بتایا تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا لیکن پھر اس پر پہلی سی چمک عود کر آئی۔ "اساں سوہنے سائیں دی رعیت ہاں، میں تینکوں اتھے لے جاساں۔"

شام پڑنے لگی تھی اور پرلا کنارہ جس کی طرف ہم جا رہے تھے، کھجوروں اور روضوں کی ایک دھند سا بن رہا تھا —— دریا کے بہاؤ کی سمت ایک دو میل دور۔ سوہنا کبھی کبھی اپنے گھونگھے کو سیدھی سمت پر رکھنے کے لئے چپو چلا دیتا اور بس۔

وہ گانے لگا۔ اس کی آواز میں ایک وحشیانہ تموّج تھا ایک آزاد الاپ —— اپنے دریا سے مستعار لی ہوئی الاپ۔ یہ اس کے دیس کا نغمہ تھا۔ جہاں آدمی قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتا تھا اور تنومند اور دلیر اور جیالا ہو کر پروان چڑھتا تھا:

میری بیڑی ویندی پئی اے
نچدی کھلدی ویندی پئی اے
دریاواں دی مچھی اے
سوہنی اے تے سستی اے
میری بیڑی ویندی پئی اے
پھلن تے سنسار دیاں دے
تر کنڈے سنگھاڑ دریا دے
بیڑی دے ہن یار سبھانے

"یہ بڑا اچھا گیت ہے سوہنا۔ یہ گیت کس کا ہے؟"

میرے یہ کہنے سے وہ بڑا خوش ہوا۔ "یہ گیت میں نے خود بنایا ہے۔ میں نے اور کئی گیت بنائے ہیں۔ جب میں مچھلی کے شکار پر آتا ہوں تو گیت خود بخود میری زبان پر آجاتے ہیں۔ بہت سے تو مجھے بھول بھی گئے ہیں، مگر کیا ہوا۔ نئے گیت میں آسانی سے بنا لیتا ہوں۔"

سوہنے میں ایک شاعر کی روح تھی اور جب شام گہری ہوئی تو میں نے اپنے خوف کو بالکل بھلا کر اس سے مختلف سوال پوچھنے شروع کئے۔ اس سے زیادہ پرکشش اور حیران کن لڑکا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک چوہڑے کا بیٹا ہے اور اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں ٹوکریاں بن کر پیٹ پالتی ہے اور وہ اپنی

چھوٹی کشتی میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ بہت غریب ہیں اور دونوں تک ان کی خوراک میں ابلی ہوئی مچھلی اور بھنے ہوئے باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں ہفتوں تک کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

یہ کشتی جس میں ہم اس غصیلے پانی پر سفر کر رہے تھے سوہنے نے خود اپنے ہاتھ سے ایک کھجور کے تنے کو کھوکھلا کر کے اور کچھ تختے جوڑ کر بنائی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ اکیلا مچھلی پکڑنے جاتا ——— کانٹے اور ڈور کے بغیر۔ اس کے پاس ایک پھٹا پرانا جال تھا جو ایک شناسا مچھیرے نے اسے دیا تھا۔ اسے ایسی آوازیں نکالنی آتی تھیں۔ خاص قسم کی سیٹیاں اور کلکاریاں اور لوریاں کہ جن کو سن کر مچھلیاں خود بخود کشتی کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔

"سائیاں۔ میکوں مچھی آون دا آپے آپ پتہ چل ویندا اے۔" اس نے کہا۔

سوہنا میں وہ چھٹی حس تھی جو قدرت کے سب جنگلی جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی حس سے ہوا کے پرندے طوفان کے آنے سے گھنٹوں پہلے خبردار ہو جاتے ہیں اور شکاری کتے خرگوش کے قدموں سے اس کی بو پا کر اپنے کان کھڑے کر لیتے ہیں اور چمگادڑ اپنی آنکھوں کے بغیر سب رکاوٹوں سے بچتی بچاتی اڑتی ہے۔ اب بھی روہی میں ایسے لوگ ہیں جو زمین کے نیچے پانی کو سونگھ لیتے ہیں، اور کبھی ایسے ریڈ انڈین بھی ہوتے تھے جو ایک ٹہنی کی ہلکی سی چٹخ سے یہ بتا سکتے تھے کہ ان کی کھوج میں کون دشمن آ رہا ہے۔

سب مخلوقات جو قدرت کے ساتھ یکجان ہو کر رہتی ہے اس چھٹی حس کی مالک ہوتی ہے اور یہ باعثِ حیرت نہیں کہ ننھے مانجھی کو یہ پتہ چل جاتا تھا کہ مچھلی آ رہی ہے۔

جب مچھلی نزدیک آ جاتی تو وہ اپنے منہ میں چاقو اور ہاتھ میں جال لئے دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔ وہ کبھی کشتی میں سے جال نہیں پھینکتا تھا کیونکہ جال پھٹا پرانا تھا اور اس میں سے مچھلی نکل جانے کا خطرہ تھا۔ پانی میں وہ مچھلیوں کو جال میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ یہ کوشش اکثر بار آور ہوتی۔ لیکن اگر مچھلی جال میں کسی وجہ سے نہ آتی تو وہ اپنے ہاتھ استعمال کرتا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ مچھلی کے شکار کے وقت منہ میں چاقو کیوں دابے رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ دریا میں ایک بڑی مچھلی بھلّن ہوتی ہے۔ جب مچھلیاں اس کی کشتی کی طرف آتی ہیں تو بعض دفعہ یہ بھلّن ان کے پیچھے پیچھے آ پہنچتی ہے۔ یہ گدھے جتنی بڑی ہوتی ہے اور بڑی طاقتور ہوتی ہے۔

"ایہہ چاقو، سائیاں، بھلّن کو مارنے کے لئے ہے۔ میں بھلّن کے پیٹ کے نیچے تیر کر جاتا ہوں اور دو تین بار اس کے پیٹ میں چاقو گھونپتا ہوں۔ اپنے قد و قامت کے باوجود یہ آسانی سے مر جاتی ہے۔"

سوہنے نے مجھے اپنی بائیں ٹانگ دکھائی۔ یہاں گھٹنے سے لے کر ایڑی تک ایک گھاؤ کا نشان تھا۔ "سائیاں بوجھو۔ یہ کیسے ہوا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

"تم کو یقین نہ آئے گا سوہنے سائیاں۔ ایک دفعہ میں پار کے علاقے میں بیڑی میں مچھلی پکڑنے گیا۔ بڑی دیر تک کوئی مچھلی نہ آئی اور میں نے سمجھا کہ اس حصے کی سب مچھلیاں کہیں چلی گئی ہیں۔ پھر جب میں گھر کا رخ کرنے لگا تو مچھلیوں کا لشکر بیڑی کی طرف تیرتا ہوا آیا۔ لیکن اس کے پیچھے گدھے جتنی بڑی بھلّن تھی میں چاقو منہ میں دابے پانی میں اتر گیا۔ اب بھلّن مچھلیوں کو کھاتی ہے اور سنسان

بھلّن کا شکار کرتا ہے۔ اس وقت بھلّن کے پیچھے پیچھے ایک سنسار بھی بھلّن کو کھانے چلا آیا تھا۔ یہ مجھے پتہ نہ تھا۔ میں بھلّن کے پیٹ میں چاقو گھونپنے لگا تھا کہ نیچے سے سنسار نے اپنے جبڑے میں میری ٹانگ کو پکڑ لیا۔ سائیاں تم یقین نہیں کرو گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھے۔ میرے باپ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ سنسار کی آنکھیں اگر اندھی کر دو تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ بس سائیاں میں تیر کر سنسار کے دہانے کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں چاقو سے دو گھونپے دیئے۔ بڑا لہو بہا۔ سنسار تکلیف سے تڑپنے لگا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں بچ کر اپنی کشتی میں چڑھ آیا مگر میری ٹانگ بالکل تو تھڑا ہو گئی۔ ہسپتال میں وہ اسے کاٹنے لگے تھے پر بڑے ڈاکٹر نے کاٹنے نہ دیا۔ مجھے ہسپتال میں چار پانچ مہینے رہنا پڑا اور میری ٹانگ اب سوائے اس نشان کے بالکل ٹھیک ہے۔"

ننھا مانجھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے چمکیلے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا: میں سچ بول رہا ہوں!

پھر اس نے کہا "سائیاں۔ میں مچھیاں کوں سڈاں؟ اس ڈار وچ مچھیاں بہن۔" وہ سیٹیاں بجانے لگا اور اپنے ہاتھوں کو ایک خاص انداز میں بجانے لگا۔ تھوڑی دیر میں پانی میں مچھلیوں کے اچھلنے کی حرکت پیدا ہونے لگی۔ ننھے مانجھی کو پانی میں نہ اترنا پڑا کیونکہ ایک مچھلی چھلانگ لگا کر کشتی میں آ گری۔ تڑپتی ہوئی۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ ہم اب پُرسکون پانی میں تھے ——— دریا کی چھل کے بنائے ہوئے ٹاپو میں۔ ہم اس تپن سے گذر آئے تھے جہاں فیری لنگر ڈالے تھی اور اب کھجوروں کے جھنڈوں میں سے اندھیرے سبز راستوں میں شب نشانے گذر رہے تھے۔ کشتی میں سے کھجوروں کے گچھے توڑتے ہوئے ہم آخر خشکی پر آئے۔ مغرب کی سمت ایک سفیدی نے ہمیں بتایا کہ چاند ابھر آیا ہے۔

ننھے مانجھی نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور ہم سونی سڑک پر چل پڑے۔ میرا دریائی چچا شہر کی ایک دو منزلہ حویلی میں رہتا تھا۔ میں وہاں پہلی دفعہ آیا تھا لیکن سوہنے کو اس جگہ کا پتہ تھا وہ مجھے وہاں لے گیا۔

میرے چچا نے مجھے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہی! اس کا چہرہ مسکراہٹوں سے شکن آلود ہو گیا۔ کیونکہ اب تک وہ میرے آنے سے مایوس ہو چکا تھا۔

جب میں اس سے مل رہا تھا تو سوہنا دروازے میں کھڑا تھا۔ میں سوہنے کو دو روپے دینے لگا تو میرے چچا کا مسکراہٹوں میں لپٹا چہرہ درشت اور سخت ہو گیا۔ وہ سوہنے پر برسا۔ "او چوہڑے دے بچے۔ تینکوں ساڈے خاندان توں پیسے لیندیاں شرم نہیں آندی؟" سوہنا چلا گیا۔ میرا چچا ان علاقوں میں ایک سخت اور جابر آدمی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کا نام لینے سے سوہنے کے چہرے کی رنگت کیوں بدل گئی تھی۔

(۲)

میں مٹھن کوٹ میں دو ہفتے رہا۔ مجھے اپنے چچا سے آبائی زمین کے معاملات طے کرنا تھے مگر اس کے زرخیز دماغ میں دوسرے ارادے تھے البتہ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں اور یہاں مجھے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ میں نے خواجہ غلام فرید کے روضے کی عقبی گلی میں سوہنے کو پھر دیکھا۔ سوہنا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دریائی ٹاپوؤں کے کنارے پر سرکنڈوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس میں مٹی کے دو تین برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یا پھر سیپیوں کا ایک ہار اور ایک

بنسری دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سوہنا یہاں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے کچھ افسوس سے کہا کہ اس کی ماں نے شادی کر لی ہے اور وہ اور اس کا خاوند علی پور چلے گئے ہیں۔ جہاں اس کے سوتیلے باپ کی لوہارے کی ایک دوکان ہے۔

"سوہنا۔" میں نے پوچھا "تمہارے پاس چارپائی نہیں؟"

"میں زمین پر سوتا ہوں، سوندھی سجری زمین پر۔" اس نے سرکنڈوں کی ایک چٹائی مجھے دکھائی۔ "میں اس پر سوتا ہوں۔ یہ میرا دیجھادن ہے۔"

"تم سانپوں سے نہیں ڈرتے؟" میں نے پوچھا۔ میں خود سانپوں سے بے حد ڈرتا تھا اور ان کے ڈراونے خواب دیکھا کرتا تھا۔

"سانپ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں تو ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔"

"اور تم سردیوں میں کیا کرتے ہو؟ تمہارے پاس لحاف نہیں اور تم ٹھٹھر جاتے ہوگے!"

"مجھے سردی نہیں لگتی۔ جب سردی سخت پڑتی ہے تو سائیاں پتہ ہے میں کیا کرتا ہوں؟ میں بہت سا گڑ کھا لیتا ہوں اور اپنے دچھادن پر لیٹ جاتا ہوں۔ یہ بڑا لمبا ہے۔ اس لئے اس کے آدھے حصے کو الٹا کر اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہوں۔ میں اتنا گرم ہو جاتا ہوں جتنا سیڑ (خرگوش) اپنے بھٹ میں۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ سکھر چلے۔ میں اسے وہاں کسی فیکٹری میں نوکر کرا دوں گا مگر وہ سوچ میں کھو گیا۔ اس نے اپنا سر ہلایا۔ "میں اپنی بیڑی اور دریا کو نہیں چھوڑ سکتا سائیاں۔ میں فیکٹری میں کام کرنا نہیں چاہتا۔"

پھر اس نے کہا۔ "سائیاں، میں تیڈی کیا خدمت کروں۔ میری پاس کچھ مخانے ہیں۔" وہ ایک پیالے میں مخانے لے آیا۔ اور ہم کھانے لگے۔ یہ غریبانہ مہمان نوازی ایک بادشاہ کی ضیافت سے کہیں اچھی تھی۔ پھر اس نے بنسری دیوار سے اتار لی۔ اور اسے بجانے لگا۔

"سوہنا، تم نے کوئی نئے گیت بنائے ہیں؟"

"بہت سے۔ ہر روز جب میں اپنی بیڑی میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہوں نئے گیت بناتا ہوں۔ کبھی میرے ساتھ شکار پر چلو۔ میں تمہیں بہت سے گیت سناؤں گا۔"

میں نے اسے تین روپے دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ سوہنا ایک خود دار لڑکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اپنی کشتی میں منٹھن کوٹ لے کر آیا تھا اور میں نے اسے کوئی اجرت نہ دی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ بازار میں لے آیا۔ اور اسے اس کی پسند کی چیزیں خرید دیں۔ ایک نیا چاقو۔ ایک سیر نمک، آدھ سیر گڑ، چائے کا ڈبہ، کنگھی، تھوڑا سا رنگدار لٹھا۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اور اس نے کہا کہ اب وہ بادشاہزادے کی طرح رہے گا۔

وہ اس وقت تک مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوا جب تک میں نے اس سے وعدہ نہ کر لیا کہ میں کسی دن اس کے ساتھ شکار پر جاؤں گا۔

(۳)

میں اس کے ساتھ مچھلی کے شکار پر نہ جا سکا اور اگرچہ میری رخصت کے چند دن باقی تھے مگر دوسرے ہی دن اپنے دریائی چچا سے ایک جھگڑے کی وجہ سے منٹھن کوٹ چھوڑنا پڑا۔ دریا کے تمن پر جاتے ہوئے میں سوہنے کی جھونپڑی میں جھانکا مگر ننھا مانجھی وہاں نہ تھا ساتھ کی جھونپڑی میں ٹوکریاں بننے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ لڑکا شکار پر گیا ہے۔ "اللہ اس کو حیاتی دے۔ بڑا نیک لڑکا

ہے۔ مچھلی لاتا ہے تو بچوں کو تقسیم کرتا پھرتا ہے۔ میں اس کے لئے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ رب اسے نظرِ بد سے محفوظ رکھے"۔

مجھے اس سے نہ ملنے کا افسوس ہوا۔ میں فیری لانچ کے پتن پر پہنچا اور ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ ریل کے ڈبے کے سے کمرے میں بڑا حبس تھا اس لئے میں سامنے عرشے پر پتوار کے پاس ایک چارپائی پر جا بیٹھا جو دراصل ایک ترکی ٹوپی والے تھل تھل کرتے مخدوم کے لئے بچھائی گئی تھی۔ میں نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اس لئے کسی نے اعتراض نہ کیا۔ مخدوم کے پاؤں دبانے کے لئے چار نوکر تھے اور ایک اس کا حقہ بھرنے پر مامور تھا۔ میں نے مخدوم کے ساتھ حقہ پیا اور ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ —— افراط کی "چیرہ دستی" کی، روحانیت کی کمی کی اور شکار کی۔ ایسے موقعوں پر آدمی خود کو بڑھا کر ظاہر کرے تو ٹھیک رہتا ہے۔ اس لئے میں نے مخدوم پر یہ ظاہر کیا کہ میں شکار پور میں فارسٹ آفیسر تھا۔ پھر میں نے اسے اگلی سردیوں میں وہاں شکار پر آنے کی دعوت دی۔ فیری لانچ ابھی منجدھار میں تھی کہ مجھے ننھے مانجھی کی بیڑی دکھائی دی —— بالکل ننھی سی ڈونگی، ننھا مانجھی پانی میں تھا۔ مچھلیاں پکڑتا ہوا، دھوپ میں ایک یونانی دیوتے کی طرح حسین اور جیالا۔

اس نے ایک دفعہ بھی فیری لانچ کی طرف نہ دیکھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے میں بہت مصروف تھا۔ "اب دیکھو" مخدوم نے کہا۔ "اب ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے پرانے وفادار مدار المہام کو بھی چھٹی دے دی ہے۔ گورنمنٹ کہتی ہے کہ ان کی املاک چھین لو۔ کل کو کہے گی۔ کہ ان کے شکاری کتے بھی چھین لو۔ آخر کتے بھی املاک میں شامل ہیں"۔

میں نے اتفاق کیا۔ اس گئے گذرے زمانے میں روحانیت کی اقدار واقعی مٹ رہی تھیں۔

(۴)

چار پانچ سال بعد میں علی پور میں سینیئر کمپاؤنڈر مقرر ہوا۔ ہماری بیشتر آبائی جائیداد مٹھن کوٹ کے پاس تھی اور میں نے کوشش کر کے اپنی تبدیلی علی پور میں کرائی تاکہ جائیداد کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں مٹھن کوٹ اپنے چچا سے ملنے نہ گیا۔ ہمارے تعلقات بعض خاندانی معاملات کی وجہ سے کشیدہ اور تلخ ہو چکے تھے۔ چار سال پہلے سکھر میں میں نے ایک سندھی تاجر کے گھرانے میں شادی کر لی تھی اور اب ہمارے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شادی ایک عجیب تجربہ ہے۔ یہ ساری کی ساری گلابوں کی سیج نہیں جیسے کہ پہلے پہل نظر آتی ہے۔ آزاد منش آدمی کو تو یہ بالکل راس نہیں آتی۔ اور وہ کئی بار مضطرب ہو کر ان بندھنوں کو توڑ کر جنگلوں میں بھاگ جانا چاہتا ہے۔ ہمارے درمیان اخراجات پر اکثر جوتم پیزار ہونے لگتی تھی۔ عورتیں عموماً تنگ دل اور ارضی ہوتی ہیں اور جب ان کے بچے ہو جاتے ہیں تو ان کی ساری محبت اور دلچسپی بچوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے خاوند ان کے لئے صرف ضروریات مہیا کرنے کے آلے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان تلخ جھگڑوں کے بعد ہم بعض دفعہ دنوں ایک دوسرے سے نہ بولتے اور ان دنوں ستا ہوا اور بجھا ہوا میں دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے ننھے مانجھی کے بارے میں سوچتا —— ہواؤں کی طرح آزاد اور گیت گاتا ہوا۔ سوہنا کتنے مزے کی زندگی گذار رہا ہو گا۔

ایک دن سوہنا آ گیا۔ مجھ پر اس صبح تاریک موڈ طاری تھا اور میں ہسپتال کے دواخانے میں بیٹھا ہسپتال کے اردلی بخش کو نمبر ایک سے لیکر نمبر دس تک مکسچر بنانے کی ہدایات بے پروایانہ انداز میں دے رہا تھا۔ تب میں نے کھڑکی میں سے سوہنے کو دیکھا۔ دبلا اور پیلا سوہنا۔ بالکل ایک مختلف سوہنا۔ اس کے ساتھ رنگدار چھینٹ کے کرتے اور گھگھرے میں ایک دیہاتی عورت تھی۔ پینتیس چھتیس سال کی مگر ابھی تک جوانی کی سج دھج لئے ہوئے اور نخریلی۔ سوہنا اس کے کندھے کا سہارا لئے ہوئے تھا اور گھسٹتے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ

بیمار تھا۔

میں نے اسے کھڑکی میں سے آواز دی۔ "سوہنے" اور میں باہر برآمدے میں آگیا۔ سوہنے کے چہرے پر مجھے دیکھ کر پہلی سی مسکراہٹ آگئی۔ "سائیاں" مجھ سے ہاتھ ملا کر اس نے کہا۔ "سائیاں تم یہاں کہاں؟"

میں اسے اپنے دواخانے میں لے آیا اور سہارا دے کر سٹول پر بٹھا دیا۔ عورت اطمینان سے پھسکڑا لگا کر ایک دلہ یا حیوان کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آیا سوہنا نے شادی کر لی ہے۔ ان علاقوں میں وٹے کے رواج کی وجہ سے سولہ سال کے لڑکے کے ساتھ اپنے سے کافی زیادہ عمر کی عورت کا بیاہ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ سوہنے نے مجھے اس شش و پنج میں سے خود ہی نکالا۔ "سائیاں ایہہ میری اماں بی بی اے۔"

دریائی علاقے کی عورتیں اپنی جوانی کے رنگ روپ کو دیر تک قائم رکھتی ہیں۔

"سوہنا۔ تم بیمار ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

سوہنا نے مجھے بتایا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے ایک عجیب پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہے۔ پہلے پہل اس نے توجہ نہ دی اور مچھلیاں پکڑنے کے کام کو جاری رکھا لیکن اب وہ کافی بیمار ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو جاتے تھے۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ اور ایک دو دن پہلے اسے خون کی قے ہوئی تھی۔

"ڈاک دار صاحب"۔ سوہنے کی ماں نے کہا۔ "میرا سوہنا پتر لکھ ہو گیا ہے اہدے چہرے ول ویکھ ڈاک دار صاحب۔ میرے سوہنے نوں ٹھیک کر دے۔"

مجھے سوہنے کی بیماری کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔ کسی طرح میرے دل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوہنا بھی سب کی طرح بیمار پڑ سکتا ہے۔ سوہنے نے کہا۔ "جب میں بیمار پڑ گیا تو میں اپنے ماما کے ساتھ بس میں بیٹھ کر اپنی اماں بی بی کے پاس علی پور میں آگیا۔ میری اماں بی بی یہاں یار دو لوہار سے بیاہی ہوئی ہے۔ میرا مستریا باپ بڑا اچھا آدمی ہے۔ ہر وقت دا نمازی۔"

سوہنا اپنی اماں بی بی کے دوسری شادی کر لینے کو بالکل قدرتی بات سمجھتا تھا اور ایک طرح اسے غرور تھا کہ اس کی ماں ایک خاوند کو پھانسنے اور اپنا گھر بسانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں اس کا ذرا ملال نہ تھا ——— یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تہذیب کے "طیبو" ہی ہر بات کو عجیب بنا ڈالتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر سوہنے اور اس کی ماں کو ہسپتال میں ایک چھوٹی سی الگ کوٹھڑی لے دی۔ ڈاکٹر مریضوں کو ہسپتال میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ اس سے اس کا کام بڑھ جاتا تھا اور بعض قیمتی دوائیں جو بازار میں فروخت ہو سکتی تھیں، ضائع ہو جاتی تھیں۔ مگر میں نے اس سے کہا کہ سوہنا میرا قریبی عزیز ہے یوں وہ مان گیا۔

سوہنے کو دق کی قسم کی کوئی بیماری تھی اگرچہ پوری طرح اس کی تشخیص نہ ہو سکی۔ میں اس کا بھائی کی طرح خیال رکھتا۔ اسے وقت پر دوا ملنے اور ٹیکے بہم پہنچانے کی فکر کرتا۔ اور شام کو کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اس کی باتیں سنتا۔ جب بھی میں جاتا اس کا چہرہ کھل اٹھتا اور ایک پہلی سی مسکراہٹ اس پر آجاتی۔ اس کی ماں سب دیہاتی عورتوں کی طرح حوصلہ مند اور محنتی تھی۔ وہ شام کو کوٹھڑی کے باہر ریت پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کے لئے روٹی پکاتی۔ بعض وقت یار دو لوہار آتا۔ بھاری بھرکم، چوڑا چکلا

چہرہ، مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی، آنکھوں میں سرمہ۔ وہ ہمیشہ سوہنے کے لئے کچھ نہ کچھ چیز لے کر آتا۔ سوہنے میں کوئی ایسی بات تھی۔ اس کی گفتگو کا ایسا سبھاؤ تھا کہ ہر کوئی اس سے محبت کرنے لگتا تھا۔

لیکن ہماری تمام تر توجہ کے باوجود سوہنے کی حالت ابتر ہوتی گئی اور وہ ماضی کے سوہنے کا ایک ہیولا سا رہ گیا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں اب پتلی سوکھی لکڑیاں نظر آتی تھیں۔ اب مجھے احساس ہونے لگا کہ ہواؤں اور دریاؤں کا پالا سوہنا ہمارے پاس سے چلا جائے گا۔ لیکن وہ کیسے مر سکتا تھا! وہ جو قدرت کے عناصر میں سے ایک تھا! دریا جس کا بھائی تھا اور بیڑی جس کی بیوی اور محبوبہ تھی! وہ جو لہروں پہ بادشاہ کی طرح سوار ہوتا تھا اور دیوتاؤں کی طرح گیت گاتا تھا! مچھلیوں کو کلکاریوں سے بلا لینے والا سوہنا! بھلن اور مگرمچھ سے کشتی لڑنے والا سوہنا! وہ بھلا کیسے مر سکتا تھا۔

ایک شام میں اس کی کوٹھڑی میں گیا۔ اتنی کمزوری کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ اس نے کہا۔ "سائیاں۔ میں اچھا ہو جاؤں گا تو ہم چھل پر مچھلیاں پکڑنے جائیں گے۔"

"ہاں ہاں سوہنا! تم اچھے ہو جاؤ گے"۔

پھر وہ اداس ہو گیا۔ "میری بیڑی میرے واسطے مونجھ گئی ہوسی۔ سائیاں میں مرگیا تے میری بیڑی دا کیا ہوسی؟"

"تم جلد اچھے ہو جاؤ گے سوہنے۔"

"نہیں اب نہیں سائیاں"۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "حیاتی کتنی سوہنی شئے ہے سائیاں۔ میں مر ویساں تے تاں دریا میکوں یاد کریسی کہ کوئی حوصلے والا اتھا میڈی چھاتی دے چڑھ کے گماہا (گاتا تھا) میری مچھیاں پوچھیسن (پوچھیں گی) کہ چھوٹا جیا مانجھی کتھاں ایں جیہڑا کلکاریاں نال انہاں کو سنڈ دیندا ہا۔ میں ہن شکار تے کدے نہیں جاسّاں سائیں۔ میں کدھے ہور دریا دل ویندا پیا ہاں ——"

اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں، کسی دور کے دیس کی طرف۔ پھر اس پر کھانسی کا ایک سخت دورا پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ جھٹ لیٹ گیا۔ اس کی ماں بھاگتی بھاگتی اندر آئی اور اپنے بیٹے سے روتی ہوئی لپٹ گئی۔ "او میرے سوہنے لعل۔ او میرے سوہنے پتر۔"

میں بھاگا بھاگا کورامین لانے گیا۔ لیکن جب میں لوٹا تو سوہنا بہت دور جا چکا تھا۔

اس کی ماں چھاتی پیٹ کر بین کر رہی تھی مگر سوہنا جیسے چپ چاپ سو رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ زندگی اور موت کے بڑے پر شور دریا پر تن تنہا مچھلی اور بھلن کا شکار کرنے چلا گیا تھا، میرا ننھا مانجھی!

ندرت الطاف

دریچے کی صلیب

فلیٹ میں ہنگامہ برپا ہے۔ ہر سمت لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ ہر سمت لوگ باتیں کر رہے ہیں۔

میرا بھائی سرجی ایک سیدھی سادی لڑکی سے ماڈرن آرٹ پر لیکچر سن رہا ہے۔ ابھی ابھی جب اس لڑکی کو معلوم ہوا کہ سرجی خود بھی پینٹر ہے اور پیرس میں اس کا اسٹوڈیو ہے تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ سرجی مسکراتا ہوا اپنی شستہ فرانسیسی میں کہہ رہا ہے "کوئی بات نہیں —— کوئی بات نہیں —— تمہاری گفتگو بہت دلچسپ تھی، اور یقین کرو کہ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مادموزیل"۔

اور یہ ہمارا میزبان ہے۔ تھیوری آف میوزک کا ماہر —— اس سمر سکول کا منتظم جس میں، میں پچھلے چار ہفتے سے جا رہی ہوں اور ابھی چار ہفتے اور جاؤں گی اور اس نے سر ہلا کر کہا ہے۔ "مادموزیل —— مادموزیل —— تم آکسفورڈ میں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں پیرس میں رہنا چاہیے"۔

اور پھر میں نے دور ایک چہرہ دیکھا ہے۔ ایک شائستہ، نرم، حساس چہرہ —— میں اس سے بات کرنا چاہوں گی۔ میں جاننا چاہتی ہوں یہ اتنا اداس کیوں ہے۔ اس نے کن تجربات سے گزر کر اتنی افسردگی کو اپنا لیا ہے۔ لیکن وہاں بہت سے لوگ ہیں۔ اور وہ بہت انہماک سے گفتگو کر رہا ہے۔

اور بار کے قریب پہونچ کر میں نے خود سے پوچھا —— کیا میں ذرا سی وائن اور لے لوں؟ یہ بہت نفیس ہے! اور اچانک میں نے خود کو ایک بہت دلچسپ گروپ میں پایا۔

ایک طالب علم نے میرا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ "مادموزیل، میں تمہارا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے سٹنگ دے سکو گی —— ؟"

اور اچانک ایک مشہور مجسمہ ساز میرے قریب آیا۔ "مادموزیل میں تمہارا مجسمہ بناؤں گا۔ تم اب تک کہاں تھیں —— ؟"

یہ فرانسیسی بھی خوب لوگ ہیں بھائی۔ یہ ہر لڑکی سے یہی کہتے ہیں۔ تم اب تک کہاں تھیں مادموزیل —— !

"کیا تم خالص ہندوستانی ہو؟" —— اس مجسمہ ساز نے پوچھا ہے۔

"قطعی" —— میں نے جھوٹ بولا۔

"میرے خیال میں ہندوستانی بہت خوبصورت ہوتے ہیں ——" میرے عقب سے ایک آواز آئی —— یہ تو وہی خوبصورت اداس چہرہ تھا۔

"تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں خالص ہندوستانی نہیں ؟"

"میں نے کبھی کسی ہندوستانی لڑکی کو اسقدر خوش نہیں دیکھا ——"

ہاں میں تم سے سچ بولوں گی۔ میں خالص ہندوستانی نہیں۔ میری ماں ہسپانوی ہے اور اس کے علاوہ بھی میری رگوں میں جانے کہاں کہاں کا خون ہے۔ ہمارا بہت عجیب و غریب گھرانا ہے۔ چار نسلوں سے ہم عقیدے، قومیت اور نسل کے بت توڑتے چلے آئے ہیں۔ اور تم نے یہ بھی ٹھیک کہا —— میں بہت خوش ہوں۔ ماحول بہت خوبصورت ہے۔ دنیا بہت خوبصورت ہے۔ وائن بہت خوبصورت ہے —— اور میں MASTER OF CEREMONIES ہوں۔ میں پریما ڈونا (PRIME DONNE) ہوں ——

اور یہ بہت طمانیت کی بات ہے —— میں نے مسکرا کر اس خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اب میرا گلاس چھلک گیا ہے اور وائن میرے لباس پر گر پڑی ہے —— اس نے "تاسّف" سے میری ساری کو دیکھا ——

"فکر مت کرو، یہ دھل سکتی ہے" —— اس چہرے پر اتنی پریشانی دیکھ کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ ارے یہ صرف ایک ساری ہی تو ہے۔ تم اسقدر پریشان کیوں ہوتے ہو ؟ —— کیا ایسی ہی پریشانیوں سے گذر کر تم اتنے اداس ہو گئے ہو ؟ ؟

اور اس مجسّمہ ساز نے کہا —— "مادموزیل میں تم کو اپنا سٹوڈیو دکھانا چاہتا ہوں۔ تم کب چل سکو گی ——؟"

لیکن اس لمحہ کسی نے جھک کر اپنے نیپکن سے میرے بال پونچھ ڈالے۔ ارے یہ وائن کیا میرے بالوں پر بھی گر گئی تھی ؟ —— یہ وہ خوبصورت چہرہ تھا۔ اور وہ لمحہ بہت طویل ہو گیا —— جیسے صدیوں پر محیط ہو۔

اور اب سب لوگ چلے گئے ہیں۔ صرف ایک لمحہ میرے قریب ہے —— اور ایک چہرہ —— ایک خوبصورت اداس چہرہ —— اور میں نے کہا —— "زندگی اتنی حسین ہے۔ اور دنیا اتنی اچھی —— پھر تم اتنے اداس کیوں ہو ——؟"

"میں کچھ یوں ہی اُداس سا آدمی ——" اس نے مسکرا کر کہا

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو ؟ اور زندگی سے کیا چاہتے ہو ؟"

اور اس نے کہا —— "میں آسٹرین ہوں۔ میں وی آنا کا رہنے والا ہوں۔ اور میری ماں فرانسیسی تھی"۔

وی آنا جو موسیقی کا شہر ہے۔ جو خوبصورتیوں کا شہر ہے —— لیکن تم میرے سوال کو غلط سمجھے ہو۔ مجھے تمہاری قومیت سے کوئی مطلب نہیں —— میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا تم نے خود کو پالیا ہے ؟ —— کیا تمہیں بالآخر یہ علم ہو گیا ہے کہ تم زندگی سے کیا چاہتے ہو ؟ —— اور پھر میں نے کہا —— "میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی۔ اگر مجھے زندگی کو ایک بار پھر نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع مل سکے تو جب بھی میں وہی کروں جو میں نے اب تک کیا ہے"۔

اور اس نے کہا۔ "تم بہت خوش قسمت ہو۔ شاید تم نے زندگی میں کوئی غلطیاں نہیں کیں —— نہیں شاید یہ غلط ہے —— شاید تم نے اتنی کم زندگی گذاری ہے کہ غلطیوں کا امکان ہی نہ تھا"

اور میں نے اسے اپنے بھائیوں کے بارے میں بتایا ہے۔ میرے تین بھائی ہیں۔ سرجی —— وہ جو اس کونے میں کھڑا اس لڑکی سے گفتگو کر رہا ہے پہلے وہ فارن سروس میں گیا اور بہت بیزار ہوا۔ چھ سال بعد اس نے استعفا دے دیا۔ اب وہ مستقل پیرس میں رہتا ہے اور پینٹ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بالآخر اس نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔

اور وہ یار کے قریب میرا دوسرا بھائی ہے۔ اڈون ——— وہ موسیقار ہے وہ یورپ بھر میں کانسرٹ دیتا پھرتا ہے۔ اس دنیا میں وائلن اس کی عزیز ترین متاع ہے۔ وہ کہتا ہے وائلن بہت خوبصورت ساز ہے ——— خوش ہو کر اس کو گلے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور خفگی میں اسے جھنجھلا کر پٹخا جا سکتا ہے ——— وہ کہتا ہے۔ پیانو یا آرگن کبھی دل سے یوں قریب نہیں ہو سکتے جیسے کہ وائلن ——— غم میں اپنے وائلن سے لپٹ کر رویا جاسکتا ہے۔ لیکن پیانو سے لپٹ کر رونے کا خیال ہی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

اور وہ میرا تیسرا بھائی ہے۔ ارجن ——— ادھر شمعدان کے قریب ——— وہ جو اپنا پائپ صاف کر رہا ہے۔ وہ ہیونگ کی یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتا ہے۔ کبھی کبھار مجھے خیال آتا ہے کہ شاید ہم میں سے صرف ارجن نے خود کو پالیا ہے۔ دراصل یہ سائنس داں لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں ——— بہت سیدھے سادے ——— بہت سلجھے ہوئے ——— ان کو اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی سے کیا چاہتے ہیں ——— ان کی چاہتیں بھی بہت سیدھی سادی ہوتی ہیں ——— بہت معصوم ——— بچوں کی سی ——— جیسے چاند تک پہونچنے کی خواہش ——— اس میں کوئی الجھاؤ نہیں ——— کوئی ہیر پھیر نہیں ——— اور یہ فنکار لوگ ——— یہ تو بہت گڑبڑ ہوتے ہیں ——— ایک دم فراڈ ——— لیکن شاید مجھے یہ باتیں نہیں کہنا چاہئیں ——— کیونکہ یہاں بہت سے فنکار موجود ہیں۔

بہت حیرت سے میں نے سوچا ہے۔ میں کیوں اس سے اتنی باتیں کر رہی ہوں۔ کیا بالآخر ایک وجود دوسرے وجود سے یوں باتیں کر سکتا ہے جیسے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ——— کوئی شے حائل نہیں ——— کیا اس دنیا میں اتنی یگانگت ممکن ہے!

کھانے کے بعد "کریم دی ماں" کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے میں نے اس سے کہا ——— "کیا ہم اب سٹنگ روم میں واپس چلیں۔ اور کیا تم "کریم دی ماں" نہیں پیو گے؟"

اور اس نے کہا۔ "نہیں تم کریم دی ماں" سے زیادہ حسین ہو۔ اور زیادہ دلچسپ ——— ہاں ہم سٹنگ روم کی طرف لوٹ جائیں گے۔"

"نندیتا کیا تم ہمارے ساتھ چلو گی؟ ——— " سرجی نے پکار کر کہا

"نہیں سرجی۔ کرنے کو اتنی بہت سی باتیں ہیں۔ میں ٹھہر کر آؤں گی۔ تم جاؤ۔" ———

میں اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس پاس کوئی جگہ خالی نہیں۔ اور اس نے کہا ——— "مجھے تمہارے قدموں میں بیٹھنا پڑے گا۔" میں نے دور پڑے ہوئے ایک سٹول کی طرف اشارہ کیا۔ "نہیں۔ میرے قدموں میں بیٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم وہ سٹول اٹھا لاؤ۔"

اور تب ہم نے بہت سی باتیں کیں ——— میں نے اسے بتایا ہے۔ کہ آکسفورڈ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں بہت خوبصورت دریا ہے۔ بڑی خوبصورت پگڈنڈیاں ہیں ——— بہت حسین سبزہ زار ہیں ——— بہت اچھے قہوہ خانے ہیں ——— اور بہت خوبصورت نے خانے ——— اور وہاں خواب آلود SPIERS ہیں اور فنِ تعمیر کا حسن ہے ——— اور کالجوں کا سحر ———

اور میں نے اسے بتایا ہے کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ میں اپنے کس بھائی سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔ دراصل

وہ تینوں ہی بہت اچھے ہیں۔ بڑے پیارے ــــــ ایک دم ــــــ ایلفا ایلفا۔ (ALPHA ALPHA)
"یہ ایلفا ایلفا کیا ہوتا ہے؟" ــــــ اس نے مہربانی سے پوچھا ہے۔
"ارے تم ایلفا ایلفا نہیں جانتے!" ــــــ مجھے بہت عجیب لگا ــــــ ہمارے ہاں ــــــ یعنی آکسفورڈ میں جب اونچی قسم کے فرسٹ کلاس مارکس ہوں۔ تو اس کو ایلفا ایلفا کہتے ہیں ــــــ یعنی بہت فرسٹ کلاس قسم کی فرسٹ کلاس ــــــ جس کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو" ــــــ میں نے وضاحت کی۔
وہ بہت ہنسا۔ اور ہنستا ہوا بہت اچھا لگا ــــــ "اور ایلفا ایلفا قسم کے اور کتنے لوگ ہیں اس دنیا میں؟" ــــــ اس نے پوچھا۔
"میرے بھائیوں کے بہت سے دوست بھی وہاں ہیں۔ ارجن اور سرجی بیلیل (BALLIOL) میں تھے اور اروِن ماڈلین (MAGDALEN) میں ــــــ ابھی تک ان کے بہت سے دوست وہاں ہیں ــــــ وہ سب بھی بہت اچھے ہیں۔ ایلفا بیٹا (ALPHA-BETA) قسم کے ــــــ"
"وہ کیا ہوتا ہے؟"
"جب فرسٹ کلاس تو ہوتی ہے لیکن کچھ کچھ سیکنڈ کلاس بھی ــــــ یعنی وہ خالص فرسٹ کلاس نہیں ہوتی کہ جہاں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ ہو ــــــ لیکن تم بھی اچھے آدمی ہو۔ بہت اچھے۔"
"کیا تمہارے خیال میں مجھے ایلفا بیٹا (ALPHA-BETA) دیا جا سکتا ہے؟؟" ــــــ اس نے بھویں چڑھا کر سوال کیا۔
میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ "نہیں تم خالص ایلفا قسم کے آدمی ہو۔ اور تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ــــــ ہاں یقیناً تم خالص ایلفا ہو۔ میرے بھائیوں کی طرح ایلفا ایلفا ــــــ" میں نے پورے وثوق سے کہا۔
وہ بہت ہنسا۔
"تم آکسفورڈ ضرور آنا۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اور تم اس کو بہت پسند کرو گے۔"
"سوال یہ ہے کہ کیا آکسفورڈ بھی مجھے پسند کرے گا؟ ــــــ لیکن میں ضرور آؤں گا ــــــ ہاں میں ضرور آؤں گا۔ لیکن کیا ہم اس سے پہلے نہیں ملیں گے؟؟ ــــــ گو مجھے یقین ہے کہ تمہارے بہت سے دوست ہوں گے۔ اور تمہارے پاس میرے لئے شاید وقت نہ ہو!!!"
اور تب اس خوبصورت شخص نے مجھے گھر پہونچایا ــــــ میں نے غور سے اس کے بالوں کو دیکھا ــــــ یہ کیسے بے تحاشا خوبصورت بال تھے ــــــ اور ان میں چاندی کے سے تار چمک رہے تھے۔ کس قدر حسین ــــــ
"کیا تم برا تو نہیں مانو گی۔ اگر میں اپنے گھر سے اپنا چشمہ لے لوں؟" ــــــ اور اس نے اپنا چشمہ لیا ــــــ "اور کیا تم یہ گھر یاد رکھ سکتی ہو؟" ــــــ اور کیا تم کسی روز مجھ سے ملنے آؤ گی؟ ــــــ جیسے تم اپنے اور بہت سے دوستوں سے ملنے جاتی ہو؟؟ ــــــ"

اور میں نے کہا۔ "میں ضرور آؤں گی۔ لیکن تم بھی ہمارے ہاں آنا۔"

اور تب لیٹن کوارٹرز (LATIN QUARTERS) میں سرجی کے سٹوڈیو کے سامنے اس نے گاڑی روکی۔

"وہ اوپر کا فلیٹ سرجی کا ہے" ـــــ میں نے اسے بتایا۔

"ہاں تم اوپر پہونچ کر دریچہ کھول کر ہاتھ ہلا دینا۔ تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ تم خیریت سے پہونچ گئی ہو۔ پھر میں اطمینان سے چلا جاؤں گا۔"

"آندرے اچھا آدمی ہے" ـــــ ناشتے پر سرجی نے میری پیالی میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"آندرے! ـــــ وہ کون ہے پارٹنر؟"

"وہی جس نے تمہیں گھر پہونچایا تھا۔"

ارے تو اس کا نام آندرے ہے۔ میں نے اپنا بیگ کھول کر ڈھونڈھ ڈھانڈ کر اس کا کارڈ نکالا ـــــ ارے ہاں۔ ٹھیک تو ہے ـــــ ظاہر ہے اس کا کوئی نام تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔

"اچھا تو تم اسے جانتے ہو؟"

"بس اتنا ہی کہ وہ آرٹ ہسٹورین ہے اور دی آنا کی یونیورسٹی میں آرٹ کی تاریخ پڑھاتا ہے" ـــــ سرجی نے کہا۔

دریائے سین کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ٹہلتے میں سینٹ مائیکل برج کے قریب آ پہونچی ہوں۔ یہاں بہت سے ہسپانوی طالبعلم اپنے رُک سیک بغلے بیٹھے ہیں۔ اب انہوں نے اپنے سینڈوچ نکال کر کھانا شروع کر دیئے۔

میں دریا کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی ہوں۔ ایک طالب علم میرے قریب آیا۔ "سینوریتا کیا تم سینڈوچ کھاؤگی؟"

"نہیں" ـــــ میں نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "لیکن مجھے اپنا گتار دو۔ میں تمہیں ایک گیت سناؤں گی۔"

ہسپانوی لوک گیت کے ختم ہوتے ہی انہوں نے خوشی سے اور حیرت سے نعرے لگائے۔

"میں خود بھی کچھ ذراسی ہسپانوی ہوں" ـــــ میں نے کہا۔ "اس لئے تم کو حیرت نہ ہونی چاہیئے۔"

تب ایک آواز آہستہ سے آئی۔ "یہ بہت خوبصورت گیت تھا۔"

اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی حسین۔ افسردہ چہرہ تھا۔

"اوہ ہیلو ـــــ!"

تب میں نے ہاتھ ہلا کر ہسپانوی طالب علموں کو خدا حافظ کہا۔ اور اس خوبصورت شخص سے کہا ـــــ "میں سیر کرنے جا رہی ہوں۔ کیا تم چلو گے؟"

تب زرد پتوں کو روندتے ہوئے ہم دور تک چلے گئے۔ اور ہم نے کتنی بہت سی باتیں کیں ـــــ دکھ کی ـــــ اور سکھ کی ـــــ میں نے اسے اپنے خواب بتائے۔ اور بتایا کہ زندگی سے میں کیا چاہتی ہوں ـــــ اس نے بڑے تحمّل سے یہ سب کچھ سنا۔ اور ایک بار پھر حیرت سے میں نے سوچا کہ میں کیوں اس سے اتنی باتیں کر رہی ہوں؟ میں کیوں اس سے بڑے تکلّف سے سیدھی سادی چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں کرتی؟ ـــــ

تب سین کے کنارے جھک کر اس نے مجھے پیار کیا اور کہا۔ "تم بہت حسین ہو۔ اور بہت دلچسپ ——— اور تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ ——— اور مجھے تمہارا پہلا نام تک یاد نہیں ———"

"نند تیا" ——— میں نے اسے بتایا۔

اور میرے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اور اس نے کہا ——— "نند تیا یہ بال کیسے میری راہ میں حائل ہو ہو جاتے ہیں"۔

میں نے ہنستے ہوئے اپنے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"میں شکایت تو نہیں کر رہا نند تیا" ——— اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہمیشہ ہنستے رہا کرو۔ جب تم ہنستے ہو تو بہت اچھے لگتے ہو"

تب اس کا ہاتھ تھامے تھامے میں سرجی کے فلیٹ تک آئی۔ اور میں نے تحیر سے سوچا ——— اس ہاتھ کو تھام کر مجھے کتنی طمانیت محسوس ہوئی ——— جیسے دنیا میں مکمل امن ہو اور کوئی دکھ نہ ہوں۔

اور ایک دم وہ رکا اور اس نے کہا ——— "سنو نند تیا ——— یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ایک غیر زبان میں گفتگو کر رہے ہیں اور اس کے باوجود اتنی بہت سی باتیں کر سکتے ہیں ——— مجھے ابھی ابھی یہ خیال آیا ———" اس کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی تھی اور بچوں کی سی حیرت۔

"کل ہم پھر سیر کرنے جائیں گے ——— ہے نا؟" ——— اس نے کہا۔

ہم زرد پتوں کے فرش پر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے بازو میری طرف بڑھائے اور میں نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور ہزارویں دفعہ میں نے حیرت سے سوچا ——— یہاں کتنا امن ہے ——— اور کس قدر تحفظ کا احساس ——— جیسے اب کوئی دکھ ہم تک نہیں پہنچ سکتا ——— جیسے رنج و الم اب ہماری زندگی کو چھو تک نہیں سکتے ———

"شاید بالآخر مجھے عشق ہو گیا ہے"۔ میں نے اس سے کہا۔

اس کے خوبصورت چہرے پر پریشانی ہے اور الجھن ہے اور افسردگی ہے ——— اور اس کے بالوں میں چاندی کے سے تار ہیں ——— اور دو آنسو اس کی پلکوں سے نکل کر میرے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"تمہارے لئے"

"اور تم رو کیوں رہے ہو؟"

"جب میں بہت خوش ہوں تو رو دیتا ہوں"۔ اور اس نے ہنستے ہوئے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں ———

"کیا ہم آج شام کا کھانا ساتھ کھائیں گے؟" ———

تب شمعوں کی روشنی میں میرے گلاس میں وائن انڈیلتے ہوئے اس نے کہا۔ "سنو نند تیا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کیوں نہیں!"

"میں تم سے بہت بڑا ہوں نا ——— پورے تئیس سال"۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مجھے اتنے اچھے لگتے ہو کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی"۔

"تم فکر مت کرو نند تیا۔ میں مروں گا نہیں ——— میں سو سال تک زندہ رہوں گا اور میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گا۔ اور یہ کتنی اچھی بات ہو گی نند تیا۔ کہ جب بھی میری آنکھ کھلے تو تم قریب موجود ہو"۔

"ہاں یہ اچھی بات ہو گی۔ کہ جب صبح ہی صبح اٹھوں تو تم موجود ہو" ——— میں نے سوچ کر سر ہلایا ——— "ہاں یقیناً بہت اچھی بات ہو گی"۔

"نہیں ——— صرف صبح ہی نہیں نند تیا ——— جب بھی میری آنکھ کھلے ——— کسی بھی وقت ——— تو تم قریب موجود ہو ——— بالکل قریب"۔

"مجھے عشق ہو گیا ہے" ——— اگلی صبح میں نے اپنے بھائیوں کے سامنے اعلان کیا ——— سرجی بہت زور سے ہنسا۔ اروِن نے بُرا سا منہ بنایا۔ صرف ارجن خاموشی سے اپنا پائپ بھرتا رہا۔

"وہ کون بدقسمت ہے؟ ——— اسے یہاں لاؤ بی بی" ——— سرجی نے تارپین کے تیل سے برش صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں سب جانتا ہوں۔ یہ وہ آرٹ ہسٹورین ہے" ——— اروِن نے خفگی سے کہا۔

"اروِن میرے بھائی۔ تم اس قدر خفا کیوں ہو۔ میں بہر حال اس سے شادی کر رہی ہوں۔ اور آج شام کا کھانا ہم یہاں کھائیں گے"۔

"بیگم صاحبہ، آپ شاید یہ بھول گئیں کہ آپ انڈر گریجویٹ ہیں اور جب تک آپ اپنی ڈگری ختم نہیں کر لیتیں، آپ کو شادی کی اجازت نہیں مل سکتی ——— قاعدے سے آپ کو اپنی منگنی تک کی اطلاع پرنسپل کو دینا چاہیے ——— "اروِن مستقل خفا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ ہم اگلے موسم بہار میں شادی کر لیں گے" ——— میں نے اپنا ٹائپ رائٹر اور گٹار اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ اپنی چیزیں تم کہاں لئے جا رہی ہو؟ ———"

اروِن خوفزدہ تھا۔ وہ مجھے خوب پہچانتا تھا۔ یہ میری کل متاع تھی ——— جب میں اپنا ٹائپ رائٹر اور گٹار اٹھا لوں تو بس میں گئی ———

"نند تیا ——— نند تیا ——— تمہیں بہت دکھ پہونچے گا ——— یہ لوگ جو ہم سے عمر میں بڑے ہوتے ہیں نا۔ ان کے پاس ہمارے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صرف دکھ پہونچاتے ہیں۔ یہ ہمیں نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ یہ زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں"۔

اروِن بہت دہشت زدہ تھا۔ اس نے در اصل خود اپنے ٹیوٹر کی بیوی سے بہت زوروں سے عشق کیا تھا۔ اور بقول اپنے بہت دکھ اٹھایا تھا۔

"اروِن ——— نند تیا کو اپنے فیصلے خود کرنے دو" ——— سرجی نے کہا۔

"اسے جانے دو اروِن" ——— ارجن نے پائپ پر سے نظریں اٹھا کر کہا۔

"نہیں ——— میں کوئی دکھ نہیں اٹھاؤں گی ——— آندرے نے کہا تھا وہ ہمیشہ میرا خیال رکھے گا۔ وہ سو سال تک زندہ رہے گا"۔

ہنستے ہوئے میں نے زینہ طے کیا۔ اور اپنی چیزیں دیوان پر پٹخ دیں۔ ڈیسک پر کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ اور وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے قریب پہونچ کر میں نے اپنے بازو پھیلائے ـــــ اور کہا ـــــ "ہم کو پیار کرو آندرے۔"
اس کے چہرے پر بڑی پریشانی تھی۔ "آدھ گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہو رہی ہے اور مجھے آج یہ مقالہ پڑھنا ہے نندتیا۔"
"تو کیا ہوا تم مجھے ایک منٹ کے لئے پیار تو کر سکتے ہو۔"
"تمہیں معلوم ہے۔ ایک منٹ کتنا طویل ہو جاتا ہے۔ تم بہت خطرناک ہو۔ میں پہلے بھی ایک سیشن پر نہیں پہونچ سکا تھا۔ پلیز نندتیا۔ پریشان مت کرو۔"
اور پھر اس نے جھنجھلا کر کہا۔ میں صرف خوشی پر تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرا کام بھی تو ہے نندتیا ـــــ اور بچوں کی طرح ضد مت کرو۔"

وہ بہت دکھ بھرا لمحہ تھا۔ اور اس دکھ بھرے لمحے میں میں اپنی چیزیں اٹھا کر لوٹ آئی۔
پھر سین کے کنارے بیٹھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔
ہاں کام بہت اہم ہے۔ کام سے عزت ملتی ہے۔ اور شہرت ملتی ہے ـــــ اور پیار کیا ہے ـــــ اس میں صرف دکھ ہیں رنج و الم ہیں ـــــ شاید پیار بہت حقیر چیز ہے ـــــ شاید جو پیار کرتا ہے، وہی حقیر ہے ـــــ
اور اس شام میں نے نیا اعلان کیا۔
اب ہم کبھی عشق نہیں کریں گے۔
سر جی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں ـــــ "بہت جلد یہ فیصلہ کر لیا تم نے۔"
ارون نے غصے سے پیر پٹخے ـــــ "وہی ہوا جس سے میں ڈرتا تھا۔"
اور ارجن حسب معمول اپنا پائپ صاف کرتا رہا۔
اور پھر میرے تینوں بھائیوں نے ایرپورٹ پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلایا۔ اور اب وہ نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں ـــــ پیرس پیچھے رہ گیا ہے ـــــ غسل خانے میں جا کر میں نے واش بیسن پہ اپنا سر رکھ دیا ہے۔ بہت دیر کے رکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے رہے۔
میں سو سال تک زندہ رہوں گا نندتیا ـــــ
میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھوں گا نندتیا ـــــ
ضد مت کرو نندتیا ـــــ
یہ کیسا جنم جنم کا غم تھا جو میں نے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ کس لئے انسان اتنے دکھ سے گزرتا ہے ـــــ کس لئے ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ لمحے اتنے مختصر ہیں ـــــ اور جاننا اتنا دشوار ہے ـــــ

میں آندرے ہوں۔ اور اس کے کالج کی لاج میں جا کر میں نے پورٹر سے پوچھا ہے۔ "کیا میں یشودتی رانا سے مل سکتا ہوں؟"

اس نے نوٹس بورڈ پر لگے ہوئے ایک پلین کی طرف اشارہ کیا۔ "لائبریری سٹیر کیس —— کمرہ ۱۲ —— کیا آپ رستہ تلاش کر لیجئے گا؟" —— اور وہ لاج سے باہر نکل آیا۔ "وہ دیکھئے پاپلر (POPLAR) کے درختوں کے قریب —— صدر دروازے سے اندر جاکر اگر آپ دائیں ہاتھ گھوم جایئے تو غلام گردش کے آخر میں آپ کو زینہ نظر آئے گا۔ وہاں سے پہلی منزل پر —— کمرہ ۱۲ —— کوریڈور کے آخر میں ہے —— دریا کی سمت —— کمرے پر نام کا کارڈ لگا ہوگا —— یہ ہمارے کالج کا سب سے خوبصورت سٹیر کیس ہے" —— پورٹر نے فخر سے سر ہلایا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ۔"

وہ دیوان پر لیٹی ہے۔ اپنا لبادہ اوڑھے ہوئے —— اس کا بھائی اروِن اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اروِن نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا —— اور اب وہ اٹھ کر باہر چلا گیا ہے۔ "میرا خیال ہے میں ذرا دریا تک ہو آؤں۔"

ایک لمحے کے لئے نندتیا کے چہرے پر حیرت کی جھلک آئی۔ پھر مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی ہے اور اس نے کہا۔ "آؤ۔ آؤ۔ ہر پروفیسر —— تم کہاں گھوم رہے ہو —— میرے خیال میں تم وہ آتشدان کے قریب والی کرسی لے لو۔ وہ سب سے آرام دہ ہے۔ اب بتاؤ تمہاری کیا خاطر کریں —— کافی پیو گے؟ —— اچھا شیری سہی؟ —— اور یہ بتاؤ تم انگلستان میں کیا کر رہے ہو؟ اچھا تو تم رائل اکیڈمی کی دعوت پر آئے ہو —— ؟" —— اس نے معنی خیز طریقے سے سر ہلایا —— "تب تو پارٹنر، تم کو بہت مصروفیت ہو گی۔ ناحق تم نے ایک دن آکسفورڈ پر برباد کر دیا —— تمہارے کام کا بہت حرج ہوگا۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا ہے۔ نہیں —— اس جملے میں کوئی طنز نہیں —— یہ سیدھا سادا بیانیہ جملہ ہے۔

اس کے سیدھے دراز بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کی پیشانی اور گردن پر ذرا سا پسینہ ہے اور چند بال وہاں چپک گئے ہیں

"میرے خیال میں اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو ذرا یہ آگ بجھا دو۔ آج کل سنٹرل ہیٹنگ پوری شدت سے چل رہی ہے۔"

میں نے بجلی کی آگ کا بٹن بند کر دیا ہے۔ میں نے اپنے رومال سے اس کا پسینہ خشک کیا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ۔"

تب میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپا لیا ہے —— اور کہا —— "نندتیا —— نندتیا —— تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔"

ایک لمحے کے لئے اس کی انگلیاں میرے بالوں پر رکیں۔ ان انگلیوں میں وہی پرانی ملائمت تھی۔ میرے ماتھے پر گرے ہوئے بال اس نے پہلے پیار سے پیچھے ہٹا دیئے۔ پھر ایک دم وہ انگلیاں تن گئیں —— یہ ہاتھ بھی عجیب چیز ہیں —— یہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

"کیا میں تمہیں پیار کر سکتا ہوں نندتیا؟"

"اگر تمہارا جی چاہے —— لیکن مجھے فلو ہے۔ کہیں تمہیں نہ ہو جائے —— " اور اس نے نرمی سے اپنا سر ہٹا لیا

"تم کیسے وقت یہاں آئے۔ جبکہ میں ذرا بیمار ہوں۔ اور فلو تو اڑ کر لگنے والی چیز ہے اور پھر آج شام کو میری ٹیوٹر نے مجھے شیری پر بلا رکھا ہے۔ یہ آکسفورڈ دراصل بہت بے ہنگم جگہ ہے۔ جب کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو اسے تنہا نہیں چھوڑا جاتا —— دراصل یہاں ہماری بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے —— لیکن کوئی بات نہیں۔ اردن یہاں ہے۔ آج شام وہ ہمارے کالج میں کانسرٹ دے رہا ہے جس کی آمدنی ہمارے کالج کے بلڈنگ فنڈ میں جائے گی۔ وہ تمہیں آکسفورڈ دکھا دے گا۔ وہ تمہیں کانسرٹ پر بھی لے جائے گا۔ پھر شام کا کھانا ہم سب ساتھ کھائیں گے۔ تم کہاں کھانا پسند کرو گے؟"

اس نے گویا میری زندگی کا سارا پروگرام طے کر کے رکھ دیا ——

"اور تم کہاں ٹھہرے ہو؟ —— ارے ناحق تم نے ہوٹل میں کمرہ لیا —— تم اردن کے پاس ٹھہر سکتے تھے۔ وہ جب بھی آئے ماڈلین میں ٹھہرتا ہے۔ یہ اس کا پرانا کالج ہے اور اکیڈیمی نے تمہیں کس سلسلے میں بلایا ہے؟ ظاہر ہے کوئی دلچسپ کام ہو گا —— اچھا تم نائش کا افتتاح بھی کر رہے ہو! کیسی عمدہ بات —— اگر میری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں ضرور آتی۔"

وہ اس پر تکلف مہذب لہجہ میں مجھ سے باتیں کر رہی تھی، جس کا ذکر اس نے خود بہت دفعہ ہنس ہنس کر پیرس میں کیا تھا۔

"سانڈ آندرے یہ رسمی قسم کے ریسیپشن بھی خوب ہوتے ہیں۔ مجھے ہر ٹرم میں کم سے کم چھ پر جانا پڑتا ہے۔ بہت تفریح رہتی ہے —— اوہ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کالج کے کس ہال میں ہے۔ ان سب میں وڈ پینلنگ (WOOD PANELLING) ہوتی ہے —— اور گہرے آتشیں رنگ کے قالین —— اور جھاڑ فانوس —— اور دیواروں پر روغنی تصویریں —— اور ان مخملیں قالینوں پر چلتے ہوئے شیری یا وائن کا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے —— ساری کالج بڑے انداز میں بائیں شانے پر گرائے ہوئے —— میں —— نندتیا لشوپتی رانا —— اپنی ڈپلومیٹک مسکراہٹ بکھیرتی ہوں۔" "ہیلو مسٹر بیلوغ! پچھلی چھٹیوں میں آپ کا مشرق وسطیٰ کا دورہ کیسا رہا؟" —— "ہیلو سر رائے! کیا کامن مارکیٹ میں برطانیہ کے شامل ہونے کے بارے میں اب بھی آپ کی وہی رائے ہے جو پہلے تھی یا بدل گئی؟" —— "میں نے سنا ہے اگلی ٹرم میں آپ کرنسی اور کریڈٹ پر لیکچر دے رہے ہیں —— کاش کہ یہ میرا مضمون ہوتا" —— "ہیلو سر ولیم! آپ روس سے کب لوٹے؟ —— آپ کا ٹرپ کیسا رہا؟" —— "اوہ ہیلو لیڈی ہیٹر! آپ کا لباس کتنا خوبصورت ہے۔ لیکن آپ اس لباس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں" —— "ہیلو مسٹر اوپی! میں نے آپ کی نئی کتاب دیکھی۔ بہت اچھی ہے —— اگر لیبر اس دفعہ انتخابات جیت گئی تو کیا آپ حکومت کے ایڈوائزر بن کر چلے جائیے گا؟ اور اگر چلے جائیے گا تو پھر آکسفورڈ کا کیا ہو گا؟" "ہیلو مسٹر کوئنٹن! آپ کا کل کا لیکچر بہت دلچسپ تھا۔ لیکن جب آپ نے کہا کہ کچھ لوگ تو بس ہر وقت پلٹ پلٹ کر تتلیوں کو دیکھتے رہتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہاتھ نہ آنے والی چیزیں ہیں، تو اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے بعض لڑکے بہت شرمائے" —— "ہیلو مسٹر رچرڈز! میں نے سنا ہے۔ جب آپ کے پاس آل سولز کی فیلوشپ تھی۔ تو آپ مستقل پانچ برس تک جاسوسی ناول پڑھتے رہے —— !"

میرا جی چاہا۔ میں چیخ پڑوں اور کہوں —— نندتیا —— نندتیا —— تم مجھ سے صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ میں چلا جاؤں —— یا شاید یہ غیر مہذب حرکت ہو گی۔

——— ہاں وہ مجھ سے مستقل اسی ٹون میں باتیں کر رہی تھی جیسے یہ اس کا کمرہ نہیں، کسی کالج کا ہال ہے۔ اور یہ کوئی بڑا بھاری قسم کا ریسپشن تھا اور اسی قسم کی کسی تقریب پر ہم پہلے مل چکے تھے ——— اور اسے معلوم تھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور میری دلچسپیاں کیا ہیں ——— اور میں نے ابھی حال میں کیا کیا ہے۔ اور مجھ سے کس قسم کی گفتگو کرنا چاہیئے۔

جیسے ہم پہلے کبھی نہیں ملے ——— جیسے ہم نے مستقبل کے کسی خاکے میں کبھی رنگ نہیں بھرے ——— اور کبھی اس نے مجھ سے لپٹ کر یہ نہیں کہا تھا ——— "آندرے ہم کو پیار کرو"۔

اور اب اس نے آکسفورڈ کے بارے میں ایک گائیڈ بک نکالی ہے اور مجھے بتا رہی ہے کہ کون کون سی جگہیں دیکھنے کے قابل ہیں، لیکن اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا۔ یہاں ماڈلین ٹاور ہے۔ جہاں ہم یکم مئی کو حمد گا کر بہار کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس لیے پہلی رات اکثر لوگ دریا پر گذارتے ہیں۔ گذشتہ برس رات بھر بارش ہوتی رہی ——— ہم لوگ الاؤ جلاتے اور وہ بجھ جاتا۔ رات بھر ہم کمبلوں میں لپٹے ٹھٹھرتے رہے ——— تم اگلی مئی کو ضرور یہاں آنا ——— ہم شام دریا پر گذاریں گے ——— ہم صبح کو ماڈلین ٹاور پر ساتھ جائیں گے ——— اس کے بعد کالج میں ناشتہ کریں گے ——— اور پھر ہائی سٹریٹ میں مورس ناچ دیکھیں گے ———

"کیا میں اگلے موسم بہار میں یہاں آؤنگا نندتیا؟" ——— میں نے اس سے پوچھا

"اگر تمہارا جی چاہے ———" اس نے سادگی سے کہا۔

——— اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا: تم اگلے موسم بہار میں آکسفورڈ ضرور آنا ——— ہم سپرنگ بال پر جائیں گے ——— اور ہم کومیموریشن بال پر جائیں گے۔ یہ ہمارے ہاں کی بہت پرانی روایات ہیں ——— یہ بہت آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے رقص ہوتے ہیں ——— مدھم مدھم روشنیاں ——— اور آرکسٹرا ——— مختلف کمروں میں مختلف قسم کی موسیقی ——— عام طور پر لائبریری میں سب سے اچھی موسیقی ہوتی ہے ——— اور تم بہت اچھا رقص کرتے ہو ——— اور تمہارے ساتھ جا کر مجھے بہت خوشی ہوگی ——— عام طور پر میں اپنے بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ جاتی ہوں ——— اب تک میں کسی کے ساتھ تنہا نہیں گئی ——— دراصل مجھے کوئی اچھا آدمی ملا ہی نہیں ——— جب یہاں میرا پہلا سال تھا تو میرے پاس چھ دعوت نامے آئے لیکن وہ سب کے سب بہت بور لوگ تھے ——— ایک کی ناک بہت لمبی تھی ——— دوسرے کا چہرہ بہت چپٹا اور سر بہت چھوٹا تھا ——— تیسرا ہر وقت اپنے بورڈنگ سکول کا ذکر کرتا رہتا تھا ——— اور باقی تین بھی ایسے ہی گڑبڑ تھے ——— تب میں بہت روئی۔ اور میں نے اپنے بھائی ارون سے کہا ——— "ارون، آدھ گھنٹے تک تو خیریت ہے لیکن کسی کے ساتھ تو گھنٹے تک کیسے رقص کیا جا سکتا ہے، جب تک وہ شخص بہت ——— بہت زیادہ پسند نہ ہو" ——— ارون مجھے روتے دیکھ کر بہت گھبرایا۔ اور پھر وہ مجھے رقص پر لے گیا ——— لیکن تمہارے ساتھ جانا بہت اچھا رہے گا۔ ہے نا؟ ——— تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو ——— ٹھہرو میں کون سا لباس پہنوں گی! میرا خیال ہے۔ میں ہندوستان سے چند نئی ساریاں منگواؤں گی۔ اور پھر تم مجھے بتانا کہ میں کونسی پہنوں۔

اور اب وہ مجھے بتا رہی ہے کہ کس کالج کی چیپل میں کیا خوبی ہے۔

"نند تیا ـــــ کیا میں اگلے موسم بہار میں یہاں آؤں گا ـــــ ؟ ـــــ کیا ہم بہار کے رقص پر ساتھ جائیں گے؟؟"
اس نے تکیے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "شاید ـــــ لیکن اگلا موسم بہار تو ابھی بہت دور ہے ـــــ ابھی تو یہ خزاں کی ٹرم ہے۔"

میں نے ایک آخری DESPERATE کوشش اور کی ہے ـــــ "نند تیا ـــــ کبھی ہم نے عشق کیا تھا بہت بھرپور ـــــ بہت شدید ـــــ کیا اب وہ سب باتیں بے معنی ہو کر رہ گئیں؟ ـــــ وہ چار ہفتے ہی سہی لیکن کیا چار ہفتوں کو زندگی سے کاٹ کر یوں دور پھینکا جا سکتا ہے؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ہے ـــــ سنو آندرے ـــــ وہ جو چار ہفتے تھے، ان میں میں نے بے پناہ خوشی دیکھی ـــــ لیکن ہم ان کا ذکر نہیں کریں گے ـــــ اس کے بعد تیرہ ہفتے اور بھی گذر چکے ہیں ـــــ اور عشق کیا ہے؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ـــــ شاید ہم سب خوفزدہ ہیں ـــــ اور تنہا ہیں ـــــ اور اس خوف سے گھبرا کر عشق کر ڈالتے ہیں۔ شاید تم نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ میں تم سے عشق نہیں کرتی ـــــ یا شاید جذبے کو کسی دوسرے تک پہونچانا ہے ہی مشکل کام ـــــ یہاں نہ الفاظ کام آتے ہیں، نہ لمس۔ ہم سب کی VOCABULARY ـــــ مختلف ہے ـــــ خواہ وہ الفاظ کی ہو یا جسم کی ـــــ اس VOCABULARY میں ہمارا ماضی شامل ہوتا ہے اور ہمارے مستقبل کے خواب ـــــ لیکن شاید یہ بھی بڑی بات ہے کہ کوئی شخص زندگی میں ہر اعتراف سے دامن بچاتے ہوئے گذرتا چلا جائے ـــــ ملکوں ملکوں گھومتا رہے ـــــ جنم جنم بھٹکتا پھرے ـــــ اور پھر کہیں ایک لمحے کے لئے ہی سہی، لیکن کسی سے اپنے وجود کی پوری شدت کے ساتھ یہ کہہ سکے ـــــ "ہاں ہمیں تم سے عشق ہے"! یہ اپنی ذات سے دیانت برتنے کا مسئلہ ہے۔ جسم و جاں کے خلوص کا سوال ہے۔ کسی سے یہ کہنا کہ تم ہمیں بہت اچھے لگتے ہو۔ اتنا ہی دشوار ہے جیسے جب کوئی اچھا نہ لگتا ہو اور وہ کہے تم ہمیں بہت اچھی لگتی ہو۔ اور ہم ہنس کر ٹال جائیں اور کہیں شکریہ ـــــ کسی سے یہ کہنا، ہمیں پیار کرو پلیز ـــــ اتنا ہی دشوار ہے جیسے جب کوئی ہمیں پیار کرنا چاہے تو ہم پریشان ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیں اور کہیں، تم ہمارا ہاتھ چوم سکتے ہو۔ بس ـــــ لوگ ایک دوسرے کی انجانے میں کتنی تحقیر کرتے ہیں۔ تحقیر وہ انڈر گریجوائٹس بھی کرتے ہیں جو جھک کر پوچھتے ہیں۔ تم ہم سے پیار کرتی ہو۔ ہے نا؟ ـــــ اور وہ بھی اتنی ہی تحقیر کرتے ہیں۔ جو یہ کہیں ـــــ نہیں تم ہم سے پیار نہیں کرتیں ـــــ ہماری ذات کی دیانت دونوں صورتوں میں مجروح ہوتی ہے۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم کسی کے جذبے کی تحقیر کریں ـــــ عشق کی اہمیت بس اتنی ہی ہے ہر پیڈ فلیپر، کہ وہ ہمیں اپنی ذات سے دیانت برتنا سکھا دیتا ہے ـــــ اس سے زیادہ کی خواہش اگر کوئی کرتا ہے تو وہ اس کی حماقت ہے۔ اور سادگی ہے ـــــ اور بچپنا ہے"

وہ تھک کر لیٹ گئی

"پلیز آندرے ـــــ ہم ان باتوں کا ذکر نہیں کریں گے۔"

میرے دل پر ایک چوٹ سی پڑی ہے۔ یہ وہ نند تیا نہیں ـــــ اس نے ایک بار بھی بچوں کی طرح اپنے بازو میری طرف نہیں پھیلائے۔ اور یہ نہیں کہا:

کہا تم ہم کو پیار نہیں کرو گے آندرے!



میں ارجن ہوں۔ نندتیا کا سب سے بڑا بھائی۔
میں ابھی ابھی آکسفورڈ پہونچا ہوں۔ وہ مجھے اپنے کالج کے زینے پر ملی۔
"اوہ۔ ہیلو۔ ارجن ——" اس نے سادگی سے کہا۔ وہ خوشی سے چیخ کر میرے گلے سے نہیں لپٹی ——
"تم کمرے میں چلو۔ میں یہ خط ڈال کر آئی۔"

کمرے میں اوپر تلے بہت سے بکس پڑے ہیں۔ ایک طرف کارڈ بورڈ کے بکسوں کا ڈھیر لگا ہے —— وارڈ روب خالی ہے اور کپڑے پلنگ پر اور کرسیوں پر پڑے ہیں۔ میں نے بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کی ہے۔

چھٹیوں کے شروع میں ہمیشہ اس کمرے کا یہی حشر ہوتا ہے۔ صرف ایک فرق ہے۔ یہاں ہمیشہ اس کمرے میں بہت سے لوگ پیکنگ کیا کرتے تھے۔ آج نندتیا تنہا ہے۔ آج اس کے دوست یہاں نہیں ہیں —— ہمیشہ وہ ٹرم کے خاتمے پر بہت غل مچاتی —— اُفوہ کس قدر کام ہے۔ مجھے بہت سے کارڈ بورڈ بکس چاہئیں —— اور پھر سب لوگ ہنستے، غل مچاتے، کالج کے باغ میں جا کر باغباں سے اس کا دستی ٹھیلہ مانگتے اور اسے دھکیلتے ہوئے مختلف شراب خانوں میں جاتے —— آس پاس کے سب شراب خانوں کے مالک اس کو پہچان گئے تھے اور اس کے پہنچتے ہی خالی بکس نکالنا شروع کر دیتے۔

اس لدے ہوئے ٹھیلے کو لے کر وہ کالج پہونچتے —— اور ہر شخص اپنا اپنا کام شروع کر دیتا۔ ایک صاحب نازک چیزیں پیک کرنے کے ماہر تھے۔ وہ گڑیاں۔ مجسمے۔ نوادر اور شیری کے گلاس پیک کرتے —— ایک اور حضرت زیادہ سے زیادہ کپڑے چھوٹے سے چھوٹے بکس میں ٹھونس دینے میں کمال رکھتے تھے۔ تیسرے کی خصوصیت کتابیں پیک کرنا تھی۔

وہ آرام سے ڈیسک پر بیٹھ جاتی۔ "تم یہ سب کام کرو۔ میں کچھ خطوں کے جواب لکھ لوں۔ ورنہ وہ چھٹیوں بھر پڑے رہیں گے۔"
جب سب لوگ کام ختم کر کے پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے قریب آتے تو وہ مسکراتی۔ "اوہ کام ختم ہو گیا! اچھا اب میں تم لوگوں کو کافی پلاؤں گی" —— جیسے اس سارے کام کی تلافی صرف ایک پیالی کافی تھی۔

ارون بہت خفا ہوتا۔ "نندتیا یہ بہت بُری بات ہے۔ تمہیں اپنا سب کام خود کرنا چاہیئے۔"
"لیکن میرے پیارے بھائی۔ تمہیں نہیں معلوم وہ سب اس کام کو کس شوق سے کرتے ہیں۔"
"اوہ مجھے سب معلوم ہے" —— وہ چڑ کر کہتا۔ "تم —— تم لوگوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہو —— یہ استحصال ہے۔ قطعی جذباتی استحصال" —— وہ موٹے موٹے لفظ استعمال کرتا۔

اور آج وہ تنہا پیکنگ کر رہی تھی —— اور بھاری بھاری چیزیں اٹھا رہی تھی —— مدت سے ہم سب یہ چاہتے چلے آئے تھے کہ وہ اپنا کام خود کرنا سیکھے —— برسہا برس سے ہم چاہتے چلے آئے تھے کہ اس میں متانت آ جائے اور تحمل آ جائے —— ہاں اس میں متانت آ گئی اور تحمل آ گیا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اور کتنا بہت کچھ آ گیا —— اس میں بردباری آ گئی اور کلبیت بھی آ گئی —— ہم نے یہ سب تو نہیں چاہا تھا۔

اس نے اپنی ساریاں تہہ کر کے بکس میں رکھیں۔

"نندنیا۔ تمہارے سب دوست کدھر ہیں آج؟" میں نے پوچھا۔

"ارجن ——— میں نے سوچا تو اروِن کی بات ٹھیک معلوم ہوتی ——— یہ جذباتی استحصال ہے ——— اور یہ غلط بات ہے ———" بکس کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "انسان دراصل تنہا ہے ——— بالکل تنہا ——— ہے نا ارجن!" یہ اس نے ایسے ہی کہا۔ جیسے بیسیوں بار اس نے کہا تھا۔ "ہم کو آئس کریم کھلانے لے چلو گے۔ ——— ہے نا ارجن!" یا جیسے کوئی اچھا ڈرامہ یا بیلے دیکھنے کے بعد وہ کہا کرتی۔ "کیسی خوبصورت شام تھی ——— ہے نا ارجن!" یا موسم بہار کی کسی چمکیلی روشن صبح وہ سبزے پر لوٹ لگاتی اور کہتی۔ "زندگی بہت خوبصورت ہے ——— ہے نا ارجن"۔ انسان کی تنہائی کا ذکر بھی اس نے اسی سادگی سے کیا۔ صرف اس کے ہونٹ اپنے خم کے قریب ذرا سا کپکپائے ———

"اروِن حسب معمول ماڈلین میں ٹھہرا ہے ——— سرجی رینڈولف میں ہے۔ کیونکہ اس کی موجودہ محبوبہ بھی آئی ہے۔ شاید یہ اس کی گیارہویں یا تیرھویں محبوبہ ہے ——— اس کی محبوبائیں اس قدر جلد بدلتی ہیں کہ میں تو دراصل نمبروں کا گھپلا کر جاتی ہوں۔ کل ہم سب رقص پر گئے تھے ——— ہمارے پاس آج کی شام بھی ہے ——— پھر میں چھ ہفتوں کے لئے چلی جاؤں گی۔ کیسی عجیب بات ہے ارجن کہ آکسفورڈ میں آدمی ہفتوں کے حساب سے سوچتا ہے ——— دو ہفتے ——— چار ہفتے ——— آٹھ ہفتے ——— جبکہ زندگی دراصل لمحوں سے عبارت ہے ——— اور صبحوں سے ——— اور شاموں سے۔ شاید یہ یہاں کا اکیڈیمک ماحول ہے جس میں ٹرم آٹھ ہفتے کی ہے ——— اور ٹرم کے ہر ہفتے میں دو مقالے لکھنا پڑتے ہیں ——— تم نے ہماری اس ٹرم کی رپورٹس نہیں سنیں ارجن ——— بہت خراب ہیں ——— میرے ٹیوٹرز کا کہنا ہے کہ میرا کام اس ٹرم میں بہت مایوس کن رہا ہے ——— یہ لوگ ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں ——— "مایوس کن!" ——— جیسے میرے کام سے بھی ان کی آرزو میں لپٹی ہوئی ہوں ——— شاید میری کلاس سے صرف میری ذات متاثر نہیں ہو گی بلکہ ان کا بھی اس چمک دمک میں حصہ ہوگا ——— دنیا میں کیسی افراتفری ہے ——— ہے نا ارجن ——— اور دنیا اتنی بڑی بھی ہے۔ ——— مجھے کبھی کبھی اس وسعت سے، اس ہنگامے سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے یہاں کوئی گوشہ، کوئی مختصر سا گوشہ صرف اپنا بھی ہوتا جہاں زرد پتے بکھرے رہتے ——— خودرو جنگلی پھول ہوتے ——— اور سبز گھاس پر لیٹ کر میں آنکھیں بند کر سکتی۔ اور دھرتی سے لپٹ کر صرف اتنا پوچھ سکتی ——— میں کون ہوں؟ ——— میں کیا ہوں؟ ——— اور میں کیا چاہتی ہوں ——— مجھے دراصل اپنے آپ سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ کل میں پورٹ میڈو گئی تھی اور وہاں گھاس پر لیٹ کر میں نے یہی پوچھنا چاہا تھا ——— لیکن پھر ایک دم ایک تیز درد سے میری آنکھیں کھل گئیں ——— وہاں ایک عجیب قسم کی جنگلی بوٹی تھی اور اس نے میرے بازو پر کاٹ لیا تھا ———

وہ جلدی جلدی پیکنگ کر رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

"کیا میں تمہاری کوئی مدد کروں نندنیا؟" ———

"نہیں ارجن۔ اب تو بس کام ختم سمجھو ——— اور تم یہاں کیوں بیٹھے رہو۔ کیوں نہیں تم ٹرف ٹیورن چلے جاتے؟

سرجی اور اروِن دونوں وہاں ہیں ——— میں بھی آدھ گھنٹے تک وہاں آجاؤں گی۔ پھر ہم سائیڈر پئیں گے۔"

نندتیا ——— تم اسپین جا رہی ہو ——— یہ چیک رکھ لو۔ شاید تمہیں وہاں ضرورت پڑے ———"

وہ چونکی جیسے اسے پھر بچھو بوٹی نے کاٹ لیا ہو۔ "ارے نہیں ارجن ——— میرے پاس کافی پیسے ہیں ——— تم یہ رکھو۔ تمہیں خود بھی کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

یہ ہماری بہن تھی۔ اس نے کبھی کچھ لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو خود کہتی ——— ارے میرے تین بھائی ہیں۔ لیکن آج کل میں کس قدر کنگال ہوں ——— وہ ہمیشہ ہی کنگال رہتی اور پھر بہت آرام سے وہ چیک جو اس کو دیئے جاتے ہنس کر اپنے بیگ میں ڈال لیتی۔

اور پھر ہم نے اسے خدا حافظ کہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کے کپڑوں کا کیس تھا اور دوسرے میں گٹار اور ٹائپ رائٹر۔

"لاؤ۔ میں تمہاری چیزیں اٹھالوں۔ نندتیا" ——— اروِن ہمیشہ اس کا سامان اٹھاتا تھا۔

"ارے نہیں اروِن ——— یہ سب سامان مجھے سارے سفر میں خود ہی اٹھانا ہے۔ اچھا ہے عادت پڑ جائے۔"

"نندتیا کیا تم چاہو گی کہ ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ چلے؟ تم چاہو تو ہم سب چل سکتے ہیں" ——— سرجی بہت گیلنٹ تھا۔

"ارے نہیں سرجی۔ پھر تمہاری تیرھویں محبوبہ کا کیا ہوگا ——— اور اروِن کی پہلی اور اکلوتی محبوبہ کے غم کا کیا بنے گا۔ اور ارجن کی سائنس کانفرنس کا کیا حشر ہوگا؟ ———" وہ بہت زور سے ہنسی۔

اس نے سیٹ پر اپنی چیزیں رکھیں۔ ایک اطالوی نے اس کے قریب آکر کہا۔ "سینورا، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"شوق سے ———" اور اس نے اروِن کو آنکھ ماری۔

اور پلیٹ فارم سے نکلتے ہوئے اروِن نے کسی کو دیکھ کر خوفزدہ ہو کر کہا ——— "ارے یہ تو وہ آرٹ ہسٹورین ہے۔"

ہاں وہ آندرے ہی تھا۔

"ہیلو آندرے ——— کیا تم نندتیا سے ملنے آئے ہو؟ ——— ہم ابھی ابھی اسے خدا حافظ کہہ کر آئے ہیں۔ وہ اسپین گئی ہے۔ لوک گیتوں کی دھنیں جمع کرنے ——— لیکن ابھی ہم یہیں ہیں اس لئے آج کی شام تم ہمارے ساتھ گذارو۔ یعنی اگر تم کچھ اور نہیں کر رہے ہو" ——— سرجی نے شفقت سے مسکرا کر کہا۔

اس خوبصورت انسان کے چہرے پر افراتفری کی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ صرف ایک بادل سا آیا اور چھٹ گیا ——— اس نے ٹکٹ چیکر کی طرف اپنا ٹکٹ بڑھایا ——— اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔

تب شام کو ہم ماڈلین برج کی سیڑھیاں اتر کر بوٹ ہاؤس تک گئے اور دریا کے قریب بیٹھ گئے ——— روشنیوں کا عکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ اور جگنو سے چمک رہے تھے۔

"یہ بوٹ ہاؤس میرے اور نندتیا کے کالج کا مشترکہ ہے ——— یہ ہمارے کالج کے چپو ہیں" ——— اروِن نے قریب پڑے ہوئے چپوؤں کی طرف اشارہ کیا ——— "اور وہ نندتیا کے کالج کے ——— وہ نیلی اور سفید دھاری والے ——— کیا تم دریا کی سیر کرو گے؟" اروِن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ملامت سے پوچھا ——— شاید اسے افسوس ہو رہا تھا

اور آندرے سے ہمدردی ـــــــ اردن میں دوسروں کا دکھ سمجھنے کی بڑی صلاحیت تھی۔

"تم مجھ سے بہت خفا ہو نا؟" ـــــ آندرے نے سر اٹھا کر کہا۔

"نہیں تو۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ صرف میں نے اس کو دکھ سے بچانا چاہا تھا۔ وہ ہماری بہت لاڈلی بہن تھی ـــــ اور اس کو اتنا دکھ پہنچا"

"اردن نیشتو پتی رانا ـــــ شاید ایسا چاہتے وقت تم یہ بھول گئے تھے۔ کہ ہم میں سے کوئی کسی کو دکھ سے نہیں بچا سکتا ـــــ چاہنے کے باوجود بھی نہیں ـــــ" سرجی نے ایک کنکر کو ٹھوکر مار کر دریا میں پھینک دیا۔

"کیا تم ٹہلنا پسند کرو گے؟" ـــــ سرجی نے اس کے قریب جھک کر اور گھاس کا وہ تنکا جو اس کے بالوں میں اٹک سا گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر نرمی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

اب سرجی اور اردن ٹہلتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ چلے گئے ـــــ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ ہاں یہ واقعی بہت حسین شخص تھا ـــــ بہت نفیس ـــــ اور بہت اداس بھی ـــــ

"تم چاہو تو نندتیا کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہو" ـــــ میں نے اس سے کہا

"ہم پیرس میں ملے تھے۔ وہ موسمِ خزاں کی آمد آمد تھی ـــــ اور تب ہم نے اگلے موسمِ بہار میں یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا ـــــ پھر وہ کیوں چلی گئی ـــــ؟" ـــــ اس نے سر اٹھا کر کہا

دریا کا پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا ـــــ یہ دریا کا پانی ہے نا ـــــ یہ صدیوں سے یونہی بہتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن کیا یہ وہی پانی ہے جو گذشتہ سال تھا یا اس سے پہلے تھا! ـــــ تو یہ موسمِ بہار کیا وہی ہے جس کے بارے میں اس نے چند مہینے پہلے سوچا تھا! یا یہ کوئی اور سا موسمِ بہار ہے ـــــ کون کہہ سکتا ہے۔ کون جان سکتا ہے!!!

ہاں تم شاید اسے چاہتے ہو۔ لیکن کیا اس نے تمہیں نہیں چاہا۔

وہ کس قدر خوش تھی۔ ہنستے ہوئے آ کر اس نے کہا ـــــ "سنو ہمیں عشق ہو گیا ہے ـــــ"

اس کا بس چلتا تو وہ قلابازیاں کھاتی اور ناچتے ناچتے دنیا بھر کو بتاتی۔ اس جذبہ میں کتنا تحیر شامل تھا ـــــ اپنی ذات کے بارے میں کتنے انکشافات شامل تھے ـــــ

وہ تمہارے ساتھ تیرنے کے لئے گئی۔ اور پھر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی واپس پہونچی ـــــ اور میرے قریب آ کر بولی۔ "ہماری گردن کے خم کے قریب جو یہ تل ہے، یہ بہت خوبصورت ہے ـــــ ہے نا ارجن ـــــ!"

پھر اس نے دستی آئینہ اٹھا کر اپنے بازو کو گھما پھرا کر دیکھا اور خفا ہو کر اردن کی طرف پلٹی۔ "اردن تم کیسے نکمے بھائی ہو۔ ہم تم اتنی بار تیرنے گئے لیکن تم نے ہمیں کبھی نہ بتایا کہ ہمارے بائیں شانے پر نیچے کی سمت ایک تل ہے۔"

پھر ایک روز اس نے کہا ـــــ "میرے بال بہت خوبصورت ہیں ـــــ ہے نا اردن ـــــ یہ دنیا کے حسین ترین بال ہیں۔"

اردن دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح وہ پلٹا۔ وہ تم سے بہت جلتا تھا۔ "یقیناً یہ پہلا موقعہ نہیں ہے۔ کہ کسی نے تم سے یہ کہا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے بھائی ــــ یقیناً یہ پہلا موقعہ ہے کہ مجھے یہ بات اتنی اچھی لگی۔"

ہاں اس کی آنکھوں میں ستارے جھلکتے رہتے۔ اور اس کے چہرے پر خواب بکھرے رہتے۔ اور ایک روز جب شاید تم لوگ ورساتی جا رہے تھے اور وہ ناچ ناچ کر گنگناتے ہوئے تیار ہو رہی تھی۔ سرجی بے خبری میں اس سے ٹکر گیا۔

"ہش ــــ ہش ــــ سرجی۔ دیکھ کر چلو بھائی۔ ہماری شان میں یہ گستاخی ــــ ہم آبگینوں سے بھی زیادہ نازک ہیں ــــ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے" ــــ اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"یہ بات ہے ــــ ہش بی بی؟" ــــ سرجی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ہنس پڑا ــــ

"قطعی یہی بات ہے" ــــ وہ ہنستے ہوئے اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ "سرجی ہم مونالیزا کی مسکراہٹ ہیں۔ ہم رینوآر کی پینٹنگ ہیں۔"

سرجی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا ــــ "اتنی خوشی سنبھال سکو گی؟ ــــ کیوں بی بی؟؟" ــــ

"سرجی ایک بات بتاؤ۔ اپنے ایمان سے ــــ تمہاری اتنی محبوبائیں ہیں۔ ہے کوئی ہم جیسی؟" اس نے چیلنج کیا۔

"ارے نہیں بی بی ــــ تمہاری برابری کوئی کر سکتا ہے بھلا؟" ــــ سرجی نے فوراً ہار مان لی۔

"ایک بات اور بتاؤ سرجی ــــ سچ سچ ــــ کبھی کسی نے تم کو اتنا چاہا کہ وہ پریشان ہو ہو جائے۔ بس جیسے اس کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ جبکہ وہ آدمی بہت ــــ بہت زیادہ سمجھدار بھی ہو۔"

سرجی نے فکرمندی سے سر کھجایا۔ "نہیں بی بی ہم سے کبھی کسی نے ایسا پیار نہیں کیا۔"

"اردن، اب کبھی جو تم دوبارہ عشق کرو تو کسی ہم جیسی لڑکی سے کرنا۔" اس نے اپنی گردن پر انگلی رکھ کر "ہم" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "پھر تم بہت خوش رہو گے۔ اور اب ایک بہت ہی پیارے بھائی کی طرح ہمارے بلاوز کے بٹن بند کر دو۔ یہ ہمارا ہاتھ پیچھے نہیں پہونچتا۔"

اردن نے خاموشی سے اس کے بلاوز کے بٹن بند کر دیئے۔

وہ میرے قریب آئی۔ "ارجن ہم بہت حسین ہیں۔ یعنی ہم یہاں بھی حسین ہیں۔" اس نے اپنے سر پر انگلی رکھ کر کہا۔ ــــ "اور ہم میں بہت زندگی ہے۔ ہم DYNAMIC ہیں ــــ ایک دم DYNAMIC ــــ اور جہاں ہم ہوں۔ وہ جگہ جگمگا اٹھتی ہے ــــ ہے نا ارجن!"

"ہاں بی بی" ــــ میں نے پائپ پیتے ہوئے کہا۔

"ارے بی بی۔ تم جہاں سے گذر جاؤ۔ وہ رستہ جگمگا اٹھتا ہے" ــــ سرجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور ارجن، وہ بہت اچھا ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ اور بہت نفیس ہے۔ اور وہ بہت اداس رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مسکراتا ہے تو اس کا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے۔ تب وہ اور بھی اچھا لگتا ہے ــــ اور بھی حسین ــــ اس کو ذرا

سا اور ہنسنا چاہیے۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"ہاں اس کو یقیناً بہت خوش رہنا چاہیئے۔ وہ بہت اچھا ہے نا؟ ــــ اور اچھے لوگوں کو بہت سی خوشی ملنی چاہیئے۔ ارجن ــــ دنیا میں اتنے اچھے لوگ ہیں ــــ اس کی تو مجھے خبر ہی نہ تھی ــــ" اس کی آواز میں بہت حیرت تھی۔

ــــ "یعنی وہ ایک دم ایلفا ایلفا قسم کا آدمی ہے" ــــ یہ بہت بڑا اخراج تحسین تھا جو اس نے تمہیں ادا کیا۔

"ارجن ہم اتنی باتیں کرتے ہیں۔ اتنی بے تحاشا باتیں ــــ اس سے باتیں کرنا اتنا آسان ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور اس کے ساتھ خاموش بیٹھے رہنا بھی بہت آسان ہے۔ یعنی باتیں نہ کرتے ہوئے بھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم باتیں کر رہے ہیں۔ ارجن، اس نے زندگی بھر کبھی کسی سے اتنی باتیں نہیں کیں۔ در اصل وہ تو بہت خاموش سا آدمی ہے ــــ" پھر اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں ــــ "ارجن جب تم عشق کرو گے نا، تو کسی ہم جیسی لڑکی سے کرنا۔ پھر تم بھی بہت سی باتیں کیا کروگے۔"

"اچھا بی بی۔"

جب وہ چلی گئی۔ تو اروِن جو دریچے میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ پلٹ کر غصّے سے دانت بھینچ کر بولا۔ "تم لوگ اسے خوب بگاڑ رہے ہو۔ جی بھر کر ــــ جو کمی اس احمق ہسٹورین نے چھوڑی ہے۔ وہ تم پوری کر رہے ہو۔ تم ــــ تم کو کیا ہو گیا ہے؟" ــــ اس نے سرجی کو غصّے سے گھورا ــــ "اور ارجن تم بھی ــــ تم بھی ــــ" اس کے لہجے میں بڑی شکایت تھی جیسے وہ بروٹس سے مخاطب ہو۔

"اروِن۔ میرے بھائی ــــ" سرجی نے نرمی سے کہا۔ "اسے تنہا چھوڑ دو۔ یہ جو تم اس کی زندگی کے بارے میں اس قدر پریشان رہتے ہو اور منصوبہ بندی کی کوشش کرتے ہو، تو بند کرو اس خرافات کو ــــ یہ تم کوئی اس پہ احسان نہیں کر رہے۔ اور اس کے لئے وہ تمہاری کبھی ممنون بھی نہ ہو گی۔"

"تاکہ اسے دکھ پہونچے" ــــ اروِن نے خفگی سے کہا۔

"یہ دکھ دکھ کی رٹ کیا لگا رکھی ہے تم نے اروِن؟ ــــ کیونکہ یہ دنیا صرف حسین ہی نہیں، اس میں بہت دکھ بھی ہیں ــــ کیونکہ زندگی کی مسکراہٹوں کے پیچھے ایک بہت بڑا المیہ چھپا ہوا ہے ــــ کیونکہ دنیا ہمارے خوابوں کو قدموں تلے روند ڈالتی ہے ــــ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم پہلے ہی اس کو ان خوابوں کی قدر و قیمت بتا دیں ــــ بلکہ تمہارے حسابوں تو ہمیں یہ چاہیے کہ ہم اس کو خواب دیکھنے بھی نہ دیں ــــ کیا خوب منطق ہے بھائی ــــ اور تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ صرف تمہیں اس کو چاہتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اور ارجن اسے نہیں چاہتے؟ اس کو اپنے خواب دیکھنے دو اروِن۔ ــــ اس دنیا میں جتنی بھی خوبصورتی اور جتنی بھی بدصورتی ہے، اسے خود ہی اس کی تلاش کرنے دو ــــ ابھی اس نے زندگی کا حسن پایا ہے۔ کسی روز وہ اس کے حزن اور اس کے المیہ کو بھی پا جائے گی ــــ لیکن اپنے وقت پر اروِن ــــ زندگی کی رفتار کو تیز مت کرو میرے بھائی ــــ ابھی سے اسے یہ نہ بتاؤ۔ کہ یہ دنیا بہت اداس بھی ہے ــــ یہاں بہت دکھ بھی ہیں ــــ یہاں دل ٹوٹ بھی جاتے ہیں" ــــ سرجی پنجرے میں بند شیر کی طرح سٹوڈیو میں گھوم رہا تھا بہت دن کے بعد میں نے اسے اس موڈ میں دیکھا تھا۔ "اسے تنہا چھوڑ دو اروِن ــــ بالکل تنہا ــــ"

"آج کل تو تم بھی لفٹ ہی نہیں دیتیں نند تبا" ——— ایک روز اردن نے اس کے قریب جا کر بڑے درد سے کہا۔

"ہاں اردن ——— مجھے خود بھی یہ خیال آیا ہے ——— شاید یہ عشق کچھ چیز ہی ایسی ہے۔ لیکن نہیں، شاید یہ غلط بات ہے ——— کیونکہ تم لوگ تو جب بہت دل توڑ دینے والا عشق کرتے ہو، تب بھی مجھے نظر انداز نہیں کرتے ——— پر کیا بتائیں بھائی، وقت ہی نہیں ملتا" ———

"کیا تم اس فانوس کو چھونا پسند کرو گی!" ——— اردن نے اسے اٹھا کر چھت کی طرف اشارہ کیا۔

"اوں ——— فانوس!" ——— اس نے ناک چڑھائی۔ "تم کس قدر بچے ہو اردن ——— میں تو آج کل چاند تاروں کو چھو رہی ہوں ——— چاند تاروں کو ——— اور ایک بات بتاؤ اردن ——— جب تم نے عشق کیا تھا تو کیا ایسا ہوا تھا کہ ہر رات تم اپنی محبوبہ کے بارے میں سوچتے سوچتے سو جاؤ اور صبح کو اٹھتے ہی سب سے پہلا خیال ——— سب سے پہلی یاد اس کی آئے ——— بس یوں سمجھو جیسے ہر وقت کوئی آنکھوں میں لہراتا رہے ——— کیا تم نے بھی ایسا ہی عشق کیا تھا؟ ——— کیوں پارٹنر؟" ——— اردن نے ایک آہ بھری اور اسے نیچے اتار دیا۔

پھر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آویزے پہننے کی کوشش کی ——— "میں کیسی لگ رہی ہوں اردن؟"

"بہت اچھی بی بی ———"

"اوں ہوں ——— اچھا کچھ ایسا مناسب لفظ نہیں ——— دراصل ابھی تک کوئی ایسا لفظ تخلیق ہی نہیں ہوا جو یہ بتا سکے کہ دراصل میں کیسی ہوں۔"

ہاں، وہ ہر وقت تمہاری کہی ہوئی باتیں دہراتی ——— یہ باتیں وہ یوں کرتی جیسے یہ اس کی اپنی دریافت ہوں۔ اور پھر ہم سے ان کی تائید چاہتی۔ وہ چلتی بھی یوں جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ وہ ہنستی ہوئی سو جاتی اور ہنستی ہوئی اٹھتی ——— وہ سوتے میں بھی مسکراتی رہتی۔ وہ جو بہت دیر سے اٹھنے کی عادی تھی، صبح بہت جلد اٹھ بیٹھتی ——— ہا ——— ایک اور خوبصورت دن طلوع ہوا ——— آج ہم کیا کریں گے؟ ——— اور وہ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی ——— اس سوال کی مخاطب وہ خود ہوتی۔

"سر جی" ——— ایک روز اس نے کہا۔ "میں برسہا برس سے ہر سال اس موسم میں پیرس آتی ہوں اور وہ بھی ہر سال کانفرنس میں آتا ہے، لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے ——— اور سنو پچھلے سال میں روم گئی تھی نا اگست میں ——— تو وہ بھی وہیں تھا۔ لیکن ہم نہیں ملے ———" اس کے چہرے پر بڑی حیرت تھی۔ جیسے زندگی کو ہرگز ہرگز یہ حق نہیں پہونچتا تھا کہ وہ اتنے عرصے تک تم دونوں کو ملنے نہ دے۔

ایک روز صبح ہی صبح وہ ہنستے ہوئے اٹھی اور اس نے خوب غل مچایا۔ آکسفورڈ کے بارے میں جتنی کتابیں ہیں سب مجھے دیدو اور سب تصویریں بھی ——— آج ہم تصویریں دیکھیں گے اور کتابیں پڑھیں گے ——— یہ کیسی عجیب بات ہے سر جی کہ یہ شخص دنیا بھر میں گھوما ہے۔ اس نے اتنی دور دراز کی جگہیں دیکھی ہیں لیکن اگر نہیں دیکھا تو آکسفورڈ ——— ہاں اسے تم

سے یہ شکایت تھی۔

کیسی عجیب بات ہے ارجن کہ جب کسی سے عشق ہوتا ہے تو جی چاہتا ہے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ یعنی صرف اپنے ہی بارے میں نہیں، اپنے پیاروں کے بارے میں بھی ——— ایک ایک بات ——— ہم کیسے بڑے ہوئے ——— ہم نے کہاں کہاں پڑھا ——— ہم اب تک کیسے رہے ——— ہم نے اب تک کیا کیا ——— ہم کہاں کہاں گھومے ——— اور ہم نے کیا کیا سوچا ———

ہاں وہ بہت خوش رہتی۔ وہ اس قسم کی خوشی تھی جس سے سرجی کا سٹوڈیو بھی مہکا رہتا ——— چپکے چپکے مسکراتا رہتا جیسے اس نے اپنی مسرتیں فضائیں بکھیر دی ہوں ——— ہاں شاید محبت کی مسرت محدود نہیں رہ سکتی۔ وہ تو جیسے سارے ماحول میں بکھر بکھر جاتی ہے ———

پھر ایک روز وہ میرے قریب آ کر کشن پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"ارجن" ——— اس نے کہا ——— "دنیا بھر کے لوگ آپ کو چاہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا مطلب ہے انسان خوش ہوتا ہے۔ اس کی انا کی تسکین ہوتی ہے لیکن وہ دراصل خوش نہیں ہوتا ——— یعنی سچ مچ نہیں ——— خوش تو ہم جب ہوتے ہیں جب ہم بھی کسی کو چاہیں ——— پھر جب کوئی کہتا ہے، تمہاری آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگاتی ہیں اور تمہارے بالوں کا آبشار یوں بکھر بکھر جاتا ہے ——— تو دنیا بہت حسین ہو جاتی ہے ——— اور کیا ہوتا ہے سرجی ——— کہ ہم اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ لیکن پھر کوئی فرد ایسا آتا ہے جس کے بازوؤں میں رقص کرتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری جگہ ہے ——— ہماری اپنی جگہ ——— اتنی بڑی ——— اتنی وسیع و عریض دنیا میں یہ ہمارا مقام ہے۔ اور ہماری منزل ———"

"اور ان ہماری جلد دیکھو ———" اس نے اپنے بازو ارون کی طرف پھیلائے ——— "دیکھو یہ کتنی براؤن ہے۔ دنیا بھر کی سن بیدنگ بھی کسی سفید جلد کو اتنا براؤن نہیں کر سکتی ——— براؤن جلد بہت خوبصورت ہوتی ہے ——— ہے نا؟"

پھر ایک روز وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اور اس نے کہا ——— "ارجن ——— دیکھو ہمارے پاس کیا ہے ——— اس نے ہمیں یہ بریسلٹ دیا ہے۔ یہ اس نے دلی آنا سے منگوایا ہے۔ خاص ہمارے لئے" ——— پھر وہ فکرمند ہو گئی۔ ———

"ارجن میں بھی اس کو کوئی تحفہ دینا چاہتی ہوں۔ کوئی بہت اچھی سی چیز ———"

یہ بڑی عجیب سی بات تھی ——— نندیتا بھی کسی کو تحفہ دینا چاہتی تھی۔ کمال ہے بھئی ——— وہ تو تحفے وصول بھی یوں کرتی جیسے کسی پر احسان کر رہی ہو۔

"شاید اسے سچ مچ عشق ہو گیا ہے" ——— سرجی نے فکرمندی سے سر ہلایا۔ اور منٹ کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ہاں اسے عشق ہو گیا تھا ——— بقول اس کے ——— بالآخر ———

پھر وہ شام آئی۔ وہ اداس غمگین شام ——— وہ ضدی بچوں کی طرح منہ تھتھائے بیٹھی رہی۔

رات کو اس نے کہا۔ "ارجن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیا میں تمہارے پاس آ جاؤں؟" ——— اور وہ میرے پاس آ کر لیٹ گئی ——— یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی۔ جب بھی اسے ڈر لگتا وہ ہم میں سے کسی کے گلے سے لگ کر سو جاتی۔ لیکن اس رات وہ

سوئی نہیں۔ رات بھر وہ روتی رہی ــــــ

اندن اس کے لئے ہار لیکس لایا۔ اور اس نے کہا "میرے پیارے بھائی ــــــ کیوں نہیں تم مجھ کو ایک لیکچر پلاتے ــــ "میں نہ کہتا تھا" کی قسم کا کوئی لیکچر ــــــ مصیبت یہ ہے کہ تم ہمیشہ سچ کہتے ہو۔ تم سب لوگ مجھ سے زیادہ ــــ بہت زیادہ عقلمند ہو ــــ میں کیا ہوں ــــــ صرف ایک احمق سی لڑکی" ــــــ وہ ضدی بچوں کی طرح پیر پٹختی رہی۔

"کیا تم برانڈی پیو گی؟ ــــــ اس سے تمہیں نیند آجائے گی" ــــ سرجی نے پیار سے کہا۔

"نہیں سرجی۔ تم مجھے صرف یہ بتادو۔ کہ کام کیوں اتنا اہم ہے؟"

"تم جیسی لڑکیوں کے لئے ــــــ جب تک دنیا میں تم جیسی لڑکیاں موجود ہیں۔ ہم جیسے احمق مرد کام کرتے رہیں گے"۔ ــــــ سرجی نے گویا قطعی فیصلہ دیدیا۔

ہاں وہ رات بھر میرے گلے سے لپٹی روتی رہی۔ اور اس نے کہا ــــ "ارجن، کیوں انسان اتنے دکھ سہتا ہے ــــ" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اور پھر چند ہفتوں کے بعد ہم یہاں آئے ــــ اور اب جیسے اس نے زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اپنے حسابوں مکمل سمجھوتا۔ اب جیسے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ زندگی سے کچھ چاہنا بیکار ہے ــــــ خواہشیں بیکار ہیں۔ اور آرزوئیں بیکار ہیں۔ جیسے سارے خواب بکھر کر رہ جائیں ــــــ زندگی پر جو مان ہو وہ ٹوٹ جائے ــــــ سوال بے معنی ہو کر رہ جائیں ــــــ اور جواب جاننے کی کوئی خواہش دل میں باقی نہ رہ جائے ــــــ سمجھنے کی کوشش بیکار ہے ــــــ اور جاننے کی خواہش بے معنی ــــــ انسان بالآخر تنہا ہے!

دریا کا پانی اسی طرح گمبھیرتا سے بہے چلا جا رہا ہے اور آندرے نے سر اٹھا کر کہا ــــ "لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کیوں اس نے مجھ سے انصاف نہیں کیا؟"

کون کس سے انصاف کر سکا ہے! ہر پروفیسر ــــــ ہم سب اپنی اپنی ذات کے زنداں میں قید ہیں ــــــ ہم سب ــــ اکیلے اکیلے ــــ اور ایک بات کہوں ــــــ یہ بات میں اس کا بھائی ہونے کے ناطے نہیں کر رہا۔ یہ ویسی بات نہیں جو اندن نے کی ــــ کیا تم اپنے آپ سے خوفزدہ نہیں تھے؟ پندرہ برس سے یا بیس برس سے زندگی کے دروازے تم نے اپنے اوپر بند کر رکھے تھے ــــــ تم نے کوئی دکھ سہا اور اس کے بعد ایک قلعہ اپنے اردگرد تعمیر کر لیا ــــــ یہ تمہارا کام تھا جس میں صرف چین ہی چین تھا۔ کام جس میں سکھ ہی سکھ تھا۔ جس میں دکھ نہیں تھے ــــــ پھر ایک فرد آیا اور اس نے تمہارے دل کے دروازے پر دستک دی اور تم نے بے خبری میں دریچہ ذرا سا وا کیا۔ یہ بہار کا پہلا جھونکا تھا۔ صبح کی پہلی کرن تھی۔ یہ کتنی بڑی مسرت تھی جو انجانے میں تمہیں ملی ــــــ حیرت سے تم نے اپنی آنکھیں ملیں اور بہت خوش ہوئے اور ایسا کرتے میں تم اپنے دریچے کی صلیبوں کو بھول گئے ــــــ لیکن تمہارے قلعے کی فصیل میں شگاف پڑنے لگے۔ اور پھر بے خبری ہی میں تم خوفزدہ ہوئے ــــــ اور ایک اور لمحہ آیا ــــــ اور یہ دکھ بھرا لمحہ تھا۔ جس میں تم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے ــــــ تم دونوں کے دریچے کی صلیبیں راہ میں حائل ہوئیں۔ اس میں کس کی خطا ہے۔ اندن کہے گا۔ تمہاری ــــــ

تم نے اسے نہیں سمجھا —— تم یہ نہیں جان سکے کہ اس کے لیے اس ایک لمحہ کا پیار کتنا اہم تھا۔ سرجی کہے گا۔ اس کی —— اس نے ایک مرد کے کام کی اہمیت کو نہیں سمجھا —— کام جو عقلمند مرد خوبصورت لڑکیوں کے لیے کرتے ہیں۔ میں کہوں گا۔ شاید کسی کی بھی نہیں —— نہ تمہاری —— نہ اس کی —— نہ اس لمحہ کی —— یہ ٹریجڈی تو شاید انسان کی ذات کی ہے۔

میں نے اپنا آپ سنبھالا —— چلو ہم سرجی اور اردن کو تلاش کریں۔ پھر ہم سب کہیں کھانا کھائیں گے —— اور تم بہت اچھے آدمی ہو —— اور مجھے بہت افسوس ہے ——

دریا اسی طرح بہے چلا جا رہا ہے —— صدیوں سے —— ماڈلین ٹاور اسی طرح اپنی جگہ پر ہے —— پندرھویں صدی سے —— یہاں پہلی مئی کو گیت گا کر طالب علم موسم بہار کو خوش آمدید کہتے ہیں —— لیکن دنیا کتنی بڑی ہے —— کس قدر بے تحاشا بڑی —— اور انسان کے اندر کتنی تنہائی ہے —— ازلی و ابدی تنہائی!

منیر احمد شیخ

وِن اصغر مال

گھاٹی دروازے کا چوک بھی ایک عجیب جگہ تھی۔ اس کے ایک طرف پرانے شہر کا دروازہ تھا اور دروازے کے ساتھ ٹوٹی ہوئی فصیل کے نشان تھے۔ ڈیوڑھی نما دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ فصیلوں سے گھرا ہوا شہر بھی کیا چیز ہوتا تھا۔ شام ڈھلتے ہی فصیل کا دروازہ بند ہو جاتا اور باہر سے آتے ہوئے قافلے کھلے میدان میں پڑاؤ کرتے اور نور کے تڑکے جب دروازہ کھلتا تو قافلے شہر کے اندر داخل ہوتے۔ شہر بانند ایک کنبے کے ہوتا تھا، دیوار سے دیوار ملی ہوتی اور دل سے دل۔ شہر کے اندر کوئی شخص دوسرے کے لئے اجنبی نہ ہوتا تھا۔ لوگ اپنے پیشوں سے نہیں، اپنے ہُنر سے پہچانے جاتے تھے۔ وہی جوان قبیلے کی آنکھ کا تارا ہوتا تھا جو اپنی جوانمردی کو بیچ میدان میں ثابت کرتا تھا۔ لڑکیاں اسی مرد کو چاہتی تھیں جو مردانہ صفات کے جوہر سے لیس ہوتا اور انہیں حاصل کرنے کے لئے اپنی طاقت اور بہادری کا سکہ اپنے حریفوں سے منواتا۔ زندگی میں کوئی چور راستہ نہ تھا۔ جسے جو کچھ حاصل کرنا ہوتا کھلے میدان میں اتر کے حاصل کرتا۔

گھاٹی دروازے کے باہر ایک زمانے میں کھلا میدان ہوا کرتا تھا، جہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ پھر جب قافلوں، فصیلوں، دیواروں اور کنبوں کا دور ختم ہوا تو گھاٹی دروازے کی فصیل میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کائی جمی دیوار جگہ جگہ سے گرنا شروع ہو گئی۔ فصیل کے نیچے کی خندق مٹی سے بھر گئی۔ لوہے کا دروازہ ٹوٹ گیا۔ اب شام ڈھلے کوئی دروازہ بند نہ ہوتا اور نور کے تڑکے کوئی قافلہ اس کے اندر داخل نہ ہوتا۔ دیوار سے دیوار الگ ہو گئی اور کنبے بکھر گئے اور جب کنبے بکھر گئے تو فصیل کے باہر نئی بستیاں آباد ہو گئیں اور نئی سڑکیں بنیں۔ یہ نئی بستیاں جب آباد ہوئیں تو گھروں پر کوئی منڈیر نہیں تھی۔ ایک گھر سے دوسرا گھر ایک شریفانہ فاصلے پر تھا۔ اب ہر شخص دوسرے کے لئے اجنبی تھا۔ اور لوگوں کے نام ان کے پیشوں سے پکارے جاتے تھے۔ پھر پیشوں میں بھی کئی درجے تھے۔ ایک کلاس ون کا آدمی تھا، ایک کلاس ٹو کا، ایک کلاس تھری کا اور ایک کلاس فور کا۔ یہ مختلف ذاتیں تھیں جن کے مطابق اُن کے رہن سہن کا چلن متعین ہوتا تھا۔ درجوں کے حساب سے ہی مراعات ملتیں اور درجوں کے حساب سے ہی عزت و حقارت نصیب ہوتی۔ پرانے شہر اور نئے شہر کے درمیان اگرچہ اب فصیل گر گئی تھی لیکن یہ فصیل اب دونوں آبادیوں کے رہن سہن، طرزِ گفتگو، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے اور رونے ہنسنے کے درمیان آن کھڑی ہوتی تھی۔ پرانا شہر اپنے مزاج کے ساتھ زندہ تھا اور نیا شہر ایک نئے مزاج کی تعمیر کر رہا تھا جو پرانے شہر کے مزاج سے بالکل لگا نہ کھاتا۔ پرانے شہر کے تنگ بازاروں میں لوگ شام کو اسی طرح چوکڑیاں جماتے، گرم حماموں میں نہاتے، تیل کی مالش کرتے، لڑتے جھگڑتے، چاقو مارتے، گالیاں دیتے، دشمن کو دشمن سمجھتے اور دوست کو دوست، پیار کرتے، میلے

لگاتے، مزاروں پر چراغ جلاتے، دعائیں مانگتے، صبح کو پوری حلوے، نان اور سری پائے کا ناشتہ کرتے، لسّی اور دودھ پیتے، آنکھ میں شرم رکھتے اور ایک دوسرے کو اس کی صفات سے پہچانتے۔ عیدالفطر، عید، محرم، بارہ وفات ان کے تہوار تھے۔ محرم کا چاند دیکھ کے روتے اور عید کے چاند پر مسکراتے اور ایک دوسرے کو مبارک بادیں دیتے۔ پہلی کا چاند انہیں کچھ کہتا تھا اور وہ اس کی زبان سمجھتے تھے پرانا شہر پرانے چاند کے ساتھ زندہ تھا

فصیل سے باہر نیا شہر اپنا مزاج تعمیر کر رہا تھا۔ اس شہر کے باسی نئی روشنی کے لوگ تھے۔ یہ روشنی انہوں نے چاند سے نہیں لی تھی۔ روشنی ان کے مکانوں کے باہر بکھری ہوئی تھی لیکن اندر اندھیرا تھا۔ اندر کی روشنی کے لئے وہ بڑی بڑی ٹیوبیں جلاتے اور قمقمے روشن کرتے۔ پرانے شہر کے لوگ جو چیزیں اور برتن کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لئے استعمال کرتے، نئے شہر کے لوگ اُن چیزوں کو انگیٹھیوں پہ سجا دیتے، صراحیاں، چلمچیاں، سماوار، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے حقّے، کشتیاں اور ملاح، بیل گاڑی، تانگے، شاہی مسجد، ستار اور طبلے کی ایش ٹرے۔ پرانا شہر نئے شہر کی انگیٹھیوں، کارنسوں اور دیواروں کی زینت بن گیا تھا۔ پرانے شہر کی بود و باش کا نقشہ نئے شہر والے ایک دوسرے کے ڈرائینگ روم میں کھلونوں کی شکل میں دیکھ لیتے تھے۔ پرانے شہر کی زندگی کو کھلونوں اور سجاوٹوں میں ڈھال کر انہیں گونہ اطمینان ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے ماضی کو محفوظ کر لیا ہے۔ نئے شہر کے لوگ پرانے شہر کے لوگوں کو دور کھڑے یوں دیکھتے تھے جیسے کوئی کھیل تماشہ ہو رہا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پرانے شہر والے کوئی میلہ رچاتے تو نئے شہر والے ان کے پاس سے گذرتے ہوئے کاریں کھڑی کر لیتے اور کیمرے سے ان کی تصویریں کھینچتے۔ عیدالفطر عید کو جب پرانا شہر مسرت کی لہروں میں ڈوبا ہوتا، نئے شہر والوں کو اخبار کے ذریعے پتہ چلتا کہ کسی کونے میں کوئی ہنگامہ ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ پرانا شہر نئے شہر والوں کے لئے ایک خبر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور وہ ان کی خوشیوں اور غمیوں پر ایسے ہی چونکتے جیسے خبروں پہ چونکتے ہیں۔ نئے شہر میں دھوکا، جھوٹ، سازش، مکاری، چالاکی، گٹھ جوڑ اور سیاست تھی۔ ہر شخص اپنے آپ کو چھپائے بیٹھا تھا۔ ہر شخص خوفزدہ ——— اپنے آپ سے خوفزدہ تھا جیسے کوئی مسلسل اسکا تعاقب کرتا ہو۔ ہر کوئی اپنی ہی آہٹ سے چونک چونک جاتا اور جب مڑ کے دیکھتا تو اسے اپنے سائے کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ نئے شہر والوں نے اپنی ذات سے باہر نکل کر نہ کبھی کھلے آسمان پر پہلی کا چاند دیکھا تھا اور نہ یہ دیکھا تھا کہ ڈھلتے ہوئے چاند کی روشنی میں اداسیوں کے کتنے رنگ ہوتے ہیں۔ یہاں زندگی کی خوشیوں کو ایک دوسرے سے چھین کے حاصل کیا جاتا تھا، ہتھکنڈوں اور مکاریوں سے ——— کھلے میدان میں نکل کے چیلنج کرنے کی ہمت کسی میں نہ رہی تھی ——— کامیابیوں اور کامرانیوں کے ہزاروں چور دروازے نکل آئے تھے جن میں سے چھپ چھپ کے لوگ منزلِ مراد کو پہنچتے۔

لیکن گھاٹی دروازے کے چوک کا قصہ یہ تھا کہ یہ دو تہذیبوں کا سنگھم تھا۔ ایک تہذیب وہ جو پرانے شہر کی تنگ گلیوں سے ہوتی ہوئی اس چوک تک پہنچتی اور دوسری نئی روشنی کی تہذیب جو اصغر مال سے گذرتی ہوئی یہاں آکے سانس توڑ دیتی۔ نئے اور پرانے یہاں آکے ایک دوسرے سے ملتے اور بچھڑ جاتے۔ لیکن اس چوک میں دِن اصغر مال کی عمارت ایک عجیب و غریب مخلوق پر مشتمل تھی۔ میرا مطلب ہے کہ دِن اصغر مال میں رہنے والوں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ پرانے شہر سے رشتہ توڑیں تو کیونکر توڑیں۔ اور نئے شہر کو اپنائیں تو کیونکر اپنائیں؟ ان کی مصیبت یہ تھی کہ کہنے کو تو وہ گھاٹی دروازے کے چوک میں رہتے تھے اور وہیں پلے بڑھے تھے لیکن سکولوں کالجوں میں پڑھ جانے کے بعد وہ گھاٹی دروازے سے اپنی نسبت ملانا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اگر کوئی یہ جان لے کہ یہ

گھاٹی دروازے کے رہنے والے ہیں تو یہی سوچے گا کہ یہ تو مانے گامے ہیں! گھٹیا اور کم تر لوگوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ دن اصغر مال والوں کے بچے جوان ہوئے تو جب کوئی اُن سے پوچھتا کہ آپ کہاں رہتے ہیں تو وہ فوراً کہتے۔ "دن اصغرمال"۔ اپنی جگہ وہ بھی سچے تھے۔ اصغرمال گھاٹی دروازے سے ہی شروع ہوتی تھی اور اس کا پہلا مکان ایک طرف اصغرمال سے لگتا تھا تو دوسری طرف گھاٹی دروازے کا چوک شروع ہوتا تھا۔ لیکن "دن اصغرمال" کہہ کر انہیں یہ تسکین ہوتی کہ انہوں نے اپنے آپ کو جہالت، گھٹیا پن، غربت اور سفلے پن سے بچا لیا ہے۔ ان کے بچے نچلے درمیانی طبقے میں پیدا ہوتے تھے اور گھاٹی دروازے کے چوک ہی میں وہ پرانے شہر کے لونڈوں کے ساتھ پروان چڑھے تھے۔ اور جب گھاٹی دروازے کے دوکانداروں کو پتہ چلا کہ دن اصغرمال والے باؤ اپنے آپ کو گھاٹی دروازے سے منسوب کرتے ہوئے شرماتے ہیں تو وہ بڑے اطمینان سے دھوتی کو مروڑا دے کے کہتے۔ "جی یہ کہیں چلے جائیں، کیا فرق پڑتا ہے۔ مہریں تو ہماری ہی لگی ہوئی ہیں۔"

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مہریں ان پہ گھاٹی دروازے ہی کی لگی ہوئی تھیں اور ایسی پختہ کہ ان کے نقش مٹانے کی وہ جتنی کوشش کرتے اتنے ہی وہ اور ابھر آتے۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ دو بہنیں اور دو بھائی امریکہ اور انگلستان سے تعلیم حاصل کر آئے تھے۔ اب واپس آکر گھاٹی دروازے کے چوک میں رہنا ایک کٹھن مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا لیکن ایک روز اُن کے والد کو یکا یک خیال آیا کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر چکے ہیں، اگر وہ اتنا کچھ پڑھنے کے بعد بھی گھاٹی دروازے کے ہی کہلائے تو انہیں کون پوچھے گا؟ اولاد کے مستقبل کا سوال تھا۔ انہوں نے سوچا کہ یہاں سے باہر کسی بہتر محلے میں چلے جائیں پھر یہ تو کوئی نہیں کہے گا کہ اچھا تو گویا آپ گھاٹی دروازے کے ہیں! اپنے آپ کو اس تہمت سے بچانے کے لئے انہوں نے درمیانے طبقے کے لوگوں کی ایک بستی میں کرائے پر مکان لے لیا جو نئی نئی شہر سے پرے تعمیر ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اس بستی میں انہیں کوئی نہیں جانتا، وہ جو کچھ اپنے آپ کو ظاہر کریں گے، لوگ اسے مان لیں گے۔ یہاں کون ہے جو انہیں پہچانے گا۔ گندگی اور غلاظت سے نکل کے وہ اوپر کے طبقوں کی طرف دیکھ سکیں گے اور ممکن ہے آہستہ آہستہ وہ دن بھی آجائے جب وہ خود اعلیٰ طبقے میں شامل سمجھے جائیں۔

نئی آبادی میں آکر انہیں بظاہر خاصا اطمینان ہوا۔ لیکن نئی آبادی میں رہنے کے تھوڑی دیر بعد ہی انہیں احساس ہوا کہ یہ آبادی تو درمیانے درجے کے لوگوں کی ہے جو زندگی میں آخر انٹر کلاس ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کیا اسی لئے تھی کہ وہ ان پچپڑ کنائیوں میں آکے مطمئن ہو جائیں! نئی آبادی میں انہوں نے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کوئی کوشش نہ کی، بلکہ وہ تو ہر اس شخص سے نفرت کرتے تھے جو تانگوں، سائیکلوں اور سکوٹروں اور پاؤں پر چلتے تھے اور اپنے حال پر مطمئن نظر آتے تھے۔ ایک جھوٹی اور سطحی شرافت اور برتری کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے طرزِ عمل میں ایسی سختی پیدا کر لی جو مایا لگے ہوئے کپڑے میں ہوتی ہے۔ بہنوں اور بھائیوں کی گردنیں ان کے کندھوں پر اکڑی ہوتیں۔ کسی سے بات کرنی پڑ جاتی تو وہ بڑی مشکل سے اپنی گردنوں کو کندھوں کے اوپر سے پھیر کر بات کرنے والے کو دیکھتے اور روکھے سے جواب کے ساتھ اسے جھٹک کے الگ کر دیتے۔ یوں لگتا تھا کہ سارے بہن بھائی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ذرا سا جھٹکا دیا تو گر پڑیں گے یا ٹوٹ جائیں گے۔ چہروں پر کھچاؤ، رگیں تنی ہوئی، لہجے میں درشتی، اور چال میں سختی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت درمیانے طبقے میں رہنے کا یہ انداز اختیار کیا ہے۔ بعض لوگوں کو ان کی اس حالت پر ہنسی آتی لیکن وہ اس خیال سے ضبط کر لیتے کہ

محلے داری ہے اور پھر یہ کہ وہ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں، ممکن ہے اپنے ہی خیالوں میں مست رہتے ہوں۔

وہ خیالوں میں مست تھے یا نہیں لیکن چھوٹے نفیس پر مستی کا دورہ ضرور پڑ گیا تھا۔ نفیس ایم اے کرنے کے بعد امریکہ سے بھی ایک ڈپلوما پکڑ لایا تھا۔ سول سروس کے امتحان میں پاس نہ ہو سکنے کی وجہ سے اسے "شہادت" کا احساس ہر وقت رہتا اور وہ سمجھتا کہ یہ معاشرہ اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ بیزاری اور نفرت اس کی ناک پر مستقلاً جمی رہتی۔ یوں تو سب بہن بھائیوں کے کلف لگا ہوا تھا لیکن نفیس پر اس کے زیادہ ہی کوٹ چڑھ گئے تھے۔ اس کی زبان اور جسم دونوں میں ایسا تناؤ رہتا تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد ایک خاص طرح کی بے چینی کا احساس ہوتا۔ وہ بالعموم انگریزی میں گفتگو کرتا اور لفظ اس کے منہ سے یوں نکلتے جیسے وہ چابک مار رہا ہے۔ چنانچہ لوگ چابک سے محفوظ رہنے کے لئے اس کے قریب ہی نہ آتے۔ بڑی بہن امریکہ یا فرانس سے کوئی ڈگری لے کے آئی تھیں اور اس امید پر دن گنا رہی تھیں کہ کوئی اچھی خاصی موٹی اسامی ہاتھ لگے تاکہ وہ اپر کلاس کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کریں اور موٹی اسامیوں کا یہ قصہ تھا کہ وہ کچھ دیر کے لئے تو مس صاحبہ سے "ڈیٹنگ" کرتے لیکن جب مس صاحبہ بھنچی ہوئی مٹھی کھولتیں اور اس پر انہیں ازدواجی زندگی کی خواہش پڑی نظر آتی تو وہ بھاگ جاتے۔ کچھ دنوں کے لئے وہ ادھیڑ عمر کے کھاتے پیتے آدمیوں کے ساتھ سوشل فنکشنز پر نظر آتیں۔ لوگ دیکھ کے یہ کہتے کہ چلئے انہوں نے آخر مرغا چانس ہی لیا لیکن مرغا ان کے پہلو میں بانگ دے کر پھریری لیتا اور اڑ جاتا اور مس صاحبہ کو پَر جھاڑنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ لیکن نفیس کا قصہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہمسائے میں دودھ مکھنوں سے پلی ہوئی ٹُس ٹُس کرتی رضیہ پر نظریں جما بیٹھا تھا۔ رضیہ کو پندرھواں سال لگ رہا تھا لیکن اس کا جسم غیر معمولی طور پر نمایاں ہو گیا تھا۔ یوں لگتا کہ چڑھتی جوانی کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے اسے بڑا زور لگانا پڑ رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی بڑے کھلے ڈھلے تھے۔ وہ بڑی بے باک اور نڈر لڑکی تھی۔ رات کے وقت وہ نئی آبادی کی سڑک پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ نکلتی۔ شلوار کو گھٹنوں تک اٹھا کر ادھر سے ادھر ننگے پاؤں دوڑتی۔ اس کے قہقہے رات کے اندھیرے میں وحشی ہرنی کی پکار کی طرح بکھر جاتے اور نفیس پر اس وحشت کا حملہ رضیہ کا یہ قہقہہ سن کر ہی ہوا تھا۔ اس کی آواز میں کچھ عجیب سی جھنجھلا دینے والی کشش تھی جس سے نفیس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لکڑی کے ڈھانچے کو کسی نے شعلہ دکھا دیا ہے۔ رضیہ اس کے ہمسائے میں رہتی تھی اور اپنے والدین کے ساتھ پرانے شہر کے ایک محلے سے اٹھ کر یہاں بستی میں آ گئی تھی۔ اس کا باپ صبح کو اکھاڑے میں کشتی لڑتا اور پھر محلے میں سری پائے اور نان کی دکان کرتا۔ محلے والے اسے پہلوان جی کہتے تھے۔ پہلوان کی بہت سی لڑکیاں تھیں۔ رضیہ ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ بڑی لڑکیوں نے اپنے بر خود ہی ڈھونڈ لئے تھے۔ شادی سے پہلے وہ محلے پر آفت بن کے گرتی تھیں لیکن شادی کے بعد اپنے گھروں میں یوں آباد ہوئیں جیسے انہوں نے کسی غیر مرد کا سایہ تک نہیں دیکھا۔ بڑے خلوص سے بچے جنتیں اور نانیوں اور دادیوں جیسی باتیں کرتیں۔ رضیہ ایک نئی آفت تھی جو نفیس پر بجلی بن کے گری۔ نفیس نے سوچا نچلے درجے کے لوگ ہیں، وقت کٹی کے لئے اس سے اچھی چیز کیا ہو گی۔ دن کے وقت جب رضیہ اسے اشارے سے بلاتی تو اس کی گردن کو مایا لگ جاتی اور جسم لکڑی کی طرح سخت ہو جاتا۔ وہ خوفزدہ ہو جاتا کہ کہیں کوئی اسے نچلے درجے کی لڑکی سے عشق لڑاتے نہ دیکھ لے۔ دیکھ لے تو کیا کہے گا کہ امریکہ سے پڑھ لکھ کے آنے کے بعد بھی وہ اتنا گھٹیا آدمی ہے کہ اپنے مقام اور مرتبے ہی سے بے خبر ہے۔ وہ اسی طرح تنا ہوا رضیہ کے سامنے سے گذر جاتا۔ رضیہ اسے دیکھ کے زور سے

ہنس دیتی اور اس کی ہنسی اس کے لکڑی کے جسم کو آرے کی طرح چیر کر پار ہو جاتی۔ وہ لکڑی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جلدی سے پھر جوڑتا اور تیزی سے آگے نکل جاتا۔ رات کے اندھیرے میں جب رضیہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو نکلتی تو درخت کو ہاتھ لگانے کے بہانے جوتے اتار کر شلوار کو گھٹنوں تک چڑھا لیتی اور سہیلیوں کو وہیں چھوڑ کر سڑک کے اگلے سرے پر پہنچ جاتی۔ نفیس وہاں دبکا ہوا ایک طرف کو کھڑا ہوتا۔ رضیہ کی سانس پھولی ہوتی۔ وہ اپنے لمبے چوڑے مضبوط ہاتھوں سے اس کا بازو کھینچ کر اسے کونے میں سے نکال کر اپنی طرف کھینچتی تو وہ ہچکچاتا۔ "نہیں رضیہ کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھ لے گا تو کیا ہو گا۔ ہم کوئی چوری کر رہے ہیں۔"

"چوری نہیں، میرا مطلب ہے مجھے کوئی تمہارے ساتھ کھڑا دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔"

"کیا کہے گا؟ میں تمہارے ساتھ کھڑی اچھی نہیں ہوں کیا؟" اور وہ پنجے اٹھا کر اس کے کندھے سے کندھا ملاتی۔ "تمہاری میری جوڑی تو سارے محلے میں لاجواب ہے۔"

جوڑی کے لفظ پر نفیس ٹھٹھک جاتا اور اپنے جسم میں شدید کمزوری محسوس کرتا۔ رضیہ اس کو بازو سے ہلا کر کہتی۔ "جسے رب لائی آ نے توڑ نبھائیں۔"

توڑ نبھانے کے الفاظ سن کر وہ کہتا۔ "اچھا کوشش کریں گے۔" اور سمجھتا کہ اس طرح اس نے رضیہ کو مطمئن کر دیا ہے ــــــ یہ سلسلہ کچھ دیر چلتا رہا۔ پہلوان کو رضیہ کے ارادوں کا پتہ چلا تو اسے ایک منٹ کے لئے غصہ آیا۔ اس نے بڑا چمچہ سری پائے کی دیگ میں زور سے گھمایا لیکن اگلے ہی منٹ میں اس نے چمچہ وہیں چھوڑ دیا اور دیگ پر ڈھکنا رکھ کے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو رضیہ کا سلسلہ اگر اس باؤ سے ہو جائے تو یہ بھی اپنے گھر آباد ہو جائے گی۔ اس نے سوچا کہ پڑھے لکھے جنٹلمین سے اس کا نباہ اچھا ہو گا۔ بڑی بہنوں کی طرح اس نے بھی خود ہی اپنا جوڑ پسند کر لیا ہے۔ پہلوان نے باؤ نفیس پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ اس کے دفتر کا پتہ لگایا۔ تنخواہ وغیرہ کی بابت کلرکوں وارکوں سے پوچھ گچھ کی۔ محلے میں دھوبی، نائی وغیرہ سے کہا کہ باؤ کا اگر کوئی کام ہو تو اس میں دیر نہ ہوا کرے۔ جب وہ صبح دفتر جانے کے لئے اس کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو وہ اسے سلام کر کے کہتا۔ "باؤ جی، پیدل چلتے ہوئے آپ اچھے نہیں لگتے۔ تانگے پر جایا کیجئے۔ اپنا تانگہ گھوڑا کس لادوں؟"

نفیس بے رس زبان میں اس کا شکریہ ادا کرتا اور کہتا، "میں پیدل چلنا پسند کرتا ہوں۔" اور محلے سے نکلتے ہی آنکھ بچا کر ادمنی بس میں سوار ہو جاتا۔ پہلوان اسے دفتر سے واپس آتے ہوئے بھی دیکھتا اور پھر سلام کرتا۔ رات کو جب وہ کھانے سے فارغ ہو کر نکلتا تو وہ پھر بھی اس کی تاک میں رہتا کہ وہ کس وقت باہر جاتا ہے اور کب واپس آتا ہے۔

ایک رات جب نفیس سوٹ بوٹ پہنے رات کو باہر نکلا تو پہلوان نے دیکھا کہ وہ شہر کی طرف جا رہا ہے۔ پہلوان کو تجسس ہوا، "باؤ رات کو کہاں جاتا ہے؟" وہ دکان سے اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ نفیس رات کی تاریکی میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا۔ پہلوان نے اپنی چال بھی تیز کی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نفیس نے چلتے چلتے نظر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا۔ پہلوان جلدی سے ایک دیوار کے ساتھ لگ گیا اور جب نفیس سیدھا ہوا تو پھر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نفیس بازار کا موڑ مڑتے ہی نوابی محلے

کی اس گلی میں داخل ہوگیا جو طوائفوں کے مکانوں کے پیچھے سے گذرتی تھی۔ ان مکانوں کی بیٹھکیں دوسری طرف بازار کی جانب کھلتی تھیں اور گاہک بالعموم بازار کی طرف سے ہی داخل ہوتے تھے۔ پچھلی گلی میں بھی ان مکانوں کا ایک دروازہ ہوتا جو چور دروازہ کہلاتا۔ جب کبھی پولیس وغیرہ کے چھاپے کا خطرہ ہوتا تو اسی دروازے سے گاہکوں کو بھگا دیا جاتا۔ یا پھر کوئی ایسا گاہک جو جنٹلمین قسم کا ہو اور بھرے بازار میں سے آنے سے گھبراتا ہو، اس دروازے کے راستے چپکے سے اندر آجاتا اور پھر وہیں سے کھسک جاتا۔

پہلوان نے جب باؤ نفیس کو پچھلی گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک لمحے کے لئے رُکا۔ "تو کیا باؤ نفیس ادھر کی بھی سیر کرتا ہے!" لیکن اس نے اس خیال کو یہ کہہ کر رد کرنے کی کوشش کی۔ "کچھ نہیں، جوانی میں ہم نے بھی یہ کسب کئے ہیں۔ دو منٹ کا موج میلہ ہے اور کیا۔" اگلے لمحے اس نے دیکھا کہ نفیس چور دروازے سے اوپر سیڑھیوں پر چڑھ گیا ہے۔ پہلوان بھاگ کے سیڑھیوں کے قریب آیا اور پنجوں کے بل اس کے پیچھے پیچھے اوپر جانے لگا۔ نفیس ابھی کوٹھے پر پہنچا ہی تھا کہ پہلوان بھی آدھمکا۔ ایک تیز طرار لڑکی ابھی اسے بیٹھنے کا اشارہ کر ہی رہی تھی کہ پہلوان نے آواز دی۔ "باؤ نفیس!"

نفیس نے گردن گھما کر دیکھا اور وہیں ٹکڑی ہوگیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز اس کے حلق ہی میں دب گئی۔ اس کی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹنے لگا۔

پہلوان نے اس کو گریبان سے کھینچ کر اس کی ناک کو اپنی ناک کے بالکل قریب لاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں پیوست کردیں اور اُسے زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "باؤ! یہاں آنا کوئی بری بات نہیں پر مرد کی اولاد ہو تو سیدھے دروازے سے آیا کرو۔"

گریبان چھوڑتے ہوئے اس نے باؤ نفیس کو ہلکا سا دھکا دے کر پلنگ پر گرا دیا اور خود بازار والے راستے سے باہر نکل گیا۔

مسعود اشعر

پا بہ زنجیر

"میرے دادا سورۂ مزمّل کے عامل تھے۔" مدثّر حسین نے ٹھنڈے پانی کا دوسرا گلاس حلق سے نیچے اتارا۔ "بڑے بڑے جن انہوں نے تابع کر رکھے تھے۔" اس نے حقارت سے خلیل کی طرف دیکھا جو سانپوں کے قصّے سنا رہا تھا۔

سلیم مدثر کے دادا کی کرامات کئی بار سن چکا تھا۔ ہر بار اس ذکر سے اس کے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ جاتی تھی لیکن آج اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آج اسے "اکل حلال" کے نام پر بھی ہنسی نہیں آئی۔

خلیل نے پہلی بار سورۂ مزمّل کا قصّہ سنا تھا۔ اس لئے وہ بھی اپنا چشم دید قصّہ سنانے پر مُصر تھا کہ کس طرح سانپ نے ایک عورت کی گردن پر کاٹا اور کس طرح سپیرے نے سانپ کو بلایا۔

پھر سانپ عورت کے پیروں کے پاس گیا اور آہستہ آہستہ گردن کی طرف بڑھنا شروع کیا اور پھر گردن پر جاکر صرف اسی مقام پر اپنا پھن رکھ دیا جہاں اس نے ڈسا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" مدثر نے بے خیالی میں پوچھا۔

"پھر مجھے لوگوں نے دیکھ لیا اور وہاں سے نکال دیا۔"

"تو پھر سانپ مرگیا ہوگا؟"

"ہاں سانپ مرگیا تھا۔"

"مگر سانپوں کی بات اور ہے۔ وہ نظر آتے ہیں۔ جن تو نظر بھی نہیں آتے۔" مدثر نے اپنی آواز کو اور زیادہ گمبھیر بنانے کی کوشش کی۔

"ایک بار ہم نے کہا، دادا جان! ہم جنات دیکھیں گے۔ دادا جان ہنس دیئے۔ مگر عباس علی خاں نہیں مانے ——— عباس علی خاں کو جانتے ہو نا؟" مدثر نے سلیم کو متوجہ کیا۔ "وہی جو ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔"

اور پھر اندر والے کمرے کے دروازے کا پردہ ہلا۔ سلیم کا دل زور سے دھڑکا اور حلق میں کچھ پھنس گیا۔ اور اسے خیال آیا کہ وہ پیاسا ہے اور بہت دیر سے پیاس دبائے بیٹھا ہے۔ اس نے مدثر کے سامنے پڑا ہوا گلاس اٹھا کر اس کا جھوٹا پانی پی لیا پھر مدثر اور خلیل کی طرف دیکھا کہ کہیں انہوں نے تو اس کے چہرے کی تبدیلی محسوس نہیں کرلی۔

پردہ ساکت ہوگیا تھا اور مدثر حسین اس جن کا واقعہ سنا رہا تھا جس نے سبق پڑھتے پڑھتے ہاتھ بڑھا کر پیپل کے درخت سے

پلنگ اتار دی تھی۔

پردہ ساکت تھا مگر سلیم کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ "وہی ہے!۔۔۔۔ آخر کیا چاہتی ہے! مجھے کیوں پریشان کر رہی ہے؟"

سلیم کا جی متلانے لگا۔ اسے زور کی ابکائی آئی اور ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا سارا غبار، ساری غلاظت مدثر حسین پی۔ سی۔ ایس کے ڈرائنگ روم کو داغدار بنا دے گی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی! کہاں چلے؟" خلیل چونکا۔

"بیوی یاد آ رہی ہوگی!" مدثر حسین نے اپنی دانست میں بہت بڑی چوٹ کی۔

اسے غصہ تو بہت آیا مگر پی گیا۔۔۔۔ یہ کمبخت بار بار مجھے کیوں یاد دلاتا ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ کیا اسے پتہ چل گیا ہے کہ آج کل میں کس امتحان سے گزر رہا ہوں!۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ جب اس نے پہلی بار ناز کے سامنے میرے بیوی بچوں کا ذکر کیا تھا تو اس وقت اس کی نیت صاف تھی البتہ میں غلط سمجھا تھا۔۔۔۔ مگر میں نے غلط کیوں سمجھا تھا؟

پہلی بار اس نے اسے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا وہ آرائشی چیزوں کی دکان کے پاس کھڑی تھی۔ وہ وہاں کیا لینے گیا تھا! غالباً کتابیں دیکھنے!۔۔۔۔ نہ جانے کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر اسے بہت پہلے کی ایک بات یاد آ گئی۔

"باجی! میں کسی لڑکی سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ ایک دن ملاقات کرتا ہوں دوسرے دن اس سے عشق ہو جاتا ہے۔ اور تیسرے دن خودکشی کی سوچنے لگتا ہوں۔۔۔۔"

باجی۔ جو اس کی اپنی باجی نہیں تھیں بلکہ جگت باجی تھیں۔۔۔۔ اس بات پر خفا ہو گئی تھیں۔ مگر جس لڑکی سے وہ تعارف کرا رہی تھیں وہ ہنس دی تھی۔ اور آج وہی لڑکی اس کی بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دو بچوں کی ماں۔ اس سے بے تحاشہ محبت کرنے والی۔

اس نے اپنی عادت کے مطابق ایک اچٹتی ہوئی نظر اس لڑکی پر ڈالی اور کتابیں دیکھنے لگا۔ لیکن پھر خود بخود اس کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے پیٹھ موڑی۔ مگر جو رسالہ وہ دیکھ رہا تھا وہ پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ اس لئے اسے پھر اسی طرف مڑنا پڑا۔۔۔۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ اسے نظر بھر کے دیکھے۔ لیکن کیسے دیکھے! وہ اس کی چوری پکڑ لے گی!۔۔۔۔ پھر شرافت کا بھرم کہاں جائے گا؟

اس نے اسے بتدریج دیکھنے کی ٹھانی۔

پہلی نظر۔۔۔۔ آنکھیں! خوبصورت ہیں۔۔۔۔ بادامی؟ نہیں شربتی!۔۔۔۔ کچھ کہتی ہوئی!

دوسری نظر۔۔۔۔ پورا چہرہ!۔۔۔۔ عجیب کچا پن ہے۔ آنکھوں کے نیچے گالوں کے ابھار پر سرخی کی ہلکی سی چھوٹ۔۔۔۔ پھر زردی کا ہالہ اور پھر سرخی اور زردی گھل مل کر تھوڑی دیر تک یونہی چلی گئی تھیں۔ پھر ٹھوڑی کے ابھار پر زردی کا نشان۔

تیسری نظر۔۔۔۔ ہونٹ!۔۔۔۔ درمیان سے بہت بھرے بھرے۔ پھر دونوں جانب بتدریج باریک ہوتے ہوتے

گالوں میں کھو گئے ہیں جیسے پہاڑی چشمہ۔ نہ کہیں سے آئے نہ کہیں جائے۔

چوتھی نظر ——— سینہ! ——— کیا عمر ہو گی اس کی؟!! ——— ۲۵ سال سے کم تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا چہرہ؟ ——— یا تو اس کا چہرہ دھوکا باز ہے یا سینہ!

پانچویں نظر ———

مگر پھر ٹرین آگئی اور وہ بھیڑ میں کھو گئی۔

---*---

دوسرے دن وہ حسب معمول کھٹکھٹائے بغیر مدثر کے گھر میں گھس گیا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی اس کے پاؤں رک گئے۔ اٹھارہ انیس برس کے لڑکے کی طرح اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

یہ یہاں کیسے آگئی؟ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ مگر دوسرے ہی لمحے مدثر کی والدہ کی آواز آئی۔

"آؤ آؤ بیٹے۔ یہ مدثر کی چچیری بہن ہے۔ پنڈی سے آئی ہے۔"

اب اس نے ہمت کر کے اس کی طرف دیکھا اور ڈر گیا ——— اس کی آنکھوں میں پہچاننے والی چمک تھی اور ہونٹوں پر وہی بے تعلقی والی مسکراہٹ۔

ہم نے آپ کو اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ آپ ہمیں گھور کیوں رہے تھے؟

سلیم نے سر جھکا لیا۔

خوفناک حد تک خوبصورت ہے! ——— اس نے اپنے آپ سے مذاق کیا اور خود ہی خفیف ہو گیا۔

"میں صبح ہی مدثر سے کہہ رہی تھی کہ سلیم آئے تو اس سے چھالیہ منگاؤں۔" سلیم مدثر کی والدہ کے پاس بیٹھا تھا ——— وہ سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔

"مدثر تو کسی کام کا ہے نہیں اور خان کو چھالیہ کا پتہ نہیں۔"

"ہوں! ——— جی ہاں ——— ہوں!" اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"کل سلمیٰ بھی کراچی سے آگئی ہے۔"

"اچھا ——— !"

"مدثر سے اتنا نہیں ہوا کہ جا کر اسے لے آتا۔ یہ بے چاری گئی تھی اسٹیشن اسے لینے۔"

اچھا ——— تو یہ صاحبزادی کل مدثر کی بہن کو لینے گئی تھیں۔ اس نے سامنے دیکھا۔ لڑکی نے ایک لمحہ کو آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر رسالے پر اور زیادہ جھک گئی۔

کیا نام ہو گا ان صاحبزادی کا؟ سلیم نے اس کے ماتھے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی ——— یہ دوپٹہ اوڑھنے کا عجب انداز ہے! اتنا کس کے سینے پر کیوں منڈھتی ہے؟ ——— اسے خود بخود ہنسی آگئی۔ نام میں اور دوپٹہ اوڑھنے کے انداز میں کیا قدرِ مشترک ہے؟ ——— اسے نام کا سوچتے سوچتے آخر یہ دوپٹہ کیوں نظر آگیا!

"مدثر کہاں ہے؟" اس نے اپنی ہنسی چھپانے کے لئے امی جان سے سوال کیا۔

"وہ سلیمٰے کو شریف صاحب کے پاس چھوڑنے گیا ہے ——— نازو! ذرا خان سے کہو۔ سلیم صاحب کے لئے شربت تو لے آئے۔"

تو گویا ان کا نام نازو ہے۔ جبھی اتنے نخرے ہیں۔ مگر یہ نازو تو کوئی نام نہیں ہوا۔ نازنین، نازلی، نزہت یا نازک ——— "پنڈی میں مدثر کے جدی چچا رہتے ہیں۔" امی جان نے نازو کے جانے کے بعد اس کا پورا تعارف کرایا ——— "یہ ان کی لڑکی ہے۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر آئی ہے۔"

"ہوں! ———" مگر یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟

"باپ کا خیال ہے اگر اچھا لڑکا مل گیا تو شادی کر دیں گے ورنہ ایم اے میں داخلہ لے لے گی۔"

اسے اس ورنہ پر ہنسی آگئی۔

امی نے بھی اس کی ہنسی کا مطلب سمجھ لیا۔

"لڑکیاں پالنا آسان کام نہیں ہے۔ چار لڑکیاں ہیں ان کی۔ اگر اس کی شادی نہ ہوئی تو یہیں داخلہ لے گی۔ میں نے کہہ دیا ہے اسے میرے پاس چھوڑ دو۔ میری بھی دوسراہٹ ہو جائے گی ———"

نازو واپس آئی تو مدثر بھی آگیا۔

"ہیلو سلیم الزماں خاں۔ یہ کیا سازشیں ہو رہی ہیں امی جان کے ساتھ! ——— ظاہر ہے میرے خلاف باتیں ہو رہی ہوں گی۔" پھر اس نے نازو کی طرف دیکھا جو گلاس میں اسکوئیش ڈال رہی تھی۔

"بھئی نازو! تم ہمارے دوست سلیم الزماں خاں سے ملیں! تم اردو میں ایم اے کرنا چاہتی ہو۔ یہ تمہارے بہت کام آئیں گے۔"

اس لڑکی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح بے نیازی کے ساتھ گلاس لاکر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

آپ ہیں کون؟ ہماری توجہ کیوں چاہتے ہیں؟

مدثر اپنا گلاس لے کر بیٹھ چکا تھا۔

"اور کہو ——— بھابی کا کیا حال ہے؟" مدثر نے اچانک حملہ کیا۔

سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھابھی اور بچوں کا کیا ذکر تھا؟ اسے ایک دم غصہ آگیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے نازو کی طرف گھبرا کے دیکھا ——— وہاں وہی سکون تھا۔ البتہ ہونٹوں کے کناروں والی مسکراہٹ کا زاویہ بدل گیا تھا ——— یا یہ بھی اس کا وہم تھا!

"کبھی تو اس بے چاری کو بھی گھر سے باہر نکالا کرو۔" مدثر نے دوسرا حملہ کیا۔

اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ بڑی ہمدردی ہے آپ کو میری بیوی کے ساتھ! وہ تلخ ہو گیا۔

"بہت اچھا۔ دونوں بچوں کو بھی آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔"

"آہ ـــ ہاہا ـــ ہاہا ـــ" مدثر نے گلا پھاڑ کے قہقہہ لگایا۔ "آ گئے نا اپنی پٹھن ولی پر ! ـــ بیوی کے نام پر ناراض ہو گئے ـــ"

مگر میں پہلے تو کبھی بیوی بچّوں کے نام پر ناراض نہیں ہوا تھا؟ ـــ آج کیا بات ہے !! ـــ اسے اپنی حرکت پر خود ہی شرم آگئی۔ مدثر کی امّی نہ جانے کیوں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہی تھیں ـــ نازو کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ یقیناً اس کے متعلق بری رائے قائم کر چکی ہوگی۔ مگر ـــ مجھے اس کی رائے سے کیا لینا؟ اچھی قائم کرے یا بری!

وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو بھئی!" مدثر خدا جانے کیوں سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"نہیں، مجھے کام ہے۔ پھر آؤں گا ـــ"

"اچھا بیٹا۔ میرے لئے چھالیہ ضرور لیتے آنا ـــ شام کو آؤ گے نا؟ ـــ"

شام کو؟ بھئی شام کو پھر آنا پڑے گا! نہیں۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ کیا منہ دکھائے گا نازو کو اب؟ ـــ منہ دکھائے گا؟ نازو کو؟ ہونہہ۔ ایسی تیسی نازو کی ـــ

اس روز اس نے بچوں کے لئے بہت سی ٹافیاں خریدیں اور بیوی کے لئے عطر کی شیشی، نیل پالش، لپ اسٹک اور پتہ نہیں کیا کیا لیا۔ اس دن اسے اپنی بیوی اور بچّوں پر بہت پیار آیا۔ رات کو اصرار کر کے وہ بیوی کو فلم دکھانے لے گیا اور اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ فلم شروع ہوئی تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے بیٹھ گیا۔

میں یاسمین سے بے پناہ محبّت کرتا ہوں۔ میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے گھر میں کسی دوسری عورت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

وہ بار بار پیار سے اس کا ہاتھ دباتا رہا۔ شادی کے چھ سال بعد وہ یہ حرکت کر رہا تھا۔ یاسمین پہلے تو حیران ہوئی۔ پھر اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر سلیم نے اور زور سے ہاتھ پکڑ لیا

اس کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کیا فلم دیکھ رہا ہے۔ جب یاسمین کسی بات پر ہنستی تو وہ بھی ہنس دیتا اور اس کا ہاتھ اور زور سے دبا دیتا۔

انٹرول میں اس نے سیون اپ کی ٹھنڈی بوتلوں کا آرڈر دیا اور یاسمین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں کی طرف اٹھایا ـــ وہ خفا ہو گئی۔

"شرم نہیں آتی آپ کو؟" اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ "آپ تو بالکل بچّہ بن گئے ہیں۔"

بچّہ بن گیا ہوں؟ واقعی یہ کیا حرکت ہے! یہ میں اپنے آپ کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ ـــ پھر اسے ایک دم ہنسی آگئی۔ خوب زور کی ہنسی۔ اور بہت دیر تک یاسمین کو دیکھ دیکھ کر ہنستا رہا۔

اور جب وہ گھر پہنچا تو یہ ہنسی وہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے یاسمین کو زور سے دبوچا اور گھمانا شروع کر دیا۔ قہقہے اس کے منہ سے پھوٹے پڑ رہے تھے

"توبہ۔ تم تو بالکل پاگل ہو گئے ہو۔" وہ زبردستی اس سے علیحدہ ہو گئی۔ "فلم کی ہیروئن تو پسند نہیں آ گئی جو مجھ سے بدلہ نکال رہے ہو؟"

یاسمین بہت چالاک ہے۔ اس نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ وہ یکلخت خاموش ہوگیا۔

وہ دوسرے دن بھی خاموش رہا اور تیسرے دن بھی۔ دونوں دن وہ مدثر کے گھر نہیں گیا۔ چوتھے دن وہ بازار میں مل گئی سلمیٰ باجی کے ساتھ۔ سلمیٰ باجی نے اسے نہیں دیکھا۔ پہلے نازو نے دیکھا اور خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی —— اسے اپنے آپ سے ڈر لگا اس نے سوچا راستہ کاٹ کے نکل جاؤ۔ مگر اس وقت تک سلمیٰ باجی بھی اُسے دیکھ چکی تھیں۔

"ارے سلیم صاحب! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"جی میں —— چھالیا خرید رہا تھا امی کے لئے۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"اچھا تو آج خرید رہے ہیں چھالیہ! وہ تو پرسوں سے انتظار کر رہی ہیں۔"

پھر انہوں نے موضوع بدل دیا۔ "ہم تین دن سے آئے ہوئے ہیں اور آپ کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ یاسمین کو ہی بھیج دیتے! ——"

پھر وہی یاسمین کا ذکر! —— اس نے بے اختیار نازو کی طرف دیکھا۔ نہیں —— یاسمین کا ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ کون ہوتی ہے یہ لڑکی ہمارے درمیان آنے والی!

"میں ضرور لاؤں گا یاسمین کو۔ دراصل وہ —— آپ کو پتہ ہے نا۔ اتنی دور سے آنا جانا مشکل ہوجاتا ہے۔"

"اچھا تو ہم خود ہی آجائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ یاسمین ضرور آئے گی۔ میں آج شام کو ہی لاؤں گا اسے ——"

یاسمین بہت تیز ہے۔ بڑی جلدی ہر ایک سے دوستی کرلیتی ہے اور یہ دوستی اتنی گہری ہوتی ہے کہ فوراً وہ دنیا بھر کے معاملات میں مشورے بھی دینا شروع کر دیتی ہے —— نازو سے بھی اس کی اتنی جلدی اور اتنی ہی گہری دوستی ہوگئی

"اچھا بھئی۔ تم ہمارے گھر آنا۔" یاسمین نے بڑے زور شور سے نازو کو دعوت دی۔ "اپنے بچوں سے ملاؤں گی تمہیں۔ اپنے باپ سے زیادہ سمجھدار ہیں وہ۔" اس نے شرارتاً پیار سے سلیم کی طرف دیکھا۔ نازو بھی مسکرائی مگر جب سلیم نے اس کی طرف دیکھا تو ہونٹ سکیڑ لیئے۔

عجیب لڑکی ہے۔ کیا مطلب ہے اس کا آخر؟ —— میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا؟

مدثر تم بہت نالائق ہو۔ اپنی تو شادی نہیں کرتے اور دوسروں کے لئے مصیبتیں کھڑی کر دیتے ہو۔ میں نے کیا جرم کیا تھا کہ تم اس لڑکی کو اپنے گھر لے آئے! اور یہ لڑکی مجھے کس جرم کی سزا دے رہی ہے؟ تم بہت سازشی آدمی ہو۔ میرے بھائی! —— تمہارے دادا تو سورۂ مزمل کے عامل تھے مگر میرے دادا رات رات بھر ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں کمزور ہوں۔ میں پریشانی کے نام سے ہی ڈر جاتا ہوں۔ اس امتحان میں کیسے پورا اتروں گا! ——

اور پھر وہ ہمارے گھر آگئی۔ نازو یاسمین کی مہمان تھی۔ دوپہر بھر دوسرے کمرے میں نہ جانے کن کن باتوں پر قہقہے بکھرتے رہے یاسمین اپنی خوش مزاجی سے مجبور ہے۔ اس کے قہقہے حسب معمول بہت زوردار تھے۔ میں دوسری آواز بھی سننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ

آواز بھی آتی تھی لیکن بہت دبی دبی ——— جیسے سن لئے جانے کا ڈر ہو۔ کس سے ڈرتی ہے؟ مجھ سے؟ ——— اور میں نے اپنے ساتھ لیٹی ہوئی اپنی ننھی منی گڑیا کو زور سے سینے سے چمٹایا اور سو گیا۔

سہ پہر کو چائے پر یاسمین خوب چہک رہی تھی۔ اور وہ خاموش تھی ——— "ہاں" یا "نا" کے سوا ایک لفظ بھی تو نہیں نکلا اس کی زبان سے۔ پہلے گڑیا سے کھیلتی رہی۔ پھر چائے پیتی رہی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔

یاسمین نے پہلے نازو کی طرف دیکھا پھر سلیم کی طرف۔

"سلی تم چھوڑ آؤ انہیں۔ اتنی دور اکیلی کیسے جائیں گی؟"

سلیم نے حیرت سے یاسمین کی طرف دیکھا۔

یاسمین! تم عظیم عورت ہو۔ اتنا بھروسہ کرتی ہو اپنے شوہر پر! ——— تمہارا دل کتنا صاف ہے۔ تم کتنی بڑی ہو اور میں کتنا چھوٹا۔ تم بہت طاقتور ہو اور میں بہت کمزور!

ٹیکسی میں سلیم نے پہلے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر پیچھے نازو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کتنا طویل سفر تھا اور کتنا مختصر! اس نے بیٹھتے ہی بڑے بیزارگانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر سامنے سڑک پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ خاموش ایک طرف کو سکڑی بیٹھی تھی ——— اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نازو کے دل کی دھڑکن سن رہا ہے۔ واقعی اس کے کانوں میں بہت زور زور سے دھک دھک کی آواز آ رہی تھی۔ یہ اس کے اپنے دل کی آواز تو ہو نہیں سکتی! ——— اسے ڈر لگا کہ کہیں اسی طرح نازو بھی اس کے دل کی دھڑکن نہ سن رہی ہو۔ اس نے اچانک باتیں شروع کر دیں۔

"آپ اردو میں ایم اے کریں گی؟"

نازو نے "اُہنہ اُہنہ" کر کے گلا صاف کیا اور خاموش رہی۔

"آپ کو لٹریچر سے تو خاصی رغبت ہو گی؟"

کوئی جواب نہیں۔ صرف اس نے پہلو بدل کر سلیم کی طرف دیکھا اور سینے پر دوپٹہ اور زور سے کس لیا۔

وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ آخر یہ بولتی کیوں نہیں؟ کیا وہ بھی میری طرح اپنے آپ سے ڈرتی ہے؟ اور اسے ایسا لگا کہ اگر تھوڑی دیر اور نازو نے بات نہ کی تو اس کا اپنا سینہ پھٹ جائے گا۔ اور وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس نے گھبرا کر دو تین بار پہلو بدلے اور چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر پھر زور سے بند کر دیا ——— ڈرائیور نے چونک کر پیچھے دیکھا اور گاڑی تیز کر دی۔ مگر وہ خاموش تھی۔

یہ لڑکی مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ مجھے پاگل کر دے گی۔ آخر یہ کیا چاہتی ہے؟ یہ کیوں میری دشمن ہو گئی ہے؟ اسے میرے اوپر بالکل رحم نہیں آتا؟ یہ اتنی کٹھور کیوں ہے؟

———×———

وہ کون سا دن تھا؟ ——— اس روز دنوں کی گنتی ختم ہو گئی تھی۔ وقت کیا تھا؟ ——— ایسا وقت جسے دن اور رات کے کسی حصے میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔

بہت دن بعد وہ مدثر کے گھر گیا تھا۔ پہلے سوچا گھنٹی بجائے۔ مگر نہ جانے کیوں اس کا ہاتھ گھنٹی پر سے واپس آ گیا۔ اور وہ

ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔

ابھی میں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک زور کے دھماکے کے ساتھ بڑا لیمپ زمین پر آرہا۔ میں گھبرا کے پیچھے ہٹا ــــ سامنے نازو تاروں میں الجھی لیمپ کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی میں نے بڑھ کر لیمپ سیدھا کر دیا۔ نازو کا دوپٹہ لیمپ میں الجھ گیا تھا اس نے جلدی سے دوپٹہ کھینچ کر سینے پر کسا اور کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ پھر بہت سرخ ہوگیا۔ ایسا سرخ کہ کانوں میں آگ لگ گئی۔ پھر ہونٹ زرد ہوگئے۔ ان پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ گھبراہٹ تھی۔ اور آنکھیں؟ ایسا لگا جیسے ابھی رو دے گی۔ میرے ہاتھوں نے بڑھ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا ــــ اس کا سر میرے سینے پر تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو نہ جانے کتنے بوسے دیئے۔ نہ جانے کتنی دیر میں اس کے گالوں، آنکھوں اور ہونٹوں کی آگ اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ وہ بچوں کی طرح مجھ سے چمٹی رہی۔

اور اس رات سلیم نے یاسمین سے کہا کہ "نازو کی شادی جلد ہوجانا چاہیے!"

"تمہیں کیا فکر ہے نازو کی؟" یاسمین نے اس کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔ "تم نہ اس کے باپ نہ بھائی!"

"یہ تمہارا دل اتنی زور سے کیوں دھڑک رہا ہے؟" یاسمین نے سینے پر سے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"میں کہتا ہوں وہ لڑکی جوان ہے۔ پھر کوئی اچھا لڑکا ملنا مشکل ہوجائے گا" اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا تو بڑی ہمدردی ہے آپ کو نازو سے؟"

وہ ڈرا۔ کہیں اس کا دل یا اس کا چہرہ اس کی پول نہ کھول دے۔ اس نے یاسمین کا سر اپنے سینے پر سے ہٹا کر برابر تکیہ پر رکھ دیا۔

"تو پھر کرادو تم اس کی شادی"

"مدثر کیوں نہیں کر لیتا! اچھی خاصی لڑکی ہے" وہ خوبصورت کہتے کہتے رک گیا۔ وہ یاسمین کی ذہانت سے ڈرتا تھا۔

"مدثر؟ ــــ تمہیں پتہ نہیں وہ عطیہ کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گا"

"عطیہ؟ ــــ" واقعی وہ بھول گیا تھا۔ "عطیہ فائنل میں ہے نا؟"

پھر اس نے سوچا۔ نازو کی شادی فوراً ہوجانا چاہیے۔ اور اس نے خلیل کو جا پکڑا۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔ مگر تم اتنی فکر کیوں کر رہے ہو؟"

"میں کیوں اتنی فکر کر رہا ہوں؟ ــــ خلیل میاں! تمہیں کیا بتاؤں کیوں فکر کر رہا ہوں!" اس نے فوراً بہانہ تلاش کر لیا۔

"بھئی بات یہ ہے کہ مدثر کی والدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ نازو کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کر دو"

"اچھا سا لڑکا؟ ــــ" خلیل ہنسا۔ "خوب تلاش کیا تم نے اچھا سا لڑکا۔ ویسے لڑکی واقعی بڑے مزے کی ہے"

"پھر میں بات کروں؟"

"مگر اتنی جلدی کیا ہے؟ میں اپنی والدہ سے تو پوچھ لوں"

"ارے والدہ کا کیا ہے۔ مائیں تو اپنے بیٹوں کی شادی کے لئے ہر وقت جوتے پہنے بیٹھی رہتی ہیں"

مدثر کی والدہ کو رشتہ بہت پسند آیا۔ مگر مدثر حیران تھا۔

"خاں صاحب! یہ آپ نے نائی کا کام کب سے شروع کر دیا؟" وہ جب طنز کے موڈ میں ہوتا تو اسے خاں صاحب کہتا۔ سلیم

کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں مدثر سمجھ تو نہیں گیا۔ اسے پتہ تو نہیں چل گیا! اس نے فوراً مذاق کا انداز اختیار کیا۔
"مدثر حسین صاحب۔ ہم تمہارے بزرگ ہیں۔"
"بجا ارشاد ـــــ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ مگر یہ شادیاں کرانے سے دلچسپی کیا معنی؟"
"اچھا تم فضول مت بکو! خلیل تمہیں پسند ہے۔ نہیں؟"
"ہاں ہاں خلیل تو خیر اچھا آدمی ہے۔ مگر تم خاصے پُراسرار ہوتے جا رہے ہو۔"
پُراسرار ہوتا جا رہا ہوں؟ کس کے لئے؟ مدثر کے لئے؟ نازو کے لئے ـــــ یاسمین کے لئے یا اپنے لئے!!
اس دن وہ بہت خوش تھا اور بہت مغموم بھی ـــــ نہیں۔ مغموم نہیں تھا۔ خوش تھا اور بہت خوش تھا۔ حسبِ معمول اپنے پاگل پن سے یاسمین اور بچوں کو خوب پریشان کیا اور سب کو ٹیکسی میں بھر کر کمپنی باغ لے گیا۔ خوب سیر کرائی۔ خوب آئس کریم کھلائی۔ پھر سب کو ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ اور پھر ـــــ رات بھر جاگتا رہا۔

* * *

"نازو کے باپ راضی ہو گئے ہیں۔"
"ہوں؟ بڑا اچھا ہوا۔"
پھر نازو آ گئی۔ مدثر کی والدہ خاموش ہو گئیں۔ نازو کشن پر غلاف چڑھا رہی تھی۔ سلیم نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا اور خوف سے کانپ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں مگر خشک۔ پتھر کی طرح خشک۔ وہ اتی کی بات نہیں سن سکا۔ وہ شاید مدثر کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ میرا دل کیوں اتنی زور زور سے دھڑک رہا ہے؟ کیا میں نے غلطی کی ہے؟ میں اور کیا کر سکتا تھا؟ کیا میں یاسمین اور بچوں سے محبت نہیں کرتا؟ یہ لڑکی تو مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے!
پھر نازو کھڑی ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے ایک نظر سلیم کو دیکھا۔ صرف ایک نظر اور سلیم تلملا کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس کی آنکھوں نے اسے ڈس لیا ہو۔

* * *

ایک ہفتہ بعد ـــــ نہیں ایک سال بعد بلکہ ایک صدی بعد خلیل اسے ملا۔
"تم بہت بیہودہ آدمی ہو۔ میری بے عزتی کرا دی۔"
"کیا ہوا؟ ـــــ" اس نے حیرت سے خلیل کی طرف دیکھا۔ مگر فوراً ہی اس کی حیرت تشویش میں بدل گئی۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔
نازو ـــــ کیا ہوا نازو کو؟ ـــــ
"ہوا کیا۔ ان صاحبزادی نے شادی سے انکار کر دیا۔"
شادی سے انکار کر دیا؟ ـــــ شادی سے انکار کر دیا! ـــــ اب میرا کیا ہوگا؟ ـــــ اس کے بعد وہ کچھ نہیں سن سکا۔
اور اس رات وہ یاسمین کے سینے پر سر رکھ کے خوب رویا۔

ضمیمہ ہریاض

ایک محبّت کی کہانی

یہ ایک محبت کی سادہ کہانی ہے۔

محبت کا لفظ تو بے شک پامال ہو چکا ہے اور چلتے چلتے کھوٹے سکے کی طرح گھس گیا ہے مگر وہ جذبہ جس کا یہ مظہر ہے، ہر زندگی کے ساتھ تازہ پیدا ہوتا ہے، اور انسان کے نازک، دلفریب احساسات میں اس کا نام سرِفہرست ہے۔ اور نوجوانی میں اس سے زیادہ خوبصورت جذبہ شاید ہی کوئی ہو۔ اگر وہ فرزانہ نہ ہوتی، کوئی اور لڑکی ہوتی، تب بھی اس حسین تجربے کی کشش سے متاثر کرتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاید اتنی شدت سے نہیں کیونکہ کچھ لوگ اپنی ساری قوتوں سے محسوس کر سکتے ہیں اور کچھ ایسا نہیں کر سکتے۔ فرزانہ تو ہر بات کو جیسے پی لیتی اور اپنے جسم میں گھول لیتی تھی۔ دنیا کی جس اکیلی سڑک پر وہ چلی تھی وہاں اس کا تنہا ساتھی اس کا تکلیف دہ احساس ہی تو تھا۔ یہ اس کی سوچ اور تلاش تھی جو اس کے پاؤں کا چھالا تھی، اور جس کی سوزش اسے ہمیشہ مضطرب رکھتی تھی، اور سب کے ساتھ رہ کر بھی وہ سب سے الگ تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے لئے وہ اپنے خاندان کے ساتھ اس پہاڑی مقام پر آئی تھی ——— (خاندان ——— یعنی وہ لوگ جن کے ساتھ وہ رہتی تھی، اور جن سے اسے انس تھا) ——— اور اب اسٹیشن سے سیدھی اس گھر میں آنے کے بعد سب کے ساتھ خوبصورت سٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ کچھ لوگ ابّو اور بھائی جان کو جانتے تھے اور انہیں اسٹیشن لینے آئے تھے۔ اب وہ بھی یہاں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔

کسی نے فرزانہ کو گرم چائے کی پیالی پکڑا دی۔ وہ تو اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی سردی سے کانپنے لگی تھی اس وقت چائے کو دیکھ کر کھل اٹھی۔ جس میں بہت سا دودھ تھا اور جس میں الائچی کی خوشبو بھی آ رہی تھی ——— چہ چہ ———!! بیچارے ابوالکلام آزاد! اگر اس چائے کو دیکھ لیتے تو کتنا کڑھتے! ———

چائے شکر کے گھونٹ تھی۔

ایک سے ایک کیریکٹر کمرے میں موجود ہے ———

اور یہ سامنے بیٹھے ہوئے صاحب جن کا نام شاید ابّو نے حسین خاں بتایا ہے بار بار میری ہی طرف دیکھے جاتے ہیں ——— لو بھائی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ!

یہ اجنبی کوئی تیس تینتیس سال کا رہا ہوگا۔ بہت سے مہمانوں میں فرزانہ کو صرف اس کے ہاتھ بار بار نظر آ جاتے، صاف ستھرے مضبوط اور بڑے بڑے ہاتھ، جن کی پشت پر بھورے بال تھے اور ترشے ہوئے ناخون چمک رہے تھے۔

فرزانہ نے دیکھا حسین خاں کی ہتھیلیاں سرخ ہیں۔
اس کا جی گھبرانے لگا۔
اوہ ـــــ اس شخص میں کس قدر خون ہے۔ اور اس کے چہرے پر نشان کیسے ہیں۔ یہ آدمی ہے کہ پہاڑ کا پہاڑ۔ یہاں سے وہاں تک صاحبزادے کی پیٹھ نظر آ رہی ہے۔ کوئٹے میں پہلا دن کیا یونہی کمروں میں بیٹھے بیٹھے گذر جائے گا ـــــ!
اونچ نیچ اور حسین درختوں کے اس شہر میں فرزانہ کے قدم بہت سبک پڑے۔ متانت سے بلند ہوتے ہوئے چنار کے درخت، ہواؤں میں دھیرے دھیرے سر دے جھومتے ہوئے چیل، پتلے اور لمبے سرو، گویا سبز رنگ کے فوارے کی اچھلتی ہوئی دھار کو کسی نے منجمد کر دیا ہو۔
دور افق پر مردار اور بولان کے پہاڑی سلسلے چسپاں تھے ـــــ اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑ ـــــ اڑتے ہوئے سپید بادلوں کے سائے کے ساتھ ان فلک بوس پہاڑوں کا رنگ بدلتا رہتا تھا۔ مٹیالا، ہلکا نیلا، دھندلا دھندلا اودا۔
وہ ہر منظر کو پوری آنکھیں کھول کر دیکھتی۔ وہ ان کی ٹھنڈک اپنی تمام حسیات میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ اس شہر کے میلے میں وہ بچے کی طرح خوش خوش گھوم رہی تھی۔ دور بین گلے میں ڈالے، سیٹیاں بجاتی ہوئی، اس کے لمبے نوکدار جوتے ہر پتھر پر پیار سے پڑتے اور اس کا دل گنگنا رہا تھا۔
فرزانہ کے پاس ایک کھلنڈری لڑکی کا دل تھا اور وہ دنیا میں سچ کو ڈھونڈتی تھی۔ سچائی اور خوشی کا چشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے؟ اس منبع کو کھوجتی وہ سب کی باتیں ہنسی میں ٹال دیتی۔
اور سچ کہاں تھا ـــــ؟ کتابوں میں ـــــ؟
ہاں کتابوں میں بہت کچھ سچ تھا۔ اسے کاغذ کی سطح اور لفظوں سے بہت دلچسپی تھی۔ کبھی وہ خوشی اور حیرت سے سوچتی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بس کتاب کھولو اور ہر صفحے پر کالے لفظ ادب سے ہاتھ باندھے قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک کے بعد ایک سب ہمارے اندر چلے جاتے ہیں۔
وہ کتابیں پڑھتی رہتی۔ کسی صبح کو اس کے بستر پر کتابیں ہی نظر آتیں۔ سوچ سوچ کر، پڑھ پڑھ کر جب وہ تھک جاتی تو کتابیں پھینک کر کھلی ہواؤں میں لمبے لمبے سانس لیتی۔ جھولے پر اونچی پینگ بڑھاتی جس میں جھولا زناٹے سے اوپر چڑھتا ہے اور ڈال سے ٹوٹے پھل کی طرح واپس آتا ہے۔ اور سب بال ہواؤں میں اڑنے لگتے ہیں۔
وہ بلی کی طرح درختوں پر چڑھ جاتی اور کھٹی کھیریاں، جو سب لڑکیوں کو پسند ہوتی ہیں نمک مرچ لگا کر کھاتی۔
زندگی سے چھیڑ چھاڑ اسے بہت بھاتی تھی۔
مگر ـــــ یہ سب اسے کچھ اوپری سا لگتا تھا جیسے پانی پر تیل ڈالو تو چکنا چکنا اوپر ہی تیرتا رہتا ہے اور ایک بوند بھی تہہ تک نہیں پہنچنے پاتی۔
وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شہر بھر کے اسکینڈلز سنتی۔ کس کی منگنی ہوئی اور کس کی ٹوٹ گئی۔ یونیورسٹی میں کون سا لڑکا سب سے زیادہ مقبول ہے۔ فرحانہ قیوم کا آج کل کس کے ساتھ چل رہا ہے (بھئی کسی سے کہہ مت دینا!) "ریو" میں کونسی پکچر لگی ہے ـــ

امتحان کا نتیجہ کب تک آ رہا ہے اور اکنامکس کا پرچہ اب کی بار کون جانچ رہا ہو گا۔

ان سب باتوں سے میرا کیا تعلق ہے ——؟ یہ ساری دنیا میرے ارد گرد گھومتی رہتی ہے اور مجھے چھو بھی نہیں سکتی!

ویسے دیکھو تو زندگی میں دلچسپیاں کم بھی نہیں۔ اور فرزانہ تو شریر بھی۔ جب وہ اپنے شیطانی غول کے ساتھ ہوتی اور کوئی بیچارہ لڑکا اکیلا دکیلا مل جاتا تو آوازے کسنے میں وہ سب سے آگے ہوتی۔ پھر ایکا ایکی وہ کھوئی کھوئی سی ہو کر رہ جاتی۔ سارے وقت اس کے خیال سایے کی طرح ساتھ رہتے۔ وہ اپنی سوچ سے عاجز تھی۔

"بھابی —— یہ زندگی بھی کیا تماشہ ہے!"

بھابی بچے کے نیپکن میں پن لگاتے ہوئے ہنس پڑیں۔ "چخد ہیں آپ تو"۔

فرزانہ اخبار پھینک کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ "اچھا کل بازار کی سیر —— بات پکی؟"

"خدا کے لئے یہاں بازار نہ جاؤ" اماں بولتیں "نہ جانے کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ تم لوگوں کے تنگ کپڑے دیکھ کر کوئی گولی وولی نہ مار دے"۔

شام کو حسین خاں آیا۔ ابّو اور بھائی گھر میں نہیں تھے۔ گھر کی لڑکیاں اس کے سامنے یوں بیٹھ گئیں جیسے وہ ایک عجوبہ ہو۔ وہ غلط اردو بولتا تھا اور محاورے کا استعمال تو بالکل نہیں جانتا تھا۔ سنبھل سنبھل کر اماں سے باتیں کرتا رہا۔ پان مانگ کر اس نے ایسے پھوہڑ پنے سے کھایا کہ سارے ہونٹ رنگ گئے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

اماں ذرا دیر کو اٹھ کر اندر گئیں تو اس نے فرزانہ کو مخاطب کرنا چاہا۔

اماں فوراً واپس آ گئیں۔

وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے سر کھجا کر رہ گیا۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے کٹے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس نے جیب سے کشمش کا پیکٹ نکالا اور کھانے لگا۔

ہاجرہ منہ پھیر کر ہنس رہی تھی۔ وہ فرزانہ کے چٹکیاں لینے لگی۔ "وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ دیکھو دیکھو۔ ایسے منہ ہلا رہا ہے جیسے کشمش کے بدلے تمہیں کھا رہا ہو"۔

اس شخص میں کوئی بہت عمدہ، بہت متوجہ کر دینے والی بات نہ تھی۔ اماں جان اور بھابی تو اسے اپنے جیسا انسان ہی تصور نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے لئے وہ اور دوسرے پہاڑی لوگ انسانوں کی دوسری قسم تھے۔

کیا فرزانہ ان کا ٹائپ تھی ——؟

اوپر سے دیکھنے میں شاید ہاں، مگر اپنا آپ پہچاننے کی تو خود اس میں بھی ابھی ہمت نہ تھی۔ اس کی ہلکی پھلکی روح پر تعلق کی کوئی زنجیر ابھی نہ پڑی تھی۔

رات آ گئی۔ سرد اور چاند پتھروں کے شہر کی رات۔ چلتی کے پہاڑ چاندنی میں ہیروں کی طرح ترشے نظر آ رہے تھے (اگر ان پہاڑوں پر سبزہ ہوتا تو یہ حسن کیسا ختم ہو کر رہ جاتا!!) گہرے نیلے اور بہت اونچے آسمان پر سفید چاند برف کے ٹکڑے

کی طرح بچھا تھا۔ اور جگر جگر کرتے تارے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ ٹھنڈی یخ ہوا فرزانہ کے نتھنوں میں گھسی جاتی تھی۔ اس کی ناک بار بار ٹھنڈی ہو جاتی اور اسے لحاف سے رگڑ رگڑ کر اس ننھی سی ناک کو گرم کرنا پڑتا۔

سونے سے پہلے فرزانہ چپکے چپکے مسکراتی رہی ——

سرخ چہرے والے اس آدمی نے فرزانہ پر محنت سے "ورک" کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایسے ایک ہزار ایک سو ایک لڑکے کالجوں میں، یونیورسٹی میں، ہر جگہ لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں بے چارے ——

اور یہ تو کوئٹے کا رہنے والا ہی نہیں ہے۔ بہت دور ملک کی شمال مغربی سرحد پر کوئی جگہ ہے جہاں اس کا گھر ہے وہ جلد ہی سو گئی۔ ایسی مسرور اور مطمئن نیند جو صرف ان کنواری لڑکیوں کو آتی ہے جن کے لئے بہت پیغام آ چکے ہوں۔

*

بھائی نے اماں کو تسلّی دی تو وہ لڑکیوں کو بازار بھیجنے کے لئے راضی ہو گئیں۔ پھر بھی ان کا اصرار تھا کہ کہیں سے برقعے مانگ کر اوڑھ لئے جائیں۔ یہ بات سب نے قہقہوں میں اڑا دی اور اماں جان بیچاری بے دلی سے مان گئیں۔ "ارے یہ تو جنگل ہے جنگل"۔

وہ شہر تھا کہ جنگل تھا۔ فرزانہ کے لئے وہ ساری کشش اور طلسم رکھتا تھا جو اس کا دل مانگتا تھا۔ جناح روڈ کو تو کوئٹے کا حصہ ہی نہ سمجھو۔ کوئٹے کا رنگ اس میں صرف کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ دو طرفہ خوبصورت سجی ہوئی دوکانیں جن میں شیشوں کے پیچھے مؤدب اور کلین شیون بردی کھڑے تھے اور خانم خانم کہہ کر منہ سکھاتے تھے۔

مگر اس شہر کی نئی پھوٹی ہوئی کونپلوں کی تازہ تازہ خوشبو نے فرزانہ کو بے بس کر دیا اور وہ بازار اور کوچے جن میں شہر کا اصلی اور کھرا رنگ تھا۔ وہ اس شہر کو مرقعے کی طرح حیران دیکھتی۔

لمبے کوٹوں اور اونی کمبلوں میں لپٹے ہوئے پہاڑی، جن کے سرخ سرخ چہرے تھے۔ سبز بھوری اور سیاہ آنکھیں تھیں اور مجسّمے کی طرح خوبصورت ڈھلے ہوئے بدن تھے، ادھر سے ادھر نکل جاتے۔ ان کی چال ڈھال سے متانت ٹپکتی تھی۔ فرزانہ انہیں مڑ مڑ کر دیکھتی ——

سیب بیچنے والے کا سرخ و سپید چہرہ اور بھرپور سرخ ہونٹ، تنور پر بیٹھے ہوئے ضعیف کی سفید براق لمبی داڑھی جو ایسی جھاگ سی سپید اور اتنی لمبی تھی کہ مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔ جوانوں کی بھنورا سی خوبصورت داڑھیاں۔ نوعمر لڑکوں کے حسین نقوش۔

یہ کیسا گل فاموں کا شہر ہے —— !

چیتھڑوں میں چمکتے ہوئے پیارے گدگدے بچے، سیاہ اور سنہری بالوں کی دو دو چوٹیوں والی جفاکش عورتیں جو درختوں کے نیچے لکڑیاں چنتی رہتیں۔ کڑھے ہوئے شیشے سے جگ مگ کرتے ہوئے لمبے کرتے، چھینٹ کی شلواریں، سرخ چھینٹ، سبز چھینٹ، کالی چھینٹ، گورے پنڈے پر گہرے گہرے رنگ، چمکتے ہوئے دھاگوں سے کڑھی ہوئی شیشے جڑی بانکی ٹوپیاں جو سامنے سے ہلال کا سا کٹاؤ رکھتی تھیں۔ بازاروں کا بے تکلّف شور۔ نسلوں کا تنوع ——

وہ بازار میں حیرت سے آئینہ بن جاتی۔

یہ عرب نقوش ہیں، صحرائی لمبی خمیدہ ناک —— کہیں خدوخال سے منگول نسل جھانکتی، زرد رنگ اور نیم وا ترچھی آنکھیں۔ اور

یہ خالص آریائی چہرہ ہے، یونانی بتوں کی ٹھوڑی اور ترشے ہوئے لب۔

یہ لوگ کیسے ہیں ——! یہ سب کیسے ہوں گے۔ جذباتی۔ جوشیلے اور وارفتہ ہو جانے والے۔ جی کھول کر پیار کرنیوالے۔ جو ذرا ذرا سی بات پر کہتے ہیں۔ "میں قربان —— ! خدا کی قسم"۔

گرمیاں گزارنے والے سیاح خوب ہنستے۔ "ارے ان کی عقل تو ٹخنے میں ہوتی ہے"۔

"یہ لوگ وفادار بہت ہوتے ہیں"۔ ابو نے کہا۔ "ہو سکا تو ہم یہاں سے ایک چوکیدار ملازم رکھ لیں گے"۔

پہاڑ کی بارش

تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔

ٹین کی چھت پر بوندوں کا جلترنگ بج رہا تھا۔ فرزانہ کو لگ رہا تھا جیسے یہ پھوار اس کے اپنے بدن پر پڑ رہی ہے۔ وہ تنہا برآمدے میں بیٹھی تھی۔ سرد برفیلی ہوا چلتی تو وہ کانپ کانپ جاتی۔ جسم کے ساتھ اس کے احساس میں بھی ایسی سنسنی پیدا ہو گئی تھی جسے وہ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس سنسناہٹ سے اس کا دل ہوا میں ننھے سے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اندھیرا —— تنہائی۔ بارش کا شور اور سائیں سائیں کرتی ہوئی تیکھی ہوا۔ فرزانہ کے اندر سوئے ہوئے بے نام جذبے نے کروٹ بدلی۔

نیند تو آنکھوں میں دور دور بھی نہ تھی۔ پھر بھی عجیب نشہ سا تھا۔ وہ احساس تھا یا سرور سے لبریز ایک کپکپاہٹ جب دل اپنے آپ کو چھپانا چاہے بھی اور نہ بھی چاہے۔

بارش —— اس کی دشمن! ہمیشہ اسے یونہی ستاتی تھی۔

بارش کی بوندیں اب ننھی ننھی سپید برف کی گولیاں بن گئی تھیں اور آنگن میں جمع ہو رہی تھیں۔ پھر پہاڑ کی بارش جس سرعت سے شروع ہوئی تھی ویسے ہی ختم ہو گئی اور برستے ہوئے بادل نشیب کی طرف جانے لگے۔

ذرا سی دیر میں سڑکیں پھر چلنے لگیں۔

خنکی دھیرے دھیرے فرزانہ کی ہڈیوں میں گھسنے لگی مگر وہ یونہی بیٹھی رہی۔ برفیلی ہواؤں کے ساتھ ایک فقیر کے گانے کی آواز آ رہی تھی، کرخت آواز مگر بے فکر اور لاابالی۔ فرزانہ کو جانے کیا سوجھی۔ وہ بھاگ کر پھاٹک سے جھانکنے لگی:

خدا کے لئے اب تو آؤ محمد
نواسوں کی گردن کٹی جا رہی ہے

آواز نزدیک آ رہی تھی۔

یہ آدمی کون ہے؟ کتنے راستوں پر سے چل کر آیا ہے؟ یہ شاہراہ پر گذرتی ہوئی زندگی کتنی دلفریب ہے! چلتے جاؤ —— نئے گھر، نئی سڑکیں، نئے پھول اور نئے لوگ ملتے ہی رہتے ہیں۔

ہمارا آخر ان سب سے بندھن ہی کیا ہے۔ ہم سب، ہر صورت میں، ہر حال میں، بالکل تنہا ہیں اور اپنی ذات میں واحد —— خواہ مخواہ لوگ مکان بناتے ہیں اور ان میں صوفے اور قالین خرید کر رکھتے ہیں۔ یہ فقیر کتنا بشاش ہے اور اطمینان سے گاتا جا رہا ہے

فقیر گھر کے سامنے آگیا تھا۔ امید سے اس کی رفتار ہلکی ہوگئی۔ فرزانہ کے دل میں آیا بھی کہ اسے پیسے لادے مگر وہ اس خیال کو انسان بننے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اب وہ آگے جارہا تھا۔

گیٹ سے باہر بلکے اندھیرے میں اس فقیر کا حلیہ بھی ٹھیک سے نظر نہ آسکا۔ صرف بھیگی ہوا پہ اس کی بھاری آواز تیر رہی تھی۔

غریبوں کے مولا، ضعیفوں کے والی
امیدوں کی جھولی ہے مدت سے خالی

امیدوں کی جھولی ——!

فرزانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

امید! —— امید! —— ! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، یہ لفظ میری رگ رگ میں گھاؤ بن کر سما گیا ہے۔ میرے اعصاب اس انتظار سے ساز کے تار کی مانند تنے رہتے ہیں۔ کیا مجھے اس سے کبھی نجات نہ ملے گی؟ —— اور آج سارے دن حسین خاں نہیں آیا۔

بریف کیس اٹھائے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوا۔

"بھئی معاف کیجئے گا میں پہلے نہیں آسکا۔ دراصل ......" وہ معذرت کر رہا تھا، اجنبی لہجے میں۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔ اور جب فرزانہ کی طرف دیکھ کر بات کرتا تو اس کی آنکھوں میں محبت کی خستگی آجاتی۔

فرزانہ کو لگا کہ اگر وہ کچھ دیر اور اس کی آواز سنتی رہی تو وہیں بیٹھے بیٹھے سو جائے گی۔

اس کی خاکی قمیض پسینے سے بھیگ رہی تھی۔

کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ اور محبت کی دھیمی آنچ میں سلگتی ہوئی آنکھوں نے فرزانہ سے کہا۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ میں دو راتیں جاگتا رہا، یہاں نہ آنے کی کوشش کرتا رہا اور اب آخر ہار مان کر آگیا ہوں ——

چائے پر سیب کاٹنے کے لئے چھری کو نظرانداز کرتے ہوئے خان نے جیب سے چھ انچ لمبے پھل کا چاقو نکالا۔

کھرر...... سے کھلنے کی آواز سن کر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ چونکے ہوگئے۔ خان کو فوراً احساس ہوا۔ اس نے ذرا بوکھلا کر یونہی توجہ ہٹانے کے لئے اپنی نرالی اردو میں کہا۔ "یہ سیب بڑا لذت والا ہوگا۔"

نستعلیق اہلِ زبان ہر لفظ کے پیش کئے ہوئے مبہم سے خیال کو بھی گرفتار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عجیب جھینپ کا سا ماحول بن گیا۔ ابوجان سر جھکا کر دانت کریدنے لگے۔

خان نے جلدی میں ٹیڑھا سیب کاٹ کر چاقو جیب میں ڈال لیا۔

اور فرزانہ کے دل پر جو ذرا سی برف جمی رہ گئی تھی۔ اب بالکل پگھل گئی۔

وہ دھڑکتا ہوا دل لئے خاموش بیٹھی رہی۔ سب رسمی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد خان نے نظر بھر کر فرزانہ کو دیکھا اور ایک فیصلہ کیا۔

بریف کیس سے ایک تصویر نکال کر اس نے فرزانہ کی طرف بڑھائی ـــــ یہ میری ماں ہے ـــــ اور یہ ـــــ میرا چھوٹا بھائی۔

ایسی اچٹتی ہوئی، پیاسی ملاقاتیں دو چار ہی ہوئیں مگر اِن میں اُن کہے الفاظ کا جادو اور میٹھی خلش تھی۔ ہر روز کی ایک ہی کہانی تھی۔ صبح سے آہٹ پر کان۔ ہر کام سے جی اچٹا اچٹا۔ اس کا آنا۔ وہی دل کی پاگل دھڑکن، وہی اعصابی کھنچاؤ، نظروں کا پیہم تصادم، چھوٹے چھوٹے رسمی جملے جنہیں کہہ کر دونوں دیر تک دل سنبھالتے اور پھر حسین خاں چلا جاتا۔

یہ وقت فرزانہ کے لئے سب سے کٹھن ہوتا۔ سب سے اذیت ناک......

جب خان باہر کے نامعلوم اندھیرے میں قدم رکھتا تو اسے اپنے اندر سے کوئی چیز کھنچتی ہوئی معلوم ہوتی ـــــ مت جاؤ مت جاؤ میں تمہارا قرب چاہتی ہوں ـــــ تم میری نظروں کی حدود سے پرے نہ جاؤ۔

جب تک خان سامنے رہتا فرزانہ کے دل کو چین رہتا اور کوئٹہ کی یخ ہوائیں بھی اس کی آنچ سے خوشگوار ہو جاتیں۔

اور باہر کی دنیا تو فرزانہ کے لئے بالکل انجانی تھی۔ اس ناآشنا شہر میں خان کہاں کہاں جاتا ہے۔ اس کا قرب ـــــ! اس کا قرب ـــــ!

فرزانہ کا دل کھانے پینے کو بھی نہ چاہتا تھا۔ ہر رات کروٹیں بدلتے گذرتی اور صبح سر درد سے پھٹنے لگتا۔ وہ چیزیں رکھ کر بار بار بھولنے لگی تھی۔

ایک رات وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ سب سو چکے تھے اور وہ ہاتھ میں کتاب تھامے چپ چاپ سوچ رہی تھی۔ دیر سے بادل گڑگڑا رہے تھے اور اب چھت پر، کھڑکی کے شیشوں پر بوندوں کی پٹر پٹر شروع ہو گئی تھی۔

سڑک کی مدھم روشنی میں ایک نوخیز لڑکا سفید سویٹر پہنے، ماؤتھ آرگن بجاتا ہوا، دھیمے دھیمے، مزے سے، بھیگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

کمرے میں تنہائی کا خلا تھا ـــــ وہ تنہائی جس میں عمر کے سترہ سال گذارے تھے، فرزانہ کے دل میں ایک درد تھا۔ نہ جانے وہ درد کہاں تھا۔

وہ کتاب پر جگہ جگہ حسین خاں کا نام لکھنے لگی۔

کوٹھڑی میں الٰہ آباد کا سید ولالٹین بجھاتے ہوئے گنگنا رہا تھا:

سنن سنن رات کرے بہیلا پونوا ہو
بھوجی تو بھیا سے کہہ دے کردی لگنوا ہو

آہوئے دشت ہوئم، از ما سوار میدہ

اس نے فرزانہ کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ نازک کامنی سی لڑکی، خان کے آسمان جیسے سینے میں چھپ گئی۔ اتنی بڑی چھاتی میں حسین خاں کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ میں کانچ کی گڑیا تھی جسے وہ بھینچ نہ سکتا تھا اور خود کو روک بھی نہ سکتا تھا۔ دھیرے سے، ایسی احتیاط سے کہ حباب نہ ٹوٹے اس نے فرزانہ کو اپنے سینے سے جدا کیا۔ فرزانہ نے اس کا ہاتھ اپنے چھوٹے

چھوٹے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی موٹی موٹی گوری انگلیوں میں لرزش دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

خان ——— میرے حسین خان ———

اس نے اپنا منہ خان کے ہاتھ میں چھپا لیا۔

میں تمہارے لئے سب کچھ کرنا چاہتی ہوں خان۔ تمہارا نام کتنا اچھا ہے۔ تمہارا نام میں کتنی بار لوں ——— !تم ———

کیا کہنا چاہتی تھی وہ ——— !کیا سچ مچ کچھ کہنے کی ضرورت تھی ——— ؟ وہ خان کو اپنا سارا حسن دکھانا چاہتی تھی۔ اپنی روح کی ——— اپنے دل کی ساری خوبصورتی وہ اس پر نچھاور کر دے گی، کیسے سنائے، کیسے الفاظ ڈھونڈے وہ اپنی لرزتی ہوئی دھڑکنوں کے نغمے کے لئے۔ اس کے دل میں دھیما دھیما سا کھنچاؤ ہو رہا تھا اور ایک بے نام درد اس کے سارے وجود میں بس گیا تھا۔

خان دھیرے سے اس پر جھک گیا۔ اس کا چہرہ کتنا سنجیدہ لگ رہا تھا۔ گال پر زخم کا گہرا نشان۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ خان کا چہرہ اداس ہو رہا ہے۔

وہ اس کے ہونٹ چوم رہا تھا۔ گردن سے شانے تک اور کان کی نرم لو کو اس کے ہونٹ اور سانسیں چھو رہی تھیں۔

کان کی بالی جو ہلی تو موتی بجنے لگے اور ہلکی جھنکار میں خان کی سرگوشی ابھری ——— فرزانہ ——— تم میری ہو ——— میری اپنی ——— گڑیا …… میں تمہارے لئے کپڑے بنواؤں گا، ریشم کے کپڑے اور زیور، سونے کا ہار، اور تمہارے خوبصورت پاؤں کے لئے جوتے لاؤں گا ——— بہت خوبصورت جوتے ———

خان نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔ حیرت سے فرزانہ ہنس پڑی۔ مگر خان کے بے حد حساس ہونٹ دیکھ کر وہ دم بخود سی رہ گئی۔ اور پھر ——— نہ جانے دل کی کون سی گہرائیوں سے اس کی آنکھوں میں آنسو اترنے لگے۔

یہ مرد جس کے بازوؤں میں وہ ننھی چڑیا کی طرح ہے، اس کا اپنا ہے، جو اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے، جو اسے ہیرے موتی ——— خوبصورت پتھر، ہر چیز سے سجا دینا چاہتا ہے۔

اور خان سوچ رہا تھا۔ وہ یہ سب کہتے ہوئے شرماتا تھا۔ اپنے دل کو عریاں کیسے کرتا۔ مگر اس کی ہر دھڑکن اس کے کھلے ہوئے ہونٹ کہہ رہے تھے ——— فرزانہ، تم میری شہزادی ہو۔ دیکھو میں نے عمر کے تپتے ہوئے صحرا میں پتھر کوٹے ہیں۔ انہیں اپنے ہاتھوں کے خون سے سیراب کیا ہے، صرف اس آس پر کہ تمہارے ہاتھ ایک دن میرے ہاتھوں میں آئیں گے۔ میں نے تم کو دیکھا بھی نہ تھا تب سے سنگلاخ پہاڑوں سے دودھ کی نہر کھود رہا تھا۔ صرف تمہارے ہاتھوں کے لئے۔

وہ اپنے محبوب کے بازوؤں میں آرام سے لیٹی تھی۔ کیا اس سے پاکیزہ اور اچھوتی بھی کوئی خوشی ہو سکتی ہے۔

خان نے اسے لپٹا لیا جیسے وہ کبھی اسے اپنے سے جدا نہ کرے گا۔ فرزانہ کا ننھا سا وجود اس کے جسم کا ایک حصہ بن گیا۔

اور وہ جھکا ہوا اس سے کہہ رہا تھا "چلو ——— ملا کے پاس چلیں"۔

میں تمہارے لئے کتابیں لایا ہوں ——— بہت سے رنگین روغنی سرورق اس کے چاروں طرف بکھر گئے۔ نئی کتابوں کی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

"ہمارا گھر ہوگا" خان نے نرمی سے کہا...... اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں
"میرا گھر پہاڑوں پر ہے۔"
فرزانہ بہت ہلکی ہو کر اڑتی ہوئی کہیں دور نکل گئی۔
"میرے پہاڑ پر بہت برف گرتی ہے۔ اب کے سال جب برف پڑے گی تو تم میرے پاس ہوگی۔ ہیں نا؟
"اور وہاں ہماری زمینیں ہیں اور باغ۔ یقین نہ آئے تو احمد خاں سے پوچھ لینا۔ مکان بھی ہیں۔ آغا اور ماں وہیں رہتے ہیں۔"
"میں تمہارے نام اپنی آدھی جائیداد کر دونگا ——"

دور دیس سے لوٹ کر آیا تو خان نے فرزانہ کی تعجب سے پوری کھلی کھلی کھوئی کھوئی آنکھیں دیکھیں اور اس کے گلابی ہونٹ ذرا سے کھلے تھے۔

خان دھیرے سے ہنس پڑا —— "میری جان —— ! اس طرح میری طرف دیکھنے کے لئے تم کو ایک ہزار بوسے!" اس نے انگریزی میں کہا۔

"نہیں نہیں خان —— !" فرزانہ چونک گئی "مجھے تمہارے مکان وکان نہیں چاہییں۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"
"کیوں فرزانہ —— کیوں؟"
خان پریشان ہوگیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔
اس کے لہجے میں مجبوری تھی۔
مجھے تم سے محبت ہے۔

——✱——

وہ نرم بھربھری مٹی پر بیٹھے تھے۔ بارش کی وجہ سے جس پر ننھے ننھے ڈمپل پڑ گئے تھے اور جس میں سے گلاب کی بھینی مہک آتی تھی ہرجائی کا چشمہ قل قل کرتا بہہ رہا تھا۔

اور بھلا دنیا میں مجھے چاہیے بھی کیا! —— حسین خان نے سکون اور خوشی سے سوچا —— فرزانہ سے پہلے دنیا کے رنگ کہاں تھے؟ اب تو چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی تصویر کی طرح حسین ہے۔ تازہ ہریالی جو پھیلتے پھیلتے آسمان سے مل گئی ہے۔ شفاف سمندر کا سا نیلا آسمان اور سپید دودھیا بادلوں کے تیرتے ہوئے بادبان —— چشمے کے پاس گلاب کے پھولوں سے گندھی ہوئی جھاڑیاں ہیں۔ سرخ اور سفید گلاب، بھیگے ہوئے، نکھرے نکھرے، ایک دوسرے کے منہ پر منہ رکھے خاموش تھے۔ ایک پہاڑی خوبرو لڑکا جو میلے اور پھٹے ہوئے کپڑوں میں چاند کی طرح چمک رہا تھا، کھلے ہوئے گلاب توڑ کر گلے میں لٹکی ہوئی ٹوکری میں رکھتا جاتا تھا۔ کچے پتوں پہ بارش کے قطرے اب تک لرز رہے تھے اور ڈھلکتے ہوئے مٹی میں جذب ہوتے جاتے تھے۔

"ادھر دیکھو ——" خان نے لچکیلی ڈال کے سرے سے فرزانہ کے لبوں کو چھوا۔

سامنے پہاڑی مزدور کی جھونپڑی کے باہر بکری کا میمنا سیب کے درخت سے بندھا تھا، میمنا بالکل سفید تھا، صرف اس کی پیشانی پہ سیاہ نشان تھے ننھے ننھے نوکیلے سینگ، ہلال کے ٹکڑے کی طرح خمیدہ تھے اور ایک گل گوتھنا بچہ وہاں کھیل رہا تھا۔

گول مٹول چہرہ، سنہرے بال اور سبز آنکھیں ——— وہ ایک پیارا سا گڈا تھا جیسا شوکیسوں میں سجا رہتا ہے۔ لیکن وہ ننگے پاؤں تھا اور اس نے صرف ایک میلا کرتا پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں سے نیچے تک جھول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آدھا کھایا ہوا سبز سیب تھا جو وہ میمنے کو کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ خوبصورت میمنے کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گیا۔ اور چپکے چپکے مسکرا کر، سنہرا سر ہلا کر، اس سے باتیں کرنے لگا۔

آہستہ سے ——— اتنے آہستہ کہ ان کے چاروں اطراف کھینچی ہوئی تصویر کو جنبش بھی نہ ہو۔ حسین خاں نے فرزانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ دیر تک وہ یونہی بیٹھے رہے۔ وقت کا دریا سست رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ اس کے ایک طرف دنیا تھی اور اس کا شور اور ہنگامہ اور ملی جلی آوازیں ——— دوسری طرف پرسکون خاموشی تھی جس میں وہ ایک دوسرے کی سانسیں بھی سن سکتے تھے۔ زندگی کی تھکن سے چور، ایک دوسرے کی بانہوں میں سستاتے ہوئے، ان کی آنکھیں ایک شیریں غنودگی سے بند ہوتی جا رہی تھیں۔

پھر جب وہ بچہ جھونپڑی کے اندر بھاگ گیا تو خان فرزانہ کو علیحدہ کر کے سیدھا بیٹھ گیا۔

"ہمارے بچے ———"

فرزانہ نے چونک کر خان کی طرف دیکھا۔ کیا یہ اتنے دھیرے سے خان نے کہا تھا؟ کیا یہ سچ مچ خان ہی نے کہا تھا یا صرف فرزانہ کو محسوس ہوا تھا کسی نے ——— بالکل نزدیک سے ——— کہیں بہت قریب سے کہا ہو۔

مگر یہ محض فرزانہ کا خیال نہ تھا۔ یہ بات تو خان نے ہی کہی تھی جو اب اسے شرارت سے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں فرزانہ کے بکھرے بالوں سے اترتی ہوئی اس کے ستھرے پیروں کے انگوٹھوں تک آئیں۔

فرزانہ کے اندر کوئی چیز لرزنے لگی۔

"ہمارے بچے ہوں گے"۔

سانس روک کر فرزانہ نے اسے دیکھا ——— محبت کی ساری خلش! سب چبھن اس کے دل میں کروٹیں لینے لگی ——— خان تم میرا ہاتھ تھام لو ایسا کہتے ہوئے ——— تم مجھ سے الگ کیوں ہو بیٹھے ہو؟ اس کا دل پکار رہا تھا کہ وہ اس بڑھتے ہوئے درد کو دبانے کے لئے خان کے سینے سے لگ جائے، مگر وہ جنبش بھی نہ کر سکی۔

"بتاؤ تو ہم ان کا نام کیا رکھیں گے، ہیں؟"

فرزانہ کے گال تمتمانے لگے۔

"میرے بچے۔ فرزانہ جانتی ہو، وہ صرف میرے وطن کی زبان بولیں گے۔ میں اردو وردو ان کو نہیں سکھاؤں گا۔ پھر ان سے باتیں کر کے تم کو سناؤں گا......"

خان نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس نے جلدی سے ہٹا لیا۔ اگر اس وقت خان نے اسے چھوا تو وہ غبارے کی طرح پھٹ جائیگی۔

"میرا پہلا بیٹا ——— وہ تو شاعر ہوگا، ہیں فرزانہ؟ دوسرا میری طرح کوہ پیما ہوگا یا ہم اسے فوج میں بھیجیں گے۔ تیسرے کو ہم زمینوں پر رکھیں گے۔ آخر انہیں بھی تو کوئی سنبھالے گا۔ اور چوتھے کو ———"

"ارے ارے خان! خدا کے لئے بس کرو۔" فرزانہ کو محسوس ہوا جیسے اس کے پیٹ میں سینکڑوں ننھی ننھی ذرا ذرا سی چیزیں کلبلا رہی ہیں۔ اسے پھریری آگئی اور وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ گئی۔

خان کا بلند قہقہہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بہت نزدیک ـــــ بہت نزدیک ـــــ

چھین جھپٹ کا پرانا ـــــ ازلی کھیل۔ آخر حسین خاں نے منت سے کہا۔ "مجھے اپنا جسم دیکھنے دو نا ـــــ"

"ہائے اللہ! بدتمیز" ـــــ فرزانہ نے سرخ ہو کر کہا ـــــ جیسے لڑکیاں کہا ہی کرتی ہیں۔

وہ اپنے ہاتھ چھڑانے لگی ـــــ حسین خاں نے اس کا دامن پلٹ دیا۔

گوری کھال جو بدن کے جھکاؤ سے شکن آلودہ تھی، آہستہ آہستہ سیدھی ہو گئی ـــــ اس کی کمر پتلی تھی اور جسم پر ننھے ننھے سنہری نامعلوم سے روئیں تھے۔

خان کے مشتاق چہرے پر انجانے خوف اور سوچ کا سایہ آگیا۔ اس نے احتیاط سے فرزانہ کے جسم پر ہاتھ رکھا ـــــ اور پھر چپ چاپ اس کا پیٹ ڈھانپ دیا۔

"اس میں کیا میرا بیٹا ہوگا ـــــ؟"

فرزانہ کا بل کھاتا ہوا بدن ساکت تھا۔ اس کے چہرے سے شرم ڈھل گئی تھی۔ اب وہ اپنے ہونٹ بھی دانتوں سے نہیں کاٹ رہی تھی۔ یہ بات جو خان نے پوچھی ـــــ یہ بات جو اس سوچتے ہوئے مرد نے پوچھی ـــــ وہ اتنی سادہ تھی، اور اتنی گہری، کہ فرزانہ اس کی شکل تکتی رہ گئی۔

وہ اب ایک باپ بننا چاہتا تھا اور بھابی کا بچہ لے کر اس کا منہ چومتا تھا۔ پھر جب وہ فرزانہ کو دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں باپ کی چاہت کا درد ہوتا تھا۔ پھر وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سوچتا۔ اس وقت فرزانہ کا دل دھڑکنے لگتا۔ اس آدمی کا ماضی پراسرار ہے۔ اس کی کھوئی آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ہوگا۔

حسین خاں ہنس پڑا۔ اس کے ہونٹ پرکشش تھے۔ فرزانہ کو بچوں کی طرح ہاتھوں میں پلٹ کر خاں نے اس کی پشت پر زور سے کاٹ لیا۔ اتنے زور سے کہ فرزانہ کی دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔

خان نے اطمینان سے مسکرا کر آدم خوروں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا

"اب کئی دن تک یہ جگہ دکھے گی اور تم کو میری یاد دلائے گی۔"

"نہیں خان۔ میری بات کو مذاق نہ سمجھو۔ مجھے سچ مچ یہ جنجال پسند نہیں۔ بہت دن ہوئے میں نے ایک فقیر کو دیکھا تھا اور میرا دل چاہا تھا کہ میں بھی اس کی طرح سڑکوں پر مانگتی ہوئی چل دوں۔"

خان مسکراتا رہا۔

"یونہی رستوں پر چلتی رہوں۔ ہر راہ کی خوشبو سمیٹتی ہوئی۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں خود پر کوئی ظلم کرنا چاہتی ہوں۔ جب بھوک لگے تو پیٹ

بھر کے کھانا کھاؤں اور اسی مہربان زمین پر سو جاؤں۔ پھر آگے چل دوں۔"

"اور کپڑے؟" خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"کپڑے —— ہم —— کپڑے تو شاید میں چاہتی ہوں۔"

"اور میں؟"

"تم بھی میرے ہم سفر ہو۔"

"اور ہمارے بچے ——؟"

"وہ بھی۔"

"پھر تو گھر بنانا پڑے گا۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی ان کی معصوم روحوں کی طرح ایک دوسرے میں گھل گئی

———— * ————

ہاجرہ فرزانہ کی بہت پیاری سہیلی تھی۔ دراز قد اور لچکیلی۔ وہ سندھ کا مکمل ہونٹ تھی۔ بھرے ہوئے ہونٹ۔ سانولی صورت اور معصوم آنکھیں۔ وہ اپنی خالہ کے گھر منگی ہوئی تھی۔

ایک دن حسین خاں نے فرزانہ کی طرف دیکھ کر اسے مخاطب کیا۔ " ہاجرہ بہن، وہ تمہارا انتظار کرتا ہے، خدا کی قسم! اتنے بڑے شہر میں بالکل اکیلا ہے وہ —— ساری رات بستر پر تمہاری یاد میں کروٹیں بدلتا ہے۔"

فرزانہ خان کا مطلب سمجھ گئی اور اس کی نظر جھک گئی۔ مگر ہاجرہ تو شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ پھر سب نے مل کر کوشش کی مگر وہ بھولی لڑکی کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے بالکل چپ سادھ لی۔

حسین خاں نے جب اسے دیکھا تو کچھ تعجب اور پسندیدگی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ ہنس کر بے اختیار کہہ اٹھا۔ " خدا کی قسم کتنی پیاری لڑکی ہے۔"

کوئی آری سے فرزانہ کے دل کو کاٹ رہا تھا۔

جلن کی بجلی چمکی اور فرزانہ کے سارے وجود کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

اسے خان پر بھروسہ تھا اور ہاجرہ بہت پیاری لڑکی تھی اور خان تو ہر اچھی چیز کو پسند کرتا تھا مگر فرزانہ اس تعریف کی تاب نہ لا سکی۔ اس کا ٹھنڈا دل اور دماغ یونہی رہ گیا۔ پھر کبھی اس نے ہاجرہ کو نہیں بلایا۔ حسین خاں کے ایک جملے نے ہاجرہ کو سات سمندروں کی وسعت سے بھی دور بھیج دیا۔

———— * ————

احمد خاں لمبا چھریرا اور بھوری آنکھوں والا وجیہہ فوجی تھا۔ وہ حسین خاں کا رشتے کا بھائی اور دوست تھا۔ بات بات پر دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے۔ یہ حیران کن تھا کہ احمد خاں حسین خاں سے کتنی محبت کرتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کی بات کو کیسے جانتے تھے۔ احمد فرزانہ کو بہت دلچسپی اور محبت سے دیکھتا تھا۔

جب احمد خاں کو حسین خاں پہلی بار فرزانہ سے ملانے لایا تو حسین خاں جھینپا ہوا کھڑا رہا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراہٹ چھپاتا ہوا، زمین کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

احمد خاں کے باریک لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ بے چین آنکھوں میں تجسس لئے وہ خود ہی اس کی طرف بڑھا۔ "سلام الیکم"۔

خان کی نظریں احتیاط اور امید و بیم سے مضطرب، فرزانہ پر جم گئیں۔

آخر فرزانہ اس کا انتخاب تھی۔

خان کی یہی ہچکچاہٹ تھی جسے دیکھ کر فرزانہ گھبرا گئی۔ کھانے کے وقت دونوں کی نگاہیں سنگینوں کی طرح اس کے پہلو میں چبھ رہی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت بھاگ جاتی مگر اسے یہ بھی تو خیال تھا کہ حسین خاں کو فرزانہ کی کسی بات سے شرمندگی نہ ہو۔ وہ گردن اونچی کئے بیٹھی رہی، لیکن اس کا گلا سوکھنے لگا۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔

اور تب نوالہ توڑتے ہوئے حسین خاں نے دھیرے سے اس کی انگلی دبا دی۔

فرزانہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ "حسین خاں ——— میرے محبوب!!"

خان کے رخ سے سب حجاب ختم ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیسا والہانہ پیار تھا اور اس کے حساس ہونٹوں پر کیسی شگفتہ مسکراہٹ تھی، جیسے وہ پھولوں کو دیکھ کر کہہ اٹھتا تھا۔ "اللہ پاک کی قسم ——— !"

فرزانہ کی انگلی جو ایک لمحہ کو سُن ہو گئی تھی، اب ذرہ ذرہ دل بن کر دھڑک رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے مگر ان آنسوؤں میں تو محبت تھی اور یقین تھا۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ کسی نے بھی توجہ نہ دی لیکن فرزانہ نے جب گردن جھکائی تو اس کے دل میں سکون تھا اور آنکھ میں دلہن کی حیا تھی۔

دونوں فرزانہ کو سامنے بٹھا کر اپنی زبان میں باتیں کرتے جسے فرزانہ نہیں سمجھتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہنس دیتے اور احمد خاں حسین خاں کے کندھے پر ہاتھ مارتا۔ دونوں مرد مسکراتے ہوئے مستقبل کی باتیں کرتے جب وہ فرزانہ کو اپنے وطن لے جائیں گے۔

احمد خاں ایک وفادار دوست تھا۔ اگر کبھی حسین خاں فرزانہ سے ناراض ہو جاتا تو احمد بھی ناراض ہو جاتا۔ ایک دفعہ حسین خاں یونہی روٹھ گیا کیونکہ روٹھ کر وہ خوش ہوتا تھا اور تب وہ فرزانہ کو ایک معصوم پیارا پیارا بچہ لگتا۔

ہونٹ لٹکا کر وہ فرزانہ سے کہنے لگا۔ "تم میری کیوں پروا کرو گی ——— !"

اور گونج کی طرح احمد خاں نے دہرایا۔ "ہاں، تم اس کی کیوں پروا کرو گی"۔

حسین خاں نے تعریفی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ دونوں ناراض ہو کر ساتھ ساتھ مڑے اور واپس جانے لگے۔ فرزانہ نے انہیں پکارا۔ "حسین خاں۔ احمد خاں۔ دیکھو میری بات تو سنتے جاؤ"۔

احمد خاں کی خوبصورت بیوی الماس وطن میں رہتی تھی اور احمد ہر تیسرے روز اسے خط لکھتا تھا۔

———※———

"اب تم کو اپنے لڑکپن کے قصے سنانا چاہتا ہوں۔ جب میری ماں نے مجھے پہلی بار مارا تھا۔ اور جب میں کالج کی ٹیم کا کپتان تھا۔

اور جب میں نے بی اے پاس کیا ـــــ ارے میں تو کمرے میں بند ہو گیا تھا رزلٹ کے دن۔ میری بہن پکارتی رہی۔ "لالہ آجاؤ! تم پاس ہو گئے ہو۔" مجھے یقین ہی نہ آتا تھا"

"پھر تم پاس ہو گئے؟"

خان شرمندگی سے جھجکنے لگا۔ "پاس ـــــ؟ پاس تو ہو گیا پر تھرڈ ڈویژن آئی۔ سیکنڈ میں تھوڑے سے نمبر کم رہ گئے"۔

فرزانہ کا دل چاہا کہ کھل کھلا کر ہنس دے۔ میرا پگلا خان ـــــ! آٹھ نو سال پرانی بات پر اب بھی نادم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ صرف دھیرے سے مسکرا دی۔ کیونکہ وہ خان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔

وہ کتنا سنجیدہ تھا ـــــ! کیا یہ وہی خان ہے جو محض گردن کے اشارے سے دوسروں کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اس وقت وہ کیسے اسکول کے لڑکے کے سے جوش اور اشتیاق سے فرزانہ کا ہاتھ تھامے باتیں کر رہا ہے۔ اس نے اپنا نیا پائپ سلگا کر دانتوں میں دبا لیا۔

فرزانہ نے شوخی سے سر ہلایا۔ "اُفوہ ـــــ! پرسنالٹی!!"

حسین خان فوراً جھینپ گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر نظریں چرالیں اور پائپ کو کھٹکھٹانے لگا۔

اتنے بڑے پورے مرد کو شرماتے دیکھ کر اسے لطف آگیا۔ اس کے اندر ایک قہقہہ جگہ بنانے لگا ـــــ ارے میرے خان۔ تم اپنے اوپر لاکھ چھلکے چڑھاؤ۔ میں ایک دن سب کے اندر پہنچ جاؤں گی۔

تھوڑی دیر بعد خان دوسری طرف منہ پھیر کے خاموشی سے پائپ بجھا کر جیب میں ڈال رہا تھا۔

ذرا سی تمازت سے خان کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلتا۔

"گرمی ـــــ!!! ایمان سے میں گرمی میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔

اسے برف کے ڈھیر پسند تھے۔ سخت سے سخت سردی میں وہ ایک پل اوور پہن کر مطمئن ہو جاتا۔ اسے پہاڑوں سے عشق تھا اور چند برس پہلے وہ ایک بیرونی جماعت کے ساتھ کوہ پیمائی کی مہم پر بھی جا چکا تھا۔ کنچن جنگا کی سفید چوٹیاں اور راستے کے گلیشیر اس کا پسندیدہ موضوع گفتگو تھے۔ وہ کہتا تھا۔ "میں نے پہاڑوں کی پھسلتی ہوئی برف پر راتیں گذاری ہیں۔ اور اتنی بلندی تک ہماری ٹیم پہنچ گئی تھی۔ جہاں ہمارے پاس آکسیجن بھی ختم ہونے لگی تھی۔ وہاں سے زندہ لوٹ کر آنے کے بعد اب میں کبھی جھوٹ نہ بول سکوں گا۔ ہم بغیر آکسیجن کے اتنے فٹ گئے!"

وہ فرزانہ کو کوئی بڑا سا نمبر بتاتا۔ فرزانہ اس کا منہ دیکھ کر آنکھیں جھپکتی ہوئی سوچتی رہ جاتی۔ وہ تصور کرنے کی کوشش کرتی کہ خان کی بتائی ہوئی اونچائی کتنی ہوگی۔ مگر ہمیشہ کراچی میں رہنے والی لڑکی کے لئے یہ تصور بے معنی سا ہوتا۔

"میری جان ـــــ! اب کی بار تم کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ چلو گی؟"

فرزانہ کے بدن میں ہر نئے خوشگوار تجربے سے جوش کی گرمی پیدا ہو جاتی۔ اگر وہ جاتے تو فرزانہ ضرور بڑی خوشی سے چلتی۔ اور وہ تصور کرتی کہ وہ کوہ پیماؤں کا بھاری لباس اور موٹے موٹے جوتے پہنے لڑکھڑاتی ہوئی خان کے ساتھ پہاڑ سر کرنے جا رہی ہے۔ جہاں

چنبیلی کے پھولوں جیسی گوری برف ہے۔

اور برف خان کو اتنی پسند ہے!

جب سیاحت کی بات ہوتی اور فرزانہ بولتی تو وہ غور سے سنتا مگر اپنی رائے کے اظہار میں اس کے چہرے پر سختی ہوتی۔ وہ کچھ یوں فیصلہ کن انداز میں بات کرتا تھا کہ یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی تھی کہ اس آدمی کی رائے بحث سے نہیں، برسوں کے تجربے سے ہی بدل سکتی ہے۔ ایسے میں وہ فرزانہ کو دور سرکتا ہوا معلوم ہوتا اور خان پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی بے انداز تمنا کے باوجود وہ یہ گفتگو زیادہ عرصے تک جاری نہ رکھ پاتی۔

کیونکہ اب تو ہر بات ثانوی تھی۔

پہلے خان تھا۔ اور پھر باقی کی تمام دنیا تھی۔

کتابوں کی بات کرتے ہوئے وہ البتہ کچھ جھجکتا تھا۔ اور فرزانہ کا دل لطف سے جھوم جاتا جب وہ کچھ مرعوب ہو کر، فرزانہ کی گفتگو سنتا۔

خان کی کمزوریوں پر فرزانہ کو پیار آتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ خان کو اپنی باہوں میں چھپا لے اور کہے۔ "میرے خان —— میرے ننھے منے خان!"

اس عجیب جذبے پر وہ خود ہی پریشان ہو جاتی۔ اور ہر لمحہ اپنے دل میں کلیوں کی طرح کھلتی ہوئی نئی نئی خواہشوں کو سمجھ نہ پاتی تھی۔

"میر —— میر اور غالب کیا کہیں گے جو ہمارا خوشحال خان خٹک کہہ گیا ہے۔"

فرزانہ کی اماں چھالیہ کترتے ہوئے سروتے کو جھٹک دیتیں۔ ابا جان سونے سے پہلے عینک صاف کر کے شعراء کا کلام پڑھتے تھے۔ ان کی کتابوں میں غالب دیکھنے کے بعد اماں کو کسی خان شاعر کی تعریف پسند نہ تھی۔

"اچھا ——؟" فرزانہ دلچسپی سے پوچھتی۔ "خوشحال خان خٹک صاحب کا فلسفہ ہے کیا؟"

"وہ کہتا ہے۔" خان ناپسندیدگی سے فرزانہ کی بے آستین کی قمیص کو دیکھتا۔ "وہ کہتا ہے کہ عورت کا اصلی مقام گھر ہے۔"

بھابی چہکتیں۔ "اور مرد کا اصلی مقام کون سا ہے؟"

خان بھابھی اور فرزانہ کی شوخ نظر سمجھ جاتا اور "کوئی بھی نہیں" کہہ کر منہ پھیر لیتا۔

"بتایئے نا! آپ کے خٹک نے مردوں کے لئے کچھ شاعری نہیں کی؟" وہ لوگ اسے جلاتے۔

تنگ آ کر وہ کہتا۔ "مردوں کا کیا ہے۔ "تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"۔"

"یہ تو خیر اقبال کا خیال ہے۔" فرزانہ بڑی کامیابی سے ہنسی چھپا کر کہتی۔ "آپ کے خٹک صاحب کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بھی یہی کہتا ہے اور ہمارے ہاں ہوتا بھی ایسا ہے۔"

"یا اللہ ——— ! گویا عورتیں تو رہیں گھروں میں اور مرد پہاڑوں کی چٹانوں میں۔ کیا سرحد کے علاقے میں یہ لوگ ساتھ رہنا بالکل پسند نہیں کرتے؟"

قہقہوں کے شور میں خان ہار مان کر ہنس دیتا۔ پھر بالکل ڈھیٹ بن کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا۔

مگر اسے یہ بات پسند نہ تھی۔

فرزانہ کی شوخی اور حاضر جوابی پر اس کا دل نثار ہو جاتا تھا۔

"میں کتنا نصیب والا ہوں فرزانہ یا میری محبوبہ خوبصورت ہے اور اس کے ساتھ اتنی شوخ اور خوش ادا بھی"۔

"سچ مچ ——— ؟ اچھا خان ——— خان، تمہارے بازو پر یہ لمبا سا نشان کیسا ہے؟" فرزانہ فکر مند ہو جاتی۔

"یہ ——— ؟" وہ لاپروائی سے بازو پر ابھری ہوئی لمبی سفید لکیر کو دیکھتا۔ "وطن میں ایک دشمن نے چاقو مار دیا تھا"۔

فرزانہ کی روح فنا ہو جاتی۔ "تم لوگ وہاں کیوں رہتے ہو خان؟" وہ تنہائی میں التجا کرتی۔ "وہاں جب ایسا ماحول ہے۔ کسی کی جان کا اعتبار نہیں"۔

اسے گھبراتا دیکھ کر حسین خان ہنس دیتا۔ "ڈرتی ہو ——— ؟ آخر ہمارے گھر میں بھی تو بندوقیں ہیں"۔

فرزانہ چپکے سے لاحول پڑھتی۔

لیکن ——— جب وہ حسین خاں کے مضبوط بازوؤں میں ہوتی تھی اور حسین خان آسودگی کے ساتھ اپنے رخسار سے اس کے بال سہلاتا تو اس کے مضطرب دل کو چین آجاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خان کے گاؤں میں یہ پر خطر زندگی گذارنے کے لئے بالکل آمادہ پاتی۔ اسے حسین خاں پر پورا بھروسہ تھا۔ بلکہ اس لڑکی کے دل میں اس تمدن کے لئے خفیف سی حقارت پیدا ہو جاتی جہاں معمولی سی بات کی بھی پولیس میں رپورٹ کر دی جاتی ہے۔

ایسی بلا خیز تھی ان کی محبت۔ اندھے، پرشور طوفان کی طرح، ہر شے کو اپنے بہاؤ میں سمیٹ لے جانے والی۔

جو باقی بچا وہ ایک نئی فرزانہ تھی جس کا وجود حسین خاں سے الگ نہ تھا۔

———*———

"فرزانہ، ہم کم از کم پندرہ بیس دن تو کاغان میں رہیں گے۔ شادی کے دوسرے دن ہی چلے جائیں گے۔ کیوں؟"

وہ خوشی اور غرور سے فرزانہ کو چھیڑ رہا تھا۔ اور فرزانہ شرما رہی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ خان کے اندر جو پختہ پہاڑوں میں بسنے والا آدمی ہے اسے شرماتی ہوئی لڑکیاں ہی پسند ہیں۔ پھر فرزانہ ایک ہنر مند عورت کی طرح اپنے حصے میں آئے ہوئے آدمی کو کیوں نہ لبھاتی یہی تو اس کی ایک کمزور رگ ہے۔ یہیں تو وہ غلاموں کی طرح بے بس ہو جاتا ہے۔ اور اپنی دانست میں خوش بھی ہوتا ہے کہ میں نے فرزانہ کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ نادان نہیں جانتا کہ ان لمحوں میں وہ اپنا سارا اختیار فرزانہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

"تم کیسا مجھ سے شرماؤ گی ——— ! مگر کہاں جاؤ گی مجھ سے دور ——— ! میں تمہاری چوٹی اپنی چارپائی سے باندھ کر رکھوں گا۔"

———*———

SADLY UPON THE CITIES OF MY YOUTH.

BLOWS THE WIND OF DISENCHANTED HOPES.

MOURNING THE LOSS AND RUINS OF MY TOWNS.

(خان کی ڈائری میں سرخ روشنائی سے لکھی ہوئی نظم ——)

*

"تمہارے ابو جا رہے ہیں" شکستہ اور اداس حسین خاں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کتنا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔!

چلی جاؤ گی فرزانہ ؟

چلی جاؤ گی......؟؟

ہواؤں میں حسین خاں کی آواز بہہ رہی تھی۔ ہر نکیلا پتھر فرزانہ سے پوچھ رہا تھا۔ کوئٹے کے جلے ہوئے پہاڑ سوال بنے فرزانہ کے سینے میں گڑے تھے۔ ایران جانے والی گاڑی بھک بھک کرتی فرزانہ سے پوچھتی گذر جاتی اور کالا دھواں سرد ہوا میں نقش بنا رہ جاتا۔ ریل کی پٹریاں ایک لمبے راستے کی طرف اشارہ کرتیں۔

فرزانہ کے ابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسے دنیا کی باتیں بتائی تھیں جن کا مطلب تھا کہ اب تک وہ صرف ہوائی اور خیالی باتوں کو اہمیت دیتی رہی ہے۔

یہ زندگی کی حقیقت نہیں۔

حسین خاں کے ساتھ زندگی بھر کو بندھ کر اسے کیا مل سکتا تھا ——؟

اس کے گھر کا ماحول دوسری قسم کا تھا۔ اس کی تنخواہ اور نوکری کچھ پرکشش نہ تھے

ایک فیٹ ۶۰۰ تک تو اس کے پاس نہیں تھی۔

اور پھر وہ پہاڑی تھا۔ اجنبی —— بالکل اجنبی —— جس کے جسم پر زخموں کے نشانات تھے اور جو غیر زبان بولتا تھا۔

اگر فرزانہ کہتی ہے کہ اس نے حسین خان کو بے تابی سے پہچان لیا تو یہ جذبات ہیں۔ محض جذبات۔ جو ہم بالکل نہیں سمجھتے۔

مسرت اور حقیقت کی تلاش بڑی اچھی باتیں ہیں۔ بے شک ایسی باتیں مجلسی گفتگو میں شامل رکھو۔ مگر رہو اسی طرح جیسے سب لوگ رہتے ہیں۔ خوشی دراصل تمہارے خون میں رچی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ تو باہر کی چیزوں میں ہوتی ہے۔ شاید کبھی دل میں کلف کی طرح لگی رہتی ہے۔

اور حسین خان کی اداس آنکھیں پتھر کی بن گئی تھیں۔ وہ ایک ایک انچ پتھر کا لگ رہا تھا۔

میری عمر کے بتیس سال ——

یہ بتیس بھاری پتھر ہیں جو میرے سینے پر رکھے ہیں۔ جن کے بوجھ سے میں رک رک کر سانس لیتا ہوں۔ ماضی ایک لق و دق صحرا ہے —— یہاں نم سے پھول کھل سکتے تھے۔

میں دوسروں کے لئے زندہ رہا ہوں۔ جوانی کے بے معنی سال یونہی گذرے ہیں۔ زندگی میں ایک دو لڑکیاں آئیں بھی اور چلی بھی گئیں۔ میری راتیں اکیلی ہی گذرتی ہیں۔ تمہیں دیکھنے سے پہلے اتنی بے تابی بے شک نہ تھی۔

دیکھیں ـــــ زندگی مجھے کیا دینا چاہتی ہے۔

اس کا فیصلہ تو تم کو کرنا ہے۔

پچھلی عمر کو اپنے آپ سے یوں علیحدہ کر دو جیسے دھاگہ توڑ دیتے ہیں۔

کیا تم ایسا کر سکتی ہو ـــــ؟

میرے ساتھ میرے وطن چل کر رہو۔ میرے بچوں کی پرورش کرو۔ تم کو کتابیں پسند ہیں نا ـــــ؟ میں تمہارے گھر میں دنیا بھر کی کتابیں جمع کر دوں گا۔ مگر تم کو میرا کھانا بھی تیار کرنا ہوگا۔ اور میری ماں کے پیر بھی دبانے ہوں گے۔ میں تم کو سر آنکھوں پر رکھوں گا۔ تم کو خوش رکھوں گا۔ جتنی بھی مجھ میں طاقت ہے۔ جس قدر میں کر سکتا ہوں۔

اب تم پر ہر بات چھوڑ دی ہے۔ میں تو ایسے بھی جی لوں گا۔

بس یہ خیال آتا ہے کہ تم مجھ سے ملی نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔

فرزانہ کے دل میں اس وقت صرف ایک خیال تھا۔ صرف ایک ـــــ

کیا حسین خان اتنی آسانی سے مجھے کھو دینے پر آمادہ ہو جائے گا ـــــ اتنی آسانی سے ـــــ!!

وہ ضد اور ارادے سے بڑھی اور خان کے شانوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔

مٹی کا بنا ہوا خان زندہ ہونے لگا۔ فرزانہ کی آنکھوں میں اپنے لئے آرزو دیکھ کر اس کا اشتیاق جاگ گیا۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی اس نے فرزانہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"میں تم کو اٹھا کر لے جاؤں گا" اس نے مضبوطی سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے فرزانہ کی طرف دیکھا۔ "چاہے مجھے جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔"

فرزانہ مسکرا دی۔ خان کے دل میں کیسے کیسے خیالات آتے ہیں۔

اس کے ہاتھ فرزانہ کے شانوں سے نیچے اترنے لگے۔

فرزانہ کو ایک عجیب سا خیال آیا کہ وہ گیلی مچھلی بنتی جا رہی ہے اور ابھی تڑپ سے خان کے ہاتھوں سے پھسل جائیگی۔

مگر خان کے بازوؤں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کے بے تاب ہونٹ فرزانہ کے چہرے پر پھر رہے تھے۔ فرزانہ ادھر ادھر منہ پھیرتی رہی لیکن آخر خان اس کے لبوں کے کنارے چومنے لگا۔

اور پھر ـــــ فرزانہ کا اپنا ہوا لہو پرسکون ہو گیا۔ چکر کھاتی ہوئی چیزیں ساکت ہو گئیں۔ اب وہ دلچسپی سے خان کی گہری گہری سانسیں سن سکتی تھی۔

شرارت سے۔ چالاکی سے۔ فرزانہ نے سر ہٹا لیا۔ خان کا بوسہ ادھورا رہ گیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ غصے سے اس نے دوبارہ فرزانہ کو اپنے نزدیک کھینچ لیا اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں پر پھر ہونٹ رکھ دیئے۔

عورت کے غرور اور مسرت سے فرزانہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ وہ بہت پرسکون تھی۔ خوشی سے اس نے خان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کا دل ایک سرور اور بے فکر ہنسی ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔

"پھر ابا جان نے کہا تھا۔ "تم سب کچھ بھول سکتی ہو بیٹا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔"

روشنی اور اندھیرے کا لمبا تسلسل۔ گھپ اندھیرا۔ دھڑکتی ہوئی سیاہی۔ دھیرے دھیرے سرکتا ہوا اجالا —— اندھیرا —— روشنی ——! اندھیرا ——! روشنی ——! اندھیرا ——!

یہ وہ سرنگیں تھیں جن سے کوئٹہ سے آنے والی گاڑیاں گذرتی ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو چکا ہے۔ حالات کے اس الجھے الجھے تانے بانے کو وہ سلجھا نہ پاتی —— اتنی جلدی۔ اتنی سرعت سے کیا کچھ ختم ہو گیا۔ وہ جیسے صدیوں میں بھی نہیں ہونا تھا!

اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس کی آنکھ میں آنسو آگئے تھے اور اس کے دل میں کوئی امید نہیں تھی۔

مجھے یاد ہے۔ حسین خان! جب تم نے پہلی بار میرا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ لرزش اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے بدن میں تمہارے لمس سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ منجمد ہو گئی ہے۔ جب تمہاری انگلیاں پہلی بار میری گردن پر سرکتی تھیں اور تمہارے ہاتھ کے نیچے میری رگیں دھڑکنے لگی تھیں۔

لیکن شاید مجھے کچھ یاد نہیں —— سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو چکا ہے۔ تمہاری یاد کے سب رنگ یوں آپس میں گھل مل گئے ہیں کہ اب انہیں پہچاننا دشوار ہو گیا۔

اس الجھاوے میں۔ اس دم گھونٹ دینے والے اندھیرے میں کبھی کبھی ایک مدھم سی ٹھنڈی روشنی نظر آجاتی ہے۔ کبھی کبھی رات کو نیند سے چونک جاؤں تو احساس ہوتا ہے —— مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہاری خواہش ہے۔

یونہی غنودگی کے عالم میں چپکے سے تمہارا نام لے کر میں پھر سو جاتی ہوں۔ اللہ۔ تو نے میری آنکھوں کو کتنے آنسو دیئے ہیں۔ لڑکی ہوں ناں —— اس لئے روتی ہوں۔

وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ مگر کیا ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ ایسے جدا ہو جائیں جیسے کبھی ملے ہی نہ تھے؟

یہ تو ناممکن تھا، کیونکہ وجود کے ویران صحرا سے گذرتا ہوا ہر لمحہ اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ شخصیت ماضی کے سوا اور ہے بھی کیا! مستقبل مردہ —— اور اینٹھرل حال لامحسوس —— ! شخصیت صرف ماضی ہے۔

اور پھر فرزانہ نے تو اتنی شدت سے سب محسوس کیا تھا کہ ہر واقعہ اس کے اندر لس گیا تھا اور اس کی نبضوں میں دھڑکتا تھا۔ صبح کو ریڈیو دنیا کی خبریں سناتا۔ پھر وہی ہنگامہ، وہی اعتدال، وہی یکساں زندگی۔ موٹروں کے ہارن۔ بازار سے آتا ہوا شور، پنکھے کی گھوں گھوں۔ آوازوں کے اس ٹکراؤ میں خان کی دھیمی اور پیاری آواز صاف سنائی دیتی۔

"تا سو ملاقات باندے ڈیر خوش حال شوے ام"

آپ سے مل کر بہت خوشی ہوتی!

بہت خوشی ہوئی خان —— تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ....!

اور جب فرزانہ اس کے ساتھ آواز ملا کر دہراتی تھی خان وارفتہ ہو کر کہتا تھا۔ پھر سے کہو —— جب تم میری زبان بولتی ہو تو اس کا میٹھا مزا میرے منہ میں آتا ہے۔ اور وہ اپنے بچوں کے نام رکھتا تھا۔ جو پہلی معصوم سانس لینے سے پہلے ہی گھٹ کر دم توڑ گئے۔ اور اب فرزانہ اپنی کوکھ میں خان کے بیٹوں کی لاشیں اٹھائے پھرتی تھی۔

کراچی تو پھیکا اور کاروباری شہر ہے۔ جہاں ہر جگہ پٹرول اور گیسولین کی بو اڑتی رہتی ہے۔ اندھیرے میں پھسلتے ہوئے وہ دونوں دور نکل گئے اور فرزانہ اندھی ہو کر شہر کی دیواریں ٹٹولتی گھومتی تھی۔

وہ کون سا راستہ ہے جو تم تک پہنچتا ہے ....؟

وہ ریلوے کا نقشہ ہاتھ میں تھام کر گھنٹوں دیکھتی رہتی۔ یہ ریلوے لائن خان کے دیس کو جاتی ہے! اس جگہ ٹرین بدلنی پڑتی ہے۔ اور یہ چھوٹا سا شہر .... یہی تو اسٹیشن ہے جہاں اسے اترنا ہے ....

رنگ برنگے نقشے پر وہ ریلوے لائن کے ٹرمینس سے انگلی پھیرتی۔ گہری، ہلکی اور الجھی ہوئی لکیروں پر اس کی کانپتی ہوئی انگلی اتنی بار گھومی کہ وہ آنکھیں بند کر کے سارے راستے کو چھو کر بتا سکتی تھی۔

اس لکیر کو تو فرزانہ نے ہونٹوں سے، سانسوں سے، زبان سے محسوس کیا تھا۔ پہلے اس کاغذ سے روغن کی خوشبو آتی تھی مگر اب یہ خوشبو اڑ چکی ہے اور آنسوؤں سے نقشے کا رنگ دھیما پڑ رہا ہے۔

بارش تھمی ہوئی تھی۔

ہر چیز دھلی دھلی —— نکھری نکھری —— کمرے سے باہر آسمان پر چھائے ہوئے سرمئی بادلوں کا دھیما اجالا پھیلا تھا۔

خنک ہوا کا جھونکا اسے اپنے چہرے پر بہت بھلا محسوس ہوا۔ اس نے لمبے سانس لے کر بھیگی مٹی کی سوندھی خوشبو اپنے اندر جذب کر لی۔

وہ ننگے پیر، ساکت کھڑی تھی۔ بھیگی ہوئی ٹھنڈی گھاس اس کے تلووں کو سہلا رہی تھی۔ دور تک خاموش سبزہ تھا اور حد نظر تک بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان۔

خدا کا عظیم، بے کراں وقت ہر طرف محیط تھا —— پر سکون —— اور بے آواز ——

"حسین خان ——"

مٹیالے بادلوں نے بڑی خاموشی سے مشرق کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔

ابدیت کا وہ محراب وہاں موجود نہ تھا۔

تھک ہار کر فرزانہ سبزے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے خالی ہو گیا اور چہرے کے نرم نقوش میں سوچ سے کرختگی سی آ گئی۔

حسین خاں ....

کوئی آنسو نہیں —— کوئی آہیں نہیں —— پھر یہ کیا ہے ——!

یہ کچھ نہیں ہے ، صرف تھکن ہے ۔ صرف تھکن ——
میں بہت تھک گئی ہوں ، سرد ہوا میں اسے اپنا جسم گرم سا لگا ۔
"حسین خان ——"
ٹپ ٹپ ٹپ بوندیں پھر پڑنے لگیں ۔
پانی کے پیسے نلکے سے پھسلتے ہوئے قطرے ایک جھالر سی بنا گئے تھے ۔ فرزانہ نے انگلی سے وہ جھلملاتی لرزتی بوندیں صاف کیں اور نلکے کے ٹھنڈے لوہے پر جلتا ہوا رخسار رکھ دیا :

عباس رضوی

اکھاڑا

اقبال سنگھ کو امریکی ساخت کی "دور مار" ملی تو وہ اس نئی "دور مار" کو بہت دیر تک زاویے زاویے سے پرکھتا رہا جس طرح ایک تجربہ کار پہلوان اکھاڑے میں اترتے ہوئے کسی نوعمر پہلوان کو نگاہوں نگاہوں سے تولتا ہے: پٹھا قابو آنے میں کتنے منٹ لے گا؟

اقبال سنگھ ایک تجربہ کار پہلوان اور ایک آزمودہ کار توپچی تھا۔ اس کے تجربہ کار پہلوان ہونے کی علامت تو اس کا گٹھا ہوا جسم تھا اور کان کی وہ لویں جو ٹوٹ کر دہری ہوگئی تھیں اور اس کے آزمودہ کار توپچی ہونے کی شہادت وہ ویر چکر دے رہا تھا جو اقبال سنگھ کے سینے پر تین رنگ کے فیتوں سے ٹنکا ہوا تھا ——— سبز رنگ جو کہ بھارت ورش کے مسلمان شہریوں کا رنگ ہے ——— سفید رنگ جو کہ بھارت ورش کے سکھ شہریوں کا رنگ ہے ——— جوگیا رنگ جو کہ بھارت ورش کے ہندو شہریوں کا رنگ ہے ——— تین رنگوں کی یہ ترتیب! جو کہ بھارت ورش کے سیکولر ازم کا رنگ ہے! اقبال سنگھ کے سینے پر سنہرے ویر چکر کے ساتھ ٹنکی ہوئی اس کے آزمودہ کار توپچی ہونے کی شہادت دے رہی تھی!!!

اقبال سنگھ نے امریکی ساخت کی نئی "دور مار" کے چمکدار سیاہ جسم پر ہاتھ رکھا تو اس کے ذہن میں یکایک ایک کوندا سا لپکا اور اس کی کھیری آنکھوں سے جھانکنے لگا۔

"بجلی!" اس کے بند ہونٹ کپکپا کر کھل اٹھے اور اس کے دانتوں کی موتی جیسی رنگت جھلملانے لگی۔

"بجلی!" اس کے ذہن نے سرگوشی سی کی اور اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر موٹے خط سے لفظ بجلی لکھا اور توپ سے چپکا دیا۔

اقبال سنگھ کو یکایک استاد بجلی یاد آگیا تھا!!! اور بیدیاں یاد آگیا تھا جو اس کی جنم بھومی تھا! بیدیاں کے وہ کھیت یاد آگئے تھے جن کی گنک کا آٹا نہایت اُجلا ہوتا تھا! اور وہ گھر یاد آگیا تھا جس میں چار کمرے تھے۔ ایک برآمدہ اور صحن جس کے کسی کونے میں اسکا نار گڑا تھا!!!

اقبال سنگھ کا جہاں مکان تھا، اس سے تھوڑے فاصلے پر سرکنڈوں کی ایک باڑ تھی۔ اس باڑ کی اوٹ میں وہ اکھاڑہ تھا جہاں استاد بجلی اپنے پٹھوں کو زور کرایا کرتا تھا۔ اقبال سنگھ کو پہلوانی کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ صبح سویرے پلنگ سے اٹھتا اور آنکھیں ملتا ہوا اکھاڑے کی طرف بھاگ نکلتا اور اکھاڑے کے کنارے بیٹھ کر پہروں زور کرتے ہوئے پٹھوں کا نظارہ کرتا رہتا۔

استاد بجلی کے اکھاڑے کے کچھ اصول تھے۔ صبح سویرے جب اس کے پٹھے اکھاڑے پر اکٹھا ہوتے تو سب سے پہلے

اکھاڑے میں گوڈی کی جاتی جس میں استاد بجلی کا ہر پٹھا باری باری حصہ لیتا۔ اس کے بعد اکھاڑے کے چاروں طرف لوبان سلگائی جاتی اور پھر استاد بجلی اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی کو کان سے لگا کر اکھاڑے میں اترتا۔

"سوندھا سنگھ" استاد بجلی سوندھا سنگھ کو آواز دیتا اور سوندھا سنگھ کا پسینہ استاد بجلی کے پسینے سے مل کر اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی میں جذب ہونے لگتا۔

"کریم داد" استاد بجلی کریم داد کو آواز دیتا اور کریم داد کی کروٹیں اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی پر بکھرنے لگتیں۔

"رام مورتی" کریم داد کے بعد استاد بجلی رام مورتی کو للکارتا......

استاد بجلی اگرچہ بڑھاپے کی طرف مائل تھا لیکن اس کی ہڈی اب بھی لوہے کی طرح مضبوط تھی۔ سوندھا سنگھ، کریم داد، رام مورتی...... آدھ ایک گھنٹے میں ڈھیلے پڑ جاتے لیکن وہ اپنے آٹھ پٹھوں کو زور کرانے کے بعد بھی چست نظر آتا۔

استاد بجلی کے باقاعدہ پٹھوں کی تعداد آٹھ تھی لیکن گاؤں کے بہتیرے چھوٹے بڑے لڑکے اکھاڑے میں شوقیہ زور کرتے تھے۔ اور انہیں زور کرانے کا کام سوندھا سنگھ کے سپرد تھا۔ کبھی کبھی استاد بجلی خود چند ایک لڑکوں کو زور کرا دیا کرتا۔ چنانچہ ایک دن استاد بجلی نے موڈ میں آکر اقبال سنگھ کو بھی اکھاڑے میں کھینچ لیا تھا اور اس کے کپڑے اتار ڈالے تھے۔

پھر یہ معمول بن گیا تھا —— ! استاد بجلی کریم داد، سوندھا سنگھ، رام مورتی کو زور کرا چکتا تو اقبال سنگھ اپنے کپڑے اتار دیتا۔

"اوئے بَلّیا! تینوں شرم نئی آندی —— کل توں لنگو پا کے آئیں، ہاں —— سنیا —— !" ایک روز استاد بجلی نے اقبال سنگھ کو دھول جماتے ہوئے للکارا تھا!

اور پھر اقبال سنگھ نے کورے لٹھے کا چھوٹا سا لنگوٹ سلوایا تھا۔ وہ صبح سویرے لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے جاتا اور استاد بجلی کی بھاری بھرکم توند کے نیچے دبا ہوا انڈے کی طرح پہروں پھدکتا رہتا اور اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی اس کے لنگوٹ کے تار تار میں اپنا رنگ بھرتی رہتی۔

استاد بجلی اقبال سنگھ کو اچھی طرح یاد تھا! سات فٹ سے کچھ سوت اوپر نکلتا ہوا قد —— چمکدار سیاہ رنگ —— بڑی سی توند —— اور شرعی داڑھی!

استاد بجلی دنیا میں دو ذاتوں کا احترام کرتا تھا —— اول ذات اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی کی تھی اور دوسری پیر جلال شاہ کی، وہ پیر جلال شاہ جن کے مرید جن تھے اور انس بھی، وہ پیر جلال شاہ کہ شاہ جنات جن کی غلامی کرتا تھا، وہ پیر جلال شاہ جن کا چہرہ بڑا جلالی تھا اور جن کی آنکھیں ہمیشہ کبوتر کے خون کی طرح سرخ رہتیں!!!

کہتے ہیں ایک وقت تھا جب کہ پیر جلال شاہ گمنام زندگی بسر کرتے تھے لیکن بھلا ہو لاہور کے لاٹ صاحب کا کہ وہ مرغابیوں کا شکار کھیلنے نکلے اور راستے میں انہیں وہ ہرن ملا جو لاٹ صاحب کو اپنے پیچھے لگا کر کالے گاؤں تک لایا اور جب لاٹ صاحب نے برٹش ساخت کی دونالی بندوق ہرن کی طرف تانی تو ہرن پیر جلال شاہ کے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔ پیر جلال شاہ نہ جانے کہاں سے موقع پر نمودار ہوئے تھے۔

اس واقعہ کے بعد سے پیر جلال شاہ کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا اور اردگرد کے تمام گاؤں کی اکثریت ان کی مرید ہو گئی تھی۔

استاد بجلی بھی پیر جلال شاہ کا مرید تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتا اور وہ نقش جو اس کے بازوؤں سے بندھا تھا، انگلیوں سے چھو جاتا تو اس کے ہونٹ کھل جاتے تھے اور وہ پیر جلال شاہ کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کرنے لگتا۔ "اے ساڈے پیر دا دتا تحفہ اے" وہ کہتا۔ "اوہ پیر جو جناں دا پیر اے تے انساناں دا پیرا اے ــــ اوہ پیر شاہ جنات جیہیں دی غلامی کردا اے"۔ وہ قصیدہ کہتا۔

لیکن اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی استاد بجلی کے نزدیک کچھ کم محترم نہ تھی۔ اکھاڑے کی یہ مٹی جس میں سوندھا سنگھ کا پسینہ رل رہا تھا ــــ اکھاڑے کی یہ مٹی جس پر کریم داد کی کروٹیں بکھری پڑی ہیں ــــ اکھاڑے کی یہ مٹی جس میں رام مورتی کی سانسیں بسی ہوئی تھیں ــــ یہ مٹی استاد بجلی کے انگ انگ کا جزو تھی۔ استاد بجلی اس مٹی کو جب تک کان سے نہ لگا لیتا، اکھاڑے میں نہیں اترتا تھا۔

اکھاڑے کی یہ مٹی اقبال سنگھ کے لنگوٹ کو اپنے رنگ سے رچ رہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔

لاہور کے لاٹ صاحب لاہور چھوڑ گئے تو ان کی برٹش ساخت کی دو نالی بندوق پیر جلال شاہ نے تھام لی اور استاد بجلی کا اکھاڑا بند ہو گیا۔ اور اکھاڑے کی مٹی جو صبح سویرے کی گوڈی سے بھربھری ہو کر ملائم ہو جاتی تھی خشک ہو کر کسی بیوہ کے لباس کی طرح اجلی پڑ گئی۔

استاد بجلی کبھی اکھاڑے کی اس اجلاہٹ کی طرف دیکھتا تھا تو کبھی پیر جلال شاہ کے اس نقش کی طرف جو اس کے بازو سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک کشمکش جاری تھی ــــ اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی یا پیر جلال شاہ! اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی یا ــــ

اور استاد بجلی نے فیصلہ کر لیا ــــ

پیر جلال شاہ بیدیاں آئے تو استاد بجلی اکھاڑے پر پڑی ہوئی سفید چادر کا کونہ الٹ رہا تھا۔

"بجلی!" پیر جلال شاہ نے استاد بجلی کو للکارا

استاد بجلی نے کدال چھوڑ دی

"تجھ پر جو کچھ واجب تھا، تو نے اب تک ادا نہیں کیا ــــ کیوں؟" پیر جلال شاہ کے ہونٹوں سے پھنکار نکلی۔

استاد بجلی صرف کانپ کر رہ گیا۔

"تجھے معلوم نہیں اس حکم عدولی کی سزا کیا ہے؟" پیر جلال شاہ نے اپنا عصا زمین پر پٹخا۔

استاد بجلی صرف کانپ کر رہ گیا۔

"بول وہ کام کب شروع ہو گا؟" پیر جلال شاہ کی آنکھوں سے خون ٹپکا اور استاد بجلی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو حرکت ہوئی اور چاندی کا وہ نقش جو استاد بجلی کے بازو سے بندھا تھا ٹوٹ کر اس کی چٹکیوں میں جھولنے لگا۔

اکھاڑے نے اپنی سفید چادر اتار پھینکی تو استاد بجلی اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی کان سے لگا کر اکھاڑے میں اترا۔ "رحمان بخش" استاد بجلی نے رحمان بخش کو آواز دی اور رحمان بخش کا پسینہ اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی میں جذب ہونے لگا۔

"غلام احمد"۔ استاد بجلی نے غلام احمد کو پکارا اور غلام احمد کی گردٹیں اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی پر بکھرنے لگیں۔
"اقبال سنگھ"۔ استاد بجلی نے اقبال سنگھ کو اکھاڑے میں کھینچ لیا اور اکھاڑے کی بھربھری ملائم مٹی اقبال سنگھ کے لنگوٹ میں رچنے لگی ——

اقبال سنگھ استاد بجلی کی باتیں یاد کر رہا تھا کہ یکا یک اس پر بجلی گر پڑی ——

چھ ستمبر کو داگہ اٹاری سیکٹر ات کی سیاہیوں میں جب اس طرح ڈوبا جس طرح روشنی کی ایک کرن اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹ کر یکایک ڈوب جاتی ہے تو اقبال سنگھ کو حکم ملا:

"فائر تھرٹی ڈگری"

"ادھر بیدیاں ہے!" اقبال سنگھ کے ذہن نے سرگوشی کی۔

فائر تھرٹی ڈگری" کمانڈر چیخا۔

"ادھر استاد بجلی ہے!" اقبال سنگھ کے ہونٹ لرزے۔

"فائر تھرٹی ڈگری"۔ کمانڈر نے اقبال سنگھ کو جھنجوڑا۔

اقبال سنگھ نے ہلکی سی جھرجھری لیکر اپنا ہاتھ بجلی کی طرف بڑھایا لیکن امریکی ساخت کا سیاہ چمکدار لوہا اس کی ہتھیلی سے چپک کر رہ گیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر چیخا:

"ادھر اکھاڑہ ہے اکھاڑہ"

اور اقبال سنگھ کے سینے پر تین رنگ کے فیتوں کی مدد سے ٹنکا ہوا سنہرا ویر چکر یوں لرزا جیسے وہ زرد پتہ ہے۔ ہوا چلے گی اور یہ پتہ ٹوٹ کر نیچے گر جائے گا۔:

کمال مصطفیٰ

تتلی کی موت

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری رگوں میں گرم خون دوڑتا تھا اور ہم آنے والی جوانی کی امنگیں اپنے سینوں میں دبائے پھرتے تھے۔ ہم ایک بیضوی احاطے میں رہتے تھے جو چاروں طرف نشیب سے گھرا ہوا تھا اور جس کے دو مختلف راستے دو مختلف اطراف میں نکلتے تھے۔ ایک ڈھلان کے ذریعے نچلی گلی میں جاتا اور دوسرا سیڑھیوں کے ذریعے ساتھ والے نچلے بازار میں ___

احاطے کے سات آٹھ گھروں نے ہم تین چار ایک ہی عمر کے لونڈوں کو جنم دیا تھا۔ ہمارا کام بس یہ تھا کہ سارا دن ہم احاطے میں اودھم مچاتے، پتنگ اڑاتے، لنگڑ لڑاتے، ہفتوں گلی ڈنڈا حواس پر سوار رہتا۔ یہی حالت گیند بلے کی تھی اور جب کیلم کاٹے کی باری آتی تو دیواریں اور دروازے چاک کی لکیروں سے بھر جاتے۔ لوگوں کی نظریں پڑتیں، شکایت ہوتی اور مولوی صاحب دندناتے ہوئے آتے اور ہم میں سے جو بھی ان کے ہاتھ آجاتا، اس کا قصور ہوتا یا نہ ہوتا، وہ اس کے کان کھینچ ڈالتے۔ کان کھینچے جانے سے ہمیں اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا مولوی صاحب کے غصّے سے۔ ان کی سفید چھوٹی آنکھوں سے، ان کی پچھے دار داڑھی سے اور ان کے منہ کے جھاگوں سے۔ راتوں کو ہم بڑے نیم کے پیڑ کے سایے تلے یا پاس ہی کنویں کی چہار دیواری کی اوٹ میں کھڑے سرگوشیاں کرتے اور دن کے وقت جب لو چلتی اور بگولے احاطے میں گشت کرتے تو ہم اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے، بالٹی میں بھیگے ہوئے آموں پر پل پڑتے اور ہمارے منہ، ہاتھ اور سینے آم کے رس اور چیپ سے سن جاتے۔ یہ تھیں برسات کی بھیگی راتیں اور گرمیوں کے دن۔

کبھی کبھار ہم آپس میں لڑ بھی پڑتے اور دنوں اور ہفتوں ہمارے درمیان کھٹی رہتی۔ یہ جدائی ہم سے برداشت ہونا مشکل تھی لیکن خود داری آڑے آجاتی۔ نتیجہ یہ کہ خطوط کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس مطلب کے لئے نیم کے تنے کے کھوکھلے "طاق" کو ہم نے اپنا لیٹر بکس بنا رکھا تھا۔ خطوں کے ذریعے اپنی اپنی صفائی پیش کی جاتی، الزامات لگائے جاتے، بہانے بنائے جاتے۔ آخر کار یہ سب کچھ ہماری برداشت سے قطعی باہر ہو جاتا اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی ہمت کرکے اس عارضی دوری کے پردے کو چاک کر ڈالتا اور ہم پھر آپس میں گھل مل جاتے۔

پھر بہار آجاتی اور نیم ہرا بھرا ہو جاتا۔ اس پہ بور آجاتا اور جب ہوا چلتی تو سارا احاطہ نیم کے چھوٹے چھوٹے پھولوں سے بھر جاتا۔ ان دنوں باہر کی دلچسپیاں احاطے کی دلچسپیوں سے بڑھ جاتیں اور ہم احاطے سے باہر نکل آتے۔ دوسرے محلّوں میں جاتے۔ کھیلتے، لڑتے اور دوستی بڑھاتے۔

ایک سال ایسا بھی آیا جب محال کی مکھیاں نیم کے درخت پر آ کر رہنے لگیں اور انہوں نے نیم پر اپنا ڈیرہ جمایا۔ اس سال نیم کے سایے تلے ہماری سرگوشیاں بند ہو گئیں اور ہم اس کے سایے سے ڈرنے لگے۔

پھر یوں ہوا کہ ہم دن کو بھی سایوں سے ڈرنے لگے۔ اب احاطے میں راتوں کو جلسے ہوتے اور دن کو ہم سبز جھنڈا لہرائے باہر سڑکوں پر پھرا کرتے۔ اب ہولی آتی تو ہمیں اس کے شوخ رنگوں سے ڈر لگتا اور بھاگ کر ہم گھروں میں چھپ جاتے۔ دیوالی آتی تو ہمیں چراغوں سے خون ٹپکتا نظر آتا۔ دسہرہ آتا تو علی الصبح پکھاوج کی آواز نقارۂ جنگ لگتی اور کبھی کبھار آس پاس کہیں شادی ہوتی، نوبت بجتی اور ہم پر اداسی چھا جاتی۔ اب نہ وہ سہانی راتیں تھیں اور نہ وہ پر کیف دن۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ دھرتی ہمارے لئے بیگانہ ہو گئی۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہماری موجودگی دیواروں اور کوٹھوں، اینٹ اور پتھروں کو بھی گراں گذرتی ہو اور ہمیں اپنے مستقبل کی خبر نہ رہی۔ کیا کریں، کہاں جائیں۔ بہت جلد ہی ہمارے تنے ہوئے سینے جھک گئے۔ وہ گلے جو بلند نعروں سے آسمان سر پہ اٹھا لیتے تھے، خاموش ہو گئے۔ اور ایک مستقل خوف دھیرے دھیرے ہماری ہڈیوں میں سرایت کر گیا۔ احاطے کے بزرگوں نے جو شاید ہم سے بھی ڈرپوک واقع ہوئے تھے، اپنے سر جوڑے اور فیصلہ یہ کیا کہ کسی بیرونی خطرے کے وقت ہم اس احاطے کو قلعہ بند کر دیں گے اور دشمن کو ——— وہی پڑوسی جو پہلے اپنے تھے، اجنبی، بیگانے اور پھر دشمن بن گئے تھے ——— پسپا کرنے کے لئے ہتھیاروں کا استعمال کریں گے۔ لیکن بندوق تو کسی کے پاس بھی تھی نہیں اس لئے طے یہ پایا کہ غلیلوں اور پکی ہوئی چکنی مٹی کی گولیوں کا استعمال ہوگا۔ چنانچہ نیم کے درخت کی شاخوں کو کاٹ کر غلیلیں بنائی گئیں، ہر مرد اور بچے کو ان سے مسلح کر دیا گیا اور غلیل کے استعمال میں ہم نے مہارت حاصل کرنی شروع کر دی۔

ساری دھرتی پر نفرت اور دشمنی کی آگ تیزی سے پھیلتی گئی اور بالآخر ہمارے چھوٹے سے پرامن شہر کے گرد بھی منڈلانے لگی۔ انہی دنوں کالی ندی سے تین لاشیں برآمد ہوئیں، وہی کالے پانی کی ندی جو بچپن سے ہم میں خوف پیدا کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ تین چار مرگھٹ اس کے کنارے واقع تھے جن کے نزدیک جاتے ہوئے ہم ڈرتے تھے۔ البتہ سال میں ایک بار ضرور ہم ان کے پاس سے ڈرتے ہوئے گذر جاتے تھے۔ مرگھٹوں کے ساتھ تین طرف سے گھنے پیڑوں سے گھرا ہوا ایک میدان تھا جہاں دن کو بھی اندھیرا رہتا۔ ہر سال جب دلی والے پتنگوں کے پیچ لڑانے ہمارے شہر آتے تو یہ دھندا اسی میدان میں ہوتا۔ اور تب ہم بھی اپنے یاروں کے ساتھ کالی ندی کے کنارے ڈور لوٹنے چلے جاتے، وہ ڈور جو ٹوٹتی کم تھی اور ہاتھوں کو زیادہ زخمی کرتی تھی۔

غرض ہم اس دن کے انتظار میں تھے جب یہ ہنگامہ یہ خونی ہولی جو ہمارے پرامن شہر کے چاروں طرف کھیلی جا رہی تھی ہمارے شہر کی، امن اور شانتی کی چہار دیواری کو توڑ کر ہمارے شہر میں داخل ہو گی۔ اس ایک دن کے خیال سے ہم سہم جاتے اور ہماری ماؤں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ ہم اس دن کے لئے تیار تھے، جسمانی طور پر یا صرف ذہنی طور پر، ہمیں نہیں معلوم، البتہ جینے کی خواہش ایک چنگاری تھی جو ہم اپنے سینوں میں چھپائے پھرتے تھے، وہ خواہش جو اندھیری، انجانی، غیر مانوس موت کے ڈر سے پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر وہ دن آیا۔ دن نہیں تھا، رات تھی۔ ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ چاروں طرف سے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں، کبھی نزدیک سے اور کبھی دور سے، نعروں کی کپکپاتی آوازیں جن سے ایک عجیب خوف اور گھبراہٹ ظاہر تھی۔ ہم سب نے اپنے ہتھیار پکڑے، گھبرائے گھبرائے احاطے میں جمع ہو گئے اور ہم نے بھی غیر ارادی طور پر نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ کسی نے کہا 'حملہ ہو گیا' اور ہماری ٹانگیں

شل ہوگئیں۔ عورتوں نے نفل پڑھنے شروع کر دیئے، مرد دعائیں مانگ رہے تھے اور بچے رونے لگے۔ یہ ہنگامہ کوئی ایک گھنٹہ تک جاری رہا اور پھر یہ طوفان بتدریج کم ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں بدل گیا۔ یہ طوفان کیوں شروع ہوا، ہمیں نہیں معلوم۔ بعد میں ہم نے سنا کہ یہ ایک منہار کے نعرے کا نتیجہ تھا جو اس نے رات کے ایک بجے، اپنے مکان کی چھت پر سے، کالی ندی کے کنارے، لوگوں کے ایک جم غفیر کو، جو چمکتے ہوئے بلم اور بھالے لئے خاموش اور ساکت کھڑے تھے، دیکھ کر گھبراہٹ میں لگا دیا تھا۔

اگلے روز صبح کو شہر کے کچھ مشہور لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے ایک خیالی خطرے کا بہانہ بنا کر اپنے شہر کی پرامن، میٹھی نیند کو اپنے زہریلے نعروں سے توڑا تھا۔

اس واقعہ کے گذر جانے سے ہمیں کچھ اطمینان سا ہوگیا تھا اگرچہ خطرہ اب بھی باقی تھا۔ دن اس طرح گذرتے گئے۔ پھر ایک دن دور مغرب میں ایک نئی دھرتی وجود میں آگئی، جو اپنی سی تھی۔ پناہ گزین جانے لگے اور شرنارتھی آنے لگے۔ ایک شرنارتھی گھرانا زہر میں بجھا، انتقام کے جذبے سے سرشار، جرأت اور ہمت کے ساتھ احاطے میں مغرب کی سمت سے داخل ہوا اور احاطے کے ایک خالی مکان پر خاموشی سے آکر قابض ہوگیا۔ اسی دن احاطے میں ایک خاموش انقلاب آگیا اور اس کی چہار دیواری بے معنی ہو کر رہ گئی۔ ہم نے بادلِ ناخواستہ اس حقیقت کو تسلیم کیا اور اپنے نئے پڑوسیوں کو خوش آمدید کہا۔ لیکن ہمارے پڑوسیوں کو ہماری عادتیں، ہمارا رہن سہن پسند نہ آیا۔ انہوں نے علیحدگی اختیار کی اور دور رہنا پسند کیا۔ ان کی دوری میں حاکمیت کا انداز تھا۔ اب کنوئیں پر سے پہلے وہ پانی بھرتے تھے اور پھر ہم۔ ہم ان کے برتنوں کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے کھینچے ہوئے ناپاک پانی کے قطروں سے پلید کرنے کی جرأت کیسے کر سکتے تھے! ان کے گھر میں ہمارا داخلہ بند تھا۔ ہم ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے اور ہر وقت ڈرتے رہتے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس کو وہ اپنے نظام حیات میں مداخلت سمجھ بیٹھیں اور پھر معلوم کیا ہو جائے۔ اب فضا میں وہ سکون نہ تھا۔

ہمارے نئے پڑوسیوں کا ایک لڑکا بھی تھا جو عمر میں ہم جتنا ہی تھا۔ کچھ دن تو وہ یونہی خونخوار فاتح کی طرح اکیلا اکڑتا پھرتا رہا، حالانکہ دل میں اس کو یہ معلوم تھا کہ وہ فاتح نہیں، اپنا دیس چھوڑ کر آیا ہے، ہارا ہوا ہے، پناہ گزین ہے، بیگانہ ہے، لیکن دل کو بہلانے کے لئے اپنے آپ کو حاکم سمجھتا رہا، ہم سے بالاتر اور بہتر۔ پھر آخر اس نے ہم پر ترس کھایا اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ہم نے خوشی سے اس کی دوستی قبول کی اور نہ صرف قبول کی بلکہ باقاعدہ عجز اور انکسار کے ساتھ اس کو خوش کرنے کی کوشش کی، اگرچہ دل میں ہم جانتے تھے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ محض ایک اوپری دکھاوا ہے اور ہمارے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

نہ معلوم کیوں شروع ہی سے اس نے مجھ پر نظرِ کرم کی، مجھ سے دوستی بڑھانے کی کوشش کی اور میں، مرتا کیا نہ کرتا، اس کی دوستی کو کیونکر ٹھکرا سکتا تھا۔ اب تو دھرتی بیگانہ ہوگئی تھی، مکان و زماں سب بیگانہ ہوگئے تھے۔ ہر طرف سے کھٹکا رہتا، ہر آہٹ پر دل دھڑکتا۔ اس کی نظرِ عنایت کے باوجود مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ میں اس کی آنکھوں سے آنکھ ملا لیتا۔ میں اس کی قربت سے گھبراتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کب مزاج بگڑ جائے اور یہ دوستی ٹوٹ جائے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ مجھ سے زیادہ تندرست تھا۔ اس کے باوجود اس کی مسکراہٹ سے میں مطمئن سا ہو جاتا اور اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ میں وہمی ہوں، احساسِ کمتری کا مارا ہوا ہوں، ایسی بھی کیا بات ہے، انسانیت تو اب بھی باقی ہے، انسانی رشتے ابھی ختم نہیں ہوتے ہیں —— لیکن یہ صرف دل کا بہلاوا ہی تھا، علاج نہ تھا۔

پھر یکایک جس طرح یہ دوستی بڑھی تھی اسی طرح ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی۔ اس کا سہرا چھوٹے چھوٹے ناخوشگوار واقعات کے سر تھا جو انسانی رشتوں کو بگاڑتے رہتے ہیں۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں گھر کے صحن میں گیند سے کھیل رہا تھا کہ اتفاق سے وہ اچھل کر ہمارے نئے پڑوسیوں کے گھر جا گری۔ میں نے فوراً باہر جا کر اُن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکل کر آیا تو ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ اس نے گیند دینے سے انکار کر دیا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ہماری دوستی کی سرد خلیج پر گویا مہر ثبت ہو گئی۔

اس سے اگلا روز تھا شاید۔ میں نیم کے درخت پر پتھر پھینک کر اپنی اٹکی ہوئی پتنگ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پاس سے گذرا اور ایک پتھر کہیں اتفاق سے اس کے بھی آن لگا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو میں ہنس رہا تھا۔

اور تب اس نے کہا۔ "جس روز بھی فساد ہوا تو میں سب سے پہلے تیرے پیٹ میں چھری گھونپوں گا۔" میں خوف کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح مجھ پر چڑھ دوڑا۔ کہتے ہیں کہ جب بلی لاچار ہو جاتی ہے تو شیر کی بھی آنکھیں نکال لاتی ہے۔ میرے ہاتھ جو پہلے صرف مدافعت میں اٹھے، ایکدم جاندار ہو گئے اور میرا سینہ تن گیا ——— وہ سینہ جو پہلے تنا ہوا تھا اور پھر عرصہ ہوا ہمارے بڑوں کی حوصلہ شکنی سے جھک گیا تھا ——— گالم گلوچ ہوتی رہی، کئے بازی ہوتی رہی، گریبان پھٹے، لاتیں چلیں۔ میری آنکھ کالی پڑ گئی اور پھر مجھ کو واقعی غصہ آ گیا اور ایک بھرپور وار میں اس کی ناک خون خون ہو گئی اور پہلی بار میں نے اس کو روتے دیکھا۔ وہ اپنی ناک کو ہاتھوں سے دبائے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ جس روز بھی فساد ہوا تم سے نمٹ لوں گا۔

وہ جا چکا تھا لیکن میں وہیں کھڑا تھا۔ اچانک مجھے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا ——— اور میں نے اس ایک لمحے میں تہیہ کیا کہ مجھے ہر صورت میں زندہ رہنا ہے اور صرف زندہ ہی نہیں رہنا ہے بلکہ زندگی پر حاوی ہونا ہے۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے سہمے ہوئے چہرے نظر آئے۔ وہ دور کھڑے تھے۔ شاید اس لئے کہ میرے ہاتھ میں اب بھی ایک پتھر تھا۔

فرخندہ لودھی

آدھی رات

"اماں اماں!" وہ بچوں کی طرح بلبلا کر روتی تھی گویا چھوٹی سی بچی ہے اور اماں نے اُس سے آج اچانک دودھ تڑوالیا ہے۔ کہیں چھپ گئی ہیں مبادا وہ پھر دودھ کے لیے ضد کرنے لگے۔ اماں کس قدر ظالم ہو گئی تھیں۔

آدھی رات کے وقت جب اُس کی آنکھ کھلی تو ٹھنڈی چاندنی صحن میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے گھر کے لوگ یوں مدہوش سوئے تھے جیسے وہ سب مردے ہوں اور یہ صحن ایک چھوٹا سا لاش گھر۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ لاشوں میں گھری ہوئی پڑی ہے۔ یہ زندہ لاشیں، یہ مردہ لوگ، جو اپنے لئے زندہ رہنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک لمحہ آکر ان کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ پھر یہ سچ مچ مر جاتے ہیں —— کس کام کے ہیں یہ لوگ، اُس نے زیرِ لب اپنے آپ سے کہا۔

وہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُس کے نیچے، برسات زدہ چارپائی چرچرائی تو بھیّا اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بولے۔ "ریما جاگ رہی ہو ریما"

"نہیں تو بھیّا ——" ریما نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز بنا کر کہا۔ حالانکہ اُسے نیند آتی ہی کب تھی۔ اُس نے کئی راتیں جاگ جاگ کر کاٹ دی تھیں کبھی کبھی ادھ سوئی جیسی غنودگی کی جھپکی آتی تو وہ مرغی کی طرح آنکھیں میچ کر بدن کی کسلمندی کو دور کر لیتی۔ پورے چاند کی روشنی میں ویسے ہی جنون سا ہونے لگتا ہے۔ پھر خاموش فضا میں ایک پرندہ بے طرح ٹرائیں ٹرائیں کرتا پھرتا تھا۔ شاید اُسے بھی چاندنی سے وحشت ہو رہی تھی —— وہ کیوں نہ کمرے میں جا کر لیٹ جائے، اُس نے سوچا اور فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر روشنی آنکھ کے پردوں کو پھاڑے دیتی ہے۔ نیند کیسے آئے؟ —— وہ اندر چلی گئی اور پلنگ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

"ریما ——" بھیّا بھی اندر آ گئے تھے۔

"تم سوئی کیوں نہیں؟ آدھی رات ہو چکی ہے" —— بھیّا نے جماہی توڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھیّا! آدھی رات کو آنکھ کھلے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے"۔۔

کمرے میں قدرے حبس تھا۔ ریما نے اُٹھ کر بجلی جلائی اور پنکھا کھول دیا۔ بھیّا آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ اُن کے چہرے پر بے خوابی اور اضمحلال تھا —— بال الجھے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ انھوں نے خاموشی سے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور پنکھے کی گردش کو گھورتے ہوئے بولے۔ "تم ٹھیک کہتی ہو ریما! آدھی رات کے وقت آنکھ کھلے تو پریشانی ہوتی ہے۔ مگر سوچو ہم کوئی دودھ پیتے بچے تو نہیں ——"

"بھیّا! پیٹ کا انتظام ہو جاتا ہے۔ یہ خلا پُر بھی ہو سکتا ہے مگر جذبات کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ احساس کا گلا گھونٹنا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ سوچو پودے کی ایک ہی شاخ ہوا میں لہرا رہی ہے۔ اُس کو کاٹ دیں تو اُس میں سے کئی شاخیں پھوٹ پڑیں گی، پھر یہی شاخ مضبوط تنا بن جائے گی اور جو تنا ہی ٹوٹ جائے تو —— اماں ہمارے بچپن میں فوت ہو جائیں —— اور پھر وہ چپکے سے مر گئیں بغیر بتائے —— بھیّا سوچو نا"

"ریما! میری اچھی بہن" بھیّا اُٹھ کر اُس کے پاس آئے اور اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے جس پر چاندی کے تار بکھرنے لگے تھے۔ ریما کے بالوں کی ساخت آدھی کالی، آدھی سفید ہو رہی تھی جیسے رات کے اندھیرے سے نور کا تڑکا جھانکے اور رات بوڑھی ہونے

گئے۔ بھیا کے دل میں پدرانہ شفقت اچانک امنڈ آئی تھی۔ "ریما، تم اس قدر گھبرا کیوں گئی ہو۔ ہمیں تو ابھی چلنا ہے تم نے یہ کیسے جان لیا کہ کسی مسافر کے چھوٹ جانے سے زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ گرتے پڑتے، مرتے پھرتے، ہمیں اپنی منزل تک جانا ہے ہمیں ابھی جینا ہے۔"

"بھیا۔ تم زندہ ہو؟" بھیا کی باتوں نے ریما کے اندر سلگتی ہوئی شکوؤں کی آگ کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ غصے کے مارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن بھیا اُس کی طرف نہایت ملائم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ریما نے ایسا سوال کیا تھا جس سے بھیا کو اُس کے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا تھا۔

جدائی کا غم کس عمر میں زیادہ بے حال کرتا ہے، انہوں نے سوچا۔ ریما کے متعلق انھوں نے آج تک کچھ نہ سوچا تھا۔ ریما اس گھر میں رہتے بستے یوں اُدھی رہ جائے گی، انھیں یہ خیال کبھی نہ گزرا۔ شب و روز یونہی گزرتے رہیں گے۔ اماں زندہ رہیں گی۔ ابھی تو وہ اتنی جوان ہیں اور اُن میں اتنی جان ہے کہ ہم بھی اُن سے مات کھا جائیں۔ ریما اُن کے ساتھ سائے کی طرح رہتی۔ اماں کو اس کی فکر ہوگی تو ہوگی۔ ہمیں کیا؟ اماں نے بھی کبھی کوئی ذکر نہیں چھیڑا تھا۔

"ریما! میں تمہیں پہاڑ پر بھیج دوں گا تمہارا دل بہل جائے گا۔ ہوں؟" بھیا نے دلاسا دیا۔ "میں سمجھتا تھا تم سنبھل جاؤ گی۔ مگر جانتی ہو اماں کو مرے ہوئے کتنے دن گزر چکے ہیں ——— بیس دن ——— اور تم، میں کیا کہوں تمہیں، اماں نے تمہاری شادی کیوں نہ کر دی۔ انھوں نے اچھا تو نہیں کیا۔ تم لوگ محبت محبت میں زندگی کے راستے کھو بیٹھتے ہو، اماں تمہاری عاشق تھیں اور بس ——"

"بھیا! آج تم مجھ سے تنگ آ گئے ہو" اُس نے اونچی آواز سے کہا اور رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔

بھابھی آنکھیں ملتی ہوئی باہر سے اُٹھ کر کمرے میں آ گئیں "تم لوگوں کو اس وقت لڑنے کا خیال آیا۔ نیند حرام کر دی۔"

"تم جا کر سو رہو، ریما کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" بھیا نے اپنی بیوی سے کہا۔ اور اُس نے اپنا فربہ جسم کرسی میں گرا دیا۔ بھابھی واپس جانے کے موڈ میں نہ تھی۔ اُس کے ساتھ جاگنے والا، اُس کے دُکھ اور سکھ کا ساتھی اب بہن کے غم میں گڑھ رہا تھا۔ پل بھر کو حسد کی لہر اُس کے قلب و جگر میں دوڑی اور ختم ہو گئی۔ چھوٹی عمر کی بیوی، ماں اور بھابھی نے بہت سنجیدہ بن کر کہا: "اماں مر گئیں۔ کوئی ہم سب تو نہیں مر گئے۔"

"آپ سب زندہ ہی کب تھے" ریما نے تڑپ کر جواب دیا۔ بھابھی کی اس بات پر اسے انتہائی غصہ آیا۔ بھابھی کے کلیجے میں لوکا سا لگ گیا۔ وہ بے تاب تھی کیا کہے کہ اس بات کا بدلہ ابھی چکا جائے۔

"ہوں —— میں سب جانتی ہوں تجھے جو نسا دُکھ ہے۔ پر میں کیا کروں۔ تیرا بھائی اندھا ہے۔ تیرے گھر کے سارے اندھے ہیں اور سب سے بڑی اندھی وہ جو تجھے ہمارے لیے چھوڑ گئی" بھابھی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بہت کچھ کہہ دے۔ سب کچھ سنا دے۔ مگر ریما کنواری بیٹھک تھی، عمر میں تو بڑی تھی۔

پھر اس عمر میں ریما کی کرختگی ویسے ہی حد سے بڑھنے لگی تھی۔ وہ کب کسی کو خاطر میں لاتی۔ اسی وجہ سے گھر کے لوگ اُس سے لاپروا ہو گئے۔ سب نے اپنے اپنے راستے لیے اور سفر پر چل نکلے۔ الگ کر رہ گئی تو ریما۔ کسی نے اُس کو ساتھ نہیں لیا۔ وہ لیتے بھی کیوں۔ اُس نے خود اماں کو کافی سمجھا۔ ساتھی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کس کی مجال تھی کہ زندگی کی گاڑی میں ریما کو کسی دوسرے کے ساتھ کھڑا کر کے جوڑ دے

پھر جب کنوار پنے کی راتیں لمبی ہونے لگیں اور دن کے وقت جان ٹوٹی ٹوٹی اور بے کار بیکار رہنے لگی تو ایسا زمانہ آتے ہی اماں چپکے سے یہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔

کمرے میں تین نفوس کے باوجود مکمل سکوت تھا۔ پنکھے کی گونج میں سانسوں کی آواز دب گئی تھی۔ بھیا سر جھکائے پلنگ پر بیٹھے اپنا دایاں پاؤں مسلسل ہلائے جاتے تھے۔ جانے وہ کیا سوچ رہے۔ بھابھی کی انگارہ سی آنکھیں ہٹ ہٹ کبھی ریما اور کبھی اپنے خاوند کی طرف اٹھتی تھیں۔ اُن میں کچی نیند اور شدید غصہ کا خمار تھا۔ وہ بے تحاشا دوپٹے کے پلو سے ہوا کئے جاتی تھی حالانکہ چھت پر پنکھا پوری رفتار سے چل

رہا تھا۔ بھابھی سوچ نہ رہی تھی، اُبل رہی تھی۔ اپنے شوہر کے لئے اُس کے دل میں دھندلی سی نفرت تھی اور نند ـــــ اُس کا کچھ بس نہیں چلتا تھا۔

بھیا نے پھر ایک بار کہا "تم جاؤ ـــــ" انھوں نے بیوی کی جانب اس اطمینان سے دیکھا گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اور بھابی صرف اُن کے حکم کی منتظر بیٹھی ہے۔ ریما اپنے دوپٹے کے ساتھ اُلجھ رہی تھی۔ اُس نے بھیا کی نگاہوں کے اعتماد کو دیکھا اور اُس نرمی کو محسوس کیا جو ایک شوہر اپنی محبوب بیوی کے لیے روا رکھتا ہے۔ جواباً بھابی ٹھٹکی۔ تو اُسے بھابی اور بھیا سے بے وجہ گھِن سی آئی۔

"تم لوگوں کو میری فکر کیوں ہونے لگی ہے۔ جاؤ سو رہو ـــــ آماں کے مرجانے کا غم کچھ مجھے ہی ہوگا۔ راتوں کی بے چینی بڑھی تو میری ـــــ تم لوگ جاؤ۔"

بھابھی اٹھی اور غصّے سے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے بھیّا کو ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ انھوں نے نظریں جھکالیں۔ ان نگاہوں میں تنبیہ تھی اور سرزنش اور ملامت، سب کچھ تھا۔ وُہ اتنا کچھ ایک ہی بار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پر ریما کو یہ نگاہ قتل کر گئی۔ کمزور مگر شوخ حریف نے جیسے اُسے آن کی آن میں چت کر دیا ہو، اور اس کے دل نے شکست کھائی ہو۔ اس شکست کا اعتراف کس قدر مشکل تھا۔ جانے یہ شکست تھی کہ ہوا کا رُخ بدل گیا تھا۔

ریما کو اماں اچھے سے اچھا پہناتی۔ اُس کے پاس کیا نہیں تھا۔ قیمتی زیور، بڑھیا کپڑا، روپیہ پیسہ اور اس کے علاوہ گھر کی سرداری سب کچھ اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ مگر اب وُہ خیال کرتی کہ ان سب پر اُس نے ناجائز قبضہ جما رکھا ہے۔ اس برتری اور اہمیت کی اُسے ہوس تھی نہ حرص۔ اس کے باوجود ایک سودا تھا جو نہ معلوم کب اُس کے اندر پیدا ہوا اور جب ظاہر ہوا "تو پھر جاگ اٹھا۔ سب اُس سے دور ہٹنے لگے اُس نے یوں محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے لوگ اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ کون ہے جو اُس سے پیار کرے۔ کوئی تو ہو۔ جس کو وہ خوب ڈانٹے پیٹے، پھر پیار کرے اور پھر فخر سے دیکھے۔ جیسے مصوّر اپنی تخلیق کو دیکھتا ہے۔ مگر وُہ یہ سب کچھ کیسے کر سکتی ہے۔ لوگوں سے وہ کٹ کے رہ گئی ہے۔ یہ گھروندے اور نگار خانے وہ اکیلی تو نہیں سجا سکتی ـــــ کوئی تو ہو جو مدد کرے ـــــ جو اُسے تصویروں میں رنگ بھرتے دیکھ دیکھ کر مسکرائے اور اُس کا حوصلہ بڑھاتا جائے ـــــ جب وہ منہمک ہو کر گھروندے بنا اور سجا رہی ہو۔ کوئی چپکے سے آکر اُس کے کاندھے پکڑے اور پوچھے ـــــ یہ سب تم کیسے کر لیتی ہو ـــــ پھر وہ چونک جائے ـــــ ریما سوچتے سوچتے سچ مچ چونک جاتی۔ اُس کا جی چاہتا۔ بھابی کے "گول گپّو" بچے کے بھولے گالوں کو انگلیوں اور ہاتھوں سے اس قدر چھوئے اور محسوس کرے کہ اُس کی چیخیں نکل جائیں۔ مگر ان بچوں کا بھی کچھ ایسا بے ڈھب پیچ تھا کہ اُس کے ساتھ ہمیشہ عیاری کرتے۔ پیار لینے چلے آتے اور جو اُس کا تربیت کرنے کو جی چاہتا تو یہ جا وُہ جا ـــــ اپنی اماں کی جھڑکیاں چٹکیں کھانے کے باوجود گود میں گھسے رہتے ـــــ "کمینے ـــــ"

"کون ـــــ؟" بھیا نے چونک کر پوچھا۔ ریما بھول گئی تھی وہ کہاں بیٹھی ہے۔ وُہ اکیلی نہیں بھیا بھی اُس کے پاس بیٹھے ہیں۔ پر اُسے تاؤ کچھ اس بہاؤ سے آرہا تھا کہ بند نہ لگتے تھے "تم، تمھاری بیوی، تمھارے بچے اور تمھارے سب ـــــ"

"ریما! ریما! تم کیا کہہ رہی ہو، سوچو تو، یہ کونسا وقت ہے" بھیا کی آواز بلند اور مرتعش تھی

بھابھی باہر پلنگ پر بیٹھی چلائی "اس پہر دونوں کے دماغ چل گئے ہیں۔ کیا کہیں گے سننے والے"

ریما دھاڑیں مار کر رونے لگی تھی اور بھیّا چوری چوری کہہ رہے تھے "چپ ـــــ ریما ـــــ چپ، آدھی رات ہے ـــــ چپ"

منصور قیصر

نئی نسل

میں جس اخبار میں کام کرتا تھا اس کا دفتر ایک بہت بڑی بلڈنگ کی تیسری منزل پر تھا۔ وہ عمارت کیا تھی پوری ایک بستی معلوم ہوتی تھی۔ سب سے نچلی منزل جو ایک بارونق بازار کا حصہ تھی، مختلف قسم کے کاروباری لوگوں کا مرکز بنی ہوتی تھی۔ ایک ٹین ساز کی دوکان سے لے کر ایک ڈاکٹر کی ڈسپنسری تک وہاں سب کچھ موجود تھا۔ بڑے دروازے کے قریب ممدو کا چائے خانہ تھا جو تینوں منزلوں کے مکینوں کو چائے سپلائی کرتا تھا۔ اس کے ساتھ پیر بخش پان والے کی دوکان تھی جہاں ہمارے چپڑاسی بابو کے کہنے کے مطابق "رنڈی باز پان" ملتا تھا۔ بڑے دروازے کے اندر بہت بڑا احاطہ تھا اور اس کے اندر بھی دوکانیں تھیں جو سب کی سب موٹروں اور ٹرکوں کے ٹائر درست کرنے والوں نے سنبھال رکھی تھیں۔ اسی احاطے میں ایک نلکا بھی تھا جہاں ٹائروں کی دوکانوں میں کام کرنے والے چھوکرے سارا سارا دن نہاتے رہتے، دوسری منزل کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر گانے گاتے رہتے اور اپنی بھری بھری، سیاہ، بھوری اور اسنڑے سے منڈی ہوئی نیلی رانیں اور سینے کے بال دکھاتے رہتے۔

بلڈنگ کی دوسری منزل پر امپورٹ ایکسپورٹ کے چند دفاتر تھے جن کے سامنے بھاری بھاری پردے پڑے رہتے اور اندر کھسر پھسر ہوتی رہتی۔ ایک فلم کمپنی کا دفتر تھا جہاں کچھ دنوں تک تو ہارمونیم اور طبلے بجتے رہے۔ اور کچھ لڑکیاں آتی جاتی رہیں لیکن جب سے ممدو چائے والے کا بل ستر روپے پچاس پیسے تک جا پہنچا تھا اس دفتر کے دروازے کسی نے پھر کھلتے نہیں دیکھے۔ اسی منزل میں بہت سے خاندان بھی رہتے تھے۔ تیسری منزل پر صرف ہمارے اخبار کا دفتر تھا ورنہ باقی فلیٹ سب بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے خاندانوں سے اٹے ہوئے تھے۔

دفتر میں میرا کمرہ بالکل الگ تھلگ اور باہر کی طرف تھا۔ اس کے ساتھ کے فلیٹ میں ایک احسان صاحب رہا کرتے تھے جو ۱۹۴۷ء میں کلکتے سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ وہ کینوس کا کاروبار کرتے تھے اور اپنے کام کے سلسلے میں عموماً شہر سے باہر رہتے تھے۔ اُن کے گھر کے کتنے افراد تھے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا البتہ ایک آٹھ نو سال کی لڑکی اور ایک بوڑھا نوکر ضرور دیکھنے میں آئے تھے۔ ہمارے چپڑاسی بابو کا کہنا تھا کہ احسان صاحب کی ایک جوان لڑکی بھی ہے جس نے کسی نہ کسی طرح میٹرک تو کر لیا ہے لیکن اسے کالج میں اس لئے داخل نہ کیا گیا کہ احسان صاحب اور بیگم صاحبہ کالج کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔ سو وہ اب یا تو گھر میں چارپائیاں توڑا کرتی ہے یا ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ اسے دیکھا کسی نے نہیں تھا مگر عام خیال تھا کہ قبول صورت تھی۔ یہ قیاس آرائی اس دلیل پر کی گئی کہ احسان صاحب خود گورے چٹے اور تیکھے نقوش کے مالک تھے، اور چھوٹی بیٹی جس کا نام تو نہ جانے کیا تھا پر اسے سب نیلی نیلی کہا کرتے تھے۔ صاف ستھرے رنگ کی لڑکی تھی اور اس کی آنکھیں غلافی تھیں۔

احسان صاحب کی بیوی کو کلکتے سے آئے چھ سال ہوئے تھے لیکن اس کا دل ابھی تک کلکتے میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جب تک کلکتے کے بارے میں روزانہ کوئی خبر نہ سن لیتی اسے کسی کل چین نہیں آتا تھا۔ ایک دن نیلی کھٹاک سے دروازہ کھول کر میرے کمرے میں آگئی۔ مگر اندر آنے کے بعد وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

میں نے کہا۔ "آؤ نیلی کیسے آنا ہوا؟"

کچھ دیر تو وہ چپ رہی جیسے حلق خشک ہو گیا ہو۔ پھر اس نے ننھے بچوں کی طرح لفظ ناپتے ہوئے کہا۔ "امی کہتی ہیں آپ کے پاس کلکتے کا کوئی اخبار نہیں آتا؟"

"کیوں نہیں آتا ——— لیکن ضرورت کیا پڑ گئی؟"

"انہوں نے مانگا ہے" یہ جملہ اس نے اس مشکل سے کہا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور بابو سے کہہ کر نیوز روم سے ہندوستانی اخبارات کا فائل منگوایا اور کلکتے کا ایک اخبار نکال کر اسے دیدیا۔

وہ اخبار لے گئی مگر ایک منٹ بعد واپس آکر کہنے لگی۔ "امی کہتی ہیں شکریہ۔"

بابو نے بتایا کہ مجھ سے پہلے جو صاحب یہاں کام کرتے تھے ان سے بھی اسی طرح کلکتے کے اخبار منگوائے جاتے تھے اور یہ اخبار نیلی کی باجی پڑھتی تھی۔

اب نیلی کا معمول ہو گیا کہ وہ ہر دوپہر کو آتی اور اخبار لے جاتی۔ وہ گاہے گاہے آکر وقت بھی پوچھا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہتی۔ "باجی گھڑی کو چابی دینا بھول گئی ہیں۔ کیا وقت ہوا ہے؟"

وقت اور جوانی میں بھی عجیب رشتہ ہے۔ جوانی وقت کو بھول جاتی ہے اور وقت جوانی کو بھول جاتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے وقت بتایا مگر ساتھ ہی کہہ دیا۔ "باجی سے کہنا۔ بھولنے کی عادت اچھی نہیں۔" پھر میں نے یہ جملہ بار بار دہرایا۔ پھر ایک دن نیلی آئی اور کہنے لگی۔ "باجی کہتی ہیں کہ میں تو یہی بھول جاتی ہوں کہ میں نے صبح کیا کھایا تھا۔"

بہت معمولی بات تھی مگر میں بیحد محظوظ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد نیلی پھر آئی اور بولی۔ "باجی کہتی ہیں۔ "آپ کھانا کھائیں گے؟ ہم نے آج پسندے پکائے ہیں۔"

میں نے تکلفاً انکار کر دیا۔

اس کے بعد نیلی کا معمول ہو گیا کہ وہ روزانہ تین چار بار دفتر میں ضرور آتی۔ کبھی اخبار لے جاتی، کبھی باجی کا سلام کہہ جاتی۔ اس کی باقاعدہ آمد سے میرے بعض ساتھیوں نے بھی کھسر پھسر شروع کر دی۔ سب کہتے۔ "اب سمجھ میں آیا کہ آج کل اس کا کالم اتنا رومانٹک کیوں ہوتا ہے۔"

میرے یہ تعلقات ہمسائیگی قاضی کو تو ایک آنکھ نہ بھائے۔ سب ایڈیٹر قاضی جسے ہم سب گھگھو کہا کرتے تھے اپنا سارا کباڑ خانہ اٹھا کر میرے کمرے میں آن دھمکا اور یہ کہہ کر وہیں چپک گیا کہ "یہ کمرہ قدرے ٹھنڈا ہے اور یہاں ٹیلی پرنٹروں کا شور نہیں آتا۔"

قاضی گھگھو عورت کے معاملے میں بڑا ریشہ خطمی واقع ہوا ہے۔ وہ اگر ڈویژنل انجن کی درآمد پر بھی شذرہ لکھ رہا ہو تو اس میں عورت کا ذکر کسی نہ کسی بہانے ضرور لے آئے گا۔ میرے کمرے میں میز جمانے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ میز کے دراز کو ٹافیوں اور بسکٹوں سے

ڈبوں سے بھر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ "یار ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے پھر تم بھی تو سادہ چائے نہیں پیتے"۔

جونہی نیلی اخبار لینے یا وقت پوچھنے آتی، قاضی گھگھو اپنے کدو جیسے موٹے سر کو میز کی دراز میں گھسیڑ کر ٹافیاں نکالتا اور نیلی کو تھما کر اپنی میلی بتیسی کو عریاں کر دیتا۔ میں نے اسے بارہا ٹوکا کہ یہ حرکت اچھی نہیں لیکن وہ ہر بار پنجابی کا ایک ہی سوال پوچھتا۔ "تُوں ماما لگنا ایں؟"

ایک دن نیلی اخبار لینے آئی تو ابھی تک ڈاک نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا۔ "بے بی بیٹھ جاؤ ابھی ڈاک آتی ہے تو تمہیں اخبار دیتا ہوں"۔ قاضی نے کہا۔ "ہاں ہاں ابھی دوسرے کمرے سے ڈاک آ رہی ہے"۔ اور اس نے دھان پان سی نیلی کو بازوؤں سے اٹھا کر اپنے میز کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔ اور بسکٹوں کا پیکٹ کھولتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "تمہاری باجی کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی ہیں"۔

"سنا ہے وہ بال بھی کٹواتی ہیں"۔ قاضی نے کہا۔

"نہیں تو۔ ان کے تو بڑے لمبے لمبے بال ہیں"۔

"پھر تو بہت اچھا ہے"۔ دراصل قاضی لڑکیوں کے بالوں کے بارے میں بڑا رجعت پسند واقع ہوا تھا اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے اپنے سر پر بال بہت کم تھے۔ بالوں کے بعد اس نے نیلی کی باجی کے پاؤں کے ناخنوں کے رنگ تک کی تفصیل دریافت کر لی اور بغیر دیکھے اس پر جان دینے لگا۔ اس نے اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی بڑی کوشش کی کہ نیلی کی باجی کی شکل دیکھی جائے مگر ناکام رہے۔

غالباً شب برات کا موقع تھا۔ نیلی ایک پلیٹ میں حلوہ لائی اور میری میز پر رکھ کر کہنے لگی۔ "باجی نے آپ کے لئے بھیجا ہے"۔ قاضی نے کدو جیسا سر آگے بڑھا کر کہا۔ "اور میرے لئے؟"

"جھنجھنا"۔ میں نے جملہ پورا کر دیا۔ اور حلوہ کھانے لگا۔ قاضی نے بڑے پیچ و تاب کھائے۔ اسے نیلی یا اس کی باجی کی اس حرکت کا بہت صدمہ ہوا۔ اور دل کی بھڑاس اس نے ایک شذرہ لکھ کر نکالی جس میں شب برات اور عید کے موقع پر حلوے پکانے کی مذمت کی اور لکھا کہ اس طرح چینی اور سوجی کا ضیاع ہوتا ہے اور یہ قومی مفاد کے سراسر منافی ہے۔

انہیں دنوں اسمبلی کی رپورٹنگ کے لئے قاضی کی ڈیوٹی لگ گئی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ تین ہفتے کے لئے اس مستقل دردِ سر سے نجات مل گئی۔ اب نیلی آتی تو میں اس سے جی بھر کر باتیں کرتا۔ ایک دفعہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بیٹھو، میں تمہاری قسمت دیکھوں"۔ وہ میرے پاس بیٹھنے کی بجائے ہاتھ جھٹک کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کا رنگ یک لخت زرد پڑ گیا اور ہونٹ بھینگ گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس نے بہت برا مانا ہے اور جیسے ان کے گھر میں ہاتھ دیکھنا کوئی بدعت تصور کیا جاتا ہو۔

میں نے کہا۔ "چلو ہاتھ نہیں دیکھتے، آؤ تمہیں تصویریں دکھائیں"۔ اور میں نے شیلف میں رکھے ہوئے کئی غیر ملکی رسائل اس کے سامنے بکھیر دیئے۔ وہ بڑی معصومیت سے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی اور میں اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ان تصویروں پر زیادہ دیر تک نظریں جمائے رکھتی ہے جو ساحلوں پر پک نک منانے والی نیم عریاں عورتوں اور مردوں کی ہیں۔ اس نے ایک رسالے کا ورق الٹا اور پھر فوراً بند کر دیا۔ پھر رسالے کو میز سے اٹھا کر نیچے کرسی کی طرف سے گئی۔ کچھ دیر

بعد اس نے کہا۔ "میں یہ رسالے لے جاؤں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کمرے سے بھاگ گئی۔

دوسرے روز اس نے کلکتے کے اخبار کے ساتھ رسالوں کا بھی مطالبہ کیا اور کہا۔ "باجی نے منگوائے ہیں۔"

میں نے ڈھیر سے پرچے اٹھا کر دے دیئے اور کہا۔ "باجی سے کہنا اور چاہییں تو اور بھیج دوں گا۔" اور وہ اچھا کہہ کر کمرے سے کھسک گئی۔

پتہ نہیں اس روز کیا بات تھی۔ میں بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ دوسری منزل کی سیڑھیوں میں نیلی سے ٹکرا گیا۔ وہ کتابیں اٹھائے سکول جا رہی تھی۔ اس ٹکر سے کتابیں سیڑھیوں پر بکھر گئیں اور وہ گرتے گرتے بچی۔

"اوہو" میرے منہ سے نکلا اور میں کتابیں اٹھانے لگا۔ اچانک میری نظر ایک کاپی پر پڑی۔ وہ البم تھا ان تصویروں کا جو میرے دیئے ہوئے رسالوں میں سے کاٹی گئی تھیں۔ کتابیں اسے دے کر میں البم کو سرسری نظر سے دیکھنے لگا۔ اسے یا تو میری یہ حرکت بری لگی یا پھر وہ گھبرا گئی۔ وہ کانوں تک سرخ ہو گئی اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتابیں سنبھالتے ہوئے سیڑھیوں کی دیوار سے لگ کر سمٹ گئی میں نے البم واپس کر دیا۔

مجھے یہ واقعہ شاید بھول جاتا لیکن اس کے بعد نیلی نے میرے ہاں آنا چھوڑ دیا۔ اس کے نہ آنے سے مجھے تشویش ہوئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی آمدورفت اور اس سے گفتگو روزمرہ کے معمول کا ایک حصہ ہے۔ اس کی غیر حاضری سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری کوئی چیز کھو گئی ہے۔ میں اپنے آپ پر ہر وقت ملامت کرتا کہ کیوں میں نے اس کا البم دیکھا۔ میں نے تین چار بار بابو کو بھیج کر اس کا پوچھا بھی لیکن ہر بار یہی جواب ملا کہ خالہ کے ہاں گئی ہوئی ہے۔

ابھی قاضی کی اسمبلی رپورٹنگ ختم نہیں ہوئی تھی اور میں اس کی ڈیوٹی دینے کے لئے فلیٹ کی گیلری میں بیٹھ کر شذرات لکھا کرتا تھا۔ اکتوبر کی چمکیلی صبح کو میں گیلری میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ نیلی اپنے فلیٹ سے باہر نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اندر بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن میں نے اچک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اس وقت بھی وہی تھا جو میں نے تصویروں کا البم کھولتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "نیلی میں نے تمہارے لئے بہت سے رسالے جمع کر رکھے ہیں۔ تم آئی نہیں۔" وہ چپ رہی۔ میں نے گھگھو کی میز کا تالا توڑ کر اس میں سے چاکلیٹ نکالے اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنی بڑی بہن کے نام پر رسالے کیوں مانگے تھے؟ میں تمہیں بھی تو دے سکتا تھا۔"

میرے اس جملے پر وہ رونے لگی جیسے اسے یہ بات کھا گئی ہو۔ وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ "میری بڑی بہن تو کوئی ہے نہیں۔"

"پھر یہ باجی کون ہے؟"

"باجی تو میں اپنی امی کو کہتی ہوں۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے آنسوؤں اور اس کی معصومیت سے میرا جی بھر آیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ گود کھیلتی بچی ہو اور دودھ کے لئے بلکنے لگی ہو۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور باپ کی طرح اس کا منہ چومنے لگا۔ اس نے جھٹک کر اپنے آپ کو چھڑایا۔ آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور یہ کہہ کر بھاگ گئی۔ "ہائے اللہ! کوئی دیکھ لے گا۔"

ترجمہ: ہارون جمال

ماں اور بیٹی

میں اس شہر کے اسی محلّے میں پچھلے بارہ سال سے رہتا ہوں۔ میں اب جس مکان میں رہتا ہوں وہ اس مکان سے بڑا ہے جس میں میں پہلے رہتا تھا۔ آج کل ایک جوان لڑکی میرے گھر کی صفائی کا کام کرتی ہے۔ اس کی ماں میرا اگلا مکان صاف کیا کرتی تھی۔ وہ اس وقت جوان تھی، یا کم از کم ایسی تھی، جیسی کہ اس قسم کی عورتیں ہو سکتی ہیں۔

کسی عورت سے محض معمولی سا تعارف مجھے ناگوار گزرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یا تو اس سے میری گہری جان پہچان ہو یا پھر وہ بالکل اجنبی ہو۔ وہ عورت بصارت پہ بار نہ ہوتی تھی۔ وہ جن کے ہاں کام کرتی تھی ان کی اترن پہنتی تھی۔ اس کے کانوں میں بالیاں ہوتی تھیں اور اپنی برادری کے مردوں سے پردہ کرتی تھی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس سے کلام کروں، مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شروعات کس طرح کی جائے۔ مجھے حجاب سا محسوس ہوتا تھا!

ایک روز میں اپنے مکان سے باہر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ میری بیوی گھر پہ نہ تھی۔ وہ عورت آئی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کام ختم کرنے کے بعد وہ کھانا لینے کے لئے باورچی خانے میں گئی مگر ملازم موجود نہ تھا وہ واپس آ کر مجھ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ پھر گویا دیوار سے مخاطب ہوئی۔

"معلوم نہیں، ملازم کہاں چلا گیا؟"

"کیا تمہیں اس سے کچھ لینا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کھانا چاہیئے صاحب"۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو، میں تمہیں دیتا ہوں"۔ میں نے کہا اور باورچی خانہ کی جانب چل پڑا۔

میں نے اسے دو چپاتیاں دیں، جو ملازم نے اس کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔

"اس کے ساتھ کھانے کے لئے؟ ——"

وہ وہاں سے جانے کے لئے بیقرار معلوم نہ ہوتی تھی۔

میں نے یہاں وہاں ڈھونڈا مگر کچھ نہ ملا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، اس لئے وضاحت ضروری نہ تھی۔

"اچھا، مجھے تھوڑا سا گڑ دے دیجئے"۔ وہ بولی۔

میں نے گڑ کا بڑا ٹکڑا اسے دے دیا۔

وہ بطور شکریہ مسکرائی اور اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

چند دنوں کے بعد میری بیوی پھر کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ عورت یہ جانتی تھی مگر اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔

"بی بی کہاں ہیں صاحب؟" اس نے خوشی سے مغلوب آواز میں پوچھا۔

"وہ باہر گئی ہیں۔" میں نے اسے ہری جھنڈی دکھادی ——!

وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی گویا ابھی چلی جائے گی۔

تم انہیں کیا کہنا چاہتی تھیں؟ ——" میں نے جلدی سے پوچھا جیسے وہ سچ مچ چلی گئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا ——!

"میں ان سے کچھ پیسہ ادھار لینا چاہتی تھی، صاحب! ہمارا آٹا آج ختم ہو گیا ہے۔"

"تمہیں کتنا پیسہ چاہیے؟"

دو روپیہ، صاحب۔" وہ بولی۔

میں نے دو روپیہ کے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے وہ لے لئے۔

"اچھا صاحب۔ میں یہ پیسہ آپ کو لوٹا دوں گی۔ اس بارے میں بی بی جی سے کچھ نہ کہیئے گا!" وہ بولی۔ شاید وہ یہ سمجھتی تھی کہ میرے لئے دو روپیہ صرف کرنا بڑی بات ہے۔ اسے کیا معلوم کہ ان دو روپوں کی میری نگاہ میں کتنی قدر ہے۔

مگر یہ روپیہ اتنا قابلِ قدر ثابت نہ ہوا جتنی کہ مجھے امید تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس طرح سے اس کی زندگی میں داخل نہ ہو سکا جس طرح میں چاہتا تھا۔ اسے اپنے جسم کی اتنی پرواہ نہ تھی اور میرے لئے اس کے جسم میں کوئی کشش نہ تھی۔ مگر مجھے وہ اپنے ذہن کی دنیا میں داخل نہ ہونے دیتی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر وہ مجھ سے اکثر و بیشتر چند آنے اگلوانے کو اپنی کامیابی تصور کرتی تھی۔

"صاحب، آج مجھے ایک روپیہ دیجئے، مجھے دکاندار کے پیسے چکانے ہیں۔"

"میرے پاس روپیہ نہیں ہے ——"

"اچھا مجھے اپنی بچی کے لئے بسکٹ کے لئے ایک آنہ دیجئے۔"

"میرے پاس ایک آنہ بھی نہیں۔"

اس کی بیٹی پانچ یا چھ سال کی تھی، جسے وہ کبھی کبھار اپنے ساتھ لاتی تھی۔

پھر وہ اپنے شیر خوار بچے کو ساتھ لانے لگی۔ وہ بڑی سرد صبحیں تھیں۔ وہ سر پر ٹوکری اور پہلو میں بچہ لئے گھر میں آتی پھر بچے کو ایک کپڑے پر زمین پر ڈال دیتی اور خود کام کرنے میں لگ جاتی۔ بچہ ہوا میں لاتیں اچھالتا اور بلند آواز میں چیخیں مارتا۔ اور وہ اپنے کام میں لگی رہتی۔

یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے۔



اب میں دوسرے گھر میں رہتا ہوں، جو بڑا ہے اور زیادہ اچھا ہے۔ حقیقت میں، میں اب دولتمند ہو گیا ہوں۔ اور

میں اکیلا دولتمند نہیں ہوا۔ بھٹے کے مالکوں میں سے میرے تمام ساتھی دولتمند ہو گئے ہیں۔ کوئلہ کا پرمٹ حاصل کر لینا خوش نصیبی ہے سیمنٹ اب مہنگی ہو گئی ہے حالانکہ اب بھی یہ پہلے والے داموں ملتی ہے۔ اور پھر بھٹے کے مالکان ہی کیا سب لوگوں کے پاس روپیہ بڑھ گیا ہے۔ اب میرے گھر میں لکڑی کی الماری کی جگہ اسٹیل کی الماریاں ہیں اور روئی سے بھرے گدیلوں اور تکیوں کی جگہ میرے ہاں اب فوم ربر کے تکیے اور گدیلے ہیں۔ ہر باتھ روم میں گرم پانی بہتا ہے۔ اب جب میں کسی دکان میں داخل ہوتا ہوں تو بہترین اور قیمتی چیز طلب کرتا ہوں۔ اب میں معمولی چیز استعمال نہیں کرتا۔

میرا بڑا امکان اس کی بیٹی صاف کرتی ہے، جو میرے پہلے مکان کی صفائی کرتی تھی۔ جب وہ بچہ تھی تو اپنی ماں کے ساتھ میرے گھر آیا کرتی تھی۔ تب وہ چھوٹی تھی۔ اب جوانی نے اسے یکسر بدل ڈالا ہے۔ وہ میری اور شاید اس کی اپنی برادری کے لوگوں کی توقعات سے بڑھ گئی ہے۔ وہ باتیں کرنے کی بڑی شوقین ہے۔ اس سے بات چیت شروع کرنا ایسا مشکل نہیں۔ مگر تھوڑے عرصے تک ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

ایک دن جب میری بیوی کہیں گئی ہوئی تھی، میں نے اسے اپنی جانب آتے دیکھا۔ میں گھر میں گیا اور مٹھائی کا ایک پیکٹ لایا۔ وہ میں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا۔ "یہ لو، یہ مٹھائیاں ہیں ——!"

اس نے کچھ زیادہ تعجب ظاہر کئے بغیر پوچھا۔ "یہ کس لئے؟"

میں نے ذرا بھی گھبرائے بغیر کہا۔ "یہ تمہارے لئے ہیں۔"

اس نے مجھ پر ایک سوالیہ نگاہ ڈالی۔ میں نے اسے صرف دیکھا اور گویا وہ سمجھ گئی۔ وہ اپنے ساتھ سب روشنیاں بھی لیتی گئی۔ میں نے اس سے پہلے اسے اس طرح نہ دیکھا تھا۔

اس وقت اس کا زیادہ پیچھا کرنا اچھا نہ تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اخبار پڑھنے لگا۔ اپنا کام پورا کرنے کے بعد وہ میرے نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔

اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "بی بی جی کہاں ہیں، صاحب؟"

"وہ باہر گئی ہیں۔ تم انہیں کیا کہنا چاہتی ہو ——؟"

"میں ان سے پیسہ ادھار لینا چاہتی ہوں، صاحب! ہمارے گھر میں آٹا ختم ہو چکا ہے ——!"

"کتنا پیسہ چاہیے؟"

"دو روپیہ ——!"

"میں دیتا ہوں ——" میں نے دو نوٹ آگے بڑھائے، جو اس نے لے لئے۔

"صاحب!" وہ بولی۔ "میں یہ آپ کو لوٹا دوں گی۔ بی بی جی سے اس بارے میں کچھ نہ کہئے گا!"

(پنجابی سے ترجمہ)

ڈرامہ

میرزا ادیب

ہمہ آفتاب استؑ

کردار:

میاں صاحب ــــــــ شوہر

بیگم ــــــــ بیوی

خاں صاحب ــــــــ بیگم کے عزیز

رضیہ ــــــــ بچی

ثریا ــــــــ رضیہ کی باجی

امجد ــــــــ رضیہ کا بھائی

جاوید ــــــــ بڑا بھائی

ایک عام کمرے سے ذرا بڑا کمرہ، جسے گھر والے گول کمرہ کہتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کسی زمانے میں خاص طور پر مہمانوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہو مگر اب تو کثرتِ استعمال سے اس کی یہ حالت ہے کہ اس میں اور ایک عام کمرے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ویسے تو یہاں صوفہ سیٹ بھی ہے، تپائی پر ریڈیو سیٹ بھی، کرسیاں بھی اور فرش پر لمبی چوڑی دری بھی لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرنیچر جس ترتیب سے رکھا گیا تھا اس میں ابھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ سامنے کی دیوار سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ، شمال مشرقی کونے میں، ایک تپائی کے اوپر ریڈیو سٹ کے اوپر کچھ کتابیں اور کپڑے۔ درمیانی حصے میں چار کرسیاں، ایک چھوٹی میز۔ سامنے کارنس پر کچھ کھلونے قائم ہیں۔ بیچ میں ایک سینری، سوئی کو بنا ہوا ایک خرگوش، چینی کا ایک پیالہ، سنگِ مرمر کی ایک صندوقچی اور اس قسم کی دوسری متفرق چیزیں

ایک دروازہ دائیں دیوار میں جو صحن میں کھلتا ہے اور دوسرا بائیں دیوار میں جس کے ساتھ میاں صاحب کا کمرہ ہے۔ دونوں دروازوں پر پیازی رنگ کے پردے پڑے ہیں۔

دھوپ روشن دانوں سے اندر آکر خوب چمک رہی ہے۔

پردہ جس وقت اٹھتا ہے، بیگم کمرے میں اس طرح پھر رہی ہیں جیسے بڑی پریشان ہیں۔

عمر پینتیس کے لگ بھگ ۔ قد درمیانہ ۔ فربہ ڈیل ۔ رنگ گندمی ۔ لباس شلوار قمیص اور دوپٹہ ۔

بیگم کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہیں، کبھی صوفہ پر نظر ڈالتی ہیں، کبھی ایک کرسی کو کھسکا کر اس کے نیچے دری کو جھک کر دیکھتی ہیں، پھر وہاں سے کارنس کی طرف جانے لگتی ہیں۔ سنگ مرمر کی صندوقچی اٹھاتی ہیں۔ اسے کھولنے ہی لگتی ہیں کہ میاں صاحب کے کمرے سے کسی مغربی سازینے کی آواز آنے لگتی ہے ۔ صندوقچی ہاتھ میں لئے چہرہ بنالیتی ہیں جیسے اس آواز نے انھیں سخت بیزار کردیا ہے ۔

صندوقچی کا ڈھکنا اٹھاتی ہیں بہت سارے کاغذ نکالتی ہیں ۔ ان کا جائزہ لیتی ہیں ۔

مطلوبہ چیز انہیں نہیں مل سکی ۔ صندوقچی اسی طرح ہاتھ میں لئے کرسیوں کی طرف آتی ہیں۔ جلدی جلدی کاغذ ڈبے میں ڈالتی ہیں ۔ ڈھکنا اٹھاتی ہیں کہ سازینے کی آواز جو ذرا مدھم ہوگئی تھی ۔ یک لخت بلند ہوجاتی ہے ۔

بیگم ڈھکنا ہاتھ میں لئے میاں صاحب کے کمرے کی طرف جانے لگتی ہیں ۔

تین چار لمحوں کے بعد سازینے کی آواز بند ہوجاتی ہے ۔

بیگم واپس آتی ہیں۔ اب ان کے ہاتھ میں ڈھکنے کے علاوہ وہ گراموفون ریکارڈ بھی ہے جو ابھی بج رہا تھا۔ ڈھکنا میز پر رکھ کر صندوقچی میں سے وہ سارے کاغذ نکالتی ہیں ۔ ریکارڈ ان کے بائیں ہاتھ ہی میں ہے ۔

دائیں دروازے سے کھانسی کی مسلسل آواز آتی ہے —— اور اس کے ساتھ ہی میاں صاحب دروازے میں سے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ بیمار آدمی ۔ دراز قد ، سر پر جناح کیپ ۔ آنکھوں پر عینک ۔ چادر اوڑھے ہوئے ۔ کھانسی سے جسم لرزتا ہے غصے کی حالت میں ہیں اس لئے بات جلدی جلدی کہیں گے ۔

میاں صاحب : تم ریکارڈ کیوں لے آئیں ؟

بیگم : (بدستور کاغذوں کا جائزہ لیتے ہوئے) کیا کرتی ؟

میاں صاحب : کیوں ؟

بیگم : (ہاتھ روک کر شوہر کو دیکھتے ہوئے) غضب خدا کا ، رات دن ، صبح شام ریکارڈ ، کان پک گئے ہیں سنتے سنتے !

میاں صاحب : نہ سنو ، کون کہتا ہے سنو !

(بیگم مایوس ہوکر کاغذ صندوقچی میں ڈالنے لگتی ہے)

بیگم : ایک تو اس گھر میں یہ مصیبت کہ کوئی چیز وقت پر ملتی ہی نہیں اور اوپر سے ہر وقت ٹیں ٹیں ، ٹاں ٹاں ۔

میاں صاحب : ٹیں ٹیں ٹاں ٹاں ! میں نے کوئی طوطا تو نہیں پال رکھا ، انگریزی ریکارڈ بجاتا ہوں ۔

بیگم : تو اب طوطا بھی لے آؤ ۔ کون روکتا ہے تمہیں —— قسم ہے جو لانڈری کی رسید مل جائے ۔ گھنٹہ بھر سے تلاش کر رہی ہوں ۔ تمہیں کچھ خبر ہے ؟

میاں صاحب : مجھے تو اپنی بھی خبر نہیں ہے ۔

بیگم : ریکارڈوں کی خبر تو ہے نا

میاں صاحب : وہ تو ہے

بیگم : خدا کے لئے اب نہ بجاؤ !

میاں صاحب: تو پھر کیا کروں؟

بیگم: وہی جو دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

میاں صاحب: دوسرے لوگ کیا کرتے ہیں؟

بیگم: اور کچھ کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، کم از کم اس طرح بے تحاشا ریکارڈ نہیں بجاتے۔ صبح سویرے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے تو کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ پتہ نہیں تمہاری طبیعت کیوں نہیں گھبراتی اس سے!

میاں صاحب: کئی دن سے بستر پر پڑا ہوں، لیٹے لیٹے کس طرح دل بہلاؤں، کیا کروں؟

بیگم: آرام کرو۔ ڈاکٹر نے کہا نہیں آپ کے لئے آرام کی سخت ضرورت ہے۔

(بیگم اس دوران میں لانڈری کی رسید ادھر اُدھر تلاش کرتی رہتی ہیں۔ بار بار کارنس کی طرف جاتی ہیں۔ چیزیں اُلٹ پلٹ کرتی ہیں اور ساتھ ہی میاں صاحب سے باتیں کرتی جاتی ہیں)

میاں صاحب: کاش تمہیں معلوم ہوتا موسیقی روح کی غذا ہے۔

بیگم: مگر روح کو اتنی غذا بھی تو نہ دو کہ اسے بدہضمی ہو جائے۔

میاں صاحب: بیگم! تم اتنی بد ذوق ہو، یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

(بیگم جو کارنس سے مایوس ہو کر لوٹ رہی ہیں اس فقرے پر تلملا جاتی ہیں۔ گھور کر شوہر کو دیکھتی ہیں)

بیگم: اچھا تو میں بد ذوق ہوں اور تم بڑے اعلیٰ ذوق کے مالک ہو! سبحان اللہ!!

میاں صاحب: (نرمی سے) میرا یہ مطلب نہیں۔

بیگم: تو کیا مطلب ہے؟

میاں صاحب: مطلب صرف یہ کہ تم میں ذرا احساسِ لطیف کی کمی ہے، اور تو کوئی بات نہیں!

بیگم: اس میں بد ذوقی کی کیا بات ہے؟ خیر میں بد ذوق ہی سہی مگر ہمسایوں کو کیا کہو گے؟ ابھی ابھی بی اماں کہہ رہی تھیں۔ یہ تمہارے میاں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہمارے گھر کے لوگوں کو ریکارڈوں کے شور میں چیخ چیخ کر بات کرنی پڑتی ہے۔ کل میرزا صاحب بھی شکایت کر رہے تھے۔ اور خاں صاحب کی بیوی تو کئی بار کہہ چکی ہیں کہ کیا آپ لوگوں نے ریکارڈوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے اور یہ جو انور صاحب ہیں نا——

میاں صاحب: بیگم! یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ سارا محلہ میرے خلاف شکایت کر رہا ہے۔

بیگم: تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟

میاں صاحب: پورا محلہ نہیں، پورا شہر، پورا ملک بلکہ پوری کائنات مجھ سے شاکی ہے—— فرش سے لے کر عرش تک ہر ایک کو مجھ سے شکایت ہے۔

(اب بیگم نرم لہجہ اختیار کر لیتی ہیں)

بیگم: بیمار کو دل ضرور بہلانا چاہئے مگر——

میاں صاحب: مگر——

بیگم: یعنی میرا مطلب ہے—— کہ—— اب میں کیا کہوں!

میاں صاحب: کچھ بھی نہ کہو۔ اونہہ۔ کیا قیامت ہے۔ اب بیمار آدمی اپنا دل بھی نہیں بہلا سکتا! ریکارڈ بھی نہیں بجا سکتا! نازک کانوں کو تکلیف ہوتی ہے اس سے۔

بیگم: شوق سے لگاؤ۔ کون منع کرتا ہے۔

میاں صاحب: کیوں نہ لگاؤں؟

(میاں صاحب بیگم کے ہاتھ سے ریکارڈ لے کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ بیگم صندوقچی اُٹھا کر کارنس کی طرف قدم اُٹھانے لگتی ہیں۔

دوسرے دروازے سے رضیہ آتی ہے۔

رضیہ نو دس برس کی بچی ہے۔ سفید فراک میں ملبوس۔ بال بکھرے ہوئے۔ بیگم رضیہ کو دیکھتی ہیں مگر لانڈری کی رسید تلاش کرنے میں اس طرح مصروف ہیں کہ فوراً اس سے نگاہیں ہٹا لیتی ہیں

رضیہ آگے بڑھتی ہے۔

میاں صاحب کے کمرے سے پھر ریکارڈ کی آواز آنے لگتی ہے

رضیہ ماں سے کچھ کہتی ہے مگر ماں سن نہیں سکتی۔)

بیگم: (بلند آواز میں) اونچی آواز میں بکو۔

رضیہ: امی!

بیگم: کیا ہے؟

رضیہ: امی ——

بیگم: کیا ہے؟

رضیہ: امی ——

بیگم: اب کچھ کہو گی بھی کہ نہیں۔ دیکھی ہے لانڈری کی رسید؟

رضیہ: امی ——

بیگم: دفع ہو مردار —— امی امی امی!

(خاں صاحب آتے ہیں۔ میاں صاحب کے ہم عمر۔ فربہ اندام۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ ہاتھ میں چھڑی۔

بیگم انہیں دیکھتی ہیں تو جلدی سے موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہیں)

اوہ بھائی جان! آئیے بھائی جان! تشریف رکھیے۔

(بیگم صوفے کی طرف اشارہ کرتی ہیں)

خاں صاحب: ادھر سے گذر رہا تھا۔ میں نے کہا خیریت دریافت کرتا جاؤں۔

بیگم: تشریف رکھیے۔ (خاں صاحب صوفے کی بجائے کرسی میں بیٹھ جاتے ہیں)

اور تو سب خیریت ہے مگر رضیہ کے ابو ــــــ

خاں صاحب: کیا ہوا بھائی صاحب کو!

بیگم: علیل ہیں۔

خاں صاحب: کب سے! ــــ یہ ریکارڈ کہاں بج رہا ہے؟

بیگم: وہی بجا رہے ہیں۔

خاں صاحب: کیوں؟

بیگم: بیمار ہیں ذرا دل بہلا رہے ہیں۔ اور سارا دن اسی طرح دل بہلاتے رہتے ہیں بے چارے!

(خاں صاحب بہن کے اس طنزیہ انداز بڑائے غور سے دیکھتے ہیں)

خاں صاحب: کب سے بیمار ہیں؟ تکلیف کیا ہے؟

بیگم: کئی دن سے ہلکی ہلکی کھانسی آ رہی تھی۔ پھر بخار ہو گیا۔ کھانسی کم ہو گئی، بخار اُتر گیا اور ــــ

خاں صاحب: اور اب؟

بیگم: بیمار ہیں!

(رضیہ جو ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ باپ کے کمرے کی طرف چلی جاتی ہے)

خاں صاحب: بیمار ہیں؟

بیگم: جی بھائی جان!

خاں صاحب: (اُٹھتے ہوئے) اوہو!

(ریکارڈ کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ میاں صاحب کھانستے ہوئے آتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کھانسنے میں تکلف سے کام لے رہے ہیں)

میاں صاحب: خاں صاحب! معاف کیجئے۔ مجھے ابھی ابھی آپ کے آنے کی اطلاع ملی ہے۔

خاں صاحب: طبیعت کیسی ہے بھائی صاحب؟

میاں صاحب: جی رہا ہوں۔

خاں صاحب: کس کا علاج ہو رہا ہے؟

بیگم: یہ نہ پوچھیئے بھائی جان! کہ کس کا علاج نہیں ہو رہا۔ چند روز ایلوپیتھی سے دلچسپی رہی، پھر ایک پرانے حکیم صاحب کو تکلیف دی گئی، دو روز پہلے ہومیوپیتھی سے رابطہ قائم ہوا تھا ــــ یہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا ــــ اب صرف ریکارڈ بجا بجا کر اپنا علاج کر رہے ہیں!

خاں صاحب: ٹھیک ہی تو کرتے ہیں بھائی صاحب! موسیقی بعض بیماریوں میں بڑی اچھی دوا ثابت ہوتی ہے۔

بیگم: اس دوا سے انھیں تو آرام آجائے گا مگر گھر کے لوگ بیمار ہو جائیں گے۔

خاں صاحب: خدانخواستہ یہ کیوں؟

بیگم: خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک ایک ریکارڈ سو سو مرتبہ بجتا ہے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں۔
میاں صاحب: خاں صاحب!
خاں صاحب: ارشاد بھائی جان!
میاں صاحب: آپ جانتے ہیں نا بیمار کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اب اگر اس نازک دل کو بہلایا نہ جائے تو کیا ہوگا؟
خاں صاحب: صاحب! بڑی نازک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔
میاں صاحب: یہ بات ہماری بیگم نہیں سمجھ سکتیں!
بیگم: بہت موٹی عقل ہے بے چاری کی۔
خاں صاحب: کوئی مضائقہ نہیں بھائی صاحب! بیمار کا دل ہر حالت میں بہلنا چاہیئے!
میاں صاحب: جی ہاں۔
خاں صاحب: آپ لیٹ جایئے۔
میاں صاحب: (سینے پر ہاتھ رکھ کر) جی ہاں۔
خاں صاحب: درد کی شکایت ہے؟
میاں صاحب: صاحب کیا شکایت نہیں ہے!

(میاں صاحب کھانستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ رضیہ آتی ہے اور آ کر
ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

بیگم: رضیہ!
رضیہ: جی امی!
بیگم: باجی سے کہو نیچے آ کر چائے بنائے۔ کر کیا رہی ہے؟
رضیہ: امی! صندوق سے سارے کپڑے نکال رکھے ہیں۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟
بیگم: جاؤ اس سے کہو، ماموں جان آئے ہیں۔ آ کر چائے بنا دے۔
خاں صاحب: میرے لئے تکلیف نہ کرو۔
بیگم: اس میں تکلیف کیا ہے بھائی جان؟

(ریکارڈ کی آواز آتی ہے)

یہ لیجئے شروع ہو گئے۔

خاں صاحب: سارا دن اس طرح شور برپا رہتا ہے۔
بیگم: اور کیا۔ کبھی کبھی تو آدھی رات کو بھی! کل کی بات ہے، آدھی رات ہوئی، ان کے سر پر موسیقی کی دُھن جو سوار ہوئی تو ریکارڈ پر ریکارڈ بجانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز آئی میاں صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟ کسی کو آرام کرنے نہیں دو گے؟ مرزا صاحب کی بیگم صاحبہ بولیں۔

میں نے کہا اپنا نہیں تو ہمسایوں ہی کا خیال کیجیے۔ اس بے وقت کی موسیقی کا کیا مطلب ہے؟ ان سے کہا تو کہنے لگے۔ بیمار ہوں۔

خاں صاحب: ذرا دل بہلا رہا ہوں!

بیگم: (ہنس کر) جی ہاں!

خاں صاحب: یہ تو تکلیف دہ بات ہے۔

بیگم: اور کیا!

(بیگم دائیں دروازے کے پاس جا کر رضیہ کہہ کر پکارتی ہیں)

خاں صاحب: کیوں بلاتی ہو؟

بیگم: ثریا کو نیچے بلا کر لائیے نا۔

(بیگم بائیں دروازے میں سے نکل جاتی ہیں چند لمحوں کے بعد لوٹتی ہیں تو ریکارڈ کی آواز بند ہو چکی ہوتی ہے)

خاں صاحب: بھائی صاحب نے ریکارڈ ہٹا دیا ہے۔

بیگم: جی نہیں دروازے بند کر کے آئی ہوں۔ انھیں بھلا دل بہلانے سے کون روک سکتا ہے؟

خاں صاحب: جاوید کہاں ہے؟

بیگم: فلاسفر صاحب بھی اوپر کمرے میں بند ہیں۔

خاں صاحب: فلاسفر صاحب کون؟

بیگم: یہی جاوید میاں!

خاں صاحب: فلاسفر ہو گئے ہیں؟

بیگم: جانے بلا کیا کیا ہو گئے ہیں۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

(ریکارڈ کی آواز آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میاں صاحب آتے ہیں)

میاں صاحب: (بیگم سے) وقت کیا ہوا ہے؟ ......

خاں صاحب: (کلائی پر نظر ڈال کر) ڈیڑھ بج گیا ہے۔

میاں صاحب: مجھے کھچڑی کتنے بجے مل جانی چاہیے — میں تم سے پوچھ رہا ہوں بیگم!

بیگم: کھچڑی مل جائے گی۔

میاں صاحب: کب؟ جس وقت میری انتڑیاں قل ہو اللہ کا ورد کرتے کرتے بے دم ہو جائیں گی (خاں صاحب سے مخاطب ہو کر) ڈاکٹر نے تاکید کی ہے کہ آپ ایک بجے تک کھچڑی ضرور کھا لیا کریں اور اب بج رہا ہے پورا ڈیڑھ۔ صاحب! پورے تیس منٹ اوپر ہو چکے ہیں اور ابھی کھچڑی کا نام و نشان تک نہیں!

خاں صاحب: کھچڑی کا کیا ہے بھائی صاحب! ابھی تیار ہو جاتی ہے۔

میاں صاحب: نہیں تیار ہو گی صاحب!

خاں صاحب: کیوں؟

میاں صاحب: اس لئے کہ الماری کی چابی نہیں ملے گی۔ چابی نہیں ملے گی تو الماری نہیں کھلے گی، الماری نہیں کھلے گی تو پرس نہیں نکلے گا، پرس نہیں نکلے گا تو دال منگوانے کے لئے پیسے نہیں ملیں گے، اور دال نہیں آئے گی تو کھچڑی ــــــ

خاں صاحب: (ہنس کر) نہیں بھائی صاحب! ایسا نہیں ہوگا۔

میاں صاحب: تو دیکھ لیجئے!

(میاں صاحب اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں؛ ریکارڈ کی آواز بند ہو جاتی ہے۔)

خاں صاحب: کیا کہتے ہیں بھائی صاحب؟

بیگم: انھیں تو ایسی باتیں کہنے کی عادت سی ہے۔

خاں صاحب: بھائی صاحب کے لئے کھچڑی تیار کر دو نا!

بیگم: ابھی ہو جاتی ہے (پکارتے ہوئے) رضیہ! او رضیہ کی بچی۔

(باہر سے جی امی کہتی ہوئی رضیہ کی آواز آتی ہے)

اُدھر جا باجی کے پاس، الماری کی چابی لے آ۔

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ: جی امی!

بیگم: سنا نہیں تونے،

خاں صاحب: رضیہ بیٹی! اپنی باجی سے چابی لے آؤ۔

بیگم: اور کہو کہ نیچے آئے۔ ماموں جان آئے ہیں۔

رضیہ: اچھا۔

بیگم: عجیب مصیبت ہے اس گھر میں۔

خاں صاحب: بھائی صاحب گھر سے باہر نہیں جاتے؟

بیگم: کہاں جاتے ہیں! ریکارڈوں سے فرصت ملے تو باہر بھی جائیں۔ اور جائیں گے بھی تو پانچ سات نئے ریکارڈ اٹھا لائیں گے۔

خاں صاحب: (ہنس کر) خوب!

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ: امی!

بیگم: چابی لے آئی ہو؟

رضیہ: باجی کہتی ہیں مجھے چابی کی کیا خبر، میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں!

بیگم: کہا ہے ماموں جان آئے ہیں؟

رضیہ: کہتی ہیں ابھی آتی ہوں۔

(بیگم گاڈرنس کی طرف جاتی ہیں اور چابی ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتی ہیں)

بیگم: آتی کیوں نہیں؟

رضیہ: پوچھتی ہیں لانڈری سے میرا دوپٹہ منگوایا؟

بیگم: خاک منگوائی ہے اُس کے لئے ہے آکر۔

خاں صاحب: اوہو۔ اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟

بیگم: دو گھنٹے ہو گئے ہیں نواب زادی نیچے ہی نہیں اُترتی۔

(میاں صاحب آتے ہیں۔ رضیہ کھسک جاتی ہے)

میاں صاحب: (خاں صاحب سے) دیکھ لیا خاں صاحب!

خاں صاحب: کوئی بات نہیں!

میاں صاحب: اور تو کوئی بات نہیں۔ صرف چابی گم ہو گئی ہے میں نے کہا نہیں تھا۔ چابی نہیں ملے گی تو الماری نہیں کھلے گی وغیرہ وغیرہ

خاں صاحب: مل جائے گی۔

میاں صاحب: نہیں ملے گی صاحب! نہیں ملے گی—ہرگز نہیں ملے گی۔ گزشتہ بیس بائیس برس سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ دن میں سات مرتبہ چابی گم ہو جاتی ہے۔

بیگم: آپ کو تو باتیں بنانے کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے۔

میاں صاحب: میں باتیں بنا رہا ہوں؟

خاں صاحب: بھائی صاحب! ابھی چابی مل جاتی ہے۔

میاں صاحب: خاں صاحب! ہماری بیگم کی روایت یہ ہے کہ ہر روز بار بار چابی گم کر دی جاتی ہے اور پھر ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ صرف چابی ہی نہیں، ہر شے کھو دیتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے تو یہ ہے کہ کسی دن اپنے آپ کو نہ کھو دیں۔ پھر کیا ہوگا:

بیگم: (میاں کو غصے سے دیکھ کر) میں نے کہا۔

میاں صاحب: ہو سکتا ہے صاحب! ضرور ہو سکتا ہے۔ کسی دن اپنے آپ کو کہیں رکھ کر بھول جائیں۔ اُس دن تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

بیگم: مہربانی کر کے اپنے کمرے میں چلے جائیں!

میاں صاحب: جاتا ہوں، ضرور جاتا ہوں۔

(میاں صاحب اپنے کمرے میں جانے لگتے ہیں۔ دو تین لمحوں کے بعد ریکارڈ کی آواز رک جاتی ہے)

خاں صاحب: چابی نہیں ملتی تو نہ سہی۔

(خاں صاحب جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالتے ہیں)

دال وغیرہ منگوا لیجئے۔

بیگم: نہیں بھائی جان

خاں صاحب: اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ کھچڑی تو تیار کرا دو۔ بیمار آدمی کو۔ ورنہ ہو جاتا ہے، بھوک۔ برداشت نہیں کر سکتا۔

بیگم: رضیہ دوکاندار سے لے آتی ہے دال بعد میں پیسے دیدیں گے۔

خاں صاحب: میرے اور تمہارے پیسوں میں کیا فرق ہے۔ بلاؤ رضیہ کو۔

بیگم: (غصے سے آواز دے کر) رضیہ کی بچی!

(رضیہ کی کسی قدر دور سے آواز آتی ہے "جی امی")

جی امی کی بچی جلدی آ۔

(رضیہ آتی ہے)

کیا کر رہی ہے تو؟

رضیہ: میری گڑیا کا بیاہ ہے نا آج۔

خاں صاحب: کب؟

رضیہ: شام کو۔

بیگم: شام کو بیاہ ہے تو بار بار کیوں چلی جاتی ہے اُدھر؟

رضیہ: تیاری تو کرنی ہے نا

بیگم: میں کہتی ہوں بھائی جان! یہ گھر کیا ہے، ایک مصیبت خانہ ہے۔ سہیلیاں شام کو آنے والی ہیں اور صاحبزادی صبح سے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ یہ تماشا ہوتا رہتا ہے اس گھر میں۔

خاں صاحب: لو بیٹا (روپیہ دیتے ہوئے) کھچڑی کے لئے دال لے آ۔

بیگم: اور اس نواب زادی سے کہو کہ نیچے آ کر کام کرے۔

(رضیہ روپیہ لے کر نکل جاتی ہے)

کیا کروں بھائی جان! اس گھر میں کسی کو بھی ذمے داری کا احساس نہیں ہے۔

(ثریا آتی ہے۔ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے چہرے پر وحشت سی برس رہی ہے)

ثریا: سلام علیکم ماموں جان!

خاں صاحب: وعلیکم السلام۔

بیگم: یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟

خاں صاحب: کیا ہے ثریا بیٹی؟

ثریا: ایک سہیلی کی سالگرہ ہے۔

خاں صاحب: تو ٹھیک ہے۔ وہاں جانا ہے؟

ثریا: جاؤں کیسے۔ امی لانڈری سے دوپٹہ منگوا کر ہی نہیں دیتیں۔
بیگم: اور کوئی دوپٹہ نہیں ہے گھر میں؟
ثریا: مگر کوئی سوٹ سے میچ ہی نہیں کرتا!
بیگم: سوٹ پہلنا کوئی ضروری ہے؟
خاں صاحب: ہاں بیٹا! ایک خاص رنگ کے دوپٹے کے لئے اتنا تردد کیوں کیا جائے؟
بیگم: گھر میں ایک چھوڑ دس دوپٹے موجود ہیں۔ صبح سے ضد کر رہی ہے کہ پیازی رنگ ہی کا دوپٹہ چاہیئے!
ثریا: لانڈری سے منگوا کیوں نہیں دیتیں؟
بیگم: منگواؤں کیا خاک، لانڈری کی رسید نہیں مل رہی!
ثریا: آپ نے رکھی کہاں تھی؟
بیگم: یہ خبر ہوتی تو وہاں سے نکال نہ لیتی۔ پوچھتی ہے رسید کہاں رکھی تھی؟
ثریا: وقت پر کوئی چیز بھی تو نہیں ملتی اس گھر میں!
بیگم: آگ لگاؤ اس گھر کو۔ کس دیدہ دلیری سے باتیں بنا رہی ہے۔ نہ ماں کی عزت نہ ماموں کا لحاظ!
خاں صاحب: ثریا بیٹا!
ثریا: ماموں جان میں نے کہا کیا ہے۔ یہی کہا ہے ناکہ آپ ہر چیز کہیں رکھ کر بھول جاتی ہیں۔
خاں صاحب: کوئی بات نہیں تم کوئی اور دوپٹہ لے لو۔
ثریا: سہیلی کی سالگرہ پر جاؤں اور کپڑے بھی ڈھنگ کے نہ پہن کر جاؤں؟
بیگم: ڈھنگ کے کپڑے کیا ہوتے ہیں؟
ثریا: دوپٹہ سوٹ سے میچ ہی نہ کرے تو ڈھنگ کے کپڑے کیسے ہوئے؟
بیگم: دوپٹہ کسی اور رنگ کا اوڑھ لوگی تو سہیلیاں طعنے دے دے کر دل تو چھلنی نہیں کر دیں گی۔
خاں صاحب: دیکھو بیٹا! دوپٹے ایک چھوڑ سات آٹھ ہوں گے۔ کوئی دوپٹہ چن لو اور پھر اس کے رنگ کے مطابق شلوار اور قمیض کا انتخاب بھی کر لو۔
ثریا: ماموں جان پیازی سوٹ ——
بیگم: صاحبزادی پیازی رنگ کا سوٹ ہی پہنے گی اور کسی کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔
ثریا: امی! میں نے کہہ دیا ہے میں نہیں جاتی۔ بس بات ختم ہوگئی۔
بیگم: نہ جاؤ میری جوتی پروا کرتی ہے۔
خاں صاحب: اوہو۔ ثریا —— بیٹی ——
ثریا: نہیں ماموں جان! میں نہیں جاتی —— بالکل نہیں جاتی —— کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔

(لگتا ہے ابھی رو پڑے گی اور شاید اسے پیز کا احساس کر کے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ جاتے ہوئے بائیں دروازے سے نکلتی ہے)

بیگم: جا کہاں رہی ہو؟ باپ کے لئے کھچڑی پکاؤ (خاں صاحب سے) دیکھا آپ نے تماشا۔ ضرور پیازی سوٹ ہی پہننا ہے اور کوئی نہیں پہننا۔ حد ہو گئی ہے یا نہیں؟

(رضیہ رومال میں دال لے کر آتی ہے)

رضیہ: لو امی!

(رضیہ ماں کے ہاتھ میں رومال دے کر باہر جانے لگتی ہے)

بیگم: ٹھہرو ذرا

رضیہ: امی اُدھر میری گڑیا کے کپڑے بکھرے پڑے ہیں۔

بیگم: بکھرے رہنے دو۔

(بیگم رومال کھولتی ہیں)

لاحول ولا ــــ

خاں صاحب: کیا ہوا؟

بیگم: چنے کی دال اُٹھا لائی ہے ــــ (رضیہ سے) نو سال کی عمر ہو گئی مگر ابھی دودھ پیتی بچی ہے۔ نامراد کھچڑی چنے کی دال کی بنتی ہے؟

خاں صاحب: چنے کی دال؟ اوہو!

بیگم: دھیان تو اس کا گڑیوں میں ہے۔ سودا کیا خرید کر لائے گی۔ پہلے ہی چیخ رہے ہیں کہ مجھے وقت پر کھچڑی نہیں ملتی!

(رضیہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے)

خاں صاحب: رضیہ!

رضیہ: جی!

خاں صاحب: جس دوکان دار سے لائی ہے اس سے کہہ دے، ماش کی چھلکے والی دال دے دے! جلدی کر (آہستہ آہستہ لفظ منہ سے نکالتے ہوئے) ماش کی چھلکے والی دال!

(دیکارڈ کی بلند آواز آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میاں صاحب نے دروازہ کھولا ہے اور اب وہ آ رہے ہیں رضیہ دروازے کی طرف جانے ہی لگتی ہے کہ میاں صاحب آ جاتے ہیں)

بھائی صاحب!

میاں صاحب: فرمائیے!

خاں صاحب: کھچڑی ابھی تیار ہو جاتی ہے

میاں صاحب: اب ضرورت نہیں۔ ایک آدھ گھونٹ دودھ کا پی لوں گا! آدمی زندہ تو رہ سکتا ہے!

(میاں صاحب جانے لگتے ہیں۔ رضیہ موقع پا کر دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے)

خاں صاحب: کھچڑی پکانے میں دیر لگ جائے گی۔ دودھ منگوالو!
بیگم: کھچڑی بعد میں پک جائے گی۔ یہ رضیہ کہاں گئی؟ دیکھا، کس طرح کھسک گئی ہے (زور سے آواز دے کر) رضیہ۔ او رضیہ کی بچی!
(رضیہ کی باہر سے آواز: "جی امی")

جلدی آ۔

خاں صاحب: دودھ سے کیا ہوگا، کھچڑی ضرور تیار کر دینا۔
بیگم: جی ہاں!

(رضیہ آتی ہے)

گڑیوں کا خیال کسی وقت چھوڑے گی بھی یا نہیں، مردار! جلدی سے دودھ لے کر آ اور چینی ڈال کر اپنے ابی کو دے!
(رضیہ کمرے سے نکل جاتی ہے)

خاں صاحب: جاوید پیچھے نہیں آتا؟
بیگم: آتا ہے مگر خاص خاص موقع پر۔
خاں صاحب: خاص خاص موقع پر؟ کیا مطلب؟
بیگم: جب بھوک لگے یا اسے معلوم ہو جائے کہ کوئی مہمان آیا ہے۔
خاں صاحب: شاید میں مہمان نہیں ہوں۔
بیگم: آپ مہمان تو نہیں مگر آپ کے بارے میں سنے گا تو ضرور پیچھے آئے گا۔

(رضیہ کی آواز آتی ہے)

رضیہ: امی!
بیگم: کیا ہے؟
رضیہ: چینی کہاں ہے؟
بیگم: مجھ سے پوچھتی ہے چینی کہاں ہے، تجھے معلوم نہیں؟

(رضیہ آتی ہے)

رضیہ: امی! وہاں نہیں ہے۔
بیگم: کیوں — یہ امجد صبح راشن کارڈ لے کر گیا تھا، چینی لایا نہیں تھا کیا؟
رضیہ: نہیں امی!
بیگم: آج آخری دن تھا — حد ہو گئی ہے۔ شہزادہ صاحب صبح سے گئے ہیں اور ابھی تک لوٹے نہیں۔
خاں صاحب: رضیہ بیٹی! چینی خرید لانا!

(رضیہ چلی جاتی ہے۔ کسی قدر دور سے سیٹی کی آواز آتی ہے)

یہ کون ہے؟

بیگم: امجد ہے اور کون ہوگا۔

(امجد آتا ہے۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے۔ گیارہ برس کے لگ بھگ عمر)

امجد: اوہ ماموں جان! — السلام —

بیگم: دن بھر کہاں رہا ہے؟ گھر کی کوئی فکر ہے یا نہیں؟ راشن کارڈ لے کر چینی لینے گیا تھا میں پوچھتی ہوں۔ اتنی دیر تک کرتا کیا رہا ہے؟

امجد: (بڑے اطمینان سے) فٹ بال کھیلتا رہا ہوں!

بیگم: فٹ بال کھیلتا رہا ہے؟

امجد: جی امی!

بیگم: آٹھ بجے سے اب تک؟

امجد: میچ جلدی ختم ہوگیا ورنہ شام کو آتا۔

بیگم: اور راشن کارڈ؟

امجد: (راشن کارڈ نکال کر) یہ رہا۔

بیگم: اور چینی؟

امجد: راشن کی دوکان میں ہے!

بیگم: لے کر کیوں نہیں آیا؟

امجد: میچ کھیلتا کہ چینی خریدتا؟ امی! ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا تھا دو نہیں ہوسکتے!

بیگم: دیکھا آپ نے آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے کہ نہیں؟

(جاوید آتا ہے۔ عمر پچیس برس کے قریب۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ آنکھوں پر عینک۔ چہرے پر یبوست سی برس رہی ہے)

جاوید: ہیلو ماموں جان!

خاں صاحب: فرمائیے طبیعت تو ٹھیک ہے؟

جاوید: وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

خاں صاحب: اپنی طبیعت کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا!

جاوید: جی ہاں۔ انسان دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔ اپنے متعلق نہیں جان سکتا!

بیگم: بھائی جان! ابھی آتی ہوں۔ یہ رضیہ تو بس نکمی لڑکی ہے۔

(بیگم باہر جاتی ہیں اور اس کے فوراً بعد امجد بھی چلا جاتا ہے)

خاں صاحب: تمہارے بارے میں ٹھیک ہی سنا تھا۔ واقعی فلاسفر بن گئے ہو!

جاوید: نہیں۔

خاں صاحب: کیا نہیں؟

جاوید: فلاسفر تو نہیں بن سکا۔ البتہ کچھ غور و فکر کیا ہے۔

خاں صاحب: اس غور و فکر سے کس نتیجے پر پہنچے ہو؟

جاوید: کس نتیجہ پر پہنچا ہوں! ہوں ——

(عینک اتار کر اسے دو تین بار گھماتا ہے اور پھر آنکھوں پر لگا لیتا ہے)

خاں صاحب: کوئی نہ کوئی نتیجہ تو نکالا ہے نا؟

جاوید: ماموں جان!

خاں صاحب: ارشاد برخوردار!

جاوید: مجھے اس لفظ سے نفرت ہے۔ برخوردار کیا ہوا؟

خاں صاحب: ارشاد فلاسفر صاحب!

جاوید: چلئے یونہی سہی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا، نہیں عرض کرنے والا تھا کہ جو انسانی زندگی ہے نا۔ ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ ہر موج اپنی دنیا میں سفر کر رہی ہے اور سفر بھی تنہا کر رہی ہے۔ کوئی بھی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ انسان بھی سفر کر رہا ہے اکیلا اور تنہا۔ راستہ خاموش اور سنسان ہے اور اندھیرے ہیں کہ اردگرد چھائے رہتے ہیں۔ دور ایک کرن نظر آتی ہے۔

خاں صاحب: ایک کرن نظر آتی ہے ——

جاوید: دور۔ بہت دور۔ انسان اس کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے اور اس تگ و دو میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ یہ کرن کہیں تو ایک جگنو بن جاتی ہے کہیں ایک ستارہ اور کہیں افق کے نیچے، پہاڑ کی چوٹی پر چمکتی ہوئی رت کی ایک جھلک۔ انسان لاکھ کوشش کرے یہ روشنی ہاتھ نہیں آتی سب تگ و دو بے سود ثابت ہوتی ہے۔ روشنی کی یہ کرن ایک فریب ہے، ایک تخیل ہے، ایک خواب ہے، کچھ ہے بھی اور نہیں بھی۔ نہیں بھی اور ہے بھی، ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہے اور نہیں کے درمیان ایک بڑا پراسرار وجود! اب بتائیے اسے کون سمجھ سکتا ہے۔

خاں صاحب: کوئی نہیں معلوم ہوتا ہے آج فلسفے کی خاص بلندیوں پر اُڑ رہے ہو:

جاوید: اُڑ نہیں رہا سفر کر رہا ہوں!

خاں صاحب: سفر کر رہے ہو؟

جاوید: سفر، رات دن سفر، صبح و شام سفر، ہر لمحہ سفر، ہر گھڑی سفر!

(بیگم آتی ہیں)

بیگم: بھائی جان! آپ کس مصیبت میں پھنس گئے۔ یہ لڑکا آپ کا دماغ خراب کر دے گا۔

جاوید: یہ انسانی زندگی کا المیہ ہے۔ انسان زندگی اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو کہتے ہیں کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

خاں صاحب: حالانکہ اس کا دماغ روشن ہونے لگتا ہے۔

جاوید: یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ انسان کا مقدر تو یہ ہے کہ وہ روشنی کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ اس سفر میں بے شمار منزلوں، مرحلوں اور زمینوں اور آسمانوں سے گذرتا ہے، سفر کہیں ختم نہیں ہوتا۔

(ریکارڈ کی تیز آواز۔ بیگم اور خاں صاحب دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ میاں حسن آتے ہیں ہاتھ میں گلاس ہے)

میاں صاحب : (خاں صاحب سے) لیجیے ملاحظہ فرمایئے۔
خاں صاحب : کیا ہوا بھائی جان ؟
میاں صاحب : دو بجے دن کے دودھ دیا ہے تو وہ بھی بالکل پھیکا۔
جاوید : کوئی بات نہیں ابا جان ! انسانی زندگی بھی بڑی پھیکی ہے۔
میاں صاحب : چپ کرا و خلا سفر کے بچے۔
جاوید : (باپ کو غور سے دیکھ کر) یعنی آپ بھی خلا سفر ہیں ؟ آج تو میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔
بیگم : سمجھ میں نہیں آتا یہ ہو کیا رہا ہے ؟
جاوید : سفر اور سفر ــــ صرف سفر۔
بیگم : (آواز دے کر) او رضیہ کی بچی !

(رضیہ بھاگ کر آتی ہے)

رضیہ : جی !
بیگم : میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ بازار سے چینی لاکر دودھ میں ڈال لینا۔ ڈالی نہیں ؟
رضیہ : جاتی ہوں امی !
بیگم : مردار ! ابھی چینی لائی ہی نہیں (خاں صاحب سے) بتایئے بھائی جان ! اب میں کیا کروں ؟
جاوید : سفر۔ صرف سفر۔
بیگم : اللہ کرے میں تو اس دنیا سے سفر کر جاؤں ! جان چھوٹے اس مصیبت سے۔
جاوید : سفر سے جان نہیں چھوٹ سکتی ! یہ انسان کا مقدر ہے۔
میاں صاحب : لعنت ہے اس گھر پر۔

(گلاس دیوار کی طرف پھینکتے ہیں اور "ہیا۔ مر جائے تمہاری بلا سے" کہتے ہوئے جانے لگتے ہیں)

جاوید : ملاحظہ فرمایا آپ نے ماموں جان ! ابھی دودھ گلاس میں تھا، اب یہ سفر کرتا ہوا ــــ
بیگم : (منہ پر دوہتڑ مار کر) میں تو پاگل ہو جاؤں گی اس گھر میں۔

(امجد آتا ہے)

امجد : امی ! باجی زور زور سے رو رہی ہیں۔
جاوید : رونے دو ــــ سفر میں یہ مقام بھی آتا ہے۔

(خاں صاحب جانے لگتے ہیں)

جاوید : ماموں جان ! آپ کہاں چلے ؟
خاں صاحب : سفر کر رہا ہوں ــــ
بیگم : بھائی جان !
جاوید، امجد اور رضیہ : (یک ساتھ) ماموں جان !

(خاں صاحب جلدی سے دروازے میں سے نکل جاتے ہیں اور ان کے دروازے سے نکلتے ہی پردہ گرتا ہے)

رشید ملک

راگوں کے نام[ل]

"ناروِنے وچترن سانتی نامانی وکشایتے"

ترجمہ: نارد: راگوں کے نام واقعی بڑے عجیب ہیں۔

نارد۔ سنگیت مکرند۔ سنگیت ادھیائے۔ پد۴۔ اشلوک ۲۵[ئ]

نارد کے زمانے ہی میں راگوں کے ناموں کا عجیب و غریب ہونا واضح ہو چکا تھا۔ راگوں کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ فرداً فرداً ہر راگ کی تاریخ اور وجہ تسمیہ بیان کرنے کے لئے وقت اور گنجائش دونوں درکار ہیں۔ یہاں صرف ان مروجہ راگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ان اصولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ جو راگوں کے ناموں کی بنیاد ہیں۔ راگوں کی تاریخ اور ناموں سے ہمارے سنگیت کی قدامت اور استقامت کا پتہ چلتا ہے۔

ان اصولوں کی وضاحت کرنے میں چند قدیم راگوں کا ذکر جو اب ہمارے ہاں معدوم ہیں، ضروری ہو جاتا ہے۔

راگوں کے نام مختلف زبانوں میں رکھے گئے ہیں۔ ان میں سنسکرت، پراکرت، تلگو، عربی اور فارسی زبانیں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے راگوں کے ناموں کا یہ مسئلہ دراصل لسانیات کا مسئلہ ہے، یہ اس علم کے ماہرین کا کام ہے کہ وہ ہمیں یہ بتائیں کہ مالکونس راگ کا نام مالکونس کیوں رکھا گیا۔ اور اگر یہ کسی زمانے میں مالکونس نہیں تھا تو پھر مالکونس کیسے بن گیا۔ البتہ جب ان اصولوں کا کھوج لگایا جائے جن کی بنا پر راگوں کے نام وضع ہوئے تو یہ موسیقی کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ان صفحات میں ممکن ہے کسی راگ کے نام کے لغوی معنوں میں کوئی اختلاف ہو لیکن اگر وہ ان اصولوں کی وضاحت کر سکیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

لفظ ایک زندہ عضویہ ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ بنتا بگڑتا رہتا ہے۔ راگوں کے نام اس کلیے سے مستثنےٰ نہیں۔ ہمیں کئی نام ایسے ملتے ہیں جو بھرت کے زمانے میں کچھ اور تھے لیکن گردش زمانہ انھیں بدلتی رہی اگرچہ ان کا بنیادی ڈھانچہ (سروں کے لحاظ سے) قائم رہا۔ اس کی ایک مثال یہی مالکونس راگ ہے۔ بھرت کے زمانے کے آس پاس اس کا نام مالوا کیشیکا تھا لیکن ہم تک پہونچتے پہونچتے یہ مالکونس بن گیا۔ اسی قسم کا دوسرا راگ ٹوڈی ہے۔ یہ پہلے توڑی تھا لیکن بعد میں "شدھ" ہو کر ٹوڈیکا بنا اور اب پھر ٹوڈی بن چکا ہے۔

ل اس موضوع پر اوسی گنگولی نے خاصا کام کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا مضمون NON-ARYAN CONTRIBUTION TO ARYAN MUSIC جو بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے Annals میں شائع ہوا۔ اسی موضوع پر انھوں نے بنگالی زبان میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا جس کا عنوان ہے "راگ راگنیر نامے رہسیا" (راگ راگنیوں کے ناموں کا راز) اور جو بنگالی جریدہ "سنگیت وگیان پرویشکا" (کلکتہ) بابت بنگالی سال ۱۳۳۲ء میں شائع کیا۔ مزید دیکھیں ان کی کتاب RAGAS & RAGINIS مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء۔ گوسوامی نے اپنی کتاب اسٹوری آف انڈین میوزک میں کافی حد تک انہی سے استفادہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحات ۶۹-۸۰۔

ئ گائیکواڑ اورینٹل سیریز نمبر ۱۶۔ مرتبہ منگیش راماکرشنا تیلانگ۔ مطبوعہ بڑودا۔ ۱۹۲۰ء

اسی طرح ایک اور راگ "پٹ منجری" ہے جو اصل میں پرتھم منجری (پہلی کونپلیں) تھا مگر ہم تک پہنچتے پہنچتے پٹ منجری بن گیا۔ "پٹ دیپکی" بھی اسی قسم کا ایک اور راگ ہے۔

موسیقی کے طالب علم کے لئے راگوں کے ناموں کا مطالعہ اس وجہ سے دلچسپ ہے کہ اس سے فن اور ماحول کے باہمی رشتے پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور فن اور ماحول کا باہمی رشتہ جمالیات کی ایک اہم بحث ہے۔ بقول ڈانیلو:

"زبان کی ترکیبوں کی طرح راگوں کی دھنیں ان روایات کی مستقل اور پائیدار علامات ہیں جن سے کسی قوم کا تعلق ہوتا ہے۔"

ہمارے راگوں کے ناموں میں ہماری تاریخ کا عکس ملتا ہے۔ اگر ہم فرداً فرداً ہر راگ کی تاریخ پر غور کریں تو ماضی کے ان حقائق سے روشناس ہونے لگیں گے جن سے ہماری تاریخ مرتب ہوئی ہے۔

یوں تو راگ کا لفظ ان معنوں میں، جن میں آج کل ہم اسے استعمال کرتے ہیں، چوتھی صدی عیسوی کی پیداوار ہے لیکن راگ کا تصور بھرت منی سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ راگوں کے نام ہمیں تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کے نٹ شاستر میں ہی ملتے ہیں۔ اس زمانے میں راگوں کے نام ان کے وادی سوروں پر رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ جس راگ میں وادی سور شڑج تھا، وہ شڑجی جس میں وادی سور رشبھ تھا وہ آرشبھی، جس میں گندھار وادی سور تھا، وہ گندھاری کہلایا۔ اسی طرح باقی سوروں کی مناسبت سے مدھیمی، پنچمی، دھیبوتی اور نشادی بھی نام بھی تھے۔ ان میں سے چند آج بھی ہمارے ہاں رائج ہیں۔ مثلاً پنچم اور گندھاری لیکن مدھیمی بدل کر مدھیہ مادی ہوا اور آج کل ہمارے ہاں یہ مدھ مادھ کی شکل میں موجود ہے۔ بھرت منی کے ہاں کل ۲۹ جاتیاں تھیں جن میں سے ۱۸ خالص یعنی شدھ تھیں اور باقی ۱۱ مرکب۔ ان جاتیوں کے نام بھی تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر سات راگوں سے زائد راگ تھے تو ان کے نام کیا تھے؟ اور پھر دو مختلف راگوں میں جن کا وادی سور ایک ہی تھا، لوگ کیسے تمیز کرتے تھے؟

بہرحال وادی سور پر راگوں کو موسوم کرنا ان اصولوں میں سے ایک ہے جن پر راگوں کے نام رکھے گئے۔

راگوں کی دوسری وجہ تسمیہ ان کی قبائلی نسبت ہے۔ ہمارے کلاسیکی سنگیت کی بنیاد عوامی دھنوں پر ہے۔ انہی دھنوں کی تدوین کر کے ہماری کلاسیکی موسیقی مرتب ہوئی۔ چنانچہ بہت سے راگوں کے نام ان قبیلوں کے ناموں پر رکھے گئے جن کی وہ مخصوص دھنیں تھیں۔

غیر مروج راگوں میں ہمیں ایک راگ "ابھیری" ملتا ہے (کرناٹک سنگیت میں یہ اب بھی مستعمل ہے) دراصل یہ ابھیر قبیلہ کی مخصوص دھن تھی یہ قبیلہ چرواہوں کا تھا۔ منو کے زمانے میں اس قبیلے سے برہمن باپ اور چھوٹی ذات والی عورت کی اولاد مراد تھی لیکن مسیح کی ولادت کے قریب اس سے مراد وہ قبیلہ ہو گیا جو گلہ بانی اور گلہ رانی کر کے گزر اوقات کرتا تھا۔ بطلیموس (Ptolemy) ان کے علاقے کو ابیریا (Aberia) کہتا ہے۔ سوراشٹر (یعنی موجودہ کاٹھیاواڑ) کے ابھیروں کا ذکر مہابھارت میں بھی ملتا ہے۔ ان کی دیہاتی زندگی کی وجہ سے ابھیر کا مفہوم چرواہا ہو گیا یہ قبیلہ زیریں سندھ میں بھی آباد تھا۔ شمالی ہند میں یہ لفظ بگڑ کر اہیر ہو گیا۔ لیکن مراٹھی اور بنگالی میں یہ ابھی تک ابھیر ہی ہے۔ ابھیری راگ کا ذکر ہمیں متنگ کی برہا دیشی (پانچویں سے ساتویں صدی عیسوی) میں ملتا ہے۔ وہ اس راگ کا ذکر پنچم راگ کے متخرج راگوں کی ذیل میں کرتا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں راگ اہیر بھیروں اسی راگ کی ایک سنکرن شکل ہے۔

اسی قسم کا دوسرا راگ اندھرا ہے جس کا نام قبیلے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ اندھرا سے مراد تلنگانہ کا علاقہ ہے۔ بیسویں اور تلنگانہ کے براہمنوں کی ایک شاخ بھی تلنگانہ کہلاتی ہے۔ Pliny کے زمانے میں بھی لوگ اس علاقے کو اندھرا ہی کہتے تھے۔ چندر گپت موریا کے زمانے

میں اندھرا ایک دراوڑی قبیلہ تھا جس کی زبان تلگو تھی۔ اس قبیلے کے لوگ گوداوری اور کرشنا کے ڈیلٹا میں آباد تھے اور اپنے زمانے میں ایک فوجی طاقت تھے[1]

ایک اور راگ جس کا نام قبیلے کے نام پر رکھا گیا، دراوڑی ہے۔ لفظ دراوڑ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہاں اس لفظ کے مختلف مفاہیم میں جانا بے سود ہے۔ ظاہر صرف یہ کرنا ہے کہ راگ کا نام قبیلے کے نام پر مشہور ہوا۔

ساکا راگ، ساکا قبیلہ کی مقبول دھن تھی۔ ساکا وسط ایشیا کا ایک قبیلہ تھا۔ کشان اور یوچی قبائل سے پہلے یہ نقل مکانی کر کے ایران کے صوبہ سیستان میں آباد ہوا اور اس علاقے کا نام انہی کی وجہ سے ساکستان (SAKASTANE) پڑا۔ یہی بعد میں بدل کر سیستان بنا۔ ہندوستان میں اس کے داخلے کی تاریخ ۱۷۰ تا ۱۴۰ ق م خیال کی جاتی ہے انہی کی وجہ سے یہاں ساکا تقویم رائج ہو کر مقبول ہوئی[2]۔ یہ راگ پہلی دفعہ متنگ کی برہادیشی میں ملتا ہے اور آج بھی دیو ساکھ اور رچیا ساکھ کی مرکب شکل میں ہمارے سنگیت میں رائج ہے۔

قبیلوں کے ناموں پر راگوں کے اور نام مندرجہ ذیل ہیں۔

گجر قبیلہ سے گجری یا گوجری، کھوکھر قبیلے سے کھوکھر راگ، قنوج کے کھاری قبیلہ سے کھاری راگ، سوراشٹر قبیلہ سے سوراشٹری، جو بعد میں سورٹھ بنا، سوارا قبیلہ سے، جو چھوٹا ناگپور کے گرد و نواح میں آباد تھا، ساویری راگ، نٹ قبیلہ سے نٹ راگ، بھیروا قبیلہ سے بھیرویں[3] (شاید پلا قبیلہ سے پیلو[4])، کام بھوج قبیلہ سے کام بھوجی، جو شاید بعد میں کماج بنا۔ کام بھوج قبیلہ کے علاقے کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیپالی روایات کے مطابق یہ تبت کا علاقہ تھا، لیکن گریرسن کے مطابق یہ قبیلہ فارسی زبان بولتا تھا اور ہندوکش کے پہاڑوں میں آباد تھا[5]۔ اس قبیلے نے اشوک کے زمانے میں بدھ مت اختیار کیا۔ اس خیال کی تائید پانینی سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی کتاب "است ادھیائے" کے ادھیائے چہارم، سوترا ۱۷۵، پد نمبر ۱ کے مطابق کام بھوج قدیم ہندوستان کا ایک "جن پد"[6] (Cultural Unity) تھا جس کے بارے میں لاسن (Lassen) کا خیال ہے۔ کہ یہ دریائے جیحون کے منبع کے گرد و نواح کا علاقہ ہے۔ جہاں کوہستان پامیر کے پہاڑی لوگ آباد تھے۔ بہرحال اس قبیلہ نے ہمیں ایک راگ ایسا دیا ہے جو ان کے وقت سے لے کر اب تک چلا آتا ہے۔ اسی طرح ٹکا قبیلہ جو ہندوستان کی مغربی سرحدوں پر آباد تھا اور جس نے ٹیکسلا اور اٹک کو اپنے نام بخشے ہماری موسیقی میں بھی اپنا نشان چھوڑ گیا ہے۔ اس کی مقبول دھن ٹکا راگ بنی جو بعد میں ٹنک ہو گئی اور سری راگ سے مل کر سری ٹنک بنی۔ راگ ٹنکیشری اسی کی پیداوار ہے۔ تامل قبیلہ "ویلا اولی" سے ہمیں ہمارا بلاول راگ ملا۔ گونڈ قبیلہ سے گونڈ اور راجستھان کے ٹوڈا قبیلہ سے ٹوڈا راگ جو سنسکرت میں توڑیکا بنا اور پھر توڑی۔ اس شکل میں یہ آج ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ مالوا قبیلہ کا مخصوص راگ مالوی کہلایا۔ اس کی مختلف شکلوں کا ذکر بھی آگے ہوگا۔

---

[1] سمتھ۔ ارلی ہسٹری آف انڈیا۔ صفحات ۲۰۶ - ۲۱۳

[2] ساکا قبیلے کے سلسلے میں ملاحظہ ہو سمتھ کی محولہ بالا کتاب صفحات ۲۱۱ - ۲۲۶ - ۲۷۸ اور ایڈورڈز کی ہسٹری آف انڈیا۔ صفحہ ۶۴۔ مزید دیکھیں ٹامس کا مضمون "ساکستان" مطبوعہ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ سال ۱۹۰۶ء صفحات ۱۸۱ تا ۲۱۶ اور ۴۶۰ تا ۴۶۴

[3] سوامی پرجنانانند

[4] سوامی اپنی محولہ بالا کتاب میں اس کی نسبت پیلو درخت سے بتاتے ہیں۔

[5] ملاحظہ ہو جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۱۱ء صفحہ ۸۰۲

[6] اگروال India As Known To Panini صفحہ ۶۸۔ باقی تین جن پدیہ تھے۔ گندھارا ٹیکسلا سے دریائے کنار تک۔ کاپی سا موجودہ کافرستان اور دریائے کنار کا درمیانی علاقہ یعنی رو بست گری۔ پل بھیکا یعنی ہندوکش۔

تیسرا اصول جس کی بنا پر راگوں کے نام رکھے گئے ہیں، مقامی اور جغرافیائی مناسبت ہے۔ جس خطے یا علاقے کی کوئی دھن مقبول ہوئی، اس کا نام اسی خطے کی مناسبت سے رکھ دیا گیا اور وہ دھن اسی نام سے گرنتھوں میں درج ہو گئی۔

یہاں پہنچ کر ایک مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ قبیلوں نے جہاں اپنا نام راگوں کو دیا ہے، وہاں انھوں نے ان علاقوں کو بھی اپنا نام دیا ہے جہاں وہ آباد تھے۔ مثال کے طور پر سوراشٹر قبیلہ کے نام پر بھی سوراشٹر یہ راگ بھی ملتا ہے اور علاقہ بھی۔ اس لئے یہ تعیین کرنا مشکل ہے کہ اس ذیل میں آنے والے راگوں کے نام قبائلی نسبت کے حامل ہیں یا جغرافیائی نسبت کے۔

لیکن ان راگوں کے علاوہ بھی ایسے راگ بھی ملتے ہیں جن کی مناسبت محض جغرافیائی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل راگ۔

پہاڑی جموں اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کی مخصوص دھن ہے یمن ایک اور راگ ہے جس کا نام اپنی جغرافیائی نسبت کا اظہار کرتا ہے۔ دیس (دلی کے نواحی علاقوں کی دھن) پوربی (ہندوستان کے مشرقی صوبوں سے متعلق) براری (صوبہ برار سے) بنگال، بھوپال، کرناٹ وغیرہ ایسے نام ہیں جن کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ سندھوی، ملتانی، جونپوری۔ مانڈ بھی جغرافیائی نسبت کی غمازی کرتے ہیں۔ تلنگ تلنگانہ سے، کلیان کلیانی شہر سے (جنوبی ہند آندھرا پردیش) مارواریگستانی علاقہ راجستھان سے منسوب ہیں۔ مارو سے مراد ریتیلی زمین ہے۔ سنسکرت میں اس راگ کا نام مارو بکا تھا۔ جو بعد میں مارو بنا۔ اور بہاگ سے بہو ندر لگنے پر مارو بہاگ بنا۔ کوکبہ ایک اور نام ہے جس کی نسبت علاقائی ہے۔ کسی زمانے میں کوکبہ ضلع مظفر پور میں ایک مشہور شہر تھا۔

گوڑ کا لفظ ہماری موسیقی میں اکثر استعمال ہوتا ہے، گوڑ سارنگ، گوڑ ملہار، گوڑ ٹوڈی عام نام ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برہمنوں کی ایک شاخ گوڑ کہلاتی تھی اور اب بھی بنگال میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے اس علاقے کا نام بھی گوڑ ہی ہوا۔ اس لئے یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ گوڑ کے نام سے شروع ہونے والے راگوں کی مناسبت جغرافیائی ہے یا قبائلی۔ اسی طرح کا دوسرا نام کھمباوتی ہے گنگولی اس کی نسبت جغرافیائی بتاتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق مغربی گھاٹ پر ایک شہر کھمباوتی آباد تھا جس کا نام ستونوں کی بہتات کی وجہ سے کھمباوتی پڑا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ راگ Cambay کی (جو ہمارے ہاں کھمبات کہلاتا ہے اور جو رن کچھ کے قریب کا علاقہ ہے) مخصوص دین ہو۔ اس علاقے کی زبان بھی کھمباوتی کہلاتی ہے۔ سنسکرت میں اس راگ کا پرانا نام کھمباوتی تھا جو بعد میں کھمباوتی ہو گیا۔

یہاں یہ بتانا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں سات سوروں میں کم از کم دو کی نسبت جغرافیائی ہے۔ یہ دو سور گاندھار اور نشادھ ہیں۔ سنسکرت کی لغات نالندہ میں گاندھار کے جو معنی دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں: "ایک ملک کا نام۔ اس ملک کا باشندہ۔ ایک سینگران اگ" نشادھ کے بارے میں اسی لغات میں یہ درج ہے "بہت قدیم قوم جو آریاؤں سے پہلے آباد تھی، اس قوم کے لوگ مچھلی پکڑنے والے اور ڈاکہ ڈالنے والے۔ ایک ملک کا قدیم نام جس کا ذکر مہابھارت رامائن اور پرانوں میں ملتا ہے۔" رابسن کی رائے کے مطابق نشادھ کا علاقہ وندھیاچل کے شمال میں، مالوا کے جنوب میں اور ودربھا کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ مشہور راجہ نل کا یہی وطن[1] تھا۔

چوتھا اصول جو راگوں کی وجہ تسمیہ قرار دیا جا سکتا ہے، وہ ان کی شخصی نسبت ہے۔ جو راگ کسی مشہور گویئے کو مرغوب ہوا اور اس نے مرضی کے مطابق اس کے سوروں میں کچھ تبدیلی کر کے اپنے ڈھنگ سے گایا تو وہ اسی کی مناسبت سے مشہور ہو گیا۔ ہمیں بہت سے ایسے راگ ملتے ہیں جو لفظ میاں سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی، میاں کا سارنگ۔ یہ وہ مشہور راگ ہیں جو میاں تان سین سے منسوب ہیں۔ ان کے داماد بلاس خاں کے نام سے بلاس خانی ٹوڈی راگ مشہور ہوا۔ میرا بائی ہندی زبان کی مشہور شاعرہ

[1] ملاحظہ ہو رابسن Ancient India صفحہ ۱۶۷

گزری ہے۔ اس نے اپنی ساری عمر کرشن بھگتی میں گزار دی۔ اس کی وجہ سے ہمیں میرا بائی کی ملہار کا نام ملا۔ اسی طرح سور داسی ملہار، رام داسی ملہار، چرجو کی ملہار، بہادری، ڈھڈی، ہنومان ڈوڈی، حسینی کانہڑا وغیرہ راگ اپنی شخصی نسبت کے حامل ہیں۔ ملہار کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ راگ جغرافیائی نسبت کا حامل ہے۔ کرناٹک کے علاقے میں مختلف شولنگ جو پہاڑیوں پر نصب ہیں ملہار یا ملار کہلاتے ہیں۔ چونکہ میگھ راگ کا شو جی کے پانچویں منہ سے پیدا ہونا خیال کیا جاتا ہے۔ میگھ اور ملہار کے سر آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ان دونوں کا جذبہ یعنی "رس" بھی ایک ہی ہے۔ اس لئے یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ملہار راگ میگھ راگ سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ روایت بھی ہے کہ شیو نے ایک راکشس "ملا" کو برباد کیا تھا۔ اس لئے شوجی کو "ملاہاری" بھی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ملہار یا ملار اسی ملاہاری کی مسخ شدہ یا بدلی ہوئی صورت ہے۔

چنانچہ اس وجہ سے ہمیں راگوں کی وجہ تسمیہ کا ایک اور اصول ملتا ہے۔ یہ دیوی دیوتاؤں سے بعض راگوں کی مناسبت ہے۔ کسی وقت مختلف دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے لئے مختلف راگ مشہور تھے اور اس وجہ سے وہ انہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مثال کے طور پر راگ سرسوتی، شری یا سری راگ، بھیروں، شنکرا، درگا، نارائن، بھیم ایسے راگ ہیں جن سے ان کی مختلف دیوی دیوتاؤں سے مناسبت صاف نظر آتی ہے۔ کانہڑا ایک اور ایسا راگ ہے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نسبت "کاہن" یعنی شری کرشنا سے ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ راگ ان لوگوں سے متعلق ہو جو کنہڑی زبان بولتے ہیں۔ راگ کامود بھی شوجی سے متعلق معلوم ہوتا ہے کیونکہ "کام" یعنی وہ جس کی خواہش کی جائے، شوجی کا ایک غیر معروف نام ہے۔ لیکن اگر اس راگ کا نام کمود یا کمود ہے تو پھر اس کی مناسبت پھول سے ہے۔

بہت سے ایسے راگ بھی ملتے ہیں جن کے نام پھولوں اور پرندوں کی مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ مثلاً کسم (پھول) کملا (کنول کا پھول)، بڑہنس (بڑا ہنس)، ہنس کنکنی (ہنس کی گھنٹی)، ہنس دھن (ہنس کی آواز) کوکیلا (کوئل)، ناگ دھنی (سانپ کی آواز)، بھاگڑا جو کسی وقت وی بانگڑا تھا (پرندہ)

ہماری موسیقی میں موسمی روایات کو بہت دخل ہے۔ شروع شروع میں چھ راگ چھ مختلف موسموں کے لئے مخصوص تھے۔ پھر اس مناسبت میں مختلف موسمی تہوار بھی شامل ہو گئے۔ ان راگوں میں بسنت، میگھ، ہنڈول، بہار، دیوالی، پٹ منجری (جو کسی زمانے میں پرتھم منجری یعنی پہلی کونپلیں تھا لیکن بعد میں پرتھم منجری بنا اور اب پٹ منجری ہے) دیپک، ہٹ دیپکی وغیرہ ایسے راگ ہیں جن کی نسبت موسمی ہے یا وہ کسی نہ کسی تہوار سے وابستہ ہیں۔

یہ امر تو واضح ہے کہ شمالی ہند کی موسیقی پر بیرونی اثرات خصوصاً مشرق وسطیٰ کے اثرات بہت غالب ہیں اور یہی امر یہاں دونوں نظام ہائے موسیقی کو جدا کرنے کا باعث ہوا۔ ان اثرات کی نشان دہی ہمیں ایسے راگوں میں ملتی ہے جو غیر ملکی ہونے کے باوجود یہاں اپنا لئے گئے۔ اکبر نامہ کی شہادت کے مطابق صرف عہد اکبری میں تقریباً دو سو راگ ایسے مروج ہو گئے تھے جو غیر ملکی تھے۔ بدقسمتی سے ان کی تفصیل اب دستیاب نہیں ہوتی تاہم اب بھی کئی ایسے غیر ملکی راگوں کے نام ملتے ہیں جو یہاں مروج ہیں۔ ان راگوں میں یہ راگ شامل ہیں، آرابھی (عربی)، حجاز (حجیج)، زنگولہ (جنگلا) فراز، ساز گیری۔ ذیلف۔ سرپردہ (غیر ملکیوں کا راگ) غارا۔ شاہانہ۔ سگھرائی۔ اساوری اور کافی۔ اساوری اور کافی دونوں سنسکرت زبان کے الفاظ نہیں ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ غیر آریائی ہیں۔

کچھ راگ اپنے ماضی سے قطع تعلق نہیں کر سکے، جہاں کچھ نام زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے، وہاں یہ راگ من و عن ہمارے ہاں پہنچ گئے مثلاً پنچم لیکن کئی راگوں کے نام ظاہری طور پر تو وہی رہے البتہ ان کی معنوی حیثیت بدل گئی۔ مثال کے طور پر "پروبھاس" جو سارنگ دیو کے زمانے میں راگوں کی

تقسیم کا ایک حصہ تھا جس کے تحت کئی راگ آتے تھے۔ کچھ تو نابود ہو گئے۔ لیکن باقی ماندہ ایک راگ کا نام "وبھاس" ہو گیا جو ہمارے ہاں ببھاس کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح "سارنگ" لفظ "سالنگ" کی موجودہ شکل ہے۔ "سالنگ" بھی سارنگ دیو کے زمانے میں، راگوں کے ایک مخصوص سلسلے کے لئے استعمال ہوتا تھا اسی طرح راگوں کی ایک اور قدیم تقسیم میں راگوں کی ایک ترتیب "کریہ انگ" کہلاتی تھی جس کے تحت کئی ایک راگ آتے تھے۔ ان راگوں میں سے جو اب باقی ہیں، وہ اب بھی اس زمرہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان راگوں میں رام کلی، شوکلی، گن کلی، دیوکلی آتے ہیں۔ جو اصل میں رام کریہ، شوکریہ، گن کریہ اور دیوکریہ تھے۔

اب ہم ان راگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو مرکب راگ ہیں اور اصطلاحاً "چھایا لگ" اور سنکیرن راگ کہلاتے ہیں۔ راگوں کو کسی زمانے میں "سالنگ" (یعنی مفرد) اور سنکیرن (یعنی مرکب) راگوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ سنکیرن وہ راگ ہیں جو کئی راگوں سے مرکب ہوں۔ اور "چھایا لگ" وہ راگ ہیں جن میں کسی دوسرے راگ کی ترکیبیں، بغیر اس راگ کا بنیادی ڈھانچہ اور جذبہ تبدیل کئے، شامل ہو جائیں (راگ چھایا کی اسی زمرے سے مناسبت ہے) یہ سلسلہ بہت لمبا ہے لیکن اصولی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب دو راگ آپس میں ملیں اور ایک مرکب نام اختیار کریں تو اصلی راگ کا نام بعد میں آتا ہے اور شامل ہونے والے راگ کا نام پہلے مثلاً نٹ کامود یعنی کامود راگ میں نٹ راگ کی کچھ ترکیبیں شامل کر لی گئی ہیں تاہم کامود کلیان ایسا راگ ہے جو اصل میں کلیان ہے لیکن اس میں کامود کی ترکیبیں ضمنی طور پر شامل ہیں۔

کچھ راگ ایسے ہیں جو راگوں کے اشتراک کے لئے بہت مقبول ہیں۔ ان میں سے ایک راگ "مال" کی صورت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اس راگ سے کئی راگ ملتے ہیں۔ اصل میں لفظ "مال" مالوا کی مسخ شدہ شکل ہے۔ راگ مالوا کی مناسبت مالوا قبیلہ سے ہے جو کسی وقت پنجاب میں کافی اقتدار کا مالک تھا۔ چنانچہ اس میں شامل ہو کر مندرجہ ذیل راگوں کے نام ملتے ہیں:۔

مالوا کیشیکا جو بعد میں مالکونس بنا، مالوا گنجی جو اب مالگنجی ہے، اسی طرح مالوا گوری تھا جو اب مالیگورا بن گیا ہے، مالوا سری سے صرف مالسری رہ گیا۔ اسی قسم کے دوسرے راگ مالوا پنچم اور مالوا ساریکا تھے جو اب رائج نہیں ہیں۔

ایک اور راگ جو دوسرے راگوں سے اشتراک پیدا کرتا ہے "سری راگ" ہے۔ ٹنک میں شامل ہو کر یہ سری ٹنک بن گیا اور پھر اسی راگ سے ایک اور راگ پیدا ہوا جو منگیشری کہلاتا ہے، سری کانت، باگیسری، راگیسری، دھناسری اور سری انجنی اسی سری راگ کے مرکبات معلوم ہوتے ہیں۔

کلیان ایک اور راگ ہے جس میں کئی مختلف راگوں کا پیوند اچھی طرح لگ سکتا ہے چنانچہ اس سے مختلف راگوں کے ملنے سے ہمیں راگوں کے مندرجہ ذیل نام ملتے ہیں: بھوپ کلیان، شام کلیان، جیت کلیان، ہیم کلیان، کامود کلیان، شدھ کلیان، ایمن کلیان، بودیا کلیان، ساونی کلیان

اسی قسم کا ایک اور راگ جس میں اور راگوں کے پیوند لگتے ہیں یا جس کے پیوند دوسرے راگوں میں لگ سکتے ہیں نٹ راگ ہے۔ اپنی صحیح شکل میں وہ شدھ نٹ ہے لیکن دوسرے راگوں سے مل کر ہمیں راگوں کے مندرجہ ذیل نام ملتے ہیں: کلیان نٹ، چھایا نٹ، ہمیر نٹ، گور نٹ۔ دوسرے راگوں سے جب یہ راگ ملتا ہے تو ایسے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔ نٹ کامود، نٹ بہاگ، نٹ نارائن، نٹ ملار، نٹ بلاولی وغیرہ

بہار بھی ایسا ہی ایک راگ ہے۔ جو بآسانی دوسرے راگوں سے مل جاتا ہے چنانچہ اس کے پیوند سے ہمیں بسنت بہار، بھیروں بہار، باگیشری بہار، آڈانے کی بہار وغیرہ نام ملتے ہیں۔ ایسے راگوں کو اصطلاحاً ترمیل کے راگ کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا چند ایک ایسے اصول ہیں جن سے مختلف راگوں کے ناموں کی تشریح ہو سکتی ہے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے کسی ماہر لسانیات ہی کو اس طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ کوئی صاحب یہ بیڑہ اٹھائیں تو موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔

آغا بابر

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

۱۹۵۱ء میں کراچی میں کچھ مصوّر اکٹھے ہو گئے تھے۔ میری جب اُن سے ملاقات ہوئی تو ایک سے ایک مختلف تھا۔ شیخ احمد عمر کے لحاظ سے سینئر تھا۔ اسی پیشے میں مبارک حسین تھا۔

گل جی مقابلتاً نو عمر تھا۔ شام کو ناگی کے سٹوڈیو میں دھما چوکڑی مچتی۔ یہ سٹوڈیو دن کو بھی کھلا رہتا۔ بھولا بھٹکا مصوّر یا کسی مصوّر کا کوئی دوست ادھر آ نکلتا تو وہاں دم بھر کے لئے سستا لیتا۔ ناگی کی نفاست طبع نے اس سٹوڈیو کو "فرش سے عرش" تک ایک ایسے انوکھے انداز سے سجا رکھا تھا۔ کہ وہاں حالِ دل بیان کرنے کو جی چاہتا۔ خود ناگی جو کسب کمال اور فکر معاش میں لگا رہتا اپنے اسٹوڈیو میں کم ملتا۔

ایک دم سے آخر کیوں بے تکلف ہوا جائے؟ کیوں نہ سلوپائزن کی طرح سرایت کی جائے کہ متاثر ہونے والا فرد کہیں کا نہ رہے۔ میری کم آمیزی کے کچھ اپنے اصول ہیں مگر جب میں نے مصوّروں کی طرف رجوع کیا تو اُن میں ایک شخص ایسا تھا جو بے تکلفی کا بم مار کر سر پھوڑ دیتا۔ یہ مبارک حسین تھا جس کی سرمستیٔ گفتار اور بے تکلفی کا پہلے پونچا اور پھر ہاتھ پکڑنے کا انداز مجھے بار بار ناگوار محسوس ہوتا رہا۔

ایک دن میں تھکا ہارا دم لینے کو سٹوڈیو میں داخل ہوا جہاں مبارک فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت اور خوف تھا۔ "میں بیمار ہوں مجھے درد گردہ کے دورے پڑتے ہیں۔ اپریشن بھی کرا دیکھا ہے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بس زندگی کا ڈورا ٹوٹنا اب کوئی دن کی بات ہے....؟ یہ کہتا رہا میں سنتا رہا۔ پھر وہ سنتا رہا اور میں کہتا رہا"..... زندگی کے ہاتھوں تو ہم کبھی کے مر چکے ہیں۔ اب زندہ رہنا تو ہمارا اپنا کام ہے اپنے حوصلے اعتماد اور اپنی ڈھٹائی سے زندہ رہو تو رہو ورنہ مر جاؤ۔ دنیا ہماری قبر پر مٹی ڈالنے کو ہر وقت تیار ہے۔ اگر یہ چاہو کہ دنیا تمہیں کبھی نہ بھولے تو اُٹھ بیٹھو، تصویریں بناؤ۔ پھر زندہ رہ سکو گے"۔

یہ راز پاکر کہ یہ سارا بہروپ خوفِ مرگ اور اپنی تنہائی کو چھپانے کا تھا میں نے اور بننا شروع کر دیا۔

بیمار نے کروٹ بدلی۔ میری دوا کام کرنے لگی۔ وہ گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور بولا "چائے منگاؤں؟"

"اپنے لئے شربت روح پرور منگایئے" اور میں دہلیز پھلانگ کر چلا گیا۔

پھر میں نے دیکھا محفل میں بیشتر مبارک ہنسی کے غبارے بنا بنا کر اڑا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہرن کی چمک ہے۔ بدن چیتے کی طرح ہوشیار ہے۔ مگر یہ شخص گھنٹوں پلنگ پر لیٹا حقے کی نے منہ سے لگائے تنہائیوں میں کھویا رہتا ہے۔ تنہائیاں چاہتا بھی ہے اور اُن سے خوف بھی کھاتا ہے۔ ایکا ایکی مجھ پر اُس کی دو شخصیتوں کی گرہ کشائی ہونے لگی۔ اُس کی تصویروں میں درخت تنہا کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر کہیں نہ کہیں نرم زرد ابجر یا چشمے کا نیلا پانی ضرور دکھائی دیتا ہے۔

"کتنی عریاں اور فحش تصویریں ہیں"۔ ایک فرانسیسی عورت نے اُس کی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہا تو لوگ حیران رہ گئے۔
دھرتی کی ہریاول، آسمان کی نیلاہٹ، تیکھے پیڑ، پانی کے جھرنے، کس طرح فحش ہو سکتے ہیں" ایک نقاد بولا" اُس کے رنگوں کے دھیمے پن اور رچاؤ میں تو عریانی کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی"۔

فرانسیسی عورت نے مبارک حسین کی طرف دیکھا، مسکرا کر بولی "مصوّر سے پوچھ لو" ——— اور مبارک بلش کر گیا۔

نقادوں نے اُسے گھیر لیا۔ مبارک نے کہا" یہ فرانسیسی عورت بلا کی ذہین ہے۔ اُس نے مصوّر کے تحت الشعور میں جھانک لیا ہے ——— کیا تمہیں یہ ٹنڈ منڈ درخت ننگی عورتیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ عورتیں جو جنگل میں بازوؤں کو پھیلائے کھڑی ہیں"۔

نقاد ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک، جو تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا جا رہا تھا، پکارا" ان اُجلے نکھرے بادلوں کی اُنچان نچان کو دیکھو کیا یہ نسوانی کولہوں کا نشیب و فراز نہیں"۔ تصویر کا چور پکڑا جا چکا تھا جس کے فریبی چہرے کو سبھی دیکھ رہے تھے۔ مبارک کی آنکھ میں ہرن کی سی چمک پیدا ہوئی جیسے آہوئے رم خوردہ جال میں پھنس گیا ہو۔

یہ نمائش دوستوں کے بڑے طویل اصرار پر منعقد کی گئی تھی ورنہ وہ نمائش کرنے کا قائل نہیں۔ ایک دوست نے پوچھا" آخر تم اپنی تصویروں کی نمائش کیوں نہیں کرتے؟"

مبارک نے جواب دیا" اپنی تصویروں کی نمائش کرنا کچھ اس طرح کی بات ہے جیسے کوئی اپنی حسین و جمیل بیوی کا کسی اجنبی سے تعارف کراتے ہوئے کہے" میری خوبصورت بیوی سے ملاقات کیجئے"۔

مبارک کی عمر بائیس سال کی تھی جب اُس کی بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بیوی کے پیار میں اُس نے پینتیس سال بتا دیئے۔ روح کے کرب، درد اور تنہائی کو بُری طرح محسوس کیا مگر دوسری شادی نہ کی، نہ کسی سے دوسری محبت کی۔ چتا پر اپنی آرزوئیں اس طرح بھی کسی نے نہ جلائی ہوں گی شگفتہ اور ہنسوڑ مبارک کو دیکھ کر کبھی یہ سان گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اُس کی باغ و بہار شگفتگی کی سطح کے نیچے درد و کرب کی کتنی پیچ در پیچ لہریں سیلِ رواں بن کر موجزن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تصویروں میں ہمیں جھیلوں اور سمندروں کی سطح بے خروش دکھائی دیتی ہے۔ پانی طوفان میں بپھرا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ اس کی سطح کو نرم رَو لہریں گدگداتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اُس کی شخصیت کا ایک رُخ گدگداہٹ اور شگفتگی ہے۔ دوسرا رخ کربناک تنہائی اور پُربہار زندگی کی یاد جس کے طرح طرح کے رنگ ہیں، جن کے خمیر میں شعر و نغمہ کا امتزاج ہے۔ وہ مصوّر بننے سے پہلے موسیقار اور شاعر بھی تھا ؎

مہکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مبارک سکول ہی میں، چاک اور کوئلے سے دیوار پر نقش بنانے لگا جب کسی نے حوصلہ افزائی کی تو اُس نے سردار سکھ چرن سنگھ کی شاگردی اختیار کر لی۔
سردار سکھ چرن سنگھ خاندانی مصوّر تھا۔ اُس کے باپ سردار بہادر سردار رام سنگھ کو میو سکول آف آرٹس کا پہلا ہندوستانی پرنسپل ہونے کا فخر حاصل تھا۔
اس سکول کا سب سے پہلا پرنسپل انگریز تھا، لاک وڈ کپلنگ جس نے سردار رام سنگھ کی اعانت سے لاہور کے موجودہ عجائب گھر اور میو سکول آف آرٹس کا ڈیزائن تیار کیا تھا، پھر دونوں کی نگرانی میں یہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ خالصہ کالج امرتسر کی عمارت بھی سردار رام سنگھ کی ڈیزائن کردہ ہے۔ سردار رام سنگھ کے پرنسپل مقرر ہونے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ کالج کا کام کرنے میں رام سنگھ کی مثال نہ تھی۔ اس کام کی شہرت انگلستان تک پہنچی، ملکہ وکٹوریہ نے اُسے ولایت بلایا اور کہا مانگ کیا مانگتا ہے۔ رام سنگھ نے کہا" میو سکول آف آرٹس کا پرنسپل بنا دو"۔
رام سنگھ کے بیٹے سکھ چرن سنگھ کو ریاست نابھہ، جیند، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ وغیرہ میں راجاؤں کی پورٹریٹ بنانے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ وہ پورٹریٹ

بنانے میں بڑا ماہر تھا۔ مگر مبارک کے آزاد مزاج کو فطرت کی وسعتیں زیادہ اپیل کر گئیں۔ وہ لینڈ سکیپ کی طرف آگیا۔

مبارک کا اُستاد سکھ چرن سنگھ ابھی تک امرتسر میں ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے مبارک کے سینے سے کئی آہیں نکلتی ہیں۔ ہال بازار گرمو ڈیوڑھی، چوک فرید، کٹرہ مہا سنگھ اور دربار صاحب کا ذکر ہونے لگے تو سننے والے کو مبارک کے لہجے میں درد کی کسک محسوس ہونے لگتی ہے اُس کو اُس بیتی ہوئی زندگی سے بڑا اُنس اور محبت تھی۔

۱۹۴۳ء میں باٹا پور کی طرف سے ڈیزائنر کی آسامی کا اشتہار چھپا۔ مبارک حسین نے درخواست بھیج دی چن لیا گیا مگر افسر نے کہا "آپ کی باتیں بہت عمدہ ہیں۔ میں آپ کو پہلے شاپ مینجر کے طور پر ترقی کرنا چاہتا ہوں۔"

مبارک نے پہلے لاہور میں، پھر شملہ میں باٹا کی دوکان میں بطور شاپ مینجر کام کیا۔ مگر وہ کہتا ہے میں نے ایک سال بعد یہ کام چھوڑ دیا کیونکہ مجھے جوتے بیچنے پسند نہ آئے۔ کہنے لگا: "سنو میں اُن دنوں کا تمہیں ایک واقعہ سناؤں۔ آج کل تو "براسیئر" کا اتنا رواج ہے کہ ہر دکان کی شو ونڈو میں دکھائی دیتی ہے۔ اُن دنوں یہ چیکو سلاویکیہ سے آیا کرتی تھی اور صرف باٹا کی دوکان پر بکتی تھی۔ شملہ کی بارونق مال روڈ پر میری دکان تھی جس کی بلوریں کھڑکی میں نمونہ سجا تھا میں نے دیکھا ایک ستعلیق بزرگ بار بار گزرتے اور کھڑکی کی طرف غور سے دیکھ کر آگے نکل جاتے۔ میں اُن کا جائزہ لیتا رہا۔ اب کے جو وہ چکر کاٹ کر آئے تو میں نے آگے بڑھ کر کہا "آیئے تشریف لایئے"۔ وہ آئے مگر دکان کی دہلیز پر رک کر بڑے شرما کر پوچھنے لگے "اس کے کیا دام ہیں؟" میں نے کہا "ساڑھے تین روپے مگر اسے خریدنے کے لئے بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے جو فی الحال آپ جیسے لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی۔"

وہ فطرتاً حسن کا والہ و شیدا ہے۔ اُسے اپنے گردوپیش محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کئی عورتیں سمجھتی ہیں مبارک پر جادو چل سکتا ہے اور وہ بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ چل سکتا ہے۔ مگر یہ شعر ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں … جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اُس پر صادق آتا ہے۔ یہاں اُس کے حسن کی دلدادگی کی بات یاد آتی ہے۔ میرا ایک افسانہ "بادِ صحرا" اُس نے پڑھا۔ ملا تو بولا "تم بڑے ظالم اور شقی القلب ہو۔ افسانے میں ہیروئن کے حسن کو تم نے اتنی بے دردی سے کیوں بگاڑا تھا۔ حسن کو مسخ ہوتے دیکھ کر میرا دل دُکھتا ہے۔ تم نے میرا دل کیوں دکھایا۔ experience دو۔

ابھی مبارک پندرہ برس کا تھا جب اپنے اُستاد کے ساتھ مالیر کوٹلہ گیا۔ وہاں کے وزیراعظم دیوان سخاوت چند ملنے آئے۔ اُن کے ساتھ اُن کی دو حسین و جمیل جوان بیٹیاں بھی آئیں۔ دیوان صاحب باتیں کرتے رہے۔ مبارک نظریں نیچے جھکائے کھڑا رہا۔ اُستاد نے تنگ آکر کہا بادشاہو نظریں اوپر کرو۔ دیکھو تو دو بلائیں کھڑی ہیں۔ تم نے اس طرح حسن سے نظریں چرائیں تو کل کو آرٹسٹ کون بنے گا۔"

مبارک کی طبیعت میں نوع بہ نوع چھپے ہوئے رنگ اُس کی تصویروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر تصویروں میں مبارک کی تنہائی کی طرح دیکھنے والے کو بھی اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے جب اُس کا موقلم فطرت کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے تو اُس کے رنگ فطرت کی نرمی کی عکاسی کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے رنگوں میں ایک ایسے پرفن طریقے سے منصوبہ بندی برتتا ہے کہ کئی رنگ سرو رواں بن جاتے ہیں اور کئی جامد مگر مناظر میں یہ تاثر کوئی بے تعلق چیز بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ تصویر کے مجموعی تاثر میں ایک معنی خیز تضاد پیدا کر دیتا ہے۔ درخت اگر جامد ہیں تو آبجو حرکت کا پیغام بن جاتی ہے۔

اُس کی ہر تصویر کی قیمت بارہ سو روپیہ ہے۔ لینڈ سکیپ کی تین تصویریں مختلف نمائشوں میں صدر ایوب نے خریدیں۔ ایک لینڈ سکیپ راولپنڈی کی ..... بھارتی نے فرمائش سے بنوائی۔ میں نے اپنا کیمرہ مین دفتر میں بھیجا کہ مبارک کی تصویر کی فوٹو لے آئے تاکہ میں اُسے اپنے اِس مضمون میں شامل کر سکوں۔ وہاں کے ایک افسر نے کیمرہ مین کی درخواست کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم نے بارہ سو دے کر یہ پینٹنگ خریدی ہے اگر آپ اس کی فوٹو لے گئے تو ہمارے پاس کیا رہے گا؟

کیمرہ مین منہ لٹکائے واپس آگیا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور کہا "ہماری دور سے رشتے میں ایک خالہ سبحان بی ہوتی تھی۔ اُس نے ایک جگہ اپنے بیٹے کی منگنی کر دی۔ ایک دفعہ اُس سے کسی عورت نے کہا "خالہ بیٹے کی منگنی کی مبارک ہو"۔ خالہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "بہن مجھے تو یہ منگنی تو زکر ہی چین پڑے گا"۔ اُس نے پوچھا "کیوں؟" بولی "اے بہن سنو۔ لڑکی والوں کی طرف سے مجھے خط آیا ہے لکھتے ہیں ہم خیریت سے ہیں، تمہاری خیریت چاہتے ہیں۔ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ ابھی میں اُن کی لڑکی بیاہ کر اپنے گھر نہیں لائی کہ وہ میری خیریت چاہنے لگے ہیں۔ بہن اگر انہوں نے میری خیریت چاہ لی تو میرے پاس کیا رہا۔ لڑکی بیاہ لاؤں گی تو جانے وہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے جو ابھی سے میری خیریت چاہنے لگے ہیں"

وہ کامپلکس جو اکثر و بیشتر لوگوں کو ہوتے ہیں مبارک کی طبیعت میں ہرگز نہیں۔ میں ایک دن کراچی اُس کے مکان پر گیا۔ اُس کی والدہ ڈاکٹر طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ چولہے کے سامنے بیٹھا گوشت بھون رہا تھا اور دیگچی میں بڑے ساختہ پرداختہ طریقے سے چمچہ پھیر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بالکل نہیں ٹھٹکا بلکہ کہنے لگا اب کھانا کھا کر جانا۔

سلطانہ اور سلیم (اُس کی بیٹی اور بیٹا) نے اصرار کیا کہ "ابا آپ تو کمرے میں چارپائی پر بستر بچھا کر لیٹ جاتے ہیں اور حقہ پیتے رہتے ہیں۔ اس چارپائی کی جگہ میٹرس ہونی چاہیے۔ آپ دیکھتے نہیں میٹرس کا کتنا رواج بڑھ رہا ہے۔ کمرہ بھی اچھا لگے گا"

آخر بڑی رد و کد کے بعد اُن کے ساتھ جا کر میٹرس خرید لائے۔ سلطانہ نے کہا "دیکھئے نا کتنی اچھی لگتی ہے اور آرام دہ بھی چارپائی سے زیادہ ہے" اُس پر بیٹھے، لیٹے، حقہ پیا۔ بولے "اچھا تمہاری مرضی"

چارپائی کو فلیٹ کی چھت پر ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ ایک دن کمرے میں لیٹے لیٹے اُٹھے اور کڑاکے کی دھوپ میں اوپر چلے گئے۔ سب حیران، آگے نہ پیچھے یہ اس دوپہر میں اوپر کیا لینے گئے ہیں جب واپس آئے تو سلطانہ نے پوچھا "ابا آپ اتنی دھوپ میں اوپر کیا لینے گئے تھے؟" بولے "اپنی چارپائی کو دیکھنے گیا تھا۔ بے چاری دھوپ میں کھڑی ہے"

اب واضح ہو گیا ہوگا کہ اُسے فطرت سے کیوں محبت ہے اور وہ اپنی تصویروں میں دھیمی اور ہلکی لہریں کیوں بناتا ہے۔ وہ اپنے رنگوں میں بھرے ہوئے طوفانوں کو کیوں سلا دیتا ہے۔ اُس کی تصویروں میں گداز، سکون اور ٹھنڈک کہاں سے آتی ہے اور وہ فطرت کی اتنی نرمی کا عکاس کیوں ہے، سبزہ زار، دلکش وادیاں، بھرپور کھلیان، ہرے بھرے کھیت، سمندر کی گہرائی اور فطرت کی روئیدگی اُس کی تصویریں ہیں:

تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک لذتِ یکتائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

چودھری محمد صادق

سفر میں مطالعہ

ناظرین! میں نہ تو کوئی غصہ ور آدمی ہوں نہ اشتعال آمیز طبیعت رکھتا ہوں، اور نہ ہی تیز مزاج واقع ہوا ہوں۔ میرا ذہن خدا کے فضل سے ہر قسم کے خلل سے بھی پاک ہے۔ (چلئے صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ میں بفضل خدا دیوانہ بھی نہیں ہوں) اس کے باوجود یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ریل یا بس میں سفر کے دوران جب بھی مجھ سے کسی ہم سفر نے میرا اخبار یا رسالہ ہتھیایا ہے تو میں ہمیشہ ایک شدید عصبی ہیجان میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ جب یہ حادثہ مجھ پر وارد ہوتا ہے (اور یہ حادثہ مجھ پر کب وارد نہیں ہوا) تو یوں لگتا ہے کہ میرے دیدہ دلیر ہم سفر نے محض میرا اخبار یا رسالہ ہی مجھ سے نہیں ہتھیایا، بلکہ میرا دل و دماغ بھی اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ تب ریل کا ڈبہ یا بس کا خانہ مجھے علی بابا کی فوج سے بھرا ہوا نظر آنے لگتا ہے اور میں جی ہی جی میں اس شخص کی مجرمانہ حماقت پر پیچ و تاب کھانے لگتا ہوں جس نے گاڑیوں اور بسوں کے لئے لمبے لمبے برتھ ایجاد کرکے ان پر بیک وقت کئی اخبار چھین اور رسالہ جھپٹ حضرات کے بیٹھنے کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

میری ان باتوں کو خدارا کسی کٹکھنے پن پر محمول نہ کیجئے۔ آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ اگر کسی روز آپ مثلاً ملتان سے لاہور کی جانب رات کی گاڑی سے سفر کر رہے ہوں، تمام شب آپ اکتا دینے والے رتجگے میں مبتلا ہو کر یا تو کسی نچلے برتھ پر بیخ کی طرح ٹھک ٹھکا کر بسر کریں یا پھر کسی اوپر والے برتھ میں کنکوے کی طرح جھول جھول کر گذاریں۔ اس کے بعد آخر کار ٹرین کی کھڑ کھڑ، دھائیں دھائیں اور گڑپ گڑپ سے دور کہیں اندھیارے افق پر چپکے سے صبح صادق کی کلی کھل جائے۔ اور پھر جب آپ کی گاڑی ایک ادائے خاص کے ساتھ کسی نئے اسٹیشن پر رکے تو گاڑی کا شور تھمتے ہی باہر کی پرسکون مگر نو تراشیدہ فضا سے ایک ہاکر کی سنسنی خیز آواز آپ کو چونکا دے۔

"تازہ اخبار، لاہور کا تازہ اخبار، چیچو کی ملیاں میں ایک بچی کے چیچک نکل آئی...... شیخوپورہ میں ایک بس بھینس سے ٹکرا کر الٹ گئی... لنکا گو میں آبیمت پر قتل کرانے والی انجمن قائم ہو گئی...... لیجئے آج کا تازہ بخار لیجئے......"

ہاکر کی یہ صدا سن کر آپ ہڑبڑا کر اٹھیں اور تیزی سے کھڑکی کے قریب جا کر اس سے دو چار اخبار مانگیں۔ انہیں اپنی بغل میں داب کر دائیں ہاتھ سے اسے پیسے نکال کر دیں۔ اتنے میں یک بیک یوں محسوس ہو جیسے آپ کی اخبار والی بغل کے نیچے کوئی شے رینگ رہی ہے اور سر سرا رہی ہے۔ آپ گھبرا کر بغل کو ٹٹولتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھا دیں اور پھر جو لوٹ کر دیکھیں تو آپ کی "رونق بغل" لٹ چکی ہو، اور آپ کے خرید کردہ اخبار آپ کو ورق ورق ہو کر سارے ڈبے میں اندھے کی شیرینی کی مانند بٹتے ہوئے نظر آئیں۔ آپ ہی کہیئے کہ اس وقت آپ کے جی پر کیا عالم گذرے گا۔ یقیناً آپ کے مولانا جی" یہی چاہیں گے کہ آپ اسی کھڑکی کے راستے گاڑی سے باہر پلیٹ فارم پر کود جائیں اور پھر اخباروں کے ہاکر کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی یہ صدا لگانا شروع کر دیں:۔

"چھین لئے، میرے خریدے ہوئے سارے اخبار چھین لئے ــــ میرے ہمسفروں نے چپکے سے میرے تازہ اخبار میری بغل سے چھین لئے ــ"

لیکن میں یہ بات بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی اس باکرانہ فریاد پر کوئی توجہ نہ دے گا کیونکہ اس وقت ساری ٹرین کے مسافر کم و بیش آپ کے ڈبے کے مسافروں کی مانند دوسروں سے بے نیاز ہو کر اخبارات پڑھنے میں بری طرح محو ہوں گے۔

قارئین کرام! میں سفر میں مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت سے ناواقف نہیں ہوں، اور نہ ہی مجھے اس عادتِ شریفہ کی افادیت سے انکار کی مجال ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصرِ حاضر میں جبکہ زندگی کی رفتار تیز ـــــ بہت تیز ہو چکی ہے اور آدمی، دولت، شہرت، حکومت اور عظمت کی تلاش میں شب و روز کے چوبیس گھنٹے مادی قدروں کے مدار پر کسی مصنوعی سیارے کی مانند دیوانہ وار گھومتا رہتا ہے تو اس دیوانگی آمیز "گھمائی" کے دوران اسے کسی غیر مادی مشغلے مثلاً مطالعہ کتب وغیرہ کے لئے شاذ ہی کوئی وقت ملتا ہے۔ کسی پاکستانی دانشور (یا کسی مغربی مفکر یا پھر خاکسار ہی) کا یہ قول ہے کہ جدید انسان کو اپنی زندگی کی بے پناہ مصروفیات میں مطالعہ کا موقع صرف دو ہی صورتوں میں میسر آ سکتا ہے یا تو قید کے دوران میں یا پھر سفر کے دوران میں ـــ قید سے تو خدا سب کو بچائے، البتہ سفر سے فی زمانہ شاید ہی کسی کو مفر ہو۔ سفر کے وسیلۂ ظفر کو اختیار کرنے کے بعد کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو موٹے کی جانِ عزیز پر کھیل کر مطالعے کے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ ایسے حضرات دورانِ سفر دال موٹھ، مونگ پھلی، چلغوزوں اور گول گپوں کی خریداری پر تو اپنے (نہایت چلتے) پسینے کی کمائی بے دریغ لٹا دیں گے اور پھر ان جنتی میووں سے پیٹ کا دوزخ بھرتے وقت اپنے ہمسفروں کو جھوٹے منہ بھی صلا نہ دیں گے۔ لیکن کیا مجال ہے کہ چاٹوں کی چٹاچٹ بلائیں لینے والے یہ (بھوکے) بزرگ اپنے دماغ کے خالی گول گپے میں چٹپٹی خبروں کا گرم مصالحہ بھرنے کے لئے کسی اخبار پر چند ٹیڈی پیسے خرچ کریں۔ اس مقصد کے لئے اُن کی رال اگر ٹپکے گی تو کسی ایسے غریب ہمسفر کے زادِ راہ پر، جو اپنے سفر کی فرصتِ یک نفس کو یا تو راستے کے پیڑ گننے میں صرف کرتا ہے یا پھر اپنے موبل آئل جیسے گاڑھے پسینے کی کمائی سے خریدے ہوئے اخبارات و رسائل کے مطالعے پر ـــــ بدقسمتی سے میرا شمار ہمیشہ دوسرے گروہ میں رہا ہے اور مجھے جب بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے، میرے دیگر ہم سفر مثالِ پہلے گروہ کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میں لاہور جانے کے لئے ایک مسافر گاڑی پر سوار ہوا۔ سوار ہونے سے پہلے میں نے حسبِ عادت پلیٹ فارم کے بک اسٹال سے دو تین اخبارات اور ایک دو رسائل خریدے۔ اس کے بعد میں نے گاڑی کے ایک چھوٹے سے ڈبے کا رخ کیا جس میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مسافر تشریف فرما تھے۔ وہ سب حضرات چہرے مہرے سے مجھے قطعی طور پر مدرسے کی حاضری کی مصیبت سے محفوظ نظر آئے لہذا میں نے اطمینان کے ساتھ ایک سیٹ پر اپنا سامان اور اپنے رسائل و اخبارات رکھ دیئے اور پھر خود ایک کام سے ڈبے سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گارڈ نے سیٹی دے دی اور میں لپک کر اپنے ڈبے میں واپس پہنچا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرا دوسرا سامان تو جوں کا توں موجود ہے البتہ میرے اخبار اور رسالے ایک ایک کر کے ہر مسافر نے اپنے آغوش میں پھیلا رکھے ہیں اور سب بزرگ جن کے متعلق مجھے یہ حسنِ ظن تھا کہ ان کا بچپن مدرسے کی گھنٹی اور ماسٹر کی قمچی دونوں کی زیارت سے محفوظ رہا ہے، اب مجھے بے حد انہماک سے ملک کے بہترین اخبارات اور ادبی رسائل کے مطالعے میں مصروف نظر آئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جسم کو سنبھالا جس پر بیک وقت کانٹے بدلتی ہوئی گاڑی کے ہچکولوں اور میرے مقسوم میں لکھے ہوئے عصبی ہیجان کے دھچکوں کا حملہ ہو رہا تھا۔ اپنے سر کو ایک ہاتھ سے تھام کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گردن جھکا کر اس افتاد سے نروان حاصل کرنے کے لئے اپنی اندرونی روشنی کی رہنمائی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ روشنی بالآخر چمکی۔ تب میں نے سر اٹھایا۔ ایک نئے عزم سے سرشار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ میں نے اپنی لائبریری کے تمام خود ساختہ ممبروں کی خدمت میں فرداً فرداً حاضر ہو کر، قدرے گستاخانہ انداز میں سارے اخبارات و رسائل ان کے ہاتھوں سے کھینچ لئے اور ایک دم انہیں چلتی گاڑی کی کھڑکی میں سے باہر پھینک دیا۔

میرے تمام ہمسفروں کی آنکھیں ماتھوں پر اُبل آئیں اور ان کے چہرے تجریدی مصوری کے مرقعے بن گئے

"خس کم، جہاں پاک" میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "کمبخت کاغذ کے چند ٹکڑے، آدم زاد بھائیوں میں فساد کرانا چاہتے تھے۔ اچھا ہوا دفان ہو گئے۔"

"آپ نے تو حد کر دی بھائی جان" ایک آدم زاد بھائی بولے اور ساتھ ہی انھوں نے کھیس نکال دی۔

"جی ہاں حد بھی میں نے ہی پھاندی ہے۔" میں نے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ڈبے پر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو میرے ہمراہی گول گپوں کی نذر ہو گئے اور میں نے یوم شجر شماری منانا شروع کر دیا۔

ایک اور سفر کا ذکر ہے۔ میں جب گاڑی پر سوار ہوا تو صبح کا تازہ اخبار بھی میں نے اپنی مذکورہ بُری عادت کے تحت خرید لیا۔ اس روز میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ کسی ہم سفر سے نظر ملائے بغیر نشست پر جا بیٹھوں گا اور پھر فوراً ہی اخبار کا مطالعہ شروع کر کے اسے جلد جلد رفاہِ عامہ کے لئے فارغ کر دوں گا۔ چنانچہ ڈبے میں داخل ہوتے ہی میں ایک خالی سیٹ پر دھم سے جا بیٹھا اور پھر چشم زدن میں اخبار کو اپنے سامنے پھیلا کر اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ابھی میں نے شاہ سرخی پر ہی نظر دوڑائی تھی کہ میرے بین سامنے بیٹھے ہوئے ایک ٹمیم شمیم صاحب نے اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے نہایت باریک کام لیتے ہوئے بڑی نفاست سے اخبار کے اندرونی ورق کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور پھر ایک محیر العقول ڈکار لے کر وہ اس ورق کو اس خموشی اور چابکدستی کے ساتھ لے اُڑے کہ کوئی مشاق گوالا بھی اپنے مکھن میں سے بال اس ہنر مندی سے کیا نکالے گا۔ میں نے جی ہی جی میں ان کی اس استادی پر آفریں کہی، اپنی نظریں بدستور اپنے اخبار پر جمائے رکھیں اور اپنے اخبار کی گٹھڑی کو اس قسم کے دیگر خضر صورت بزرگوں سے بچانے کی خاطر کچھ اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اخبار کے مطالعہ کا سارا لطف وہ تیسرا ورق لے جانے والا دستِ غارت گر ساتھ ہی لے گیا تھا۔ چنانچہ باوجود شدید کاوش اور کاہش کے دماغ کی لوح پر مطالعہ کا کوئی نقش اُبھرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ پہلے صفحے کی دیگر سرخیوں پر ایک جھجکتی ہوئی نگاہ ڈال کر میں نے عالم بیزاری میں وہ صفحہ اُلٹ دیا۔ اور پھر دوسرے اور تیسرے جُڑے ہوئے صفحوں کو اپنے سامنے پھیلا لیا۔ عین اُس وقت مجھے اپنے دونوں شانوں پر کچھ نیا سا بوجھ محسوس ہوا۔ پہلے تو مجھے یہ گمان گذرا کہ آج میرے کراماً کاتبین اپنے وجود کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جو میں نے کنکھیوں سے اپنے دائیں بائیں نگاہیں دوڑائیں تو معلوم ہوا کہ میرا وجود کراماً کاتبین کے علاوہ کراماً قارئین کے پھندے میں بھی آ چکا ہے اور نظر آنے والے دو کاتب فرشتوں کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کے دو فرزندوں کی گردنیں بھی میرے دونوں شانوں پر ٹنگی ہوئی ہیں۔ فرق یہ تھا کہ میرے کندھوں پر سوار فرشتوں کی نظریں میرے اعمال پر تھیں تو ان دو انسانوں کی گردنوں کی نظریں میرے اخبار پر —— وہ لکھنے والے فرشتے تھے، یہ پڑھنے والے۔ میں نے ایک دبی دبی سی جھرجھری لے کر اپنے کندھوں کو اس بوجھ سے نجات دلانا چاہی لیکن تقدیر کے بار کو کون آج تک اپنی زندگی سے ہٹا سکا ہے۔ میرے بوجھ بھی بدستور اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ ایسے موقعوں پر خون کی وہ چھاگل جو ہر انسان کے اندر آویزاں ہوتی ہے، بڑا کام دیتی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اس چھاگل سے چند گھونٹ پی کر اپنے اخبار کو اس کی تقدیر کے حوالے کر دیا۔ میری بے لبی اور بسپائی کو بھانپ کر وہ دونوں گردنیں جیسے شیروں کی گردنیں بن گئیں۔ ان کی ٹھوڑیوں کے بھالے میرے ناتواں شانوں کی ہڈی میں پوری قوت سے نفوذ کرتے جا رہے تھے۔ ایک گردن جو ایک انسانی بدن کی بجائے ایک قد آدم معدے پر چسپاں تھی بار بار اپنے معدے کے دہانے سے صحرائے عظیم سے اٹھتی ہوئی بادِ سموم کے مرغولے اُگل رہی تھی اور دوسری اپنی طویل اور دبیز مونچھوں کے برش کے ذریعے میرے دائیں کان سے وقفے وقفے کے ساتھ میل نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں یہ سب کچھ سہتا رہا۔ بالآخر میں نے اپنے بقیہ دو ورقہ اخبار کو تہہ کیا۔ اور پھر نہایت عجلت اور

ہوشیاری کے ساتھ اسے بیچ میں سے پھاڑ کر میں نے اس کا ایک ورق معدے والی گردن کو دیدیا اور دوسرا ریش والی گردن کو۔ دونوں جلادوں نے ازراہِ ترحم ایک ہلکی سی متفقہ "ہوں" کے ساتھ اسے شرفِ قبولیت سے نوازا، اور پھر اپنے اپنے ورق پرستم مطالعہ فرمانے لگے۔ اُدھر میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے جلد ہی اخبار دان (بروزنِ چراغ دان) کی جون سے نکال کر دوبارہ جامۂ انسانی کا شرف عطا فرما دیا تھا۔

ایک اور سفر کا حال بھی سن لیجئے۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو باہر ہاکر نے تازہ اخبار کی ہانک لگائی۔ میں دروازے کی سمت لپکا اور پھر میں نے ایک تازہ اخبار خریدا۔ اخبار خرید کر میں اپنی سیٹ پر واپس آ رہا تھا کہ ایک نہایت مسکین صورت ہمراہی نے اپنے دُرجِ دہن سے کسی لفظ کا موتی بکھیرے بغیر اخبار میرے ہاتھ سے اثنائے راہ ہی میں (بڑے شریفانہ انداز کے ساتھ) کھسکا لیا۔ میری نگاہیں بے اختیار ان کی صورت کی طرف اُٹھ گئیں اور بخدا اس پر چھا جوں ہی مسکینی برستی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ یتیم ولیر اور بھولی بھالی شکل والے جلاد یقیناً اردو کے اس شاعر کے چیلے میں جس نے یہ شعر کہا تھا۔

اس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بولے   جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھالوں

ظالم نے میرا اچھوتا اخبار کچھ اس طرح اُڑایا تھا کہ اس سے پہلے اس کی ایک سُرخی کو بھی میرے روبرو لب کشائی کا موقع نہ دیا۔ میں نے اپنی پارہ پارہ خاطر جمع کی، اُلٹے پاؤں مڑا، یتیم الدولہ بزرگ کے ہاتھ سے بڑے ادب کے ساتھ اپنا اخبار کھینچ لیا۔ پھر میں نے جیب سے ڈھائی آنے نکالے۔ انھیں موصوف گرامی کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیا، اور آہستہ سے عرض کیا۔ "یہ لیجئے، اور اپنے لئے ایک اور اخبار خرید لیجئے۔"

حضرت یتیم الدولہ نے پیسے مٹھی میں بھینچ لئے اور پھر دانتوں کی نمائش فرمانے لگے۔ اُدھر میں کان لپیٹ کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

میں باوجود انتہائی غور و فکر کے آج تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ آخر لوگوں کو سفر کے دوران دوسروں کے ہاتھ میں کوئی اخبار یا رسالہ دیکھ کر مطالعہ کا دورہ کیوں پڑ جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دورانِ سفر آپ کے ہمراہی اول اول آپ کو قطعی حیوان ناطق ہی نظر آئیں گے اور یہی محسوس ہوگا کہ انھیں کھانے پینے اور سونے یا اونگھنے کے سوا دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں ہے لیکن اِدھر آپ نے کسی ہاکر سے کوئی اخبار یا رسالہ خریدا، اور اُدھر ان میں سے بیشتر پر ایک خاص قسم کا دورہ پڑا جس میں مبتلا ہو کر ان کی آنکھوں میں بڑی زہریلی چمک آجاتی ہے اور ان کے ہاتھ ہولے ہولے آپ کے اخبار یا رسالہ کی سمت بڑھنے لگتے ہیں۔ ایسے عالم میں آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے وہ صاحب جو صورت شکل سے کھاتے کھیلے ٹھیکیدار نظر آتے تھے، اب یک بیک جیسے کسی ریسرچ اسکالر کا روپ اختیار کر جاتے ہیں اور آپ کے اخبار یا رسالے پر کچھ اس طرح پل پڑتے ہیں جیسے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کا مواد انھیں صرف اسی اخبار سے مل سکتا ہے۔ ایک اور صاحب جو اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے بڑے ہی پُرخلوص انداز میں اونگھنے میں مصروف تھے اور انجن کی چھکا چھک کے سُر میں بڑی مہارت کے ساتھ اپنے نستعلیق خراٹوں کا سر ملائے جاتے تھے، ان کے لئے بھی آپ کے اخبار کے ورق کی کھڑکھڑاہٹ گویا صورِ اسرافیل ثابت ہوتی ہے اور وہ لقے کبوتر کی مانند اپنی گردن ایک جانب جھکا کر اپنی نیم وا مگر شعلہ مثال آنکھوں سے برابر آپ کے اخبار کو گھورنے لگتے ہیں کہ کب آپ کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور وہ اسے سمچا نگل لیتے ہیں ــــــ حالانکہ یہ وہی حضراتِ گرامی ہیں جن کے روبرو چند ہی لمحے پہلے ہاکر اخباروں اور رسالوں کا پورا کوہِ ہمالیہ اٹھائے گذرا تھا اور بڑی اشتہا افزا صدائیں لگا کر گذرا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی بزرگوار کے کان پر جوں تو کیا معنی، اس مخلوق کی اولاد کا کوئی جد امجد بھی نہ رینگا تھا۔ تب ٹھیکیدار بدستور اپنے خواص کا مظاہرہ کرتے رہے اور اونگھنے والے بزرگوار بدستور چھکا چھک کی تال پر خراٹے بھرتے رہے تھے۔ اس پر آپ کی جو شامت آئی تو آپ نے ماحول میں سب اچھا سمجھ کر ہاکر کی واپسی پر اس سے اخبار خرید لیا، لیکن ادھر اخبار آپ کے ہاتھ میں پہنچا اور اُدھر یہ حیوان ہائے ناطق یکدم انسان ہائے دانشور میں تبدیل ہو گئے۔

کہ ہم نے انقلاب چرخِ دوراں یوں بھی دیکھے ہیں۔

پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس مفت کے مطالعے کے شوقین حضرات دوسروں کے رسالے یا اخبار کو پڑھتے نہیں بلکہ پیتے ہیں۔ اخبار کو ہاتھ میں لینے کے بعد وہ اس کے رجسٹرڈ ایل نمبر سے لے کر اس کی پرنٹ لائن تک کو جرعہ جرعہ کر کے پڑھیں گے۔ پڑھیں گے کیا چوسیں گے اور اس دوران کچھ ایسے انہماک کا ثبوت دیں گے کہ آپ خواہ اپنا سر پیٹیں یا اُن کا، انہیں مطلق کوئی خبر نہ ہوگی۔

اہلِ بصیرت کہتے ہیں کہ جب کوئی قوم احکام الٰہی سے مسلسل روگردانی کو اپنا شعار بنالے اور شیری کی بجائے روباہی کا پیشہ اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ انھیں میں سے ایسے اشخاص کا ایک گروہ ان پر مسلط کر دیتا ہے جو جبر و ظلم اور جور و استبداد کے ذریعے ان پر زندگی کی عام نعمتیں بھی حرام کر دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہم اہلِ مطالعہ گاہ بگاہ پٹری سے اتر کر معیار سے گرا ہوا لٹریچر پڑھنے کی لغزش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس کی سزا قدرت کا قانونِ مکافات ہمیں اس طرح دیتا ہے کہ ہمارے سفروں کے دوران ہمارے ہمراہیوں ہی میں سے ایسے مفت خور قارئین ہم پر مسلط کر دئے جاتے ہیں جو ہم پر ان اوقات میں خود ہمارے خریدے ہوئے اخبارات و رسائل کا مطالعہ حرام کر دیتے ہیں۔ سُنا ہے کہ ایک مغنّی پرند کی جب موت آتی ہے تو اس کے اپنے ہی نغمے کی تانیں آتشیں لہروں کا روپ دھار کر اسے بھسم کر دیتی ہیں۔ میری رائے میں اسی طرح ان عذاب کے فرشتوں کے ہاتھوں اہلِ مطالعہ کے جذبۂ شوق کے لئے بھی قدرت خود انہی کے سامانِ مطالعہ کے ذریعے سامانِ فنا پیدا کر دیتی ہے۔ اللھم احفظنا!

ایک مدت سے میرے جی یہ خواہش لیی ہوئی ہے کہ سفر کے دوران کبھی تو کسی ہم سفر کے ہاتھ میں کوئی اچھی علمی یا ادبی کتاب یا معیاری مجلہ دیکھنے کو ملے لیکن اپنی قسمت کو کیا کہوں کہ مجھے اپنے ہم سفروں کے ہاتھ میں اگر کبھی کچھ دیکھنے کو ملا ہے تو مجاسوسی پنجہ" یا "لائین سیریز" کی قسم کا کوئی رسالہ۔ یا پھر مجھے اپنے ہم سفروں میں ایسے حضرات ملے جن کا ذکر جمیل پہلے کر چکا ہوں۔ خدا ہی جانے علمی و ادبی کتب و رسائل کو ہمارے ہاں کون پڑھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے رسائل و کتب کے شوقین حضرات (اپنے تجربات سفر کے پیش نظر) لازماً ان کا مطالعہ کہیں مضبوط قلعوں یا مقفل دروازوں کے اندر یا کھیتوں میں چھپ چھپا کر کرتے ہوں گے تاکہ وہ مفت خور قارئین کی پرچھائیں تک سے محفوظ رہیں۔ البتہ ایک شاید میں ہی ایسا ہوں، کہ جو اب تک اہلِ دانش کے اس اصول پر عمل نہیں کر سکا۔ اس عادت سے اکثر توبہ کرتا ہوں، لیکن بک اسٹالوں کی جنت نگاہ کے روبرو جا کر یہ توبہ ہر بار ٹوٹ جاتی ہے۔ مجبوراً میں نے مفت خور قارئین سے بچنے کے لئے ایک مدت کے تجربات کے بعد چند تدابیر وضع کی ہیں جنھیں اپنے ہم مسلک و ہم مشرب حضرات کے بھلے کی خاطر درج ذیل کر رہا ہوں:۔

۱۔ سفر سے پہلے اخبارات و رسائل خرید کر انھیں اسٹال ہی پر کسی بیگ میں محفوظ کر لیں، بہتر ہوگا کہ اخبارات کا ورق ورق علیحدہ کر لیا جائے۔

۲۔ جب گاڑی چل پڑے تو کسی اخبار کا ایک ورق بیگ سے اس طرح نکالیں کہ آپ کے ہمراہی دوسرے اوراق کی جھلک نہ دیکھ سکیں۔

۳۔ جو اخبارات آپ پڑھنے کے لئے نکالیں۔ اس کے ورق کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلائیں کہ کسی کو یہ اخبار آپ کے ہاتھ سے صحیح و سلامت چھڑانے کا یارا نہ ہو، ورق کا ایک صفحہ پڑھ کر جب اسے اُلٹنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے برق رفتاری سے اُلٹیں۔ یہ موقع اخبار جھپٹ حضرات کے نزدیک سنہری موقع کہلاتا ہے۔

۴۔ دورانِ مطالعہ ہم سفروں سے اخلاق یا ملائمت سے پیش آنا حد درجہ خطرناک ہوگا۔ اس عرصے میں کسی ہم سفر سے بات کرنا تو کجا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور اپنے چہرے پر زبردست رعب اور خشونت طاری رکھنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ کو کہیں سے شاہانہ برانڈ کی لمبی لمبی بارعب نقلی مونچھیں میسر آ سکیں، اور انھیں سفر سے پہلے ناک کے نیچے لگا لیں تو انشاء اللہ زیادہ بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ مطالعے سے پہلے آپ کا

جو وقت بھی سفر میں گذرے، اس دوران کسی ہم سفر سے کوئی اخلاقی برتاؤ نہ کریں، نہ کسی کے ساتھ تعارف کی طرح ڈالیں، ورنہ کسی کو لفٹ دیں۔ یہ مستقبل کے لئے بہت تشویشناک ہوگا۔

۵۔ دورانِ مطالعہ کھانسنے سے بھی اجتناب کیا جائے ممکن ہے آپ کی کھانسی پر کوئی تاک میں بیٹھا ہوا اخبار خور ہمراہی مزاج پرسی کے بہانے آپ کے اخبار پر دندانِ حرص و آز گاڑ دے۔

۶۔ دن میں صرف اخبارات ہی کا مطالعہ کریں اور رسائل کے مطالعے کے لئے رات کی آمد کا انتظار کریں۔ اس موقع پر اکثر ہمراہی فتنۂ خوابیدہ بن جاتے ہیں۔ رسائل کے مطالعہ کے لئے ایسے اوقات میں اوپر کے برتھ پر لیٹ جانا (یا پھر اس سے لٹک جانا) بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

۷۔ اگر ان احتیاطی تدابیر کے باوجود کوئی ہمراہی آپ کے اخبار پر اپنا دستِ ظلم دراز کرے تو اس کا فوراً تدارک کریں۔ ایک دم اس کی سمت آنکھیں پھاڑ کر دیکھیں اور پھر اس کی چٹکی سے اخبار کو چھڑوا کر (یا پھڑوا کر) فوراً دوسری جانب پہلو بدل لیں، بلکہ موثر اور نتیجہ خیز صورت تو یہ ہے کہ سیٹ پر کھڑے ہو جائیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہ احتیاطی تدابیر صرف اس صورت میں آپ کے لئے مفید ہوں گی اگر آپ کا شمار شومئ قسمت سے قارئین کے اس گروہ میں ہے جو سفر کے دوران اپنی گرہ سے اخبارات و رسائل خرید کر ان کے مطالعہ کا قائل ہوتا ہے لیکن اگر خوبیٔ تقدیر سے آپ کا شمار اس گروہ میں ہے جو مجھ سے بدنصیبوں سے ہتھیائے ہوئے رسائل و اخبارات پڑھ کر اپنا سفر کاٹتے ہیں اور آپ اس وقت بھی میرا یہ مضمون کسی ہتھیائے ہوئے رسالے میں پڑھ رہے ہیں، تو پھر میں اپنے اس ناچیز مضمون کو بکمال انکسار و بصد آداب آپ ہی کے نام معنون کرتا ہوں!

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

ایوب صابر

گذارشِ احوالِ واقعی

سچ بات ہے حضور کہ افسر نہیں ہوں میں
اک فرد سے بھی شہر میں برتر نہیں ہوں میں
لیکن کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں
عالی وقار! اتنا بھی کمتر نہیں ہوں میں
نادار آدمی ہوں، گداگر نہیں ہوں میں

اہلِ ہنر ہوں پھر بھی نہ گھر ہے نہ گھاٹ ہے
جاگیر ہے الاٹ نہ بنگلہ الاٹ ہے
بزمِ مشاعرہ میں تو کیا ٹھاٹ باٹ ہے!
گھر میں مگر اثاثہ فقط ایک کھاٹ ہے
مفلس مہاجروں سے بھی بہتر نہیں ہوں میں

پیدل ہو یا سوار، کوئی پوچھتا نہیں
اب میرا حالِ زار کوئی پوچھتا نہیں
دامن ہے تار تار کوئی پوچھتا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
افسوس، بارسوخ سخن ور نہیں ہوں میں

آیا ہے قرض لینے مرا کوئی قرض خواہ
کیسے قدم اُٹھیں کہ اب اٹھتی نہیں نگاہ
پائی نہیں ہے جیب میں اک بھی خدا گواہ
کوئی مجھے بتاؤ، کہاں جا کے لوں پناہ
کوئی اسے بتاؤ کہ گھر پر نہیں ہوں میں

میری غزال اے مری محبوبِ خوش جمال
یوں چوکڑی نہ بھر، مجھے تکلیف میں نہ ڈال
لازم ہے تجھ کو اپنے شکاری کا بھی خیال
بے آبرو نہ کر مجھے، گھر سے نہ یوں نکال
عاشق ہوں، تیری قوم کا لیڈر نہیں ہوں میں

اے دل وہ خوشگواریٔ حالات بھی گئی
محبوبِ خوش جمال کی بارات بھی گئی
کی تھی جو اُس کے باپ سے، وہ بات بھی گئی
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
سادات سے تو رتبے میں بڑھ کر نہیں ہوں میں

بیگم یہ کہہ رہی ہیں کما کر بھی لائیے
پازیب اور ساتھ ہی جھانجھر بھی لائیے
بندیا بھی لائیے، کوئی جھومر بھی لائیے
سونے کے اور چاندی کے زیور بھی لائیے
کیسے یقیں دلاؤں کہ زرگر نہیں ہوں میں

بیگم یہ چاہتی ہیں، الگ اک جہان ہو
بچوں کی فوج اُن کے ہی زیرِ کمان ہو
اُن کا ہر ایک لختِ جگر چیف خان ہو
اور نام پر ہر ایک کے پختہ مکان ہو
لیکن بحالیات کا افسر نہیں ہوں میں

کوئی مبالغہ ہے نہ اس میں ہے کوئی لاف
میں کر رہا ہوں آج ہر اک بات صاف صاف
کرتا ہوں اپنی بادہ کشی کا بھی اعتراف
کافی بہک گیا ہوں مری ہر خطا معاف
یارو! حدودِ ہوش کے اندر نہیں ہوں میں

قاضی عبدالغفار

اداجعفری

اداجعفری (سابق ادابدایونی) کے کلام کے مختصر فنی جائزے کے لئے، جنگ سے پہلے ہم نے ہندوستان کے ایک نامور نقاد سے درخواست کی تھی اور انھیں ادا کی مندرجہ غزلوں کی نقول بھی بھجوا دی تھیں۔ مگر ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء تک ان کا موعودہ مضمون موصول نہ ہو سکا۔ ہم نے ادا کے تازہ کلام کی اشاعت اسی لئے روک لی تھی۔ مگر اب وقت کم تھا، اس لئے ہم قاضی عبدالغفار مرحوم کی اس تحریر کے چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو ادا کے اولین مجموعۂ کلام "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں بطور دیباچہ درج ہوئی تھی۔ یہ ان کی یکم فروری ۱۹۵۰ء کی تحریر ہے اور گزشتہ ۱۵ برس میں ادا کے فن نے جو نئی منزلیں طے کی ہیں اور جن نئی بلندیوں کو چھوا ہے اس تحریر میں ان کے جائزے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاضی عبدالغفار مرحوم کی یہ تحریر ادا کے فن کی بنیادوں کو سمجھنے میں قارئین کی صحیح رہنمائی کرے گی۔ "ادارہ"

ادب اور شعر کے میدان میں، جو عمومیت کے جذبات کا ایک بہت وسیع میدان ہے، ابھی تک خواتین کے صرف چند ہی نام نمایاں ہیں۔ جدید ادب اور شعر کے معماروں کی صف اول میں محترمہ ادا بدایونی کا نام اور کلام نمایاں ہے۔ یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے خواتین کو اپنی طرف رجوع کر لیا ہے، موجودہ دور کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خواتین جو عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہوا کرتی ہیں۔ اب زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہیں اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار بننے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ ادا جیسی خواتین کا یہ رجحان جدید ادب کا ایک نشانِ راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ملک کے ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں مجتمع ہو رہی ہیں۔

ادا کے کلام میں ان کانٹوں کی نوک صاف نظر آ رہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔ انھوں نے جو جدید ادب کی نمائندگی کی ہے اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے عام طور پر ان کی فکر و سخن اور انداز بیان کے بعض گوشوں کی طرف سرراہ چند اشارے کرتا ہوں۔ فنی نقطۂ نظر سے، جو زیادہ تر قدیم نقطۂ نظر ہے۔ ادا کی شاعری میں اقبال، جگر اور فانی کے اسلوب بیان اور طرز فکر کے علاوہ منظر نگاری اور ترنم کا ایک پہلو کافی نمایاں ہے۔ اقبال کے اثرات کے ہلکے ہلکے نقوش بعض مقامات پر بہت پرکیف ہیں۔ جگر کے تغزل کا رنگ بھی کہیں کہیں جھلکتا ہے یا پھر ادھر ادھر چند جواہر پارے فانی کی طرز بیان یاد دلاتے ہیں۔ مناظر نگاری کا رنگ ان سب سے جدا ہے لیکن مناظر میں بھی کہیں کہیں لہجہ بہت غمگین ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ شاعر کو مایوس تو کبھی نہیں ہونا چاہیئے مگر غمگین ہونا چاہیئے۔ ایک چیز اور بھی ادا کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ وہ طنز کی ہلکی سی چاشنی ہے۔

ہیں جدید ادب کو فن کے قدیم پیمانوں میں سختی کے ساتھ جانچنے کا قائل نہیں۔ جدید ادب عوام کے لئے نئی زندگی کا ایک پیغام لایا ہے۔ لہٰذا اس کے جانچنے کا سب سے زیادہ معتبر پیمانہ اس کی اثریت ہے۔ اگر میں دیکھوں کہ کسی شاعر نے عوامی زندگی کی نبض پر انگلی رکھی ہے اور اس نے اپنے کلام میں وہ اثر پیدا کئے ہیں جن سے عوام کے قلوب میں گرمی اور ذوق عمل پیدا ہو سکتا ہو تو میں قطع نظر تمام دوسرے مضمرات کے، اس کو بلا تکلف استادانِ فن کی صف سے بھی آگے بڑھا دوں گا۔ ادا کے کلام میں جہاں کہیں یاس اور مایوسی کا کوئی پہلو نظر آتا ہے تو اس کے دوش بدوش ہم امید اور ایک بے محابا جذبہ کارفرما دیکھتے ہیں جو شاعرہ کے کلام کی تکمیل کر دیتا ہے۔ یاس اور بیزاری کے پہلو میں بھی ایک جذبۂ طلب ہے۔ ان کی آواز سراپا طلب اور احتجاج ہے۔ ان کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہو سکتا۔ عہد جدید کی گود میں ہر اس معمار کے لئے ایک جگہ موجود ہے جو شعر و سخن کو محض فن کاری کے دائرے سے باہر لے جا کر عوام کی زندگی کے وسیع ترمیدانوں میں حقوقِ انسانیت کے مطالبے کی آواز بنا دے۔ ہم اب اس منزل سے بہت دور نکل چکے ہیں جہاں اس موضوع پر بحث ہوا کرتی تھی کہ آیا صحیح نظریہ ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔ شاعری کی حسن کاری اب بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور کمالِ فن کا اب بھی ایک معیار قائم ہے لیکن زمانے کے تقاضوں نے جن شعراء کو جدید ادب کی طرف مائل کر دیا ہے۔ وہی ان تقاضوں کی صحیح تعمیل کر رہے ہیں۔
اس عہد حیات میں حسن کاری اور آرٹ کا جو صحیح مقام ہے، اسے خود علامہ اقبال نے اپنے صرف ایک ہی مصرع میں بیان کر دیا ہے ع

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اقوام عالم کی زندگی میں شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب کی تقسیم نظم زندگی کے ہر شعبے میں ایک لازوال قانون ہے۔ ہمارا جدید ادب طاؤس و رباب کی منزل کو پیچھے چھوڑ چکا ہے اور زندگی کے دائرے میں وہ قدیم فن اور حسن کاری کے نقطۂ نظر سے گزر کر پھر زندگی کے ان واجبات کو پکار رہا ہے جن کو اقبال کی اشاریت نے "شمشیر و سناں" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جدید ادب کے اس چھوٹے سے مگر تیز گام قافلے میں جب کسی نئے مسافر کا اضافہ ہوتا ہے تو میں اس مسافر کو فن اور قواعد کے ترازو میں تولنے کی بجائے اس طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ ایک اور بلاکش اور بلاکیش، محفلِ زنداں میں آیا جو زندگی کے نئے ساز پر نئے گیت گاتا ہے۔ محترمہ ادا کے کلام پر میں جو ان چند سطور کے لکھنے پر آمادہ ہوا تو اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میری تھکی ہوئی عمر ابھی اتنی نہیں تھکی ہے کہ جدید ادب کی شورش انگیزی کا خیر مقدم بھی نہ کر سکے۔

ادا جعفری

خاکِ وطن کو سلام

یہ خاکِ پاکِ وطن، آبروئے اہلِ وطن　　یہی مراد، یہی جستجوئے اہلِ وطن
یہ سرخ رو ہے کہ اس کے جوانِ رعنا نے　　دیئے ہیں خونِ جگر، خونِ دل کے نذرانے
نفس نفس میں بسائے نگار کی خوشبو　　نظر نظر میں رچائے نگار کی خوشبو
کسی کی مانگ کی افشاں، کسی کی آنکھ کا نور　　کسی کی قوتِ بازو، کسی کا ناز و غرور
رضائے حق کے لیے سوئے کارزار بڑھے　　یقین و عزم کی راہوں کے شہسوار بڑھے
مثالِ شمع ہیں شمعِ ہُدیٰ کے پروانے　　خدا کے حکم پہ دوڑے خدا کے دیوانے
کہاں کہاں سے تمنا کے قافلے گزرے　　وفا کی راہ میں کیا کیا نہ مرحلے آئے
یہیں پہ خونِ شہیداں سے لالہ زار کھلے　　یہیں پہ اہلِ شجاعت گلے بقا سے ملے
یہ خاکِ پائے مجاہد ہے احترام کرو　　نگاہ و آنکھ سے، اس خاک کو سلام کرو
اسی کو سرمۂ چشمِ حیات ہونا تھا　　اسی کے ذرّوں کو انجم صفات ہونا تھا
چلو تو نقشِ قدم سے قدم بچا کے چلو　　بہ فخر و ناز چلو، سر مگر جھکا کے چلو
عطائے حق کا یہیں فیضِ عام ہونا تھا　　اسی زمیں کو گردوں مقام ہونا تھا
یہ راہِ حق کے مسافر، یہ عزم کے پیکر　　یہ اہلِ ظرف، یہ اہلِ ہمم، یہ اہلِ نظر
مجاہدانِ جری، غازیانِ سینہ سپر　　رہِ نجات کے رہرو، حیات کے رہبر
اُٹھے تو کوہِ گراں کا وقار بن کے اُٹھے　　بڑھے تو تندیٔ برق و شرار بن کے بڑھے
جو ڈٹ گئے تو ہواؤں کا رخ بھی موڑ دیا　　بپھر گئے ہیں تو آفاق کو جھنجھوڑ دیا
عدو کا پنجۂ ظلم و ستم مروڑ دیا،　　غرور اور سرِ پُرغرور توڑ دیا
قدم نہ پیچھے ہٹے جسم و جاں پہ جو بھی بنی　　سوا خدا کے کسی در پہ یہ جبیں نہ جھکی

سوا خدا کے کسی در پہ یہ جبیں نہ جھکے
یہ صاحبِ عمل و صاحبِ یقیں نہ جھکے
کہیں بھی رہ میں اندھیرا نہیں ہے ان کے لیے
ہیں ان کے ہاتھ میں ایمان و آگہی کے دیئے

ادا جعفری

امتحانِ وفا

پہلے بھی بزمِ شوق سے ہم سرخرو اُٹھے
پہلے بھی امتحانِ وفا میں شریک تھے
پہلے بھی کوئے دوست میں وہی ہیں گواہیاں
گھر مٹوں کی چاندنی سے مٹائیں سیاہیاں
خاکِ چمن کو نذر کیے مامتا کے پھول
افشاں بنائی عرصۂ مہر و وفا کی دھول
ہر پھول ہر کلی کو زباں بخشتے رہے
حسنِ عذارِ لالہ رخاں بخشتے رہے
رنگِ شفق کو حل کیا رنگِ حنا کے ساتھ
ڈولے قدم سحر کے تو تھاما تھا ہم نے ہاتھ
کتنے نجوم سوئے تو جاگا تھا آفتاب
ڈوبے تھے کتنے چاند تو ابھرا تھا آفتاب
پہلے بھی امتحانِ وفا میں شریک تھے
پہلے بھی بزمِ شوق سے ہم سرخرو اُٹھے

اور اس سے پہلے دجلہ و کوفہ گواہ ہیں
اُٹھے جو اہلِ درد تو پھر بے پناہ ہیں
پھر آج گھر کے آئی ہیں باطل کی آندھیاں
پھر اپنے آشیاں پہ کڑکتی ہیں بجلیاں
پھر آج آزمائشِ ہمت ہے دوستو
پھر امتحانِ جذبۂ غیرت ہے دوستو
کس کس کے نام نامۂ الفت ہے دوستو
کس کا نصیب تاجِ شہادت ہے دوستو
کرنا ہیں پھر سے عام سحر کی شہابیاں
خونِ جگر سے بھر کے تندھا دو گلابیاں
سنولا گیا بہار کا مکھڑا، سنوار دیں
آنچل گلوں کے سرخیٔ خوں سے نکھار دیں
پھر امتحانِ جبر و رضا و وفا ہے آج
پھر خیر و شر میں معرکۂ کربلا ہے آج

ادا جعفری

رہِ یک گام

مبارک نوعِ انسانی کو، انساں جاگ اُٹھا ہے
مسلماں کی قیادت کو مسلماں جاگ اُٹھا ہے
جو اک چھوٹی سی چنگاری دبی تھی زیرِ خاکستر
اُسی سے نور لے کر مہرِ تاباں جاگ اُٹھا ہے
نشاں مٹ جائے گا دُنیا سے کفرِ کینہ پرور کا
کہ فرمانِ الٰہی کا نگہباں جاگ اُٹھا ہے

جہاں خونِ جگر سیرابیٔ گلشن سے کترائے
جواں مردوں پہ ایسی زندگی الزام ہوتی ہے
یہ وہ سر ہیں جو کٹ جاتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے
یہاں باطل کی اک اک آرزو ناکام ہوتی ہے
جیالے جب لگا دیتے ہیں اپنی جان کی بازی
خزاؤں سے بہاروں تک رہِ یک گام ہوتی ہے

میرے شہید

مرے دلیر! مرے نوجواں، مرے غازی
فنا کی بات نہ چھیڑو، بقا کا ذکر کرو
چراغ اب بھی فروزاں ہے، آنکھ اوٹ سہی
اندھیرا چھٹتا ہے لوگو، ضیا کا ذکر کرو
مرے مسافرِ شہرِ وفا کا ذکر کرو!

مرے شہید! ترے خون کے چراغوں سے
ترے وطن کے اندھیروں نے روشنی پائی
نشانِ راہِ عمل ہیں ترے نقوشِ قدم
کہ تیری موت سے ایماں نے زندگی پائی

ے میجر ضیاءُ الدین عباسی (شہید) ستارۂ جرأت

ادا جعفری



گھبرا کے ترا غم بھی ہمیں چھوڑ نہ جائے
اس راہ میں بن جاتے ہیں اپنے بھی پرائے

دل نے غمِ دوراں کے بڑے ہاتھ بٹائے
ہم ترکِ تمنّا سے بھی آگے نکل آئے

یہ تو نہ گلہ ہو کہ مدارات نہیں کی
لو اپنے چراغوں کی دلِ زار بڑھائے

تاریکیٔ دوراں میں ترے غم کے اُجالے
تپتی ہوئی راہوں میں تری یاد کے سائے

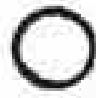
ہم بھی کبھی شائستۂ آدابِ وفا تھے
جینے کے ہمیں طور زمانے نے سکھائے

پہنائیِ جاں سے ابھی واقف نہیں شاید
کہہ دو غمِ دوراں سے نگاہیں نہ چُرائے

کس منزلِ بے نام میں دل چھوڑ چلا ہے
اب ہم سفرو! کون ہے جو راہ دکھائے

صدیوں کے اندھیرے میں ہے وہ راہِ درخشاں
جس راہ سے اہلِ دل و اہلِ نظر آئے

ادا جعفری



یہی آئینِ وفا ہے اب کے
دل دھڑکنا بھی خطا ہے اب کے
کون آیا تھا گلستاں بکنار
دل بہاروں سے خفا ہے اب کے
پھانس چبھتی ہے کلیجے کے قریں
سانس لینا بھی بُرا ہے اب کے
دل خطا وارِ وفا تھا پہلے
پھر طلب گارِ سزا ہے اب کے
کھل کے برسی نہ کھُلی ہے ظالم
کیسی گھنگھور گھٹا ہے اب کے
کس نے کی جرأتِ اظہارِ جنوں
زہر کس کس نے پیا ہے اب کے
پاؤں جلتے ہیں، قدم دھرتے ہی
امتحاں، آبلہ پا! ہے اب کے
ہم تو واماندۂ محفل ٹھہرے
رنگِ محفل نہ جما ہے اب کے
دل سا رہزن ہے نہ دل سا رہبر
آرزو قبلہ نما ہے اب کے
کتنا نازک سا سہارا ہے امید
جیسے لغزشِ پا ہے اب کے

ادا جعفری



دلِ آشفتہ سراں دیدۂ تر مانگے ہے
ہو وہ کافر جو شبِ غم کی سحر مانگے ہے

دل کو بس ایک تڑپ، ایک لگن کافی ہے
مجھکو مانگا کہ ترا سایۂ در مانگے ہے

دل بدل جاتے ہیں، انسان بدل جاتے ہیں
شوقِ دیوانہ وہی شام و سحر مانگے ہے

زندگی اتنی دلآویز کہاں تھی گردوں!
تو نے دیکھا ہے کوئی بارِ دگر مانگے ہے

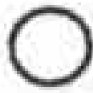
ہر نگہ دعوتِ میخانہ لیے پھرتی ہے
دل دوانہ ہے کہ وز دیدہ نظر مانگے ہے

یوں نگہ اٹھی ہے احسان کیا ہو جیسے
اور تمنا کہ دعاؤں میں اثر مانگے ہے

رنگِ گل، رشتۂ سحر، بوئے صبا کی سوگند
ہر تماشا مرا اندازِ نظر مانگے ہے

آپ سے دل کو توقع تھی پذیرائی کی
ہائے ناداں کہ بھولوں سے شرر مانگے ہے

دینے والا تو ادا شمس و قمر دے دیتا
مانگنے والا مگر داغِ جگر مانگے ہے



ہے تیرگی تو اجاگر نقوشِ شام کرو
پلک پلک پہ چراغاں کا انتظام کرو

شگفتِ لالہ و گل ہے کہ زخمِ قلب و جگر
مناؤ جشن، بہاروں کا اہتمام کرو

ابھی ہری ہے غمِ آرزو کی ہر کونپل
گلوں سے کہدو ابھی اور کچھ قیام کرو

انھیں کے چاکِ گریباں پہ ہے اساسِ بہار
کلی کلی کا گلستاں میں احترام کرو

بجا کہ آج خلاؤں میں ہیں نقوشِ قدم
جو ہو سکے تو خلوصِ نگاہ عام کرو

نہ باز آئیں گے سوزِ جگر کے دیوانے
غمِ حیات کی تلخی کچھ اور عام کرو

فسانے اور ابھی ناتمام باقی ہیں!
ادا حکایتِ قلب و نظر تمام کرو

انور خواجہ

محسن احسان

محسن احسان جدید نسل کا ایک ذہین اور حساس شاعر ہے۔ جدید نسل کے تذکرے سے بہت سے سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ کون سی جدید نسل اور کس جماعت کی جدید نسل۔ پاکستان میں ذرائع اظہار و ابلاغ پر کچھ جماعتوں، گروہوں اور ناشروں کا قبضہ ہے اور ہر ایک اپنی ہی جدید نسل کے شاعروں اور ادیبوں کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے محسن احسان کا ان جماعتوں سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے جب میں اُن کے جدید نسل کے ذہین شاعر ہونے کا ذکر کروں گا تو بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی۔ جدید نسل کے شاعروں کی ایک کثیر فوج اس وقت آزاد علامتی ملامتی شاعری فرما رہی ہے۔ جسے ہم جیسے طالب علم تو کیا، بڑے بڑے جغادری نقاد بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اب ایسے وقت میں محسن احسان کا اس شاعری کو چھوڑ کر غزل کی طرف پوری توجہ مبذول کرنا ان کے جدید نسل کے شاعر ہونے کے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دیتا ہے۔ آزادی کے بعد محسن احسان کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اُس وقت غزل کی شاعری کو جاگیردارانہ صنف ادب سمجھ کر مطعون کیا جا رہا تھا۔ اور بڑے بڑے غزل گو شاعر نعرہ بازی کی زد میں آ چکے تھے لیکن غزل نے بدلتے ہوئے حالات کا پوری طرح ساتھ دیا۔ ادب میں سانچوں کی تبدیلی خیالات کی تبدیلی نہیں لاتی۔ یہاں اُس کے دوسرے کئی محرکات ہوتے ہیں۔ ادب میں ہمیشہ ایک طرح کی قدامت پسندی پائی جاتی ہے جسے ادبی اصطلاح میں روایت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ چیز ذہنی سے زیادہ ہیئتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس طرح فکری حیثیت سے ادب میں زبردست انقلاب آتے رہتے ہیں لیکن ہیئتی سانچہ جلد جلد نہیں بدلتا۔ ادب میں جو فکری انقلاب آتے ہیں ان کا تعلق ہنگامی حالات سے زیادہ نہیں ہوتا بلکہ ادب ہمیشہ زندگی کے اساسی اور بنیادی مسائل کو پیش کرتا ہے وہ اجتماع کے رویے کا تجزیہ بھی انفرادی مشاہدے سے کرتا ہے۔

محسن احسان کی شاعری کی اساس بھی یہی نظریات ہیں۔ اُن کو روایت کا پاس ہے، فن کی اقدار کا احترام ہے۔ وہ ہر نئی چیز کو اس لئے نئی سمجھ کر نہیں اپناتے کہ وہ نئی ہے بلکہ اسے اپنے سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد پاکستان میں ایک نئے سماج نے جنم لیا اور اپنے ساتھ نئے مسائل لایا۔ ان کو حل کرنے کے لئے نئی فکر بروئے کار آئی۔ ان حالات نے نئی نسل کو جنم دیا۔ یہ نسل اپنے ملک کے مسائل کو لیکر آگے بڑھی لیکن اُس نسل کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی ذات تھا——اور اس نئے سماج میں اُس کی اہمیت اور مقام——یہ وہ نئی نسل نہیں جسے کسی ادبی دھڑے بندی نے پیدا کیا جو درآمد شدہ فلسفے اور نظریات کو پڑھ کر پیدا ہوئی۔ یہ وہ نسل تھی جو خالص اپنے ملکی و معاشرتی حالات کے تقاضوں سے اُبھری۔ محسن احسان اسی نسل کا ایک ذہین نمائندہ ہے۔ محسن احسان کے فن کارانہ ذہن اور شاعرانہ مزاج نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو وہ زمانہ بے حد پر آشوب تھا۔ یہیں سے ان کے غمِ تنہائی کی ابتدا ہوتی ہے۔ انھوں نے سارے ماحول کو اپنی ذات کے آئینے میں دیکھنا شروع کیا۔ اصل میں یہ اُس بڑے ردِ عمل کا ایک حصہ ہے جو انیسویں صدی کے مشینی اور جامد نظریات کے خلاف بیسویں صدی کے تیز اور کشادہ ذہن نے محسوس کیا۔ یہ داخلیت پسندی اور احساس ذات بیسویں صدی کے ادب کا ایک امتیازی رجحان ہے۔ ہمارے شعر و ادب میں یہ رجحان میکانکی اور مادی رجحان کے خلاف ردِ عمل کے

طور پر آیا۔ کچھ شاعروں اور ادیبوں نے کھلم کھلا اس رجحان کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا لیکن محسن احسان نے ماحول کی یاس انگیزی، کرب اور میکانکیت کے خلاف بغاوت کرنے یا کسی پر اُمید مستقبل سے وابستہ ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک نظریے سے دیکھیں تو شاعر کا ردِ عمل خاصا فطری نظر آتا ہے لیکن فوراً کچھ سخت گیر نقاد اس ردِ عمل کو منفی اور قنوطی قرار دینے کے لئے لپک پڑیں گے۔ محسن احسان کی یہ یاس انگیزی اور افسردہ دلی ان کی ذات کا سچا عکس شعر کے پیمانے میں پیش کرتی ہے۔ اس افسردہ دلی میں کہیں کہیں روشنی کے مینار بھی ہیں لیکن اُس کے مزاج کی دردمندی اُس کی غزل اور شعروں کو نہ صرف ایک گمراور مستقل تاثر ودیعت کرتی ہے لیکن اُس کی شاعری کا سارا لہجہ دردمندانہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر جو فن کار ہے وہ ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ساری انسانیت جمع ہے۔ ایک طرف وہ انبوہ میں مدغم ہو کر فنا ہو جانے سے خائف ہے، دوسری طرف اُسے تنہا رہ جانے کا خوف ہے۔ اس طرح اُس کی زندگی کے شب و روز ایک اذیت ناک تذبذب میں گذرتے ہیں:

دل بھی آباد ہے اس شہرِ خموشاں کی طرح
ہر طرف لوگ مگر عالمِ تنہائی ہے

جب یہ متوسط طبقے کا نوجوان صحرا صحرا جنگل جنگل مارا پھرتا ہے مگر اسے کوئی ساتھی نہیں ملتا۔ تو یوں احساسِ محرومی اس کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ اسے ایک ساتھی کے روپ میں کسی عورت کے بدن اور زلف و رخسار کی ضرورت نہیں۔ اُس کی جستجو میں رومانس کا عنصر کم ہے —— وہ انسان کی ازلی تنہائی کا سمبل ہے۔ انسان جو ازل سے تنہا ہے اور شاید ابد تک تنہا رہے گا۔ اس کے لئے افسردگی اور غم ایک مستقل قدر بن جاتے ہیں۔ وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جیسے وہ سارے زمانے سے روٹھا ہوا ہے۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے شاعر کوشش ضرور کرتا ہے لیکن اس کی یہ کوشش بس یونہی سی ہے۔ وہ پوری طرح جد و جہد نہیں کرتا۔ ہمیشہ یہی جذبہ اس کے اندر کار فرما رہتا ہے کہ کوئی آئے اور اس کی انانیت کو سہارا دے تبھی وہ آگے قدم بڑھائے گا۔ لیکن یہاں شاعر کو صرف اپنی انانیت سے سروکار ہے دوسرے کی انانیت کا کوئی لحاظ نہیں۔ اس طرح اپنے آپ پر طاری کی ہوئی محرومی ایک مستقل شکل اختیار کر لیتی ہے۔

محسن احسان کی یہ بیزاری ابتدا میں جذباتی تھی لیکن اپنے اندر ایک فکری عنصر بھی لئے ہوئے تھی۔ تنہائی کے احساس میں رفاقت کی کمی کے سوا، کہیں کہیں محبت کی گرمی اور ہلکی ہلکی اضطراری کیفیت بھی پائی جاتی ہے ایک کسمساہٹ کا احساس بھی ملتا ہے۔ اس کی شاعری کا یہ ابتدائی دور ایک ایسے غالب رجحان کا زمانہ تھا جب شخصی غم کو غمِ دوراں سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ فرد کی ذات اور شخصیت عوام کے وسیع تقاضوں اور مطالبوں کے پیشِ نظر پست سمجھی جاتی تھی۔ اس تیز رَو کے ساتھ محسن احسان بھی کچھ دیر چلے۔ اُن کی کچھ غزلیں اور زیادہ تر نظمیں اس خارجیت کو پیش کرتی ہیں لیکن ان غزلوں اور نظموں میں وہ اثر کم ہے جو بعد کی غزلوں کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ انداز کی گھلاوٹ اور دردمندی جو محسن احسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ متذکرہ غزلوں اور نظموں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ محسن احسان کی شاعری تدریجی طور پر اس بات کا ادراک حاصل کرتی جاتی ہے کہ صرف چند نظریات کو سامنے رکھ کر کوئی اچھی شاعری نہیں کی جا سکتی۔ اس بات سے قطع نظر کہ عظیم شاعری میں بڑے موضوعات اور اعلیٰ فلسفے موجود ہوتے ہیں لیکن ان کو باہر سے لا کر شعروں میں سجایا نہیں جاتا بلکہ شاعر کی ذات کے ساتھ وہ نظریات اور فلسفے پوری طرح شیر و شکر اور ہم آہنگ ہو کر اظہار کی منزل کو پہنچتے ہیں۔ فن غم سے جلا پاتا ہے۔ غم کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اور شاعر اپنی ذات کے آئینے میں کائنات کے مظاہر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ محسن احسان نے ہمیشہ اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے کہ بڑا ادب ہمیشہ شخصیت اور ذات کے اظہار و ابلاغ سے پیدا ہوتا ہے۔

محسن احسان

○

میں ایک عمر کے بعد آج خود کو سمجھا ہوں
اگر رکوں تو کنارا، چلوں تو دریا ہوں

جو لب کشا ہوں تو ہنگامۂ بہار ہوں میں
اگر خموش رہوں تو سکوتِ صحرا ہوں

ترے فراق میں کل رات اے مرے محبوب
نگارِ غم سے لپٹ کر بہت ہی رویا ہوں

جھلس گئی ہے ہوائے دیارِ درد مجھے
بس ایک پل کے لیے شہرِ غم میں ٹھہرا ہوں

مری خودی میں نہاں ہے مرے خدا کا وجود
خدا کو بھول گیا جب سے خود کو سمجھا ہوں

نکل کے وہ مرے آغوش سے گیا ہے تو میں
ہوائے موجۂ گل کی طرح مہکتا ہوں

میں اپنے پاؤں کا کانٹا، میں اپنے غم کا اسیر
مثالِ سنگِ گراں راستے میں بیٹھا ہوں

بلندیوں سے مری سمت دیکھنے والے
مرے قریب تو آ، میں بھی ایک دنیا ہوں

مثالِ شمعِ شبستانِ آرزو میں بھی
بھری بہار کی رعنائیوں میں جلتا ہوں

تجھے خبر بھی ہے کچھ اے مسرتوں کے نقیب
میں کب سے سایۂ دیوارِ غم میں بیٹھا ہوں

اگر ہے مقتلِ جاناں کا رخ تو اے محسنؔ
ذرا ٹھہر کہ ترے ساتھ میں بھی چلتا ہوں

محسن احسان

○

کسی کے سامنے اظہارِ دردِ جاں نہ کروں
اِدھر اُدھر کی کہوں، زخمِ دل عیاں نہ کروں

لگا کے آگ بدن میں، وہ مجھ سے چاہتا ہے
کہ سانس لوں تو فضا کو دھواں دھواں نہ کروں

میں اس کو پڑھتا ہوں انجیلِ آرزو کی طرح
سمجھ میں آئے تو معنی ہر اک بیاں نہ کروں

غضب ہے، مجھ سے توقع زمانہ رکھتا ہے
کہ پاشکستگی میں رنجِ رفتگاں نہ کروں

یہ حکم مجھ کو ملا قصرِ خسروی سے کہ میں
فغاں سنوں مگر اندازۂ فغاں نہ کروں

مزے سے سوؤں اگر ہاتھ آئے شامِ فراق
میں ایک لمحہ بھی اس شب کا رائیگاں نہ کروں

اٹھا کے سر پہ پھروں بارِ آرزو محسنؔ
کمر کو خم میں کبھی صورتِ کماں نہ کروں

محسن احسان

○

کسی کو دھیان ہی آیا نہ رُت بدلنے کا
تھا انتظار ہر اک کو ہوا کے چلنے کا

وہی پُرانے مسافر ملے نئی رہ پر
تھا افتخار ہمیں جن سے بچ نکلنے کا

اب ایک دوسرے کو مڑ کے دیکھتے بھی نہیں
کبھی تھا زعم بہت ساتھ ساتھ چلنے کا

وہ سنگ دل سہی، آغوشِ آرزو میں مگر
ہر ایک پل اُسے احساس تھا پگھلنے کا

نئی سحر بھی خدا جانے کیا سماں لائے
لگا ہے شام سے دھڑکا سا رات ڈھلنے کا

گھرا ہوا ہوں حصارِ حیات میں کب سے
کوئی بھی راستہ ملتا نہیں نکلنے کا

گلہ نہیں کوئی تجھ سے نگاہ نشۂ یار
میں خود گرا کہ ارادہ نہ تھا سنبھلنے کا

جھلس گئی ہے کڑی دوپہر میں خلقتِ شہر
یہ نام لیتا نہیں آفتاب ڈھلنے کا

محسن احسان

○

خود اپنی راہ کی دیوار بن گیا ہے کوئی
تمام دن مری تصویر دیکھتا ہے کوئی

غرورِ عشق کا یہ بانکپن بھی دیکھ کہ میں
خفا نہیں ہوں، پہ پھر بھی منا رہا ہے کوئی

جہاں کہیں بھی ہوں، وہ بزم ہو کہ تنہائی
ہر ایک پل مرے ہمراہ کج ادا ہے کوئی

قدم جو گھر سے نکالوں تو کتنے عجز کے ساتھ
دعا پلٹ کے پھر آنے کی مانگتا ہے کوئی

اگرچہ بیت چکے ہیں وہ لطف کے لمحات
پسِ دریچہ مگر اب بھی جھانکتا ہے کوئی

تجھے خبر بھی ہے بے درد و بے وفا محسن
ترے فراق میں راتوں کو جاگتا ہے کوئی

○

قبائے غم کی گرہ جب بھی کھولتا ہے کوئی
مرے سکوت کی خلوت میں بولتا ہے کوئی

چمک اٹھا ہے مرا درد صورتِ خورشید
مرے لہو میں شعاعوں کو گھولتا ہے کوئی

ہوائے دہر کی زد میں ہے کاروانِ گلاب
کلی چٹکتی ہے یا زخم بولتا ہے کوئی

پہنچ کے منزلِ دل پر کس اشتیاق کے ساتھ
مرے چھپے ہوئے غم کو ٹٹولتا ہے کوئی

نہ مٹ سکے گا کبھی زخمِ لذتِ پرواز
بریدہ ہی سہی، پر پھر بھی تولتا ہے کوئی

کئی دنوں سے امیدوں کی سیپیاں محسن
کنارِ موجۂ احساس رولتا ہے کوئی

محسن احسان

موسم اور محبّت

برف جب گرتی ہے تو لاتی ہے خوشبوئے وصال
ذہن کے ٹوٹے ہوئے کشکول میں،
کتنی بے تابی سے ملتے ہیں گلے ماضی و حال
اور میں کالج کے یخ بستہ سے اک کمرے میں کتنی دیر سے
کیٹس کی نظموں میں ناآسودگیٔ روح کی سَو اُلجھنوں کو صد قبائے
معنی پہناتا پھروں؛

اور بچے
مرگِ شاعر کے تصوّر پر فدا،
لذتِ تخلیقِ آدم کے لیے نوحہ کناں،
پتھروں کے کھردرے بستر کی اک بے نام سی خواہش کو سینے
میں چھپائے
اپنی بے معنی نگاہوں سے مری تقریر کو سنتے رہیں

ایک سفر

ہم دھڑکتی ریل سے اترے تو سائے بن گئے
ہر مسافر اجنبی تھا، ہر نظر ناآشنا
ہر صدا بیگانگی کی لذتوں پر نوحہ خواں
پھر بھی اپنے دل کے اک تاریک گوشے میں نہاں
خوف کا موہوم چور
ذہن کے ویراں بیاباں میں
عروسِ راز کے لٹنے کا شور
اور اچانک اپنی ہی آواز سے اعصاب سارے تن گئے
ہم دھڑکتی ریل سے اُترے تو سائے بن گئے

شہزاد احمد

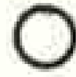
کشور ناہید

غزل اور دوسری کلاسیکی ہیئتوں کے سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ لکھنے والا ان میں اپنی شخصیت کو آسانی سے اجاگر نہیں کر سکتا۔ اظہار کے بنے بنائے اسلوب، بندھے ٹکے مضامین، محدود قافیے، غرض ایسی کتنی ہی پابندیاں ہیں جو انفرادیت کے راستے میں حائل ہیں۔ بزرگوں نے طرح طرح کے مضامین کو بار بار باندھ کر ان کی تازگی کو ہمارے لئے زائل کر دیا ہے۔ کسی بھی کلاسیکی ہیئت میں کوئی ایسی چیز تخلیق کرنا جو بیک وقت نئی بھی ہو اور اس ہیئت کی کلاسیکی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہو، اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ شاید اسی باعث جدید تر نسل نے کھلے بندوں غزل کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے جو نظمیں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں ان کے لکھنے والے ایک دوسرے سے اس قدر متاثر ہیں کہ ایک ہی نظم کئی شاعروں سے منسوب کی جا سکتی ہے۔ ایک ہی طرح سوچنے کا میکانکی عمل غزل اور نظم دونوں میں واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے یا تو کسی ایک فن کار کے تتبع کو ہی شاعری سمجھتے ہیں۔ یا اپنے کسی تخلیقی لمحے کو میکانکی طریقے سے دہرا رہے ہیں۔ چنانچہ یوں ہوتا ہے کہ بیشتر شعر کہنے والوں کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں۔ ان کی مثال اس طالب علم کی سی ہے جو دوسرے طالب علم کی نقل کر کے کامیاب ہونا چاہتا ہے۔

ہر لکھنے والا اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ میں کیوں لکھنا چاہتا ہوں؟ اس کی تحریریں اس سوال کا جواب ہیں، جو واضح طور پر یہ بتا دیتی ہیں کہ لکھنے والا محض جگالی کر رہا ہے یا اس کے اندر کوئی ایسا جذبہ موجود ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے۔ کشور ناہید کی شاعری پڑھتے اور سنتے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ شروع شروع میں ہمارا خیال تھا کہ کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح کشور نے بھی شاعری اہمیت حاصل کرنے کے لئے اختیار کی ہے مگر جلد ہی احساس ہوا کہ اس کی تحریریں دوسری شاعر لڑکیوں سے مختلف ہیں۔ اس کے شعری مسائل تو تقریباً وہی تھے جو تمام جدید شاعروں کے لئے القا کا باعث ہیں مگر ان کو لکھنے کا طریقہ اس کے ہاں بالکل مختلف تھا۔ ابتدا میں اس کی شاعری بہت ناپختہ محسوس ہوتی رہی کیونکہ الفاظ کا دروبست اس انداز کا نہیں تھا جس کے ہم سننے کے عادی تھے۔ آہستہ آہستہ خود کشور نے بھی اپنے اندر کے غیر شعوری عمل کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا شروع کر دیا چنانچہ اس کی شاعری میں ایک جدید عورت کا رد عمل نمایاں ہو گیا۔

آپ شاید یہ سوال اٹھانا پسند کریں کہ جدید ہونے میں جنسی اختلاف کا امتیاز مناسب نہیں، یا کوئی جدید ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، یہ کوئی مسئلہ نہیں کہ جدید شخصیت مرد ہے یا عورت ـــــ مگر میں معافی چاہتا ہوں مجھے تو قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم پاکستانی مرد اور عورت کے مسائل ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ عورت ویسے بھی روایت پسند ہوتی ہے خواہ وہ انتظار حسین کی نانی اماں ہو یا قرۃ العین ہو ـــــ مگر عورت جب فنکار بنتی ہے تو اپنے عورت پن کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے چنانچہ وہ عصمت چغتائی کی طرح کھل کر جنسی مسائل پر کہانیاں لکھتی ہے اور ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ بے بس عورت نہیں ہے۔ عورت کا یہ رد عمل اڈلر کی زبان میں مردانہ احتجاج اور فرائیڈ کی زبان میں خوفِ آلتگی کہلاتا ہے ـــــ کشور کے ہاں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنا عورت ہونا ایک حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے لہٰذا اس میں وہ شعوری اور لاشعوری رد عمل پیدا نہیں ہوئے جو عام طور پر ہمارے ہاں کی فن کار عورتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت کم نظمیں اور ناولٹ ایسے لکھے گئے ہیں جن کی لکھنے والیاں گھریلو عورتیں محسوس ہوتی ہوں۔ وہ تو عام طور پر "انٹلکچوئیل" نظر آتی ہیں۔ چنانچہ کشور کے شعر پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں چولہے کے پاس بیٹھا ہوں اور میرے اردگرد کی فضا میں گھر کی خوشبو رچی بسی ہے۔

کشور ناہید



ترے قریب پہنچنے کے ڈھنگ آتے تھے
یہ خود فریب مگر راہ بھول جاتے تھے

ہمیں عزیز ہیں اُن بستیوں کی دیواریں
کہ جن کے سایے بھی دیوار بنتے جاتے تھے

تماشہ بینِ ستم تھا تعلّقِ یاراں
وہ زخمۂ رگِ جاں چھیڑ چھیڑ جاتے تھے

وہ اور کون ترے قرب کو ترستا تھا
فریب خوردہ وہی تیرے فریب کھاتے تھے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

اب ایک عمر سے دکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آنکھوں پہ رُلاتے تھے

وہ لوگ کیا ہوئے جو اُونگھتی ہوئی شب میں
درِ فراق کی زنجیر سی ہلاتے تھے

کشور ناہید



ہر مرحلے پہ شوق، تماشائی چاہیے ہے
عشقِ نمود پیشہ بھی رسوائی چاہیے ہے

گھلنے لگا ہواؤں میں مایوسیوں کا زہر
پھر جی اُداس ہے، وہی پروائی چاہیے ہے

ڈھونڈے ہے اپنی ضد کے مقابل کی کوئی شے
شوقِ جنوں شعار تو رسوائی چاہیے ہے

خوبی ہے لاکھ وصفِ تحمل، شکیب و ضبط
لیکن نگارِ شوق پذیرائی چاہیے ہے

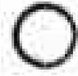
یہ دل نہ چل سکا کبھی اُڑتی ہوا کے ساتھ
یہ دل تعلقات کی گہرائی چاہیے ہے

جلوہ نہ ہو تو موجِ جنوں کیسے تیز ہو
آنکھیں نہ ہوں تو کون تماشائی چاہیے ہے

وہ کون ہے جو ساتھ ہمارے بھی چل سکے
وہ کون ہے جو غم سے شناسائی چاہیے ہے

رکھو تو زندگی میں شریکِ الم کوئی
ناہید عرضِ حال بھی شنوائی چاہیے ہے

کشور ناہید



جب میں نہ ہوں تو شہر میں مجھ سا کوئی تو ہو
دیوارِ زندگی میں دریچہ کوئی تو ہو

اک پل کسی درخت کے سائے میں سانس لے
سارے نگر میں جاننے والا کوئی تو ہو

کوئی تو آرزو دئے فروزاں سنبھال رکھ
ہاں اپنے سر پہ قرضِ تمنا کوئی تو ہو

اے خوئے اجتناب تعلق رکھیں تو رکھ
بے چارگی میں پوچھنے والا کوئی تو ہو

دیکھے عجیب رنگ میں تنہا، ہر ایک ذات
ان گہرے پانیوں میں اترتا کوئی تو ہو

ڈھونڈھو گے جس کو دل سے وہ مل جائے گا ضرور
آئینے لوگ آپ، تماشا کوئی تو ہو

بھڑکاؤ غم کی آگ سے لالہ فام سے
اس تیرگی میں گھر کا اُجالا کوئی تو ہو

پھر کوئی شکل بام پہ آئے نظر کہیں
پھر رہ گذارِ عام میں رسوا کوئی تو ہو

کشور ناہید

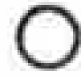
○

لگ گیا غم کی دیوار میں آئینہ
اب نہیں کوئی موجود تیرے سوا
شہر کے سارے دروازے کیوں بند ہیں
خون موجِ صبا دے رہا ہے صدا
ہونٹ بھی سِل گئے، آنکھ بھی جھک گئی
آپ کو جاننے میں بھلا کیا ملا
ڈھونڈھنے اس کو کس شہر میں جاؤ گے
اپنے ہی ملک میں فاصلہ ہے بڑا
تشنگی، جانکنی، برہمی کچھ نہیں
مختصر یہ، سمندر ہے ٹھہرا ہوا
تو نہیں ہے تو کس سے کریں بات ہم
جب تجھی سے نہ یہ حوصلہ ہو سکا
اک سمندر تھا یادوں کا پیشِ نظر
جب سفینہ کنارے کنارے چلا
ٹیلیفونوں پہ رسمِ تعارف ہوئی
نافۂ دوستی فائلوں میں کھلا
گو ہیں مشہور چہرہ شناسی میں ہم
آپ کو دیکھ کر کھا گئے ہیں خطا
ٹھہر جاتے وہ امشب اسی دیس میں
کوئی تو روکتا چاند کا راستا

○

دب نہ رہیں آلام تلے، صبر کرو
آگ بجھاتے دیر لگے، صبر کرو
بن دیکھے بھی سامنے اس کی صورت ہے
بن بولے بھی بات بڑھے، صبر کرو
زلفِ تمنا کھنچتی گئی، پر پیچ ہوئی
شانۂ تسکیں خواب رہے، صبر کرو
کب پھر بولیں پتھر بھی اس وادی کے
کب پھر رات کا ایک بجے، صبر کرو
پھر رکھے گا ہاتھ تمھاری آنکھوں پر
پھر آئے گا پاؤں دبے، صبر کرو
تھمتے تھمتے اشک تھمیں اور دل ٹھہرے
ڈوبتی ناؤ پار لگے، صبر کرو
پچھلی رات وہ آئے گا، مغموم نہ ہو
پو نہ پھٹے گی ایسے سمے، صبر کرو
جی بھر کر کب دیکھ سکو گے تم اس کو
آجاؤ گے پاؤں تلے، صبر کرو
تم بھی آخر چین کی نیندیں سوؤ گے
تم پر دن آئیں گے بھلے، صبر کرو
یونہی رہو ناہید الجھتی کانٹوں سے
وقت کی ندی یونہی بہے، صبر کرو

کشور ناہید



حسرت ہے تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
میں تجھ سے مخاطب ہوں، ترا حال بھی پوچھوں
دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں
جس نام سے تو نے مجھے بچپن میں پکارا
اک عمر گزرنے پہ بھی وہ نام نہ بھولوں
تو اشک ہی بن کر مری آنکھوں میں سما جا
میں آئینہ دیکھوں تو ترا عکس بھی دیکھوں
پوچھوں کبھی غنچوں سے، ستاروں سے، ہوا سے
تجھ سے ہی مگر آکے ترا نام نہ پوچھوں
جو شخص کہ ہے خواب میں آنے سے بھی خائف
آئینہ دل میں اسے موجود بھی دیکھوں
اے میری تمنا کے ستارے، تو کہاں ہے
تو آئے تو یہ جسم شبِ غم کو نہ سونپوں



گریہ، مایوسی، غمِ ترکِ وفا، کچھ نہ رہا
زندگی رہ گئی، جینے کا مزا کچھ نہ رہا
روشنی تھی تو ہر اک شے کی حقیقت تھی عیاں
تیرگی میں مری آنکھوں کے سوا کچھ نہ رہا
پیرہن رنگ برنگے نکل آئے اتنے
نو دمیدہ گُلِ شب میں چھپا کچھ نہ رہا
کھا گئی خاک کو ہی خاک، کریں کس سے گِلہ
کیا کریدیں کہ تہِ خاک چھپا کچھ نہ رہا
تیرے ملنے کے نئے ڈھنگ بھی تسلیم، مگر
اس طرح ذائقہ بدلا کہ مزا کچھ نہ رہا
کیوں نہ ہو حشر بپا، دادِ وفا کیوں نہ ملے
جب ترے چاہنے والوں کے سوا کچھ نہ رہا
خوشبوئے وصل، توجہ کا وہ عالم، وہ خلوص
ڈوبتے چاند کی آغوش میں کیا کچھ نہ رہا

کشور ناہید

○

اب تم بھی چھپاؤ نہ یہ داغ اور زیادہ
لگتا ہے حقیقت کا سراغ اور زیادہ

مٹ جاتے اسی قتل گہہِ دل میں بھی ہم لوگ
بھرتے جو ترے غم کے ایاغ اور زیادہ

جھٹلاتے ہیں جتنا بھی گرانبارئ غم کو
ملتا ہے نگاہوں سے سراغ اور زیادہ

یہ کاسۂ دریوزۂ غم بھر نہیں پاتا
مٹ جائے زمانے سے فراغ اور زیادہ

جب دل میں سرِ شام ہی پڑتی ہے گرہ سی
جلتے ہیں نگاہوں میں چراغ اور زیادہ

ناہید کوئی آکے ستائے بھی تو ہم کو
مہکائیں گے زخموں کے یہ باغ اور زیادہ

○

خیالِ طوقِ تعلق کو ٹالتے رہیے
ہوا میں کوئی ہیولا اُچھالتے رہیے

پرانے آشنا چہروں کو یاد کر کر کے
ہجومِ غم میں بھی دل کو سنبھالتے رہیے

تمام عمر یونہی کیجے حسرتوں کا شمار
تمام عمر یونہی دکھ سنبھالتے رہیے

سجا کے روز نئی محفلیں نئے خد و خال
زرِ فسردہ دلی کو اُجالتے رہیے

رہیں نہ دشت جو صحرا نوردیوں کیلئے
تو اپنے صحن میں پتھر اُچھالتے رہیے

نہ مل سکیں جو وہ یارانِ گل صفت ناہید
تو اپنے آپ کو سانچوں میں ڈھالتے رہیے

محمد خالد اختر

فہمیدہ ریاض

یہ سطور لکھنے سے پہلے مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ اردو شاعری سے متعلق میری معلومات بہت کم ہیں ——— اور جدید اردو شاعری سے متعلق تو اس سے بھی کم ہیں۔ جدید اردو شاعری، جدید مصوری کی طرح ایک بہت مخصوص فن ہے یا اسے ایسا بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بیشتر حصے کے حسن و مفہوم سے مجھ سا غیر شاعر اور غیر ماہر قاری قطعی نامحرم ہے ——— اور یقیناً یہ ایک قابلِ رحم محرومی ہے۔ یہ نہیں کہ میں جدید نظمیں نہیں پڑھتا۔ ان میں سے بعض نے مجھے کچھ عجیب طرح سے متاثر بھی کیا ہے۔ میں ان نظموں کے لکھنے والوں کی واضح شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل بھی ہوں مگر بیشتر نظمیں مجھے دھوم دھام کی لفاظی ——— اور افسوس کہ مبہم لفاظی ——— معلوم ہوتی ہیں۔ یقیناً قصور میرا ہی ہوگا میں فن کے ان اسرار سے واقف نہیں ہوں۔ وہ لوگ جو یہ تجریدی اور علامتی شاعری کرتے ہیں، یقیناً اس گہری شاعرانہ امنگ کے مالک ہوں گے جو دنیا کی ساری بڑی شاعری کی بنیاد ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ وہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ عین ممکن ہے کہ وہ بڑے شاعر ہی ہوں اور اپنے احساسات و تاثرات، اپنے حزن و اندوہ، اپنی محرومی و تنہائی کا اظہار صرف علامتوں ہی کی مدد سے کرنا بہتر سمجھتے ہوں مگر مجھے یہ چیز ضرور حیران کر دیتی ہے کہ آخر کلام میں ابہام کو خیال و فکر کی گہرائی ہی کیوں تصور کر لیا جائے۔ آخر بے معنی باتیں بھی تو سمجھ میں نہیں آتیں اور خیال و فکر کی گہرائی بے معنی نہیں ہوتی۔ اگر شاعری روح کا نغمہ ہے اور اسے بنایا یا گھڑا نہیں جا سکتا تو اسے اوسط ذہانت کے ایک آدمی کی سمجھ میں آنا چاہئے اور شعر کا قاری اوسط ذہانت ہی کا مالک ہوتا ہے۔ جب جان کیٹس اپنی غیر فانی نظم "اوڈ ٹو دی نائٹنگیل" یا "انڈیمیان" یا "آخری سجدہ" لکھنے بیٹھے ہوں گے تو انھوں نے اپنے آپ سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ مجھے شاہکار تخلیق کرنا ہے میں اسے ہمہ گیر اور ہمہ اثر بناؤں گا۔ یہ نظمیں ان کی تخلیقی امنگ نے ان سے لکھوائیں۔ بڑی شاعری اس طرح نہیں لکھی جا سکتی جیسے انتھونی ٹرالوپ اپنے بارسٹ شائر ناول لکھا کرتا تھا ——— یعنی روزانہ بلاناغہ مسلسل پانچ گھنٹے اپنے رائٹنگ ڈیسک پر مشقت کا پسینہ بہانے سے ——— مجھے ایسا لگتا ہے اگرچہ میں غلط بھی ہو سکتا ہوں، کہ بیشتر جدید شعراء پہلے ہی سے ارادتاً "بڑی نظم" لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، اپنے چھوٹے خیالوں کو بڑا اور گمبھیر بنانے کے لئے پرشکوہ الفاظ کی صفیں آراستہ کرتے ہیں، دماغ کے کونے کھدروں سے قطعی بعید از قیاس علامتیں ڈھونڈ کر ٹھونستے چلے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی نظمیں خود ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں صرف ان چند "نقادوں" کی سمجھ میں آتی ہیں، جو یہ بتاتے ہوئے بھجکتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ میں سوچتا ہوں ایسی شاعری کیسے زندہ رہے گی۔

پھر اس مشینی اور خلائی دور میں بنیادی انسانی جذبے اپنی بے ساختگی، اپنا "فطری پن" کھو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ چند Reflexes اور [illegible] کی پیداوار ہیں۔ محبت کی concept زمانہ کے بعد بالکل بدل گئی ہے۔ اب یہ جذبہ ایک جوان لڑکے کے ساتھ ایک جوان لڑکی کی والہانہ وابستگی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ذہنی عارضہ ہے اور تحلیل نفسی اس کا علاج ہے (گستاخی معاف فرائڈ صاحب! آخر اس کا علاج اتنا ضروری کیوں ہے؟ آخر پاگل ہونے میں حرج ہی کیا ہے؟) چاند اب وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا چاند نہیں ——— وہ جان کیٹس کا چاند:

Oh! the Queen moon is on her throne!

جدید سائنسی تحقیقات نے اس کا سارا حسن، سارا رومان، ساری اسراریت نوچ لی اور وہ دن دور نہیں جب آدمی خلائی جہازوں کی مدد سے اس کے سرد اور سُونے سناٹوں میں گھوما کریں گے۔ (جو دنیا ویلز، آلڈس ہکسلے اور جارج آرویل نے اپنے "فنٹاسٹک" تخیل میں دیکھی اور پیدا کی ابھی سے حقیقت بننے لگی ہے! بچے عنقریب شیشے کی نلکیوں میں پیدا ہوا کریں گے۔ "بڑے بھائی" کی مہیب تصویریں دیواروں پر سے اُچٹ کر ہمارا پیچھا کرنے لگی ہیں! پولیس اسٹیٹس، مانولتھک اسٹیٹس جن میں ایک فرد محض ایک

صد ہوگا، ہر جگہ قائم ہیں! بنی نوع انسان کا یہ لرزہ خیز وژن ہے! بیسیوں اور بیسیوں پنج سالہ منصوبے ـــ ملکی مصنوعات میں اضافوں کے دعوے ـــ اعداد و شمار کے انبار ـــ اور کہیں مسرت کا کہیں نام نہیں! مشقت کرنے والے اور پرکھتے ہیں تو "بڑا بھائی" انہیں جسم (اور روح؟) کی غذا بخشتا ہے! پریس اور سینما، ریڈیو اور ٹیلی وژن وہ سب کچھ ہیں جو انہیں پڑھنے اور دیکھنے اور سننے والوں کے معیار اور مطالبوں کے برعکس ہے! اور مئی ڈے پریڈ اور کرسمس کی خوشی میں ٹریفک کے ایک ہزار حادثے اور خصوصی شغب اور برتھ کنٹرول پلز، اور کنٹرا سیپٹوز، اور کامکس، اور ٹی وی کیوز، اور جینئس (I کا آئی کیو (ب) سے زیادہ ہے اس لئے وہ بہتر آدمی ہے) یہ بیٹے نمبر گیم، بے مقصد جلوس، مذہب اور نیکی اور خوبصورتی سے خالی، سنسان سڑک پر چلا جا رہا ہے! ـــ یہ انسانیت ہے جو بیسویں صدی میں سے گزرنے کے عمل میں ہے! ـــ انسان حیران ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لئے کس قسم کی شاعری ہوگی؟ اور کیا اسے کسی شاعری کی ضرورت بھی ہوگی! کیا ہمارے جدید شعرا اس عصر کے لئے کہہ رہے ہیں جو مغرب تک آ چکا ہے اور یہاں مزید تیس، چالیس، پچاس برس تک آنے والا ہے؟

مجھے فہمیدہ ریاض کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرنے کو کہا گیا تھا۔ بظاہر میں نے ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں کہا مگر دراصل یہ سب کچھ اس کی خوبصورت اور زندگی کی حرارت سے دھڑکتی ہوئی شاعری کے جاننے کے لئے ضروری تھا ـــ یعنی اگرچہ فہمیدہ نہایت جدید شاعرہ ہے لیکن اس کی شاعری ان جدید شاعروں کی سی نہیں جن کی طرف میں نے اوپر چند اشارے کئے ہیں۔ اس کی شاعری جدید بھی ہے اور سمجھ میں بھی آتی ہے اور مسحور بھی کرتی ہے۔ جدید شعری رجحانات کے حوالے سے یہ کچھ عجیب سا حادثہ ہے مگر بڑا ہی خوشگوار حادثہ ہے!

میں فہمیدہ ریاض کی شاعری کے متعلق اس طرح کا اظہار رائے نہیں کر سکتا جو نقادوں کے لئے خاص ہے۔ بدقسمتی سے نہ تو میرے پاس ثقہ نقادوں کا سا تجزیہ کرنے والا دماغ ہے اور نہ ان کی خاص ڈکشن۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ فہمیدہ کی شاعری میں سادگی ہے، حسن ہے اور اسے دل کی بات کو بے ساختگی سے کہنے کا انداز آتا ہے۔ نہ اس میں ابہام ہے اور نہ ہی علامتوں کا طومار ہے۔ مجھ سے ایک اوسط فہم کے انسان کو بھی یہ جاننے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ فہمیدہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ اتنی ہی ڈائرکٹ شاعری ہے جتنی اقبال کی یا ندیم کی شاعری۔ فرق یہ ہے کہ یہ بیشتر معریٰ شاعری ہے مگر مکمل Rythmic بہاؤ کے ساتھ۔ میرے ایک نقاد دوست کے مطابق اس وقت شعر کہنے والوں کے تین واضح گروہ ہیں۔ اوّل وہ گروہ جو روایت کا پابند ہے۔ دوم وہ جو روایت کا احترام کرتا ہے مگر اس سے بندھ کر رہ نہیں جاتا بلکہ نئے افقوں کی طرف رواں رہتا ہے۔ سوم وہ جو روایت سے بالکل کٹ کر چونکا دینے والے تجربات کرتا ہے اور اس لئے مکمل طور پر تجربہ زدہ ہے۔ اس تقسیم کے مطابق فہمیدہ ریاض کو دوسرے یعنی درمیانے گروہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ وہ middling ہے مگر مسحور کن middling! اس کی شاعری نے مجھے مسرت دی ہے اور بعض نظموں میں اس مسرت نے سرشاری کی حدوں کو بھی چھو لیا ہے۔ فہمیدہ کی ذہانت اور سادہ و حسین اظہار پر اس کی گرفت کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ جلد ہی اردو شاعری میں ایک ایسا مقام پیدا کرے گی جو اس عمر میں صرف انہی شاعروں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ارادتاً شعر نہیں کہتے بلکہ فن تخلیق کی امنگ ان سے شعر کہلواتی ہے۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری کی ایک خصوصیت قطعی منفرد اور بے انتہا دلآویز ہے۔ اس کے ہر مصرعے میں نسائیت کے احساسات کی واضح آواز سنی جا سکتی ہے۔ خواتین نے ہمارے ہاں پہلے بھی شاعری کی ہے مگر انھوں نے مرد بن کر شعر کہے ہیں۔ یوں انھوں نے اپنی نسائیت کو چھپایا ہے۔ فہمیدہ اردو میں شاید پہلی شاعرہ ہے جسے اپنی نسائیت پر فخر ہے۔ اسی لئے اس نے ایسی نظمیں کہی ہیں جو صرف ایک لڑکی ہی کہہ سکتی تھی۔ کوئی مرد اس انداز میں سوچنے تک پر قادر نہیں ہوتا۔ مجھے اس مقام پر الزبتھ بیرٹ براؤننگ یاد آ گئی ہے۔ انیسویں صدی کے انگلستان کی اس شاعرہ کی شاعری بھی مکمل طور پر ایک عورت کی شاعری تھی۔ فہمیدہ اگر شعر کہتی رہی (خواتین سے ڈر بھی لگتا ہے کہ نہ جانے وہ کب کیا فیصلہ کر بیٹھیں!) تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کے پاکستان کی ایک بڑی شاعرہ بن جانے پر کم سے کم مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی بلکہ اپنے تاثر کے صحیح ثابت ہونے پر مجھے بے اندازہ مسرت ہوگی اور میرے خیال میں آپ کو بھی مسرت ہی ہوگی۔ اس کی وجہ آپ کو ان نظموں میں مل جائے گی۔

فہمیدہ ریاض

اب سو جاؤ

اب سو جاؤ —
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو
تم چاند سے ماتھے والے ہو
اور اچھی قسمت رکھتے ہو
بچّے کی سی بھولی صورت
اب تک ضد کرنے کی عادت
کچھ کھوئی کھوئی سی باتیں
کچھ سینے میں چبھتی یادیں
اب انھیں بھلا دو — سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو
سو جاؤ — تم شہزادے ہو
اور کتنے ڈھیروں پیارے ہو
اچھا تو کوئی اور بھی تھی ؟
اچھا، پھر بات کہاں نکلی ؟
کچھ اور بھی یادیں بچپن کی
کچھ اپنے گھر کے آنگن کی
سب بتلا دو — پھر سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو
یہ ٹھنڈی سانس ہواؤں کی
یہ جھلمل کرتی خاموشی
یہ ڈھلتی رات ستاروں کی
بیتے نہ کبھی — تم سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

فہمیدہ ریاض

وہ لڑکی

جن پر میرا دل دھڑکا تھا، وہ سب باتیں دہراتے ہو
وہ جانے کیسی لڑکی ہے تم اب جس کے گھر جاتے ہو!

مجھ سے کہتے تھے: بن کاجل اچھی لگتی ہیں مری آنکھیں
تم اب جس کے گھر جاتے ہو، کیسی ہوں گی اس کی آنکھیں
تنہائی میں چپکے چپکے نازک سپنے بُنتی ہو گی
تم اب جس کے گھر جاتے ہو، کیا وہ مجھ سے اچھی ہو گی!
مجھ کو تم سے کیا دلچسپی، میں اِک اِک کو سمجھاتی ہوں
یاد بہت آتے ہو جب تم، یوں جھوٹوں دل بہلاتی ہوں
اِک دن ایسا بھی آئے گا، مجھ کو پاس نہیں پاؤ گے!
یاد آؤں گی . یاد آؤں گی! پچھتاؤ گے، پچھتاؤ گے!
لیکن میں دُکھ درد سمیٹے، ان گلیوں میں کھو جاؤں گی
لاکھ مجھے ڈھونڈو گے لیکن ہاتھ تمھارے کیا آؤں گی

فہمیدہ ریاض

ہاکس بے°

لہروں کی آوازیں سنتا
وہ چپ چاپ چلا جاتا ہے
اُٹھتی گرتی آوازوں سے،
پورا ساحل گونج رہا ہے
چاندی جیسا جھاگ اُڑاتی،
بے کل لہریں ڈول رہی ہیں
ٹھنڈے اور گیلے ساحل پر،
اس کے آہستہ قدموں کے
ایسے نقش اُبھر آئے ہیں،
جیسے اس کے لمس کے نیچے،
نرم اور بات سمجھنے والی
ریت نے کہنا مان لیا ہے
ننھے ننھے، پیارے پیارے،
نیلے اور گلابی پتھر،
ریت کے اندر جھلک رہے ہیں
سرد ہوا کا بھاری جھونکا،
جو اس کا بچھڑا ساتھی ہے
پیار سے آکر گلے لگا ہے
اس کے ماتھے اور گردن پر
ریت کے ذرّے لگے ہوئے ہیں

° HAWKS Bay ساحل کراچی کا ایک دلفریب مقام

فہمیدہ ریاض

سردیوں کی ایک شام

اک پیڑ کی اوٹ سے نکل کر
ڈوبا سرما کا زرد سورج
مٹیالے بادلوں کے پیچھے،
چپ چاپ اُفق سلگ رہا ہے
آوارہ ہوا کا سرد جھونکا،
بھٹکی سرگوشیاں سنا کر،
سُوکھے پتوں سے کھیلتا ہے
خوشبو میں گھُلی گھُلی اُداسی
ہر چیز کا رنگ سوچتا ہے
تنہائی کی شام جا رہی ہے
سینے کا بوجھ بڑھ رہا ہے
بیتی باتوں کی یاد بن کر،
پہلا تارا لرز رہا ہے

جیسے مرے آس پاس کوئی
چھپ کر ہچکی سے رو رہا ہے
آنسو آنکھوں میں چبھ رہے ہیں
کوئی مرا دل مَسل رہا ہے
کچّا رشتہ جو تجھ سے ٹوٹا
اب روح کا زخم بن گیا ہے
پتھر بن کے میں سوچتی ہوں
تو میرے لیے نہیں بنا ہے
لیکن دل کی اُداس دھڑکن
چپکے چپکے یہ کہہ رہی ہے
تو میری رگوں میں رچ گیا ہے

فہمیدہ ریاض

ایک شام

بیت چلی اداس شام
بجھ گئی بادلوں کی آگ
پھیل گئیں سیاہیاں
ایک اندھیرے موڑ سے
روشنیاں، گریز پا —،
— کوئی نہ میری آرزو
کوئی نہ دل میں اشتیاق
کیوں مری خالی آنکھ میں
رنگ بھرے گا کوئی خواب
شام کا تارا دیکھ کر
میں نہ کسی کا لوں گی نام
میرے لیے کوئی نہیں
اجنبی ہیں یہ خوشبوئیں
اجنبی ہیں دھنک کے رنگ
شام کا تارا اجنبی
اجنبی ہے ہوا کا راگ
سب کسی اور کے لیے

مری چنبیلی کی نرم خوشبو

مری چنبیلی کی نرم خوشبو
ہوا کے دھارے پہ بہ رہی ہے
ہوا کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے
ترا بدن ڈھونڈنے چلی ہے

مری چنبیلی کی نرم خوشبو
مجھے تو زنجیر کر چکی ہے
الجھ گئی ہے کلائیوں میں
مرے گلے سے لپٹ گئی ہے
وہ رات کی کُہر میں چھپی ہے
سیاہ خنکی میں رچ رہی ہے
گھنیرے پتوں میں سرسراتی
ترا بدن ڈھونڈنے چلی ہے

مرتب، ڈاکٹر وحید قریشی،

فرہنگِ شیرانی

(آخری قسط)

صورت بستن: شاہ نامہ میں نہیں ملتا زلیخا میں ہے (بحوالہ اشعار یوسف زلیخا تصنیف فردوسی) فردوسی ص۱۹۸

عام: جمع عوام ہے لیکن مصنف جواہر الغات اور جیلاج نامہ، اعوام لاتا ہے۔ تنقید ص۴۸۲

عتاب برداشتن: شاہ نامہ سے غیر حاضر ہے، زلیخا میں موجود ہے (بحوالہ اشعار یوسف زلیخا) فردوسی ص۲۰۰

عجب ماندن: دیکھئے شگفت ماندن

عرّادہ: "عرادہ منجو مغربی کہ بداں جنگ از حصار اندازند" (بحر الفضائل)

"عرادہ منجنیق خورد"۔ (شرف نامہ احمد منیری)

"عرادہ آلۂ جنگ خورد تر ز منجنیق" (لغات موجودہ)

اس آلے کا استعمال بھی قدیم معلوم ہوتا ہے۔ آداب الحرب میں اس کی چار قسمیں بیان ہوئی ہیں (۱) عرادۂ یک روئی جس سے صرف ایک ہی سمت میں سنگ اندازی کی جائے۔ (۲) عرادہ گرداں جو گھوم سکے۔ (۳) عرادۂ خفتہ جو صرف ایک جگہ قایم ہو۔ (۴) عرادۂ رواں جو ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کر سکے۔ فردوسی، اسدی اور نظامی کے ہاں یہ لفظ ملتا ہے۔ راسا ص۳۰۹

عذر خواہی: مثنوی لیلیٰ مجنوں تصنیف دکنی میں بمعنی عذر خواہی آتا ہے مقالات ص۱۸۲

عفو: بروئے تفریس بفتح اول و ضم ثانی۔ یوسف زلیخا دونوں تلفظ سے واقف ہے۔ (بحوالہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا)

فردوسی اول تو شاہنامہ میں اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو قاعدۂ تفریس سے نابلد ہے اور صحیح تلفظ سے لکھتا ہے۔

(بحوالہ شعر فردوسی از شاہ نامہ ۴۰۰ھ) فردوسی ص۲۰۸

عقد بستن: عقد کردن ... دیکھئے "بند بستن"

عماری: زلیخا اگرچہ صحیح تلفظ سے باخبر ہے۔ حرفِ دوم کو مشدد بھی باندھا ہے۔ (بحوالہ اشعار مثنوی مذکور)۔ شاہ نامہ (تصنیف ۴۰۰ھ) میں عماری کا ذکر اگرچہ پچاسوں مقام پر آیا ہے مگر مشدد کی ایک مثال بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ فردوسی ص۲۰۹

عمدا: بسکون دوم (بحوالہ اشعار عمعق بخاری و حکیم ضیاء الدین محمود الکابلی)، زلیخا میں ایک مقبول روزمرہ بن گیا ہے (بحوالہ اشعار مثنوی

یوسف زلیخا، شاہ نامہ نہ صحیح اور نہ معترض لاتا ہے۔

فردوسی ص۲۰۷

عید قرباں: .... قدمانے یہی سلوک (عربیت سے حتی الامکان اجتناب کرنا) عید قرباں کے ساتھ کیا جس کو جشن گوسفند کشاں یا عید گوسفند کشاں کہا جاتا تھا۔

(بحوالہ شعر دودکی) فردوسی ص۲۳۶۔

غریو یدن: لغات میں شور و غوغا نیز فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے۔ زلیخا میں مطلق رونے کے معنوں میں آتا ہے.... یاد رہے کہ صاحب یوسف زلیخا اس لفظ کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے اس کا استعمال کثرت سے کرتا ہے۔ شاہ نامہ میں وہ اول تو قلت کے ساتھ ملتا ہے اگر ملتا ہے تو محض شور، للکار یا فریاد کے معنی دیتا ہے۔

فردوسی ص۲۰۱

فائدہ: (ہندی لفظ ہے بحوالہ نصاب سہ زبان مصنفہ عبدالواسع) یہی لفظ خالق باری میں بھی اسی لہجہ سے ہے۔ پنجاب ص۱۹۹

فائدا: بمعنی فائدہ (بحوالہ مثنوی لیلیٰ مجنوں مصنفہ احمد دکنی) مقالات ص۱۸۶

فرمان کردن: اطاعت کردن۔ شاہ نامہ تکمیل ۴۰۰ھ میں کثرت سے آتا ہے۔ (بحوالہ اشعار کتاب مذکور) فردوسی ص۲۴۳

فرنگی: ہندوستان میں فرنگیوں میں سب سے پہلے پرتگالی ہیں جو غالباً سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے موجود ہیں۔ فوج میں بھی ملازم رکھے جاتے ہیں اور خصوصاً توپ خانے میں۔ ٹاڈ صاحب کا یہ عذر کہ ان فرنگیوں سے مراد حروب صلیبی کے فرنگی ہیں واقعات معلومہ کے سامنے عذر لنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ فرنگی ہندوستان میں صرف دسویں صدی ہجری کے آغاز سے ملنے لگے ہیں۔ اس صدی سے قبل ان کا پتا نہیں ملتا۔ ابتدا میں صرف گجرات اور دکن میں نظر آتے ہیں۔ بعد میں ہندوستان خاص میں بھی آنے لگے۔

راسا ص۱۶۱ و ص۱۶۲

فروع: فروع میں ایسے اوزان شامل ہیں جو ان ارکان کے توابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض فروع سے اوزان بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً مفاعیل یا مفاعیل فاعلات مرکب حالت میں، لیکن فروع کا اصلی دائرہ عمل زیادہ تر اواخر مصاریع سے تعلق رکھتا ہے۔ رسالہ ص۱۳۰

قصر: عروض قدیم میں ایک زحاف جس کی رو سے رکن کا آخری حرف گر کر اس کا حرف ماقبل ساکن ہو جاتا ہے مثلاً مفاعلاتن سے فاعلات اور فعولن سے فعول۔

رسالہ ص۱۴۱

قضا را: شاہ نامہ میں اس کا رواج نہیں اگرچہ (ایک) مثال میرے دعوے کے خلاف ہے۔

تمام شاہ نامہ میں صرف ایک نظیر ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فردوسی اس محاورے کا عادی تھا۔ ممکن ہے کہ بعد کی ترمیم ہو۔ زلیخا میں البتہ یہ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ (بحوالہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا)

فردوسی ص۲۰۱

قلاجوری: قلاجوری، ترکوں کا ہتھیار ہے۔ جو لوگ نیزے سے اور تلوار سے لمبے ہتھیار کے ساتھ جنگ کرنے کے عادی ہیں ان کے واسطے موزوں ہے۔ اسے ٹیڑھا یوں بنایا جاتا ہے کہ زخم چوڑا بھی آئے۔ اس کجی سے گھاؤ گہرا اور کھلا لگتا ہے۔ اگر نیزہ کام نہ دے اس حربے سے نیزہ اور تلوار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ (بحوالہ آداب الحرب)

راسا ص۳۵۹

ک : کاف بیانیہ اردو میں قدیم سے ہے پرانے مصنف اس کو شکل "ک" بھی لکھتے ہیں ..... بعد میں فارسی املا اختیار کر لیا گیا ..... فارسی اردو سے ہندوستان کی اکثر زبانوں ہندی گجراتی وغیرہ میں لے لیا گیا۔

پنجاب ص ۲۴۳

کاریگران : زلیخا میں ملازمین اور چاکروں کے معنوں میں آتا ہے شاہ نامہ (تکمیل ۴۰۰ھ) میں یہ لفظ معمار اور دیوارگر کے معنی دیتا ہے۔

(بحوالہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا و شاہ نامہ)

زلیخا میں اگر اس لفظ کو نئے معنوں میں استعمال کرنا فردوسی سے بعید معلوم ہوتا ہے

فردوسی ص ۲۱۰

کاس : (بحوالہ صاحب مؤید الفضلاء) اہل ہند آں را کچکول گویند۔" ہم جانتے ہیں کچکول فارسی لفظ ہے۔ وہ فارسی میں جب بھی مستعمل تھا اور اب بھی ہے لیکن چونکہ کچکول ان کے زمانہ میں اردو بولنے والے کثرت سے استعمال کرتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس کو اردو کا لفظ مان لیا۔ پنجاب ص ۲۸۹

کام کرتی نار بدن : محاورہ و زبان فارسی۔ شاہ نامہ میں دیکھا جاتا ہے اور زلیخا وا قعہ ہے۔ (بحوالہ اشعار شاہ نامہ ۴۰۰ھ) فردوسی ص ۲۱۱

کان : پنجابی میں بمعنی "واسطے" "دلئے" آتا ہے اور دکنی میں بھی یہی معنی دیتا ہے۔ (مثال پنجابی بحوالہ شعر عبدالحکیم و مثال دکنی بحوالہ شعر احمد دکنی قطب شاہی)

پنجاب ص ۱۳۹

کاہل : ... حالانکہ کاہل عربی میں سست کے معنی دیتا ہے لیکن اردو میں وہ بزدل اور نامرد کے معنی میں آنے لگا۔ اس کی تائید دکنی ادبیات سے ہوتی ہے جس میں کاہل فی الواقع بزدل کے معنی دیتا ہے (بحوالہ شعر محمد امین دکنی)

پنجاب ص ۲۸۹

کبش : دبابے سے ملتا جلتا آلہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس کا سر مینڈھے کے سر کے مشابہ اور آگے کو نکلا ہوتا۔ مینڈھے کا سر لکڑی یا لوہے کی موٹی بلی میں لگا ہوتا اور بلی دو رسیوں میں، جو دبابے کی چھت میں جڑی ہوئی چرخیوں پر کھنچا کرتی تھیں لٹکا کرتی تاکہ اس کے کھینچنے میں آسانی ہو۔

راسا ص ۳۰۹

کتارہ : کٹار، ہندوؤں، شہدوں اور غداروں کا ہتھیار۔ (بحوالہ آداب الحرب)

راسا ص ۳۵۹

کشکنجیر : فرہنگ نگاروں نے اس کے معنی بھی بڑی توپ بیان کئے ہیں (فرہنگ جہانگیری، انجمن آرائے ناصری) مگر فرہنگ بحر الفضائل میں جو ۸۳۷ھ کی تالیف ہے اس کے معنی "نوعے از منجنیق" دیئے ہیں۔ اور نوروز نامے سے جو حکیم عمر خیام کی تالیف ہے معلوم ہوتا ہے کہ کشکنجیر ایک خاص قسم کی نہایت سخت اور طاقتور کمان ہے۔

راسا ص ۲۱۱

کلہ زدن : باتفاق منتد و مستند و یر پرو زدن شاہ نامہ میں نہیں ملتا اور زلیخا میں ملتا ہے۔ اگرچہ شاہ نامہ اس محاورہ سے نابلد ہے۔ اسدی مسعود سعد سلمان اور سنائی کے ہاں ملتا ہے۔ (بحوالہ اشعار یوسف زلیخا تصنیف فردوسی)

فردوسی ص ۱۹۹

کلید و بند : ان کی ترکیب سے شاہ نامہ میں کئی محاورے بنائے گئے ہیں (بحوالہ شعر شاہ نامہ) زلیخا میں مطلق غیر حاضر ہے نظامی کے ہاں بند کی بجائے قفل آتا ہے۔

فردوسی ص ۲۴۵

کمان : کمانوں کی کئی قسمیں شمار کی ہیں یعنی چاچی، خوارزمی، پرواچی، غزنیچی، لاہوری، کردری، ہندری، کوہی وغیرہ (بحوالہ آداب الحرب) راسا ص ۲۵۵

کمان گاؤ : ہم ایک نئی چیز کمان گاؤ کا ذکر پڑھتے ہیں جو چینی استادوں کی ایجاد بتائی گئی ہے۔ اس کا نشانہ اگر میں عطا ملک جوینی کی عبارت کو صحیح سمجھتا ہوں، ڈھائی ہزار قدم جاتا تھا۔

راسا ص ۳۱۸

کندلواس : کدلواس، قزلباش۔ یہ لفظ دراصل ترکی قزلباش (سرخ سر) ہے۔ یہ اصطلاح ایران میں بعہد اسماعیل صفوی ۹۰۷ھ / ۱۵۰۲ء تا ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء

رواج میں آتی ہے۔ جس سے مراد شیعہ فوج ہے۔ اسماعیل نے یہ جدّت کی کہ اپنی فوج کو بارہ ترک والی ٹوپی، وردی کے طور پر دی۔ بارہ ترک رمز ہے بارہ آئمہ معصوم کی طرف۔ رفتہ رفتہ اس کے معنی ایرانی شیعہ سپاہی ہوگئے۔ ہندوستان میں اس لفظ کو اکبر کے عہد سے قبل تلاش کرنا فضول ہے۔ راساص ۱۶۴

کوتوال: خود فارسی میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی عہد (چوتھی صدی ہجری) میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں...... کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ والا بمعنی مالک قلعہ تھا یہ لفظ شاہنامہ فردوسی میں بھی موجود ہے۔ پنجاب ص ۹۳

کھانڈ: آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان اس کو کھنڈ بول رہے ہیں۔ اہل پنجاب اسی لفظ کو، آج بھی کھنڈ بولتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔ پنجاب ص ۱۹

کھنبیر: مثنوی لیلی مجنوں تصنیف احمد دکنی بعہد قلی قطب شاہ ۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ میں بمعنی کبیر آتا ہے۔ مقالات ص ۱۸۶

کھٹو: (۱) کھٹو تمام تر ریگستانی علاقہ ہے۔ یہ موضع ایک پہاڑ کے ضلع میں جو تیس میل لمبا ہے آباد ہے۔ پانی اس قدر نایاب ہے کہ اس علاقہ میں کسی وقت بھی کوئی وسیع جنگل محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(۲) کھٹو نام کے دو موضعے ہیں جو ایک دوسرے سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ایک کو دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے مغربی قصبے کو آج کل بڑی کھاٹو اور مشرقی قصبے کو چھوٹی کھاٹو کہتے ہیں۔

(۳) راقم نے اس قصبے کے متعلق جس قدر پرانے فرامین اور کتبے دیکھے ہیں، ان پر بہ صورت کھٹو نام ملتا ہے۔ کھٹو کلاں قدیم الایام میں نہایت اہم مقام ہوگا۔ وہاں کا سب سے قدیم کتبہ جو سابق میں کسی تالاب پر واقع تھا سلطان التمش متوفی ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عہد کی ایک جامع مسجد بھی موجود ہے۔ کھٹو میں شیرانیوں کا قبیلہ نہایت قدیم زمانے سے آباد معلوم ہوتا ہے۔ ان کے متعلق سب سے قدیم تلمیح کتاب مرتاہ الوصول الی اللہ والرسول میں ملتی ہے۔ جو شیخ احمد کھٹو کے حالات میں نویں صدی ہجری کے وسط کی تصنیف ہے۔ کھٹو کی شہرت وہاں کے پتھر اور بابا اسحٰق مغربی کے مزار نیز ان کے مرید شیخ احمد کھٹو کی بنا پر ہے جن کا مزار سرکھیج احمد آباد میں ہے۔ کھٹو پرگنہ ناگور میں واقع ہے۔ راساص ۱۶۷ تا ۱۶۸

کھرڑا: اردو میں عام طور پر آتا ہے...... اہل لغات اس کا ماخذ یہ اکرت کا کھرڈ داد بتاتے ہیں اس توجیہ کی بجائے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو پنجابی مصدر "کھڑنا" کی ماضی یا اسم مفعول مان لیا جائے کھڑنا کے معنی پنجابی میں رکنا اور ٹھہرنا ہے۔ (بحوالہ شعر عبدالحکیم پنجابی و احمد دکنی) پنجاب ص ۱۲۱/۱۲۲

کھونکار: خونکار، یہ لفظ فارسی میں خونکار اور خونگار کی شکل میں ملتا ہے۔ جو خداوندگار کا مخفف ہے۔ رشیدی میں اس کے معنی صاحب امر و صاحب فرمان دیئے ہیں۔ اصل میں سلاطین مغل، سلاطین عثمانیہ کو اس لفظ سے یاد کرتے تھے۔ ہندوستان میں مغلیہ عہد کے اہل قلم نے بھی یہ اصطلاح اختیار کرلی جو اکبر سے قبل بہت کم استعمال میں آئی۔ راساص ۱۶۵

کھیر: ملتانی میں دودھ کے معنی میں آتا ہے۔ قدیم اساتذۂ دکن بھی اسی معنی میں لاتے ہیں۔ (بحوالہ شعر میراں جی شمس العشاق) پنجاب ص ۱۳۹

کیکر: (خالق باری کے ایک مصرع میں آتا ہے) پنجابی لفظ بتایا گیا ہے...... لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز عمل یہ ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں قلمی نسخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع یہ کردیں ہے "ببم قرنفل ونگ دانیکو بداں"، اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض

الفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر لفظ "نیکو" ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو۔ پنجاب ص۲۰۱

کیمیا: حیلہ و تدبیر، شاہ نامہ میں عموماً آتا ہے، زلیخا اس لفظ سے واقف نہیں۔ (بحوالہ اشعار شاہ نامہ تالیف ۴۰۰ ھ) فردوسی ص۲۴۲

کیول: کیول کوئی لفظ نہیں۔ اصل لفظ "کنول" ہوگا۔ خالق باری ص۳۵

گما یدونکہ: قدما کے ہاں یہ ترکیب مستعمل ہے (بحوالہ شعر دقیقی و فردوسی) فردوسی ص۲۴۰

گرمی نمودن: بمعنی گرم جوشی کا اظہار کرنا، شاہ نامہ میں یہ محاورہ مفقود ہے، زلیخا میں موجود۔ (بحوالہ اشعار یوسف زلیخا تصنیف فردوسی) فردوسی ص۱۹۸

گرہ بردن: یہ محاورہ شاہ نامہ میں اس کے لغوی معنی میں ملتا ہے، یوسف زلیخا میں وہ کنایہ بن کر خاموش ہونے کے معنی دیتا ہے

(بحوالہ اشعار یوسف زلیخا) فردوسی ص۱۹۶، ۱۹۷

گزارشِ خواب: دیکھئے "تعبیر و معبر"

گزکاں: خالق باری میں ہے۔ گزکاں اس صورت آمند راج۔ برہان، نفائس، رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا۔ البتہ قازقاں، قزقال، گزغان بمعنی دیگ بزرگ میں ملتا ہے یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ (بحوالہ شعر امیر خسرو) پنجاب ص۲۰۰

گزگاں: گزکاں، یہ لفظ آنند راج، نفائس، برہان، رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا۔ البتہ قازقاں، قزغان اور گزغان بمعنی دیگ بزرگ میں ملتا ہے جو ترکی لفظ ہے، خسرو کے نزدیک اس کا تلفظ گزغان ہے نہ کہ گزگاں یا گزکاں جیسا کہ خالق باری میں ہے۔ خالق باری ص۳۴

گکھڑ: راسا میں گکھڑوں کا کثرت کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ وہ شہاب الدین کے وفادار اور اطاعت شعار تابعین سے ہیں مگر سلطان معز الدین کی تاریخ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گکھڑ سیاسی اعتبار سے بالکل نامعلوم کمیت ہیں۔ یہ کھوکھر ہیں جو سلطان موصوف کے عہد میں پنجاب میں نہایت طاقتور تھے اور سلطان کی آخری مہم انہیں کھوکھروں کے خلاف تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ کھوکھر کس عہد میں اسلام لائے لیکن اس قدر صاف پایا جاتا ہے کہ نویں صدی سے قبل وہ دائرۂ اسلام میں آچکے تھے۔

گکھڑوں کا سیاسی عروج اور تاریخ میں ان کی شہرت مغلوں کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ کوی چند کا اپنی تالیف میں گکھڑوں کو سلطان شہاب الدین کی ملازمت میں دکھانا حقیقت میں ایک تاریخی غلطی ہے۔ خود مغلیہ عہد کے مؤرخین میں سے بعض کو یہ مغالطہ پیش آیا ہے کہ وہ کھوکھروں کو گکھڑ سمجھ بیٹھے۔ راسا ص۱۵۳ تا ص۱۵۸

گلاب: جس پھول کو ایرانی گل کہتے ہیں اہل ہند اسے گلاب کہتے ہیں۔ لیکن یہ ہندوستانی تصرف ہے۔ راسا ص۲۰۹

گمان زدن: بمعنی گمان کرنا، یہ زلیخا (مثنوی یوسف زلیخا) کی شانِ خصوصیت ہے کہ اس میں گمان زدن ملتا ہے۔ فردوسی شاہ نامہ میں اس سے ناواقف ہے۔ (امثال از زلیخا) فردوسی ص۱۸۷

گوری: راسا، پرتھی راج نے سلطان کے وزیر تتار خاں کے ایلچی لورک رائے کھتری سے پوچھا، تمہارا بادشاہ شہاب الدین گوری کیوں کہلاتا ہے؟ اس نے عرض کی کہ غزنیں کے تخت پر مسلمانوں کا بادشاہ شاہ جلال اپنے حرم میں پانسو دس عورتیں رکھتا تھا اور ہر حاملہ عورت کو اس لئے قتل کر دیتا کہ مبادا اس کی اولاد نرینہ اسی کی قاتل ہو۔ ایک درویش شیخ نظام نامی کی بشارت سے اس کی ایک بیوی جس کا نام شیخ بی بی تھا، حاملہ ہوئی لیکن وہ سلطان کے خبر پانے سے پہلے ہی گھر سے فرار ہو کر کسی گورستان میں پناہ گزیں

ہوئی۔ وہاں اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جو باپ کا وارث تخت ہوا۔ چونکہ وہ بچہ (شہاب الدین) کسی گور میں پیدا ہوا تھا اس لئے گوری کے لقب سے مشہور ہوا۔ راسا ص۱۱۴ تا ۱۱۵

(۲) مسلمان مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ ملک غور اس کا وطن تھا (اس لئے غوری مشہور ہوا) ایسی نکتہ سنجیاں راسا کے مصنف کی جہالت اور تاریخ سے اس کی بے خبری کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ راسا ص۱۱۶

گوش داشتن: بمعنی گوش کردن و متوجہ شدن و کنایۂ از نگہ داشت و حفاظت شاہنامہ میں پہلے معنوں میں عام طور پر رائج ہے (بحوالہ اشعار شاہنامہ) ... دو امثال کے سوا گوش داشتن شاہنامہ میں حفاظت کے معنی نہیں دیتا۔ زلیخا میں وہ کنایہ بن کر عام طور پر حفاظت اور نگہداشت کے معنی دیتا ہے۔ فردوسی ص۱۹۶

گھنگھرو: گھنگھرو زنگولہ کی ہندی ہے۔ خالق باری ص۳۵

لاڈلون: لاڈلون فی زمانہ ایک جاگیری قصبہ ہے جو اس کے لکڑی بنیوں کی بنا پر دور دور مشہور ہے۔ یہ قصبہ جودھپور ریلوے کی اس شاخ پر ایک اسٹیشن ہے جو سجان گڈھ اور ڈیگانہ جنکشنوں کے درمیان چلتی ہے۔ راسا ص۱۷۶

لاکھ: آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان اس کو لکھ بول رہے ہیں اہل پنجاب (اسی لفظ کو آج بھی لکھ بول رہے ہیں ... اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے اس میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔ پنجاب ص۱۹

لڑنا: پنجابی میں سانپ کے ڈسنے کے لئے آتا ہے آج بھی کثرت سے بولا جاتا ہے۔ دکنی میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ (بحوالہ شعرا احمد دکنی) پنجاب ص۱۳۷

لطف: یہ تحریک اوّل و ثانی بقاعدہ تفریس درست ہے۔ (بحوالہ اشعار منوچہری ادیب صابر و مثنوی یوسف زلیخا) فردوسی ص۲۰۹

لوڑنا: بمعنی ضرورت ہونا پنجابی میں بالعموم آتا ہے۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔ (بحوالہ شعرا احمد دکنی) پنجاب ص۱۳۵

لوک: بمعنی لوگ۔ پنجابی میں گ ہے اور اردو میں گ لیکن اردو قدیم میں ک ہی تھا۔ (بحوالہ شعر شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ) (و بحوالہ شعرا احمد دکنی) پنجاب ص۱۴۲

لونبڑی: ہندی لفظ ہے نصاب سہ زبان میں آتا ہے خالق باری میں لونکڑی ہے (بحوالہ سہ زبان و خالق باری) پنجاب ص۱۹۹

لونگ: جزائر شرق الہند سے آتی ہے۔ ان میں جاوا اور زنبا دیا قابل ذکر ہیں۔ راسا ص۲۰۰

لہندا: مغربی مؤرخین نے شمالاً جنوباً (پنجاب میں) ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کردیا ہے۔ شرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے۔ پنجاب ص۹۱

ماٹی پاتھر: خالق باری میں آتا ہے ... آج ہم پنجابی لہجہ میں مٹی پتھر کہتے ہیں۔ پنجاب ص۱۵۳

مانگنا تانگنا : (محاورہ زبان اردو) اردو خوان جزوِثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں لیکن پنجابی زبان میں یہ الفاظ بامعنی ہیں اور آج بھی استعمال میں آرہے ہیں۔ بنجاب ص ۱۹

ماننہ : بمعنی میں (بحوالہ مثنوی لیلی مجنوں تصنیف احمد دکنی) اسی مثنوی میں کی بعض اور قدیم شکلیں دیکھئے نانہ بمعنی نہیں، بی بمعنی بھی، کیہیں بمعنی کبھی، کدہیں کبھی وغیرہ مقالات ص ۱۸۹

مشاطا : بمعنی مشاطہ (بحوالہ مثنوی لیلے مجنوں تصنیف احمد دکنی بعہد قلی قطب شاہ) مقالات ص ۱۸۹

معائنہ : بروزنِ مفاعلہ ہے مصنف (جواہر اللغات دہیلاج نامہ نے بروزن مفاعیلہ استعمال کیا ہے تنقید ص ۴۸۳

مغل اور چغتا : مغلوں کا خروج ممالک اسلام میں ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء کا واقعہ ہے جب وہ مسلمانی سلطنتوں کا چراغ گل کرتے ہوئے روم و روس بلکہ یورپ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ ان کے حملے برابر ہوتے رہے خصوصاً صوبہ پنجاب میں مگر ۹۳۲ھ/۱۵۲۸ء تک ان کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا جب ظہیر الدین محمد بابر پانی پت کے میدان میں لودھیوں کی طاقت توڑ کر ہندوستان کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ چندکوی نے راسا میں میواتی پر حکمراں جس مغل بادشاہ کا ذکر کیا ہے اس کا ہندوستان میں وجود اس زمانے میں قرین قیاس نہیں۔ راسا ص ۱۵۹ تا ص ۱۶۱

ملجور : تیمور نے بعض حالات میں ملجور سے کام لیا ہے۔ ملجور وہی ہے جسے ہم دھس اور دمدمہ کہتے ہیں۔ یہ ایک بلند تعمیر یا چبوترہ ہے جو لکڑیاں ایک دوسرے پر چن کر تیار کیا جاتا ہے۔ جوف میں پتھر اور مٹی بھرتے اور چنتے جاتے ہیں حتیٰ کہ چبوترہ قلعے کی دیوار سے بلند ہو جاتا ہے، پھر اس پر سے سنگ باری کرتے ہیں۔

قلعہ اوینک کی حصار بندی کے وقت جب منجنیقیں اور عرادے کامیاب ثابت نہ ہوئے، تیمور ملجور کی تیاری کا حکم دیتا ہے۔ اس کے لئے فوجی دور دراز مقامات سے درخت کاٹ کر لاتے اور ملجور بناتے ہیں۔ (بحوالہ ظفر نامہ) راسا ص ۳۳۳ و ص ۳۳۴

ملکت : بمعنی مملکت فی زمانہ متروک ہے۔ شاہ نامہ میں غیر رائج ہے اس لئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ سلجوقی دور میں اس کا رواج پھیلا۔ اس عہد کے شعرا، منوچہری، معزی، عثمان مختاری، حکیم سنائی، عمعق بخاری وغیرہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ مثنوی یوسف زلیخا میں بھی ہے۔ (بحوالہ اشعار شعراء مذکور و مثنوی مذکور) فردوسی ص ۲۰۴ و ص ۲۰۵

ملوک : غوریوں کے زمانے میں امرائے سلطنت ملوک کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ اور ان کے ناموں سے پہلے ملک (بفتح اول وکسر دوم) کا لفظ ضرور لایا جاتا تھا۔ راسا ص ۱۲۰

منجنیق : آلات قلعہ کشائی میں منجنیق کا استعمال نہایت قدیم ہے۔ قدیم فنیقی اسے استعمال میں لائے ہیں۔ ان سے یونانیوں اور اسرائیلیوں نے اخذ کی اور پھر دنیا کی دیگر اقوام میں پھیل گئی۔ عرب اس کی ایجاد نمرود کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سنہ ۲۰۰ ق م میں حمیریہ بادشاہ عیرہ نے اس سے کام لیا ہے جب رسول اللہ نے طائف کا محاصرہ کیا طفیل ابن محمد دوسی بت خانۂ ذی الکفین کے انہدام کی غرض سے بھیجا گیا۔ چار دن بعد اپنے چار سو آدمیوں کے ساتھ واپس آکر مع منجنیق و دبابہ رسولِ خدا سے ملحق ہو گیا۔ راسا ص ۲۸۸

(۲) منجنیق کا ذکر وصاف، شرف الدین یزدی، الکتبی لاہوری، قلقشندی، شاہد صادق، جرجی زیدان وغیرہ نے اپنی کتابوں میں کیا جس سے غازان خان، ملک اشرف والی مصر، امیر تیمور، مسعود شہید غزنوی، شاہجہاں وغیرہ کے عہد میں اس کا استعمال عام تھا۔ راسا ص ۲۹۲ تا ص ۳۰۰

(۳) منجنیق کی قسمیں: (۱) منجنیق عروس، جو چاروں طرف مارتی ہے۔ (۲) منجنیق دیو، جو غالباً ڈیل ڈول کی بنا پر اس نام سے کہلاتی ہے

(۳) منجنیق غوری وار (۴) منجنیق رواں جو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو سکتی تھی۔ (بحوالہ کتاب آداب الحرب) راسا ص۳۰

(۴) لفظ منجنیق کو عام طور پر ایرانی الاصل مانا جاتا ہے۔ مگر فردوسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی داستانوں میں ان آلات پر کام کرنے والے بالعموم رومی اور عیسائی ہوتے تھے۔ راسا ص۳۰

منجنیق ارمانوس: الپ ارسلان سلجوقی ۴۵۵ھ و ۴۶۵ھ اور ارمانوس قیصر روم کی جنگ میں رومیوں کے پاس ایک عظیم الشان منجنیق تھی۔ جس پر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ وہ آٹھ حصوں میں منقسم تھی اور اس کی بار برداری کے لئے ایک سو آدمی درکار تھے۔ اس منجنیق سے ایک ایک من سے زاید کا پتھر پھینکا جاتا تھا۔ راسا ص۲۹

منجنیق عروس: محمد بن قاسم نے جب ۹۲ھ میں دیبل پر حملہ کیا، اس کے پاس ایک منجنیق تھی جس کا نام عروس تھا۔ اسے کام میں لانے کے واسطے پانسو آدمی درکار تھے۔ معلوم ہوتا ہے بعد میں اس قسم کی منجنیقوں کا نام عروس رکھ دیا گیا۔ راسا ص۲۸۹

مونجم: مثنوی لیلیٰ مجنوں تصنیف احمد دکنی قلی قطب شاہ میں بمعنی منجم استعمال ہوا ہے۔ مقالات ط۱۸۶

مے: ماضی ناتمام اور حال کی علامت ہے (مثنوی جواہر الذات اور ہیلاج نامہ میں) اصل فعل سے دور لایا جاتا ہے۔ تنقید ط۴۸

میرآتش: یہ عہدہ ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد رواج پاتا ہے۔ راسا ص۱۳۰

میشوم: بمعنی شوم، منشوم کی بگڑی شکل ہے۔ شاہ نامہ میں نامعلوم ہے اور زلیخا میں موجود ہے۔ (بحوالہ اشعار یوسف زلیخا) (بحوالہ قابوس نامہ) فردوسی ص۲۰۹

ناجخ: ناجخ شاہی حربہ ہے دوست اور دشمن دونوں کے کام کا ہے۔ دوست کے لئے مہرہ ناجخ اور دشمن کے لئے ناجخ کا سر جو تلوار کی طرح کام کرتا ہے۔ (بحوالہ آداب الحرب) راسا ص۳۵۹

نارنگی: ایرانی اسے نارنگ کہتے ہیں جس کی معرب شکل نارنج ہے۔ نارنگ کے آخر میں "یے" کا اضافہ ہندوستانی اختراع ہے۔ راسا ص۲۱۱

ناری جبیں نرہ: اردو بیگنی۔ مغلوں کے ہاں قلماقنیوں اور اردو بیگنیوں کا دستور تھا۔ جو مردانہ لباس زیب تن کئے، پانچوں ہتھیاروں سے مسلح پہرہ چوکی اور محلات کے حفاظتی کاموں پر متعین ہوتی تھیں۔ راسا ص۲۰۳

نال: بمعنی ساتھ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اردو میں بالعموم تھا۔ (بحوالہ شعر محمد افضل متوفی ۱۰۳۵ھ)

نامہ: اس لفظ کے استعمال سے زلیخا میں کئی کنایے حاصل کئے گئے ہیں۔ شاہ نامہ میں یہ صورت نظر نہیں آئی (بحوالہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا) فردوسی ص۲۲۴

ناوک: ایک پولی لکڑی ہوتی ہے جس میں رکھ کر تیر کو ایک خاص طریقے سے چلاتے ہیں اس کی کمان نخش کہلاتی ہے۔ ناوک کا تیر اور تیروں کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ صاحب مصطلحات الشعرا نے اسے ایک نے کہا ہے جس میں تیر رکھ کر چلاتے ہیں۔ راسا ص۳۲۲

نباہ: ہندوستان میں ایک قسم کی تلوار ہوتی ہے جسے نباہ کہتے ہیں۔ وہ نرم لوہے، تانبے اور چاندی کی ملاوٹ سے بنتی ہے۔ چاندی کی وجہ سے اس کے جوہر چمکیلے ہوتے ہیں۔ اس تلوار کا گھاؤ کم بھرتا ہے۔ (بحوالہ آداب الحرب) راسا ص۳۵۶

نبیرہ: نبیرہ فرزند زادہ ہے یعنی پوتا اور نواسا۔ بلکہ زیادہ مشہور معنی پوتا ہیں۔ خالق باری ص۲۳

نظم: عربی لفظ۔۔۔ فارسی مرادف پیوستن۔۔۔ عربی میں۔۔۔ مصدر بمعنی اسم مفعول اسی طرح نظم بحالت مفعولی بمعنی کلام منظوم آ گیا۔ فارسی والوں

نے اسی قاعدہ کو مدِ نظر رکھ کر پیوستن کے اسم مفعول پیوستہ سے یہی معنی اختراع کئے۔ معنی پر غور کرنے سے رہا سہا شبہ بھی جاتا رہتا ہے۔ عربی مصدر نظم کے معنی ملانا، ترتیب دینا ہے کیا یہ ضروری ہے کہ مرادف پیوستہ بھی تمام معنی پر حاوی ہو۔ یہی کیفیت پراگندہ اور نثر کی ہے۔

نکوئی : بمعنی حسن و جمال۔ ان معنوں میں شاہ نامہ (تکمیل ۴۰۰ھ) میں یہ لفظ غیر مستعمل ہے۔ زلیخا میں بالعموم ملتا ہے۔ سنائی غزنوی کے ہاں بھی ہے۔ (بحوالہ اشعار مثنوی یوسف زلیخا و سنائی غزنوی) فردوسی ص۲۰۹

نگینہ : نگینے کے مشہور اور معتبر معنی نگین یا نگ ہیں۔ انگوٹھی پر اس کا اطلاق بہ سبیل مجاز ہے۔ اور نہایت قلت سے استعمال ہوا ہے۔

خالق باری ص۳۲

نوبت بجانا : ... نوبت زدن فارسی محاورہ ہے۔ کبیر نے اس کا ترجمہ کر لیا ہے پنجاب ص۲۰۷

نیا : نیا کے معتبر معنی نانا یا دادا ہیں۔ چنانچہ لغت فرس، فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی، چراغ ہدایت اور آنند راج میں یہی معنی دیئے ہیں۔ اور فردوسی بالعموم انہی معنوں میں لاتا ہے۔ مصنف خالق باری نہایت مشہور و مستند معنی ترک کر کے مشتبہ یا غلط معنی ماحول بیان کرتا ہے۔ خالق باری ص۴۲

نیزہ : ترکوں اور عربوں کا ہتھیار ہے۔ بحرین میں خط نام ایک گاؤں ہے نیزۂ خطی اس کی طرف منسوب ہے۔ عراق و خراسان میں بید کا نیزہ بنتا ہے جو سبک ہونے کی وجہ سے سواری اور حلقۂ ابائی کے واسطے مناسب ہے۔ (بحوالہ آداب الحرب) ملا سا ص۳۶

نیولا : خالق باری میں نیول آتا ہے ... لیکن اردو نے اپنا قاعدۂ مستمر جاری کر کے نیولا بنا دیا۔ پنجاب ص۹۸

وارج : ارج بفتح اول۔ قدر و قیمت و شان و شکوہ اور حد و اندازہ کے معنی میں آتا ہے۔ زلیخا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور شاہ نامہ میں عنقا ہے۔ شاہ نامہ اس کی بجائے ارج لاتا ہے۔ اگرچہ ارج اور ورج اصل میں ایک ہی لفظ ہیں اور ان کے معنی قدر و قیمت اور شان و شکوہ کے ہیں لیکن زلیخا میں ورج کے معنوں میں اور بھی عمومیت ہے امثال اول و دوم میں ورج برکت کرامت وغیرہ کے معنوں میں لایا گیا ہے۔ فردوسی ص۲۱۱ و ص۲۱۲

ول : پنجابی میں طرف کے معنی دیتا ہے۔ دکنی میں اس کی ترکیب سے دُوَلاں یعنی دو طرفہ آتا ہے (بحوالہ شعر قصیدہ محمد قلی قطب شاہ معاصر اکبر) پنجاب ص۱۳۸

وِن : حالتِ مجروری میں پنجابی میں کسی لفظ کے آخر ون بڑھا دیتے ہیں مثلاً ہاتھوں اور پیچھوں، دکنی میں یہ قاعدہ موجود ہے (بحوالہ شعر محمد امین دکنی) پنجاب ص۱۳۲

ویژہ : بیائے مجہول و زائے فارسی۔ خاصہ و خالص و بیغش۔ اس صورت میں یہ لفظ دونوں مثنویوں (شاہ نامہ و یوسف زلیخا) میں ملتا ہے اور دونوں تصنیفات میں روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی جمع ویژگان ہے۔ اس صورت میں خواص اور ندما کے معنوں میں آتا ہے۔ شاہ نامہ میں بالعموم رائج ہے۔ (بحوالہ اشعار شاہ نامہ و نظامی) ویژگان یوسف زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے۔ یہ امر قرینِ حیرت ہے کہ فردوسی اگر وہ یوسف زلیخا کا مالک ہے تو ویژگان کے استعمال سے اس مثنوی میں کیوں محترز ہے۔ فردوسی ص۲۱۵

ویں : پنجابی میں آ، جا، کھا وغیرہ کے علاوہ ایک اور امر ہے جو معمولی امر کے آخر میں 'یں' یا 'ویں' کے لانے سے بنتا ہے (بحوالہ پنجابی شاعر عبد الحکیم) جہاں تک معلوم ہے امر کی یہ خاص شکل پنجاب کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری زبانوں میں نہیں ملتی لیکن بہت کم لوگ واقف ہیں کہ قدیم اردو میں یہ شکل موجود تھی (بحوالہ شعر محمد امین دکنی) پنجاب ص۱۱۰

ہتھ : یعنی ہاتھ اہلِ دکن پنجابی طرز میں بھی لکھتے ہیں۔ (بحوالہ شعر محمد قلی قطب شاہ ۱۰۲۰ھ) پنجاب ص۱۴۱

ہتھنال: ہتھنار۔ اکبر کی اور ایجادات کے علاوہ ایک یہ ہتھنال بھی ہے یعنی ہاتھی کی توپ جس کا نام اکبر نے گنج نال رکھا تھا۔ اکبر کے عہد سے قبل اس گنج نال یا ہتھنال کا کتب تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔ داساص ۱۷۳

ہریانی: در اصل ایک قسم کی اردو ہے جو ۱۱ویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اس قدر مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دکھی جاتی ہے ۔۔۔ مابعد جبکہ ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ اردو میں دہلی کے محاورے اور شعرا کے تصرفات کی بنا پر تغیرات واقع ہوئے اور موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔ پنجاب ص۲۵

ہلنا جلنا: اردو خواں اس کے جز ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں لیکن پنجابی زبان میں یہ لفظ با معنیٰ ہے اور آج بھی استعمال میں آ رہا ہے۔ پنجاب ص۱۵

ہمزاد: اس کے معنی لغت میں ہم سن اور ہم سال ہیں ایسے رفیق پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو سفر و حضر میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو (بحوالہ شعر نظامی) یوسف زلیخا میں عموماً برادر کا مرادف ہے (بحوالہ اشعار مثنوی مذکور) زلیخا میں جبکہ وہ بیسیوں مقام پر ملتا ہے اور صاحب زلیخا کا روزمرہ بن گیا ہے۔ تمام شاہنامہ میں باوجود تلاش صرف ایک مثال داستان فرود میں ملی (بحوالہ شعر شاہنامہ و بحوالہ قابوس نامہ باب چہل و دوم اندر شرط سپہ سالاری ص۱۳۱) فردوسی ص۲۲۲

ہمیر: (۱) ساتویں صدی ہجری میں رنتھنبھور کے راجا کا نام ہے جو ہمیر دیو کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) ہمیر مسلمانی لفظ ہے اور لفظ امیر کی بگڑی شکل ہے۔ اول اول بخط ہندی مسکوکات پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس میں سب سے قدیم خود سلطان معز الدین محمد بن سام کے سکے ہیں جن پر "سری ہمیر" کی شکل میں ملتا ہے۔ سری ہمیر سے مقصد امیر المومنین خلیفۂ بغداد ہے۔ یہ ہندی کلمہ سلطان معز الدین، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز، سلطان رضیہ وغیرہ کے مسی سکوں پر نظر آتا ہے۔ داساص ۱۷۱

ہندی: مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے کہ وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں، عام اس سے کہ پنجابی ہو برج ہو یا پوربی۔ اردو ہو یا مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج، قنوجی، اودھی، بندیلی، مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کر لیا ہے۔ پنجاب ص۱۵۲

ہندی: ہندوی (۱) اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے۔ اس کی ایک پرانی مثال وہ ہے جو حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کے رسالہ خوش نغز میں ملتی ہے۔ پنجاب ص۵۸

ہنسنا: پنجابی میں (یہ لفظ) بہ تخفیف نون غنہ آتا ہے یعنی ہسنا یعنی اہل دکن بھی ہسنا بولتے تھے۔ (بحوالہ شعر محمد امین دکنی) پنجاب ص۲۹

ہوش باز آوردن: زلیخا میں نظر نہیں آتا شاہنامہ میں موجود ہے۔ (بحوالہ اشعار شاہنامہ تکمیل ۴۰۰ھ) فردوسی ص۲۴۳

ہیا: مثنوی لیلیٰ مجنوں تصنیف احمد دکنی بعہد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۰ھ میں بمعنی حیا مستعمل ہے۔ مقالات ص۱۸۷

یارمند: شاہنامہ تکمیل ۴۰۰ھ میں عام طور پر ملتا ہے۔ فردوسی ص۲۷

یائے مخلوطہ: قدیم زمانوں میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ملتی ہے، چنانچہ اردو میں متروک ہے اور پنجابی میں اب بھی بدستور موجود ہے اردو میں اب وہ صرف دو چار الفاظ میں ملتی ہے جیسے "کیا" اور "کیوں" وغیرہ ۔۔۔ یہ حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر تلفظ میں آتی تھی ۔۔۔ اس قاعدہ کا دونوں زبانوں میں اتنا زور رہا کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی اس کا اجرا ہونے لگا جیسے "خیال"۔

(بحوالہ شعر احمد دکنی و امین دکنی و میر تقی میر) پنجاب ص۱۲۵

یوسف و زلیخائے فردوسی: اس کتاب کا سب سے پہلا حوالہ شرف الدین یزدی کے ظفر نامہ تصنیف ۸۲۸ھ میں ملتا ہے ۔۔۔ اس کے بعد دیباچہ بایسنغری میں رحوہ ۸۲۹ھ میں تالیف ہوتا ہے۔ متاخرین اس دیباچہ کے ذریعے اس کتاب سے واقف ہوئے۔

(بحوالہ ظفر نامہ شرف الدین یزدی و دیباچہ مذکور) فردوسی ص۱۸۰

سید وقار عظیم — محمد خالد اختر — خاطر غزنوی

تبصرے

شاعری اور شاعری کی تنقید

مصنف: ڈاکٹر عبادت بریلوی — ناشر: اردو دنیا کراچی

صفحات ۴۱۲ — قیمت: بارہ روپے

ہمارے شعر و ادب کا ایک دور ایسا ہے جسے ہم آسانی سے غالب پسندی اور غالب پرستی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت جو زیادہ تر شاعری کی روایت میں جلوہ گر ہے۔ فکر و خیال اور بیان میں غالب کی جدت پسندی کی کامیاب یا ناکام نقالی ہے۔ اس دور کی نثر اپنے خیال کو موثر اور دل نشیں بنانے کے لئے غالب کے اشعار میں کہی ہوئی انسانی صداقتوں کا سہارا لیتی ہے۔ ایک اور چیز جسے پیروی غالب کے اس وسیع رجحان کا شاخسانہ کہنا چاہئے یہ ہے کہ شاعر، ناول نویس، ڈراما نگار اور افسانہ نگار اور بعض صورتوں میں اپنے مضامین کو مجموعوں کی صورت میں مرتب کرنے والے ادیب غالب کی فکر انگیز اور خیال آفریں ترکیبوں کو زیب عنوان بنا کر توجہ کو اپنا اسیر بناتے ہیں لیکن ایک دور ایسا آیا کہ نقش فریادی سے اصنام خیالی تک صدہا ترکیبیں استعمال ہو چکیں اور ترکیبوں کی گہری معنویت اور موضوع اور مواد کی نوعیت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے سب امکانات ختم ہو گئے تو مغرب پرستی کی تقلید میں کتابوں کے ناموں کی بنیاد دیا ور مزیت پر رکھی جانے لگی یا حد درجے کی حقیقت پسندی پر ــــ حقیقت پسندی کے راستے پر چلنے کی عادت کی بدولت ایک بہت آسان نسخہ ادیب اور شاعر کے ہاتھ آ گیا۔ کتاب اگر نظموں، افسانوں اور مضمونوں کا مجموعہ ہے تو مجموعے کی پہلی نظم، پہلے افسانے اور پہلے مضمون کا عنوان پوری کتاب کا نام بن گیا۔ پڑھنے والوں نے بھی اپنے ذہن کو اس سہل پسندی کا عادی بنا لیا، لیکن سہل پسندی کی یہ روش جب سے نقادوں نے اختیار کی ہے طلسم اور فریب کا ایک نیا باب وا ہو گیا ہے ــــ یہی صورت اس کتاب کی ہے جس کے متعلق مجھے اس وقت آپ سے تھوڑی سی باتیں کرنی ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب "شاعری اور شاعری کی تنقید" ہے۔ ۴۱۲ صفحے کی ۲۲×۱۸/۸ کے مسطر پر چھپی ہوئی خوشنما اور دلکش سرورق کی اس کتاب کا نام پڑھ کر مجھے اس خیال سے بہت خوشی ہوئی تھی کہ "شاعری اور شاعری کی تنقید" پر اردو میں مضمون تو بے شمار لکھے گئے تھے لیکن حالی کے بعد سے آج تک شاعری کی ماہیت پر اور اس پر تنقید کرنے کے موضوع پر اتنی سیر حاصل بحث کسی نقاد نے نہیں کی تھی کہ صحیح معنوں میں اس اہم موضوع کا حق ادا ہو سکے۔ لیکن کتاب کے دو ورق الٹنے کے بعد جب فہرست پر نظر پڑی تو طلسم و فریب کا وہی باب کھلا جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ تنقیدی مضامین کے اس ضخیم مجموعے کے پہلے مضمون کا عنوان ہے "شاعری" اور دوسرے کا "شاعری کی تنقید" اور اتفاق سے یہ دونوں مضمون اور ان کے فوراً بعد آنے والا تیسرا مضمون

"تنقید شعر کے بنیادی اصول" اس مجموعے کے مختصر ترین مضامین ہیں۔

شاعری کی حقیقت اور ماہیت اور شاعرانہ تجربے اور واردات کی نوعیت کے متعلق ارسطو، بن جانسن، دانتے، فلپ سڈنی، ڈرائڈن، لنگ، گوئٹے، کولرج میتھو آرنلڈ، ورڈزورتھ، شیلی، کیٹس اور آگے چل کر ٹی۔ ایس ایلیٹ جو کچھ کہتے رہے ہیں۔ ان تینوں مضمونوں میں جابجا اس کی گونج سنائی دیتی ہے —— لیکن اس گونج کی ایک خصوصیت اور اس لحاظ سے عبادت صاحب کے تنقیدی مزاج اور تنقیدی شعور کی یہ انفرادیت اور امتیاز ہے کہ انھوں نے مغربی تنقید کے مطالعے سے (خصوصیت سے شاعری کی تنقید کے مطالعے سے) جو کچھ اخذ کیا ہے اسے مشرق کے نرم و نازک مزاج میں سمو کر پیش کیا ہے اور یوں ان کی تنقید مغرب کے سائنٹفک اندازِ نظر اور مشرق کے جمال پسند طرزِ تخیل کا حسین امتزاج بن گئی ہے اور اس لیے جب اردو شاعری کے متعلق وہ کچھ لکھتے ہیں تو ان کے الفاظ میں شاعری کی جھنکار پیدا ہو جاتی ہے۔ عبادت صاحب کے اندازِ تنقید کی ایک خصوصیت جسے اکثر ان کی کمزوری کہا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے احساسِ پسندیدگی کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لیے ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے کہتے ہیں۔ ان مختصر مضامین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں بات دہرائی نہیں گئی۔ "شاعری، اس کی تنقید اور تنقید شعر کے بنیادی اصول" کے تحت صرف اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ہے ان کے بیان میں احتیاط اور اعتدال کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بیان میں کہیں کہیں شعریت تو ہے لیکن غیر ضروری جوش ہرگز نہیں۔

ان تین مضمونوں میں سے پہلا ۹ صفحے کا، دوسرا بارہ صفحے کا اور تیسرا چھ صفحے کا ہے۔ باقی کتاب میں ۲۱ مضامین ہیں —— ایک وؔلی کی غزل پر ایک مضمون مرزا مظہر جانِ جاناںؔ، مرزا رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور مومنؔ پر۔ دو دو مضمون جگرؔ اور جوشؔ پر۔ تین میرؔ پر، چار اقبالؔ اور پانچ غالبؔ پر۔ وؔلی کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے عبادت صاحب نے وؔلی کے رچے ہوئے احساسِ حسن اور ذوقِ جمال پر سب سے زیادہ اور اپنے اسلوب بیان کے مطابق بار بار زور دیا ہے۔ بحیثیت غزل گو میرؔ کی عظمت اور انفرادیت کا مفصل ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میرؔ کے عشق کا محرک وہ احساسِ حسن اور ذوقِ جمال ہے جس کی میرؔ کے یہاں فراوانی ہے یہی احساسِ حسن اور ذوقِ جمال انھیں کسی نہ کسی جگہ مرزا مظہرؔ اور خواجہ میر دردؔ کے یہاں اور بہت سے موقعوں پر غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، جگرؔ اور جوشؔ کے کلام میں اپنی جھلک دکھاتا ہے اور اس سے ان تنقیدوں کا پڑھنے والا یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وؔلی سے لے کر اقبالؔ جگرؔ اور جوشؔ تک کے کلام میں احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کا عکس اور پرتو دیکھنے والا یہ نقاد حقیقت میں خود حسن کا شیدائی اور جمال کا پرستار ہے۔ اس لیے اس کی جمال بین نظر ہر اچھے شاعر کے کلام میں ان کا جلوہ دیکھ لیتی ہے، اس اعتبار سے میں عبادت صاحب کی سب تنقیدوں کو اور خصوصاً ان تنقیدوں کو جو انھوں نے اپنی مخصوص پسند کے شاعروں پر کی ہیں تاثراتی تنقیدیں سمجھتا ہوں اور ان تاثراتی تنقیدوں میں نقاد کے مزاج کی اس خصوصیت کا رنگ چھایا ہوا ہے کہ جو چیز اسے اچھی لگے اس کی تعریف و توصیف میں نہ وہ بخل سے کام لے سکتا ہے نہ احتیاط سے۔ اس لیے اس کی تعریف میں ہر جگہ ایسی مدح سرائی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جسے بڑی آسانی سے مبالغہ کہا جا سکتا ہے

لیکن ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مضامین کے اس مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاں ایک طرف یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ ان کی تنقیدیں تاثراتی اندازِ خیال کی بڑی واضح مثالیں ہیں۔ وہاں بعض اور باتیں بھی سامنے آتی ہیں اور یہ سب باتیں نقاد کے مزاج سے تعلق رکھتی ہیں۔ عبادت صاحب کی تنقیدیں ایک خوشگوار تاثراتی اندازِ فکر کی مظہر ہونے کے باوجود اس اعتبار سے حد درجہ سائنٹفک بھی ہیں کہ نقاد نے اپنے چھوٹے بڑے ہر مضمون میں اپنی رائے کی بنیاد تجزیے کو بنایا ہے۔ وہ جس شاعر کے متعلق بھی لکھیں اور شاعر کے کلام کے جس پہلو کے متعلق بھی لکھیں، ان کی پہلی نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ شاعر نے جو کچھ لکھا ہے اس کے سیاسی، معاشرتی اور بعض صورتوں میں شخصی محرکات کیا ہیں اور ان محرکات نے شاعر کے موضوع اور بیان پر کیا مخصوص اثرات ڈالے ہیں اور خیال اور بیان کی کون سی خصوصیتیں ہیں جو ایک شاعر اور دوسرے شاعر میں فرق پیدا کرنے کے علاوہ ان کے شاعرانہ وجود کو انفرادیت بخشتی ہیں

عبادت صاحب کی تنقید کی یہ خصوصیت سودا، میر، غالب اور مومن سے تعلق رکھنے والے مضامین میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔

عبادت صاحب کے مزاج کی ایک اور خصوصیت جس نے ان کے تنقیدی اسلوب پر گہرا اثر ڈالا ہے، یہ ہے کہ وہ شاعر کو سماوی مخلوق سمجھنے کے بجائے خالصتاً ارضی مخلوق جانتے ہیں اور اس لیے اس کے کلام کو زندگی کے خارجی حقائق سے الگ کر کے ہرگز نہیں دیکھتے۔ یوں کلام اور صاحبِ کلام کے درمیان یہ لازمی اور لابدی ارضی اور مادی تعلق قائم کرنے کے باوجود وہ اس حقیقت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں کہ شاعری میں جمال نہیں تو وہ شاعری نہیں، اس میں کیف و نشاط نہیں تو وہ شاعری نہیں اور اس میں سوز و گداز نہیں تو وہ شاعری نہیں۔ شاعری کے متعلق اس طرح کے عقائد رکھنے والے نقاد کو دلِ دردمند کا سرمایہ دار ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کوئی نقاد شعر کا اچھا نقاد نہیں بن سکتا اور اردو کے اس نقاد کو دلِ دردمند کی یہ دولت بڑی فراوانی سے عطا ہوئی ہے۔

شاعری اور شاعروں کی تنقید کے یہ ۲۳، ۲۴ مضامین جمالیاتی، تاثراتی، تجزیاتی اور کسی حد تک مارکسی تنقید کے بڑے دلکش نمونے ہیں اور انہیں پڑھ کر بعض اچھے شاعروں کے کلام کے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو یقیناً فکر انگیز ہیں۔ گو اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ رائے کے اظہار میں، جہاں کہیں تاثراتی رنگ اتنا غالب آجاتا ہے کہ توصیف مبالغہ معلوم ہونے لگتی ہے تو قاری کو الجھن بھی ہوتی ہے اور وہ اختلاف رائے پر بھی مجبور ہوتا ہے اور یہ بات عموماً اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ عبادت صاحب نہ اپنے جوشِ احساس پر قابو رکھ سکتے ہیں اور نہ شاید اس عادت کو ترک کرنے پر قدرت رکھتے ہیں کہ ایک ہی بات بار بار کہہ کر اسے موثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

سید وقار عظیم

دستک نہ دو

مصنف: الطاف فاطمہ — ناشر: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

صفحات ۴۸۲ — قیمت: بارہ روپے

بے چارہ اردو ناول گرداب میں ہے۔ اسے کون بچائے گا؟ بہت سے شناوروں نے اچھے ارادوں اور قدرتی مشاقی سے لیس ہو کر اس کو بچانے کی کوششیں کی ہیں۔ پہلے اردو ناول ــــ قصۂ چہار درویش، فسانۂ عجائب، طلسم ہوشربا اور سرشار کے ناول وغیرہ ــــ اس صنف کی جدید تعریف کے مطابق بمشکل ہی ناول کہلائے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب قصے اور فسانے داستان گوئی کی اعلیٰ ترین خوبیوں سے خالی نہیں اور ان کا سحر دائمی ہے۔ پھر عبد الحلیم شرر اور دوسروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور ادب کی بے چاری اس صنف کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ مرزا ہادی رسوا نے البتہ امراؤ جان ادا لکھ کر ناول کو ڈوبنے سے تقریباً بچا لیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ہی قسم کے ناول لکھے ــــ ناول کی شکل میں وعظ و پند کے وہ اچھے جاندار تبلیغی پمفلٹ ضرور ہیں لیکن کیا وہ ناول ہیں؟ پریم چند اور سدرشن بھی ناول کی مدد کو پہنچے مگر خود گرداب میں الجھنے لگے۔ بعد کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے "شام اودھ" میں ایک دلیرانہ کوشش کی اور ان کا ناول فارم اور کردار نگاری میں بڑا متوازن اور کامیاب ثابت ہوا۔ البتہ بات پھر بھی نہ بنی ــــ کرشن چندر نے "شکست" میں "دی گریٹ اردو ناول" لکھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" کے پہلے آدھے حصے میں اردو ناول کو سائکی کی زمین پر لا کھڑا کیا، اور پھر دوسرے آدھے حصے میں سر پر ٹانگیں رکھ کر یکلخت بھاگ کھڑی ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر آئیں۔ اپنے طول طویل بگھو لکھنوی صنم خانوں اور جم خانوں کے ساتھ۔ ان کی خوبصورت تحریر کے باوجود ان کے ناول صنم خانے یا جم خانے ہو گئے ہیں۔ بلونت سنگھ، اور بیدی نے البتہ "رات، چور اور چاند" اور "ایک چادر میلی سی" میں اس فارم کی زحمتوں کو سمجھا، اور خدیجہ مستور نے "آنگن" میں، سوائے اس کے آخری چند ابواب کے جہاں ناولسٹ

اُونگھتی ہوئی لگتی ہیں۔ میرے خیال میں اردو کا پہلا کامیاب اور مکمل ناول لکھا اور ہم سب کتنے خوش ہوئے کہ آخرکار ناول کو بچا لیا گیا تھا۔

لیکن ناول لکھنے والے اور بھی بہت سے تھے ——— نقاشِ فطرت اور مصوّرِ جذبات کی قبیل کے ناولسٹ ——— "شاباش بہادرو بڑھے چلو" قسم کے مجاہد ناولسٹ۔ سادہ لوح پبلک نے ان کے ناولوں کو عملاً نگلا۔ ان ناولسٹوں کے ناشر امیر ہو گئے اور بہت سے نوجوانوں نے ان کے یہ لافانی شاہکاروں کو لکھنے کی خاطر کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک چندھی آنکھوں والے نوجوان جیسے "سلیم بن کریم" کے آٹھ سو پچاس صفحات کی کتابت کرنے کا شرف حاصل ہوا، اس عمل میں اپنی بصارت ہی سے محروم ہو گیا۔ مگر اسے یہ روحانی تسکین ضرور ہے کہ اس کارِ ثواب سے اس کی عاقبت سنور گئی اور بہشت میں حوریں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر ان ناولسٹوں کی ایک کھیپ کی کھیپ ہے جنھیں نسوانی رسائل کا مطالعہ کرنے والی لڑکیاں بڑے ذوق شوق سے پڑھتی ہیں۔ مگر خواتین ناولسٹوں اور انھیں پڑھنے والیوں کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ خواتین بقول روزنامہ "مشرق" بڑی حساس اور جذباتی ہوتی ہیں اور میں ان کے نازک احساسات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ یہ جوانمردی کی ریت کے خلاف ہے۔ انھیں ان کی معصومیت اور سادہ لوحی والی دنیا میں ہی چھوڑ دو، کیونکہ وہ بے چاری اس میں سے نکلنا ہی نہیں چاہتیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ بے چارے اردو ناول کے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی یہ ڈھیٹ ابھی تک سانس لے رہا ہے گو سسک سسک کر۔ مسز آدم جی نے حال میں گلڈ کے تعاون سے باربیٹ سن کے زرین ریشے سے اس کے کمزور جسم میں خون انجیکٹ کیا ہے۔ اس سے غالباً ناول کی ضخامت ضرور بڑھ گئی ہے مگر اس کا معیار نہیں۔ بڑھا البتہ اگر معیار ضخامت کا رہین منت ہے تو معیار بھی بڑھ گیا ہے)

(اب الطاف فاطمہ اپنے ناول "دستک نہ دو" (ضخامت ۷۰۰ صفحات) کے ساتھ بڑی دھوم دھام اور ٹھاٹ باٹ سے آئی ہیں۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے۔ پہلا "نشانِ محفل" تھا۔ وہ کئی سو صفحات پر مشتمل تھا جسے دو تین پڑھنے والوں نے یقین دلایا تھا کہ یہ ایک بہت اچھا ناول ہے۔ ایک نہایت شریف، سلجھی ہوئی ایم۔ اے پاس خاتون کا لکھا ہوا۔ میں نے اسے نہیں پڑھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کے لئے ایک ناول کی اچھائی یا برائی کن باتوں سے متعین ہوتی ہے۔ بہت سی ایسی خواتین ہیں جن کے نزدیک "شمع" بہترین ناول ہے انھوں نے اسے دو تین بار پڑھا ہے۔ اس کتاب کے دس بارہ ایڈیشن ہی اس کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔ میں نے اسے ایک دفعہ جی کڑا کر کے پڑھنے کی کوشش کی اور پہلے دو ابواب کے بعد تحریر کی بیوست سے اکتا کے اسے رکھ دینے پر مجبور ہو گیا۔ یقیناً محترمہ اے۔ آر۔ خاتون بڑی قابلِ قدر خاتون تھیں لیکن انھوں نے ایک عام سا مثالی "خواتینی" ناول لکھا تھا اور یہ ایک برا ناول ہے۔
(ایکسکیوزمی لیڈیز!)

ایک اچھا ناول لکھنے کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ آپ بڑے سلجھے ہوئے یا تربیت یافتہ ذہن کے مالک ہوں یا آپ کے نام کے ساتھ اعلیٰ تعلیمی ڈگریوں کے دم چھلے ہوں (ہم سب علم و فن کے ڈاکٹروں میں سے ان ڈاکٹروں کو جانتے ہیں جن کا اندازِ فکر اور کند ذہنی ہمیں خون کے آنسو رلاتا ہے) ورنہ پاسیج کی ایملی برونٹی، یا بنگال کی "ان پورنا کا مندر" لکھنے والی لڑکی یا لکھنؤ کی خدیجہ مستور کبھی کسی کالج کے ایوانوں میں سے نہیں گذریں۔ انھوں نے زندگی کے مدرسے میں تعلیم پائی اور اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا۔ انھیں قدرت نے کچھ ودیعت کر رکھا تھا۔ انھوں نے یقیناً ادبی اظہار کے لئے بے حد محنت کی، مگر قدرت کی اس امداد کے بغیر وہ ساری محنت اور لگن بالکل بے سود ثابت ہوتی اور وہ ایسے حقیقی ناول نہ لکھ سکتیں جو زندہ رہیں گے۔ دور کیوں جایئے "قصہ چہار درویش" (گو یہ لفظ کے جدید معنی میں ناول نہیں) کے میر امن کو لیجئے وہ کیا تھا؟ دلی کا ایک روڑا۔ وہ پیاری روزمرہ کی زبان اس نے دلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں سیکھی (اور میں نہیں سمجھتا کہ اس نے کبھی کسی سکول میں میڈل لیا) لیکن کیسا سدا بہار قصہ اس نے لکھا ہے؟ دنیا کے ادب میں مجھے ایسی پرکشش اور "دل ہلانے" والی کہانی نہیں ملی۔ جب بھی میں اداس ہوتا ہوں تو میں دلی کے اس بوڑھے روڑے کے باغ و بہار کی سیر کرتا ہوں۔

یہ نہیں کہ الطاف فاطمہ نے ایک بہت بُرا ناول لکھا ہے۔ بالعموم خواتین جیسے ناول لکھتی ہیں ان میں یقیناً اس کا مقام اولِ صف میں ہوگا۔ اس میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو عموماً خواتین کے ناولوں میں نہیں ہوتیں۔ سادگی، اچھوتے پن اور حسنِ بیان کی خوبیاں۔ رومانٹک ناول نویسی کے سب مرکبات، پکانے کی ترکیب کے مطابق 'ملائے ہوئے'، 'چھنے ہوئے'، 'اُبلے ہوئے' اس ناول میں موجود ہیں۔ تحریر 'تعلیم یافتہ' ہے، رواں ہے، صاف اور ہموار ہے اور پھر اتنے سارے جذبات سے پُر صفحات ہیں — قاری کو دنوں تک محو رکھنے کے لئے۔

مگر میں ناول میں اور بہت کچھ چاہتا ہوں۔ میں اس قسم کے ڈھیلے پھیلے دار، رومانٹک ناولوں سے بدکتا ہوں۔ دراصل میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے ناول اب کیوں لکھے جاتے ہیں (مسز آرنی ہینٹ، اور مسز ہنری ووڈ کا زمانہ اب گذر چکا ہے۔ لیڈیز! بے شک تم سدا اس بھولپن اور سادہ لوحی کی بہاریں لوٹو، گوبھی کا سالن اور آلو کا حلوہ بنانے کی ترکیبیں سیکھو، کروشیا اور سلائی میں مہارت حاصل کرو، اور حکیم اڈیٹر یونانی سے اپنی جذباتی الجھنوں کے حل دریافت کرو، مگر خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ کہ اپنے نشیمنوں میں سے باہر بھی تو جھانکو، دوسرے افقوں کی رنگینی کی طرف بھی تو نگاہ کرو۔ کتنا عرصہ تم خوں خاں کی یہ زندگی گذارنے پر قانع رہوگی (اکسکیوز می لیڈیز)، باورتھ پارسنیج کی ایملی برانٹی آخر تم میں سے ہی تھی، تمہاری ہی ایک بہن!)

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب باتیں (گوبھی کا سالن وغیرہ) محترمہ الطاف فاطمہ کے ناول میں موجود ہیں، نہیں مطلقاً نہیں۔ گوبھی کا سالن سارے ناول میں ایک دفعہ بھی نہیں آیا۔ میرا مقصد محض یہ ہے کہ اس ناولسٹ کا ذہن اور فکر کم سے کم اس ناول کی حد تک عام خواتین ناولسٹوں کی لمبی قطار سے مختلف نہیں۔ اس ناول میں ایک بھی اوریجنل خیال نہیں۔ حجاب امتیاز علی کو اب ہم کم ہی پڑھتے ہیں، مگر کیسی انفرادیت، دلفریبی اور اچھوتا پن ان کی تحریر میں ہے (سارے تصنع اور بناوٹ کے باوجود)۔ کم از کم ان کے ناولٹوں اور افسانوں میں جو بڑے فرانسیسی دریچے نیلے بدلیشی ساحلوں پر کھلتے ہیں اور گرم ایشیائی ملکوں کا گول چاند سیاہ مائل اودے فانوسوں پر چمکتا ہے۔ اے۔ آر۔ خاتون کی قسم کے ناول لکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ حجاب امتیاز علی کے سے کلاؤڈ کوکو لینڈ کے من گھڑت تخیلی، رومان میں ڈوبے قصے لکھے جائیں۔ کم از کم حجاب کے قصوں اور ناولٹوں میں بہاروں کی تازگی تو ہے، اور دور پرے ساحلوں پر دیکھنے کی تمنا، جو افسوس کہ بہت بہت دور ہیں۔

محترمہ الطاف فاطمہ کو یہ ناول لکھنے کا پورا حق تھا۔ میں اس حق پر اعتراض نہیں کر رہا ہوں بلکہ خوش ہوں کہ انھوں نے یہ ناول لکھا ہے اور اپنے فرصت کے اوقات کو ایک اچھے دلچسپ شغل میں صرف کیا ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو ایک بڑی فرم میں ملازم ہے، وہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد وقت گذاری کے لئے اومنی بس میں سوار ہونے والوں کی جیبیں کترتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اس شغل کی وجہ صرف یہ ہے کہ فارغ وقت اسے دوبھر معلوم ہوتا ہے، اور پھر ایسے لوگ ہیں جو مرغے لڑاتے ہیں۔ پتنگ اڑاتے ہیں یا خالی بستر پر لیٹ کر پہروں سگرٹ کے مرغولے چھوڑتے ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں ناول نویسی معصوم شغل ہے اور میں نے کسی مرد یا عورت کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ اسے اس شغل سے نقصان پہنچا ہو۔

'دستک نہ دو' کا پلاٹ کیا ہے۔ بیشتر تبصرہ نگار اپنے تبصروں میں ناول کا پلاٹ مختصراً پیش کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عادت ناولسٹ کی محنت کے ساتھ انصاف نہیں۔ اس سے ناول کی فروخت پر بھی بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے کیونکہ لوگوں میں پلاٹ جان چکنے کے بعد ناول پڑھنے کے لئے زیادہ شوق باقی نہیں رہتا۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر بھی تبصرہ نگار کو کتاب کے موضوع وغیرہ کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتانا چاہئے ورنہ لوگ یہ کبھی یقین نہ کریں گے کہ اس نے کتاب پڑھی ہے۔ میں قسم کھانے کے لئے تیار ہوں کہ میں نے یہ ناول پڑھا ہے۔ میری بیوی نے اسے دوبار پڑھا ہے اور وہ اسے بچے کی جرابیں بننے کے بعد تیسری بار پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ (آپ جانتے ہیں کہ تبصرے کے لئے دو جلدوں

کا ایڈیٹر کے پاس آنا ضروری ہے۔ فیروز سنز نے اس بہت قیمتی کتاب کی دو جلدیں ایڈیٹر فنون کو ریویو کے لیے بھجوائیں جن میں سے ایک اس نے مجھے تبصرہ کرنے کے لیے دی۔ میں اسے ایڈیٹر کو لوٹانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میری بیوی نے اسے پوری طرح اپنی ملکیت بنا لیا ہے)

اس ناول کا موضوع خاموش چپکی گونگی محبت ہے۔ صفدر یاسین عرف لیو چو ایک پھیری والا ملازم چائینا مین ہے جو اپنی سائیکل ٹن ٹناتا ہوا ایک چھوٹے شہر کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں پلنگ پوش اور پلو کیس اور اس قسم کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ جب ہم پہلے اسے ملتے ہیں تو وہ سترہ سال کا بانکا چھیلا لڑکا ہے۔ اور وہ غیر روایتی باغی چھوٹی چپٹی ناک والی ارسٹوکریٹک گھرانے کی بچی گیتی آٹھ نو سال کی۔ کہانی ان کے درمیان پروان چڑھتی محبت کی ہے۔ گونگی محبت جو کبھی اظہار کا رستہ نہیں پاتی۔ صفدر عرف لیو چو کبھی دستک نہیں دیتا۔ اور جب گیتی بہت سی [illegible] اور لبادوں کے بعد ایک معمر مرد سے شادی کر لیتی ہے تو لیو چو اپنے مالک سانگ سے لمبی رخصت لے کر پیکنگ اپنے وطن کو چلا جاتا ہے — وہ دل شکستہ ہے۔ وہ پھر شادی نہیں کرتا۔ وہ ناول میں [illegible] کی طرح فلسفی لگتا ہے۔ دوسرے بھی بے شمار کردار ہیں۔ مگر یہ دونوں دراصل ناول کی جان ہیں اور انہی کے لیے یہ ناول لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ دونوں کسی طرح بھی، تحریر کی ساری آب و تاب کے باوجود حقیقی ہونے کا تاثر نہیں دیتے۔ ناول کے شروع شروع میں چائینا مین اور گیتی زندہ ہوتے لگتے ہیں لیکن بعد میں گیتی بالکل فینٹاسٹک ہو جاتی ہے اور صفدر یاسین فلسفی لاتزے کا چھوٹا بھائی۔ بے شک بیشتر خواتین کے نازک دلوں کو صفدر یاسین اور گیتی کی ان کہی محبت غم و اندوہ سے اور میٹھے خوابوں سے بھر دے گی مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس ناول میں اصلیت کی کوئی جھلک ہے۔

اور یہ ہیں اس ناول کے مختلف ٹکڑے۔ ادھر ادھر سے اچکے ہوئے آپ کو اس کے ذائقے سے روشناس کرانے کے لیے:

"ٹن ٹن دور کہیں گھڑیال نے پانچ بجائے تھے۔ وسط نومبر کی یہ شام خنک اور خاموش تھی۔ اس نے دھیرے سے غسل خانے کا دروازہ کھولا ادھر ادھر جھانکا اور چپکے سے نکل کر غسل خانے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ اس کی نظر کے سامنے سبزیوں کی کیاریاں تھیں۔ اور بانس کے ٹھاٹھروں پر پھیلی ہوئی سیم کی بیلیں۔ سیڑھیوں کے بائیں جانب گندے پانی کی حوضی تھی۔ کائی زدہ اور گندے پانی سے لبریز جس کی سطح پر بالائی کی طرح استعمال شدہ صابن کی جھاگ لرز رہی تھی۔ سبزی مائل شکن آلود سفید سفید شکن آلود جھاگ۔ اور اس کا جی چاہا کہ وہ مٹی کی سکوری میں اس جھاگ کو آہستہ آہستہ سمیٹ لے اور مزے سے بالائی بیچے...... مگر کائیں کائیں یکلخت ہی کوؤں کی قطار کی طرف اس کی توجہ مبذول ہو گئی جو بسیرے کے لیے جا رہے تھے۔ اونچے سبز درختوں کی سبز کاہی چوٹیوں کے مقابل نیلے آسمان پر منڈلاتے ہوئے سیاہ سیاہ کوے۔

کاش مجھے کوئی کوا بنا دیتا تو بھی مزے ہی ہیں دیکھنا چیل تو کوئی خاک بنانے گا۔

اسے چیل کی پرواز بہت پسند تھی۔ وہ گھنٹوں گھنٹوں چھت پر پڑی حسرت سے دھیرے دھیرے بلندیوں کی طرف جاتی ہوئی چیلوں کو دیکھا کرتی۔ بالکل یہ معلوم ہوتا کہ اڑ نہیں رہی بلکہ تیر رہی ہیں۔ بس پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہی جا رہی ہیں۔ "اے ہے ہمارے نصیب میں تو کوا بننا بھی نہیں۔" اس نے کڑھ کر سوچا اور فوراً ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں ناچنے لگا "یہ اماں بیگم نجانے کون سے نمونے سویٹروں میں ڈالا کرتی ہیں۔ اور جو میری بات مانیں تو بس مجھے ایسا ہی سویٹر بنا دیں۔ بس ہرا اور ڈھیر سا اور باقی کا سب نیلا ہو اور آگے تمام میں چھوٹے چھوٹے کالے کالے کوے ہوں۔ مگر ان سے کون فرمائش کرے۔ جھڑکیاں دینے لگیں گی یا عرستی ان سنی کر دیں گی اور نہ وہ تو کوئی بات سنتی نہیں۔"

اور ایک دوسرا:

"صفدر یاسین عرف لیو چو نے طویل رخصت پر جاتے ہوئے اپنا سامان سمیٹتے سمیٹتے سوچا: "میں طویل رخصت پر کبھی واپس نہ آنے کے ارادہ سے جا رہا ہوں۔ اس لئے وہ ہاتھ جس کو میں نے دستک دینے سے باز رکھا تھا، اس پر میرا اختیار نہیں۔ انسان کو اپنی کسی بات یا چیز پر اختیار

نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ دل جیسی پنہاں اور گوروشے بھی اس سے سرتابی کرتی ہے۔ اور اب درویش کدھر جائے۔ شہر دل تو سکڑ کر بہت مختصر ہوا جا چاہئے:" —— سوئیٹ روفنگ سٹف۔ مگر یہ اتنا غیر حقیقی کیوں ہے۔۔

یہ اپنے انداز میں اچھا ناول ہے۔ محترمہ الطاف فاطمہ! الیور ٹوسٹ کی طرح ہم آپ سے اور بھی مانگتے ہیں۔ کم از کم میری بیوی اتنا ہی بڑا ایک اور ناول آپ کے قلم سے چاہتی ہے۔ آئندہ سرما تک۔ اوہ خدا! کیا اردو ناول میں بھی کبھی جین آسٹن اور برانٹی بہنوں کی سی کوئی لکھنے والی آئے گی۔

کون اردو ناول کو بچائے گا؟

محمد خالد اختر

تنقیدی نقوش

مصنف: ڈاکٹر عبدالقیوم   ناشر: مشتاق بک ڈپو کراچی   قیمت: تین روپے ۵۰ پیسے

"تنقیدی نقوش" میں بارہ مضامین شامل ہیں۔ ان میں تین مضامین مولانا الطاف حسین حالی سے متعلق ہیں:

"حالی بحیثیت سوانح نگار"، "حالی کی شخصیت"، "حالی کا تنقیدی شعور"۔ ایک مقالے کا موضوع ہے: "سرسید کا اثر عہد جدید کے مسلمانوں پر"۔ "تنقید کے سلسلے میں اردو تنقید کلیم الدین کی نظر میں"۔ "نیاز فتحپوری بحیثیت نقاد" اور "تنقیدی رجحانات" قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ "ترقی پسند ادب پر ایک نظر"، "تاریخ ادب کا مطالعہ"، "مضامین چکبست"، "ایک تعارف"، "اردو نثر میں خطوط غالب کی اہمیت" اور "نظیر اکبر آبادی" پر مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر عبدالقیوم نے ایک باشعور سائنٹفک تنقید نگار کی طرح مختلف نقادوں اور شاعروں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے تنقیدی یا شاعرانہ کارناموں کا جائزہ لینے سے پیشتر ماحول کی کارفرمائی کو بھی فراموش نہیں کیا۔

حالی پر مضامین میں اس فضا کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے موجود تھی۔ اور جس ماحول میں درباداری کی رسم، شاہی جلال کی موجودگی نے عشقیہ شاعری کی فضا کو خازگوار بنا دیا تھا۔ عوام کے ذہنوں میں زندگی کا کوئی واضح شعور نہ تھا جن، پری اور طلسمات کی قوی مضمحل کر دینے والی فضا نے عوام کو بے حس بنا دیا تھا۔ تصنع، بناوٹ اور مبالغہ آرائی کا رنگ اس دور کی تحریروں کا خاصہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے حالات کا رخ یکسر موڑ دیا۔ زندگی کے تلخ تجربات اور نئے تقاضوں نے زندگی اور ادب میں ہلچل پیدا کر دی۔ سرسید نئی زندگی کے میر کارواں تھے۔ حالی نے نئی زندگی کی رگوں میں نیا خون دوڑایا۔ ان کی شخصیت، ان کی تنقیدی صلاحیتیں اور ان کی سوانحی کوششیں اردو ادب کے لئے زندگی کی نئی امنگ ثابت ہوئیں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم نے اپنے ان تینوں مضامین میں مولانا حالی کی شخصیت اور فن کی انہی نمایاں خصوصیات کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن فاروقی جو ڈاکٹر عبدالقیوم سے معلمی کا رشتہ رکھتے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر عبدالقیوم کی ادبی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کا قریب سے موقع ملا ہے فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں کہ:

> "طالب علمی کے زمانے سے ان سے ادبی امور اور مسائل پر بڑی طویل گفتگوئیں رہی ہیں اور ہمیشہ میں نے ان کی سمجھ اور رائے کو بلند پایا۔ اس مجموعے میں جو مضامین ہیں ان میں سے بعض پر میرے اور ان کے درمیان گفتگو بھی ہو چکی۔ حالی اور سرسید پر ان کا مطالعہ مجھ سے کہیں آگے ہے اور ان کی رائیں میرے لئے بصیرت افروز ہوئیں۔"

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے اپنے مقالے "سرسید کا اثر عہد جدید کے مسلمانوں پر" میں سرسید کی مسلم دوستی اور اصلاحی خدمات کا جائزہ لیا ہے

وہ سرسید کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"زوال یافتہ ذہن دوسرے سے سیکھنا اور کچھ حاصل کرنا اپنے وقار کے خلاف تصور کرتی ہیں اور آنکھیں بند کر کے ایک راستے پر چلنا چاہتی ہیں اور نئی شاہراہوں پر قدم اٹھانے سے ہچکچاتی ہیں۔ وہ بندھے ٹکے اصولوں کو پسند کرتی ہیں ـــــ انیسویں صدی کے مسلمان اسی بے اعتمادی کاہلی اور رجعت پرستی کے شکار تھے ـــــ اس لئے ضرورت تھی کہ اس فاسد مواد کو نکال دیا جائے اور صحت بخش عناصر داخل کئے جائیں۔

سرسید اسلامی تہذیب کے قدردان تھے۔ لیکن وہ تہذیب عالم سے استفادہ ... کرنے کے حق میں تھے۔"

گویا سرسید ذہنی حد بندی کے مخالف تھے اور قطعیت کے قطعاً قائل نہ تھے۔ وہ نہ انگریزوں سے مرعوب تھے اور نہ اسلامی قدروں سے منحرف۔ انگریزوں کی فتوحات کو وہ ایک تنظیم اور فراست کا نتیجہ سمجھتے تھے اور اسی تنظیم اور بیداریٔ شعور کے شیدائی تھے۔ اسی ضرورت کو ڈاکٹر صاحب عہدِ جدید کے مسلمانوں کے لیئے بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کا مقالہ "اردو تنقید کلیم الدین کی نظر میں" بھی خیال انگیز ہے۔ کلیم الدین احمد ہمارے تنقیدی ادب میں ایک نمایاں حیثیت اور مقام کے مالک ہیں۔ اس کا احساس ڈاکٹر صاحب کو بھی ہے چنانچہ اپنے مقالے کی ابتدا ہی میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"اردو تنقید میں پروفیسر کلیم الدین اپنے انفرادی خیالات اور سنسنی خیز جملوں کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔"

یوں ڈاکٹر صاحب نے کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے ایک نہایت اہم پہلو کا ایک ہی فقرے میں بھرپور جائزہ لے لیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلیم الدین صاحب کے بعض جملے چونکا دیتے ہیں، مثلاً:

"اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ـــ یا ـــ اردو غزل ایک نیم وحشی صنف ادب ہے۔"

ڈاکٹر صاحب تنقید والے جملے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس جملے کی شاعرانہ لطافت پر ایمان لانا پڑتا ہے لیکن اس فیصلے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے دعوے کے جواز میں اردو میں تنقید کی موجودگی ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو میں وجہی سے لے کر شیفتہ تک برابر تنقیدی شعور ملتا ہے ـــ لیکن اس سے آگے جو کچھ کہتے ہیں وہ اس جواز کو باطل کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"لیکن یہ تنقیدی شعور وسیع اور ترتیب وار نہیں۔ یہ سماجی، سیاسی اور تمدنی مسائل کی عکاسی نہیں کرتا۔ یہ تنوع اور زندگی کی بنیادی قدروں کی اشاعت میں مدد نہیں دیتا۔ لیکن شعر و ادب کی ماہیت اور بعض فنی خوبیوں پر روشنی ضرور ڈالتا ہے۔"

حالی کے متعلق کلیم الدین احمد نے جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر صاحب اسے حالی سے ناانصافی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حالی کے متعلق کلیم الدین احمد صاحب کے ابتدائی فقرے ہی یوں ہیں:

"اردو تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ پرانی تنقید محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اساتذہ کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصولوں پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا، اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے حدود میں رہ کر حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اکثر فاضل نقاد کلیم الدین احمد کے چونکا دینے والے فقروں کی ظاہری نشتریت میں کھو جاتے ہیں اور اس کی روح تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ کلیم الدین احمد ان لوگوں میں سے ہیں جو مغربی ادب، اس کی لطافتوں، نزاکتوں اور گہرائیوں پر پوری نظر رکھتے

ہیں۔ اردو تنقید نے اب تک مغربی ادب کی جو خوشہ چینی کی ہے، وہ اس سے پوری طرح واقف ہیں۔ اردو ادب میں نئی راہیں اس خوشہ چینی سے ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن تخلیقی تنقید اور اچھوتی فکر جو مغربی ادب و تنقید کا خاصہ ہے۔ اردو ابتدا ہی سے اس سے محروم رہی ہے۔ کلیم الدین احمد اردو تنقید میں مغربی ادب والی شان اور اردو کی اپنی صلاحیت اور اپج کا مظاہرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے انہیں اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر دکھائی دیتی ہے جو بہت حد تک بجا ہے اور مجھے ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب سے اس ضمن میں اتفاق نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے باقی مضامین اور خیالات سے بھی میں متفق نہیں۔ بات اس کے برعکس ہے۔ میں ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب کے خیالات سے ہی متفق نہیں بلکہ ان کا مداح بھی ہوں۔ اردو ادب کے طالب علموں کے لئے "تنقیدی نقوش" بڑے کام کی کتاب ہے۔

خاطر غزنوی

سفر (نظمیں)

مصنف: ایس۔ اے رحمان | ناشر: مرکزی مجلس ترقی اردو لاہور | قیمت: تین روپے

جسٹس ایس۔ اے رحمان قانون و انصاف کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے بھی دلدادہ و شیدا ہیں اور اردو کے بہی خواہوں میں ان کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

زیر نظر مجموعے میں کل پانچ نظمیں ہیں۔ سفر ہی کے عنوان سے سب سے پہلی نظم طویل ہے۔ اور بقول رحمان صاحب نفس مضمون کے اعتبار سے باقی کو سفر کا تکملہ سمجھنا چاہیئے اور اسی لئے ان نظموں کو بعد میں جگہ دی گئی ہے۔

سفر کا مرکزی خیال تخلیق پاکستان کا تاریخی پس منظر ہے۔ اس نظم کا موضوع جو ایک شعری داستان کی حیثیت رکھتی ہے، مشرقی پنجاب کے ایک بوڑھے مہاجر کا جسمانی، ذہنی اور روحانی سفر ہے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں کو اس وقت چھوڑتا ہے جب کہ حب الوطنی اور مذہب کے نام پر گاؤں تباہ کیا جا چکا ہے اور اس کے باشندے تعصب اور تنگ نظری کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ وہ سخت جان بڈھا، یکہ و تنہا، پاکستان کا رخ کرتا ہے، راستے میں تھکن سے چور ہو کر ایک درخت کے تنے سے لگ کر سو جاتا ہے۔ اس کی اپنی یادیں مسلمان قوم کے اجتماعی شعور سے اس کے دماغ میں نیند کی چھاؤں میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تاریخی مناظر کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ہندوستان میں آریاؤں کے ورود سے لے کر انگریزی عملداری کے اختتام تک کے چیدہ چیدہ واقعات خواب کے طلسمی عمل سے علامتی ہیئت اختیار کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں خواب تحریک پاکستان کے نعروں کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور مسافر بیدار ہو کر ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ اپنی راہ لیتا ہے۔ اثنائے راہ ایک سکھ عورت اپنی مقتول مسلمان سہیلی کا بچہ اس کے حوالے کرتی ہے۔ یہ واقعہ گویا پاکستان کی تخلیق کی تمثیل ہے۔ بالآخر بوڑھا مسافر بچے کو لے کر پاکستان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے اور افق پر چاند ستارے کا نشان دیکھ کر سجدۂ شکر بجا لاتا ہے۔ یہی سفر کی آخری منزل ہے۔

جہاں تک نظم کا تعلق ہے۔ یہ محض کسی داستان کو منظوم کرنے کی کوشش نہیں بلکہ اس نظم میں شعری خوبیاں اور نزاکتیں بھی موجود ہیں نظم کی بحر بیانیہ اور مکالماتی ضرورتوں کے تحت بدلتی ہے۔ نظم مثنوی کے انداز میں ہے لیکن کہیں کہیں غزل بھی کسی کی فریاد کا روپ لے لیتی ہے مختلف لوگوں کے مکالموں کی زبان زمان و مکان اور موقع و محل کے لحاظ سے بدلتی ہے اور رحمان صاحب کی ہندی، عربی اور فارسی دانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان تاریخی مناظر میں محمود غزنوی کے حملے کا پس منظر ملاحظہ ہو ؎

میدان میں نقارہ گونجا ایک بگولا اٹھا لپکا

آنکھوں میں ہنگامے اُبھرے　　شعلے اور عمامے اُبھرے
دوڑے ایسے سرپٹ گھوڑے　　گویا تیر فضا نے چھوڑے
بھالے اور شمشیریں چمکیں　　ہاتھوں میں زنجیریں چمکیں
نعرے گونجے اللہ اکبر　　سہمے بت مندر کے اندر
رنجو کے سیوک سیس نوائے　　جھولی بھر بھر سونا لائے
ٹوٹے رے کرمن کے ٹکڑے　　بت شکنوں نے بت کیے ٹکڑے

بجلی چمکی، بادل گرجا
دھرتی نے پھر پلٹی کایا

تاریخ آگے چلتی ہے۔ مناظر بدلتے ہیں آخر ایسے وقت میں جب کہ "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ایک شخصیت کا سراپا کھینچا ہے :

راست رو، راست باز دور اندیش　　وہ سیاست کا باصفا درویش
سرو قد، خوش لباس، خوش گفتار　　تن کا نازک ہے عزم کا کہسار
اُس کے لفظوں میں ہے عجب تاثیر　　گونجتی ہے فضا میں یہ للکار

صدیوں سے تیرے سر پہ غلامی کا بار ہے
اس بار جانگداز کو سر سے اتار اُٹھ!

یہ سراپا کتنا مختصر لیکن مکمل ہے۔ قائد اعظم کی شخصیت کا مجمل خاکہ ہے۔ غرض یہ طویل نظم نہایت دلکش ہے، خلوص و محبت، حب الوطنی اور اسلام کی عقیدت کے جذبات سے مملو!

دوسری نظمیں بھی ایسی ہی خوبیوں سے ممیز ہیں۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لئے مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی نے ایک کے سوا باقی پانچ تصویریں بطورِ خاص بنائی ہیں۔ سرِ ورق بھی انھیں کے موقلم کا نتیجہ ہے اور صفحات کی تزئین بھی انھیں نے کی ہے۔

خاطر غزنوی

پاکستان کے عوامی گیت

مرتب : رفیق خاور　　ناشر : ادارہ مطبوعات پاکستان　　قیمت : تین روپے پچاس پیسے

"پاکستان کے عوامی گیت" کو رفیق خاور نے مرتب کیا ہے۔ ایک عجیب اور غیر مستحسن رویہ شاید اس کتاب کا بھی حسب معمول خیر مقدم نہ کرے کیونکہ اس کتاب پر بھی ایک سرکاری ادارے کی چھاپ ہے اور اس چھاپ کے تحت نادر سے نادر شہ پارہ بھی بعض قارئین کی بے رخی کی نذر ہو کر وہ مقام نہیں پاتا جو اس کے شایانِ شان ہوتا ہے یہ ایک ایسا منفی رجحان ہے کہ کم سے کم اہلِ علم اسے اپنے ذہنوں سے نکال دیں تو ادب کی خوش قسمتی ہوگی اور یوں کئی قابل قدر ادب پارے اپنا حقیقی مقام پالیں گے۔

یہ کتاب پاکستانی ثقافت کا وہ اہم پہلو پیش کرتی ہے جس میں پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں بازوؤں کے باشندوں کے

اُن جذبات اور مزاج کی صحیح ترجمانی ملتی ہے جو اس کتاب کے سرورق کی طرح سادہ اور حسین ہے اس کتاب کے مضامین نظم و نثر "ماہِ نو" اور "پاکستان کوارٹرلی" سے لئے گئے ہیں۔

کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلا باب رفیق خاور صاحب نے پیش لفظ "صوت و صدا" اور عاصمہ حسین صاحبہ کے "عزب آہنگ" پر مشتمل ہے پیش لفظ میں دیس کی میٹھی دھنوں کا ترانہ ہے اور عزب آہنگ میں مغربی پاکستان کے لوک گیتوں کا سرسری تعارف ہے جسے اس کتاب کے مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین کا نچوڑ کہنا چاہئے۔ دوسرے حصے کا عنوان کوہستان ہے اور اس میں لورالائی، سابق سرحد، ہزارہ، پوٹھوہار، گلگت اور کشمیر کے نغمات پر مختلف اہل قلم کے مضامین شامل ہیں۔ ہیر آہنگ یا میدان تیسرے باب کا عنوان ہے اور اس میں پانچ دریاؤں کی سرزمین کے نغمات کا تعارف کرایا گیا ہے نیر آہنگ یا کاہستان چوتھے باب کا عنوان ہے اور اس میں مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آخری باب بیابان کے عنوان سے وادیٔ مہران کے گیتوں کی تفسیر پیش کرتا ہے۔ کتاب کی یہ ترتیب شاعرانہ ذوق اور ماہرانہ سلیقے کی مرہونِ منت ہے۔

"رگِ سنگ" رب نواز اورکزئی صاحب کا مضمون ہے اور اس میں لورالائی کے اس چھوٹے سے حسین خطے کی باتیں ہیں جسے تل و شال بھی کہتے ہیں اور بورتل بھی اور بقول فاضل مضمون نگار اس خطے کے حسن کو ظاہر کرنے کے لئے خود اس کا مرکب نام ہی کافی ہے جو تل اور شال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس کے حسن کی آب و تاب تل اور عزت و ناموس سے کاڑھے ہوئے شال سے وابستہ ہے۔ رب نواز صاحب نے ٹپے، لنڈی، غاڑی قصی (پہیلیاں) اور چنے جیسے گیتوں کی تفسیر اس کے پس منظر کے ساتھ بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ دوسرے مضمون "یا قربان" میں پشتو ٹپے کی تاریخی اور فنی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف موضوعات پر ٹپوں کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

اسی حصے میں حریر سنگ کے عنوان سے تاج سعید، شہاب رفعت اور مسعود ہاکو، اور منظر عارف کے پشتو لوک گیتوں کے منظوم تراجم اور ملغرے کے عنوان سے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کے لویہ نیکئی، چاربیتہ، لنڈئی اقمو اور بدلہ کے منظوم تراجم شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر تراجم اس سے پیشتر اسی ادارے کی ایک کتاب "ارمغانِ پاک" میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا دوبارہ اس مجموعے میں شامل کرنا تراجم کے ادبی مقام سے قطع نظر کتاب کی تازگی پر داغ ہے۔

"ہمہ نغمہ ہمہ رنگ" میں محمد جمیل نے ہزارہ کے لوک گیتوں میں سے صرف ماہیا کی چند کلیوں کو ان کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے اور یوں اپنے مضمون کے عنوان سے بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہزارہ کے دوسرے مشہور گیت "قینچی" کا جمیل صاحب نے محض نام گنوایا ہے۔ اس گیت کی تفصیلات سلیم خاں گمی کے کشمیر کے گیتوں والے مضمون میں مل جاتی ہیں۔ پوٹھوہار کے گیتوں کا البتہ بھرپور تذکرہ ہے اور اس کی داد کے حقدار عبدالحمید خاں ہیں۔ اس باب میں قتیل شفائی کے گیت "گھوم گھمت میں گوری چلے" کو شامل کر کے شاید خاور صاحب نے شاعرانہ انداز میں قافیہ پیمائی کی ہے ورنہ اس کا یہ مقام نہ تھا۔

گلگت کے پہاڑی علاقوں کے گیتوں پر "طورِ کلیم" کے عنوان اور "یہ ذہن نغمے کی ہے" کی ضمنی سرخی کے ساتھ سید عطا حسین کلیم کا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون سے ہم پہلی مرتبہ اس علاقے کے ذوقِ سخن اور رنگِ سخن سے آشنا ہوتے ہیں۔

ہیر آہنگ میں احمد ندیم قاسمی نے پانچ دریاؤں کی سرزمین کے گیتوں کا ہمہ جہتی جائزہ لیا ہے۔ ماہیا، ڈھولا، ٹپہ، دوہا، بولیاں، شادی بیاہ کے گیت قصے، کافی غرض ہر صنف کا تعارف ہے۔

سید امجد علی نے مشرقی پاکستان کے گیتوں کا "شرقی آہنگ" کے عنوان سے جائزہ لیا ہے لیکن اس مضمون میں خلوص نہیں ملتا۔ شاید اس لئے کہ سید امجد علی صاحب بنگالی سے ناواقف ہیں اور گیتوں کے نمونے دینے میں انھوں نے مختلف شعراء کے منظوم تراجم کا سہارا لیا ہے۔ اگر وہ براہ راست بنگالی گیت اور اس کے سیدھے سادے نثر میں ترجمے دیتے تو مضمون میں شاید جان پڑ جاتی۔ اس کی ایک مثال آغا تاج محمد مرحوم کا مضمون "مہران جو جھولا"

ہے جس میں سیدھے سادے طریقے سے وادیٔ مہران کے چند گیت اور اُن کے ترجمے دیئے ہیں اور ان سے اصل اور ترجمے کو سامنے رکھ کر بے تکلفی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

پاکستان کی ثقافت کے اس اہم پہلو کو اُردو داں طبقے سے روشناس کرانے کی یہ کوشش قابلِ داد ہے۔ مواد، ترتیب اور صاف ستھرے ٹائپ کا حسن مل جل کر اسے ادارہ مطبوعات پاکستان کی عمدہ کتابوں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔

خاطر غزنوی

وحشت امکاں (مجموعۂ کلام)

مصنف: عزیز حامد مدنی — ناشر: اردو اکیڈمی سندھ کراچی

"وحشتِ امکاں" عزیز حامد مدنی کی اُن نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۹ جولائی ۱۹۴۲ء سے ۱۵ جون ۱۹۶۴ء تک لکھیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعۂ کلام "چشمِ نگراں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے لیکن جس اہتمام سے "وحشتِ امکاں" چھپا ہے وہ "چشمِ نگراں" کے نصیب میں نہ تھا۔ یہ مجموعہ روایت اور تجربے کا حامل ہے۔ روایت کی نمائندگی مدنی کی غزل کرتی ہے اور ان کی نظمیں دانشِ حاضر کی ترجمان ہیں لیکن عزیز حامد مدنی اردو کے اُن چند گنے چنے شعرا میں سے ہیں جو اپنے فن کی اساس تجربے کی وسعت، مطالعے کی لگن اور فکر کی گہرائی پر رکھتے ہیں۔ عزیز حامد مدنی جدید ترین خیالات کے ساتھ ساتھ روایت کا بھی مکمل خیال رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں بغاوت کا تصور نہیں، وہ تغیر کے قائل ہیں۔ ان کا مطمح زندگی، وقت، تغیر اور زندگی ہے۔ ان کے خیال میں انھیں دائروں میں انسان کی کتنی ہی منزلیں آئیں کتنی ہی گردِ راہ ہو گئیں۔ ہر چند کہ عام آدمی کو دیکھئے تو آج بھی گھریلو، نجی، ذاتی زندگی میں زہرہ گداز مایوسی ہی نہیں خوف ہے، بے چینی ہے، ہراس ہے، اکتاہٹ ہے، آدمی اپنی ہی یادوں کا کباڑ سی معلوم ہوتا ہے مگر معاشرہ کل سے زیادہ منظم شدہ، شعوری، حساب داں اور انصاف پسند ہے۔ وہ کل کے ساتھ آج کے سمٹنے کے باوجود وسیع ہوتی ہوئی دنیا کے قائل ہیں۔ وہ سائنس، فلسفہ، سیاست، اقتصادیات سبھی کے طرفدار اور اُن کے پھیلتے اور بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کے طالب علم ہیں۔ یہ مطمحِ نظر نہ صرف اُن کے "پیش لفظ" "دانشِ حاضر کے سوادِ میں" کی روح ہے بلکہ ان کی شاعری کی جان بھی ہے:

"درونِ خانہ" اُن کے ایسے خیالات کی بڑی روشن تصویر ہے۔

دور اک راز دار ہے چالاک دید
خجلتِ نظارگی سے بے نیاز

پرعقابوں کے سرمژگاں لئے
دانشِ حاضر کی سفاکی لئے

آنکھ کے تل میں مسِ خام و حدید
آنکھ کے ڈورے ہیں روحِ مجرمی

آہنی ہے اشکِ حسرت بے گداز
دوڑتی ہے روحِ چالاکی لئے

دوست سے محروم دشمن سے الگ

یا نظم "اسے گھومتے لمحوں کے چاک" کا یہ بند:

ساعتِ جولاں ہے گویا فرصتِ تعبیرِ وقت
اے وہم آفاق و بال آتشیں و روحِ خاک

اک صفر ناطاقتی کا اک صفر پیدائی کا
زندگی محوِ تغیر ہے تو کیا حظِ اجل

اک تغیر اک اجل اک دور و اک تقدیرِ وقت
جانِ جنبش تو۔ ابد تو گھوم اسے لمحوں کے چاک

جدید ترین خیالات و رجحانات کا حامل ہونے اور جدید تحریکوں، تغیرات اور حالات سے واقف ہونے کے علاوہ مدنی مشرقی دانشوروں

کے ساتھ ساتھ مغربی مصنفین سے بھی متاثر ہیں۔ مطالعہ اور عمیق مطالعہ اُن کے ذہن میں رچ بس کر بعض اوقات ترجمے کا روپ بھی دھار لیتا ہے اور اکثر اس ترجمے یا اکتساب پر تخلیقی فن پارے کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آبادی کے دائرے کا پہلا مصرعہ بودلیئر کی نظم To my Reader کا آخری مصرعہ ہے:

(اے برادر، راز داں، مکار قاری کچھ نہ پوچھ)

اور اسی نظم کا آخری بند دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کا پہلا بند ہے:

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم بے آگاہ میں

یہاں عزیز حامد مدنی داد کے قابل ہیں کہ وہ اس خوشہ چینی کو چھپانا نہیں چاہتے بلکہ حاشیہ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں اور یہی ان کی دیانت داری کی دلیل ہے۔

مدنی کی شاعری کی ایک خصوصیت اُن کی نظم کے پہلے مصرعے میں چونکا دینے والی بات ہوتی ہے۔ مثلاً نظم "چوہا" کا پہلا مصرعہ:

مونسِ شب معیِ دزدانہ خرام   ریزہ ہائے نان کی پیہم تلاش

اس نقطہ کے خیال کے سمندر کو کوزے میں لئے ہوئے ہے یا "قرس ترون" کا پہلا شعر ؎

فصیلِ شہر کے دامن سے ایک ویرانی   لپٹ رہی تھی شکستوں کی ایک فرد لئے

یا آپریشن تھیٹر کی پوری تصویر پانچ لفظوں میں کھینچ کر رکھ دی ہے لیکن یہ خیال رہے کہ اُن کی نظموں کے یہ ابتدائی مصرعے جامد نہیں ہوتے، ان کی نظم وہاں ختم ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ایک زندہ اور متحرک چیز کی طرح آگے بڑھتی ہے۔

یہی آپریشن تھیٹر — ایک محدود تصور سے شروع ہو کر وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ اُن کا تخیل آپریشن تھیٹر کے بند اور سہمے سہمے اور گھٹے گھٹے ماحول سے نکل کر دنیا کی وسعتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور دنیا کے وسیع کینوس کو آپریشن تھیٹر کی صورت میں دیکھنے لگتا ہے:

جنگ افلاس، قحط، بیماری   بے حسی کی فصیل اور انساں
حادثوں کی یہ تنگ دیواری   دور تک اک محاذِ خاموشی
تیر جوڑے ہوئے غنیموں کی   چار سو خندقوں میں روپوشی
درد کے سیل بے پناہ میں ہے   ہر جری ایک رزمگاہ میں ہے

یوں ایک فرد کا زخم زندگی کے زخم کا روپ دھار کر وسعت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حامد عزیز مدنی کے فن کی انفرادیت ہے

مدنی کی غزل بھی اس کی نظم کی طرح سوچ، گہرائی اور تغزل کی آئینہ دار ہے ؎

اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم   اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے
وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے   گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

"دشتِ امکاں" کی ایک خصوصیت اس کی ہر نظم پہ تاریخ تخلیق اور کتاب کے آخر میں ہر نظم کا پہلا مصرعہ ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، نہایت صاف ستھری اور خوبصورت۔

خاطر غزنوی

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر و پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۱۷۰- انارکلی لاہور سے شائع کیا